جواہر شریعت

مجموعۂ رسائل

مؤلف

حضرت مولانا مفتی محمد شعیب اللہ خان صاحب مفتاحی دامت برکاتہم

مکتبہ مسیح الامت دیوبند و بنگلور

جواہر شریعت

مجموعہ رسائل

جلد دوم

مؤلف

حضرت مولانا مفتی محمد شعیب اللہ خان صاحب مفتاحی دامت برکاتہم

بانی ومہتمم الجامعۃ الاسلامیہ مسیح العلوم ، بینگلور

مکتبہ مسیح الامت دیوبند وبنگلور

نام کتاب : **جواہر شریعت** جلد دوم

مؤلف : **حضرت مولانا مفتی محمد شعیب اللہ خان صاحب مفتاحی** دامت برکاتہم

بانی ومہتمم الجامعۃ الاسلامیہ مسیح العلوم بنگلور

وخلیفہ حضرت اقدس شاہ مفتی مظفر حسین صاحب رحمۃ اللہ علیہ ناظم مظاہر علوم وقف سہارنپور

صفحات : ۵۴۲

تاریخ طباعت: رجب المرجب ۱۴۳۸ھ

ناشر : **مکتبہ مسیح الامت دیوبند وبنگلور**

موبائل نمبر : 9036701512 / 09634830797

ای۔میل : maktabahmaseehulummat@gmail.com

جواہرِ شریعت (جلدِ دوم)
پر ایک اجمالی نظر

☆ عصری تعلیم کے خطرناک نتائج

☆ دینی تعلیم کی فضیلت وضرورت

☆ دعا مؤمن کا عظیم ہتھیار

☆ دعائے سری وجہری پر محققانہ نظر

☆ تسویۂ صفوف کی اہمیت

☆ اسلامی نکاح کے خدوخال

☆ اسلام میں حسن معاشرت کی تعلیم

☆ نمازِ تہجد کا شرعی حکم

☆ کوئی بتا سکتا ہے کہ رحم مادر میں کیا ہے؟

☆ ماہِ صفر کی دو بدعتیں

☆ تلاش حلال

☆ ایک مغالطہ اور اس کا علمی جائزہ

عناوین	صفحہ
عصری تعلیم کے خطرناک نتائج	
علم کی تعریف ومقصد	۲۴
تعلیم اور ہمارے اسلاف	۲۵
زوالِ اسپین کے بعد	۲۵
موجودہ تعلیم کے خطرناک نتائج	۲۶
عیسائی مشنری اسکول زیادہ خطرناک	۲۹
ایک نومسلم مغربی مصنف کا انتباہ	۳۰
نصاب اور مشرکانہ ذہنیت	۳۲
مغربی نظامِ تعلیم کے اثرات	۳۳
مشنری اسکولوں میں عیسائیت کا پرچار وتعلیم	۳۵
مشنری اسکولوں میں بائبل کے اسباق	۳۶

بائبل ایک پوپ کی نظر میں	۳۷
آپ سب کچھ بنئے مگر اسلام کے ساتھ	۳۸
مغربی نظامِ تعلیم کا اصل مقصد	۳۹
سادہ لوحی یا خوش فہمی	۴۱
موجودہ نظامِ تعلیم مغرب کی سازش	۴۲
لیجئے گھر کی شہادت حاضر ہے	۴۳
موجودہ مسلم عصری تعلیم گاہیں	۴۴
مسلم ممالک کی صورت حال	۴۶
مسئلہ کا حل کیا ہے؟	۴۷
پہلی بات	۴۸
دوسری بات	۴۹
تیسری بات	۵۰
دو غلط فہمیوں کا ازالہ	۵۳
دینی تعلیم کی فضیلت وضرورت	
مقدمہ	۵۶
فصل اول	۶۰
علم دین حاصل کرنے کی ضرورت	۶۰
علم دین کی ضرورت قرآن سے	۶۱
علم دین کی ضرورت حدیث سے	۶۳
صحابہ کرام کے ارشادات	۶۴

حضرات علما کے اقوال	۶۶
شیخ الاسلام محمد بن عبد الوہاب رحمۃ اللہ فرماتے ہیں	۶۶
علامہ شامی درمختار کی شرح میں فرماتے ہیں	۶۷
حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ فرماتے ہیں	۶۷
فصل دوم	۶۹
علم دین حاصل کرنے والے کی فضیلت	۶۹
فصل سوم	۷۳
اہل وعیال کو علم سکھانے کی ضرورت وفضیلت	۷۳
عورت بھی ذمہ دار ہے	۷۵
ہماری افسوس ناک حالت	۷۷
اہل وعیال کو تعلیم دینے کی فضیلت	۷۷
فصل چہارم	۸۰
بچوں کی تربیت وتعلیم کا طریقہ	۸۰
فصل پنجم	۸۳
شوق علم کے چند واقعات	۸۳
فصل ششم	۸۵
علم دین سے غفلت کی سزا	۸۵
اسکولوں میں ایمان پر ڈاکہ اور اس کا علاج وتدبیر	۸۶

دعا- مؤمن کا عظیم ہتھیار

مقدمہ	۸۹

مناجات بہ درگاہِ رب کائنات	۹۱
تمہید	۹۳
دعا کی حقیقت	۹۳
ایک حدیث کی شرح	۹۴
امر اور دعا کا فرق	۹۵
ہماری کوتاہی	۹۶
ایک ناشکرے کی حکایت	۹۷
دعا افضل ہے یا ترکِ دعا	۹۷
دعا کی فضیلت	۹۸
دعا کی تاکید	۱۰۰
دعائے کے ثمرات و برکات	۱۰۲
دعا پر قبولیت کا وعدہ	۱۰۳
قبولیت دعاء کی مختلف صورتیں	۱۰۳
ایک حدیث سے وضاحت	۱۰۵
ایک مثال سے وضاحت	۱۰۶
دعا مصائب سے حفاظت کا ذریعہ	۱۰۷
دعا سے تقدیر بدل جاتی ہے	۱۰۸
دعا کے روحانی ثمرات	۱۰۹
تمام حاجات اللہ ہی سے مانگو	۱۱۰
حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دو دعائیں	۱۱۱

حضرت موسیٰ علیہ السلام کا ایک واقعہ	۱۱۲
حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا ایک واقعہ	۱۱۳
اللہ ہی حاجت روا و مشکل کشا	۱۱۴
ہمارا ہاتھ سرکاری پیالہ ہے	۱۱۷
اللہ سے دین و دنیا دونوں مانگو	۱۱۸
ایک عمدہ مثال	۱۱۹
حضرت مسیح الامت رحمہ اللہ کا ارشادِ گرامی	۱۱۹
اپنے دعاؤں کو مقبول بنایئے	۱۲۱
حرام سے پرہیز- شرطِ اعظم	۱۲۱
گناہ کی دعا نہ کرے	۱۲۲
امر بالمعروف و نہی عن المنکر	۱۲۳
دعا میں پہلے حمد و صلوٰۃ ہو	۱۲۴
دعا سے پہلے توبہ واستغفار	۱۲۶
اللہ سے لگ لپٹ کر مانگو	۱۲۷
دعا، غفلت کے ساتھ نہ ہو	۱۲۸
دعا میں رونا بھی چاہیے	۱۳۰
ایک بزرگ کی حکایت	۱۳۰
زر، زور اور زاری	۱۳۲
دعا قبولیت کے یقین سے کی جائے	۱۳۳
جلدی مچانا بُرا ہے	۱۳۳

بددعا نہ کرو	۱۳۴
امام حرم قاری سدیس کی والدہ کا قصہ	۱۳۶
دعا میں وسیلہ کا حکم	۱۳۶
آمین پر دعا کا اختتام ہو	۱۳۸
ماثور دعاؤں کا اہتمام کریں	۱۳۹
دوسروں کے لیے دعا کا حصہ	۱۴۰
اختتام و دعا	۱۴۱
منتخب نبوی دعائیں	۱۴۲
دعائے سری و جہری پر محققانہ نظر	
کلمات	۱۶۷
تقریظ	۱۶۹
تقریظ	۱۷۰
تقدمۂ کتاب	۱۷۱
فصل اول	۱۷۳
دعاء میں سر و اخفا کا مستحب ہونا	۱۷۳
دلائل قرآنیہ	۱۷۳
ایک شبہ کا جواب	۱۷۷
دلائل حدیثیہ	۱۷۸
ایک شبہ کا جواب	۱۷۸
ایک سوال کا جواب	۱۸۴

اجماع ائمہ امت	۱۸۵
فصل ثانی	۱۸۸
دعائے سری کے فوائد	۱۸۸
پہلا فائدہ	۱۸۸
دوسرا فائدہ	۱۸۸
تیسرا فائدہ	۱۸۹
چوتھا فائدہ	۱۸۹
پانچواں فائدہ	۱۸۹
چھٹا فائدہ	۱۹۰
ساتواں فائدہ	۱۹۰
آٹھواں فائدہ	۱۹۰
نواں فائدہ	۱۹۱
فصل ثالث	۱۹۳
استحباب جہر کے دلائل کا جواب	۱۹۳
استحبابِ جہر کی پہلی دلیل	۱۹۳
استدلال مذکور پر نظر	۱۹۴
جہر کی اول وجہ	۱۹۷
افادہ وانتباہ	۱۹۹
نقلِ فتوئ حکیم الامت دربارہ حکم سورۂ فاتحہ	۲۰۱
ایک شبہ کا ازالہ	۲۰۲

جہر کی دوسری وجہ	۲۰۳
جہر کی تیسری وجہ	۲۰۴
استحبابِ جہر کی دوسری دلیل	۲۰۵
دوسری دلیل کا جواب	۲۰۶
لفظ کان کی تحقیق	۲۰۶
ایک شبہ کا جواب	۲۰۷
استحباب جہر کی تیسری دلیل	۲۰۸
جواب	۲۰۹
استحباب جہر کی چوتھی دلیل	۲۱۰
جواب	۲۱۰
استحبابِ جہر کی پانچویں دلیل	۲۱۳
جواب	۲۱۳
استحباب جہر کی چھٹی دلیل	۲۱۴
جواب	۲۱۴
افادۂ علمیہ	۲۱۶
فصل رابع	۲۱۸
جہری دعاء کا حکم	۲۱۸
جہر مفرط کا حکم	۲۱۸
مہرِ معتدل کا حکم	۲۲۲
تفصیل الاجمال	۲۲۳

مروجہ دعائے جہری میں اعتقادی مفسدہ	۲۲۵
قرآنی استدلال	۲۲۶
مروجہ دعائے جہری بدعت ہے	۲۲۷
دعائے جہری میں عملی مفاسد	۲۲۹
مستحب بھی مکروہ ہوسکتا ہے	۲۳۲
دعائے جہری مفاسد سے خالی ہوتو ؟	۲۳۶
دعائے جہری میں مصالح ہوں تو ؟	۲۳۶
ایک شبہ کا جواب	۲۳۸
ایک سوال و جواب	۲۴۰
خلاصۃ المرام	۲۴۳
تسویۂ صفوف کی اہمیت	
تسویۂ صفوف کی اہمیت	۲۴۶
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا طرز عمل	۲۴۸
صحابہ کرام اور تسویۂ صفوف	۲۴۹
ائمہ امّت اور تسویۂ صفوف	۲۵۱
ترک تسویۂ پر وعید	۲۵۳
تسویۂ صف کے معنے	۲۵۶
پیر سے پیر ملانے کا مسئلہ	۲۵۷
خاتمہ	۲۶۰

اسلامی نکاح کے خدوخال

اسلامی معاشرہ میں نکاح	۲۶۲
اسلام میں نکاح کا درجہ	۲۶۳
نکاح ایک عبادت ہے	۲۶۵
نکاح عبادت کیوں ہے؟	۲۶۶
آج کل کے نکاح	۲۶۹
عبادت کا طریقہ سنت پر ہونا ضروری ہے	۲۷۰
نکاح کا اسلامی قانون وطریقہ	۲۷۱
نکاح کا مقصد عفت ہونا چاہئے	۲۷۱
عورت کا انتخاب دین کی بنیاد پر ہو	۲۷۲
نکاح میں خرچ کم کرنا چاہیے	۲۷۳
مہر زیادہ نہ باندھا جائے	۲۷۳
ہمارے زمانے کے نکاحوں پر ایک نظر	۲۷۴
جوڑا جہیز کے طالب پر رسول اللہ ﷺ کی پھٹکار	۲۷۵
لڑکی والوں کا ناجائز مطالبہ	۲۷۸
لڑکے اور لڑکی کے انتخاب کا ذلیل معیار	۲۷۹
دیندار رشتہ آنے پر نکاح نہ کرنا فساد کا باعث ہے	۲۸۱
نکاحوں میں اسراف وفضول خرچی اور ناجائز امور	۲۸۲
موجودہ دور کے نکاحوں میں شرکت کا حکم	۲۸۳

اسلام میں حسنِ معاشرت کی تعلیم

اسلام میں حسن معاشرت کی تعلیم	۲۸۷
آج کی ضرورت	۲۸۷
حسن معاشرت کے دو اصول	۲۸۸
حقوق وفرائض کی اہمیت	۲۸۹
والدین کے ساتھ حسن معاشرت	۲۹۰
میاں اور بیوی کی معاشرت	۲۹۲
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حسن معاشرت	۲۹۴
ہماری معاشرت پر ایک نظر	۲۹۶
بڑوں کا چھوٹوں پر شفقت	۲۹۷
سیرت محمدی صلی اللہ علیہ وسلم سے سبق	۲۹۸
بچوں پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی شفقت	۲۹۹
پڑوسیوں سے حسن معاشرت	۳۰۱
پڑوسی کی خبر گیری و مدد کا حکم	۳۰۳
اپنی طرف بھی دیکھئے	۳۰۴
دور رسالت کا ایک واقعہ	۳۰۴
پڑوسی کی ایذا پر صبر اور ایک عجیب واقعہ	۳۰۵
حسنِ معاشرت کے چند عام اصول	۳۰۶
مسلمان کی تعریف	۳۰۶
کسی کے گھر بے موقعہ بیٹھے رہنا	۳۰۷

راستوں اور دروازوں پر بیٹھنا	۳۰۸
راستہ پر بیٹھنے کا حق و ادب	۳۰۶
گھر میں داخل ہونے کی اجازت	۳۱۱
دو آدمیوں کے درمیان نہ گھسو	۳۱۲
حضرت تھانوی رحمۃ اللہ کا ایک واقعہ	۳۱۳
کسی کے گھر میں تانک جھانک کرنا	۳۱۴
رشتہ داروں سے حسن سلوک	۳۱۵
صلہ رحمی کی اہمیت	۳۱۵
ایک مزاحیہ حکایت	۳۱۵
صلہ رحمی کی فضیلت	۳۱۶
اخروی فوائد و فضائل	۳۱۸
دنیوی فوائد و فضائل	۳۱۹
ایک شبہ کا جواب	۳۱۹
قطع رحمی کا وبال	۳۲۰
ایک عجیب واقعہ	۳۲۱
رشتہ داری کا حق کیا ہے	۳۲۲
حسن سلوک	۳۲۳
مالی تعاون	۳۲۳
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک واقعہ	۳۲۴
حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کا ذکرِ جمیل	۳۲۵

دوہرا اجر ملے گا!	۳۲۶
حاجت وضرورت پر کام آنا	۳۲۶
ایک انسانیت سوز واقعہ	۳۲۷
دفع مضرت	۳۲۸
لغزشوں سے درگزر کرنا	۳۲۸
نمازِ تہجد کا شرعی حکم	
التقریظ	۳۳۱
تمہید وتقدیم	۳۳۲
جماعت تہجد کا شرعی حکم	۳۳۶
تہجد کی جماعت اور حنفی نقطۂ نظر	۳۳۹
نوافل کی جماعت سے مکروہ ہونے کی دلیل	۳۴۱
دوسری دلیل	۳۴۲
ایک شبہ کا جواب	۳۴۳
دوسرا شبہ اور جواب	۳۴۴
علامہ ابراہیم حلبی رحمہ اللہ کا فتوی	۳۴۵
ملک العلماء کاسانی کا فتوی	۳۴۶
علامہ ولوالجی رحمہ اللہ کا فتوی	۳۴۶
علامہ ابن البزاز الکردری رحمہ اللہ کا فتوی	۳۴۶
علامہ احمد بن محمد الحموی رحمہ اللہ کا فتویٰ	۳۴۷
علامہ ابن نجیم مصری رحمہ اللہ کا فتوی	۳۴۷
علامہ شرنبلالی رحمہ اللہ کا فتویٰ	۳۴۸

علامہ ابن عابدین شامی رحمہ اللہ کا فتوی	۳۴۹
قاضی ثناء اللہ پانی پتی کا فتوی	۳۵۰
حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ کا فتوی	۳۵۰
حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی رحمہ اللہ کا فتویٰ	۳۵۱
حضرت شیخ الحدیث زکریا صاحب رحمہ اللہ کا ارشاد	۳۵۳
حضرت جی مولانا یوسف صاحب کاندھلوی رحمہ اللہ کا ارشاد	۳۵۳
حضرت مولانا انور شاہ کشمیری رحمہ اللہ کا ارشاد	۳۵۳
بریلوی مسلک کے مستند عالم حضرت مولانا امجد علی صاحب کا فتوی	۳۵۴
حضرت مجدد الف ثانی رحمہ اللہ کا ارشاد	۳۵۴
حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ کا فتوی!	۳۵۵
ایک وضاحت	۳۵۶
حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن رحمہ اللہ کا فتوی	۳۵۶
علامہ ظفر احمد عثمانی رحمہ اللہ کا فتوی	۳۷۵
حضرت مفتی محمود حسن گنگوہی رحمہ اللہ کا فتوی	۳۵۸
علامہ عبد الشکور لکھنوی رحمہ اللہ کا فتوی	۳۵۸
امام مالک وامام شافعی ودیگر ائمہ کرام رحمہم اللہ کے فتاوے	۳۵۹
خاتمہ اور دعا	۳۶۰

کوئی بتا سکتا ہے کہ رحم مادر میں کیا ہے؟

حرفِ آغاز	۳۶۲
تمہید	۳۶۳
آیت کریمہ کی تفسیر وتوضیح	۳۶۷

آیت کریمہ کا شان نزول	۳۶۷
آیت میں حصر کا مفہوم	۳۶۹
احادیثِ تفسیریہ	۳۷۰
رجوع بمقصد	۳۷۱
علم سے کونسا علم مراد ہے	۳۷۱
مراد علم غیب اور علم محیط ہے	۳۷۲
آمدم بر سر مطلب	۳۷۳
علم غیب کی حقیقت	۳۷۴
ڈاکٹروں کا علم، علم غیب نہیں	۳۷۶
حضرات انبیاء عالم الغیب نہیں	۳۷۷
غیر اللہ کو ما فی الارحام کا علم عطا ہو سکتا ہے	۳۷۹
ایک شبہ کا جواب	۳۸۰
ڈاکٹروں کا علم محیط نہیں	۳۸۴
ایک سوال کا جواب	۳۸۷
مرزا حیرت دہلوی پر نقد	۳۸۹
خلاصۂ کلام	۳۹۲

ماہِ صفر کی دو بدعتیں

ابتدائیہ	۳۹۴
تیرہ تیزی	۳۹۵
تیرہ تیزی عوام کی نظر میں	۳۹۵

غور کرنے کی دو باتیں	۳۹۶
رسول اکرمؐ کے بیماری کے ایام	۳۹۶
طرفہ تماشا	۳۹۷
کیا بیماری نحوست ہے یا نحوست سے آتی ہے؟	۳۹۸
صفر کی نحوست کا عقیدہ جاہلیت ہے!	۴۰۰
تین چیزوں میں نحوست کا مطلب	۴۰۱
اصل نحوست کیا ہے؟	۴۰۲
ایک بے اصل حدیث	۴۰۴
آخری چہار شنبہ	۴۰۶
آخری چہار شنبہ عوام کی نظر میں	۴۰۶
آخری چہار شنبہ اور صحت یابی رسول صلی اللہ علیہ وسلم	۴۰۷
ایک انکشاف اور اندیشہ	۴۰۷
مولانا احمد رضا خان بریلوی کا فتوی	۴۰۶
صحت وفات کے کچھ تذکرے	۴۰۶
خوشی کے موقع پر اسوہ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم	۴۱۰
بدعت، دین کی تحریف ہے	۴۱۲
سیر وتفریح اور شیطانی دھوکہ	۴۱۲
آخری بات اور دعا	۴۱۳
تلاشِ حلال	
تمہید	۴۱۵

حلال کی تلاش کا حکم	۴۱۶
کسبِ حلال کی فضیلت	۴۱۷
حلال کی برکت	۴۱۹
حرام کمائی کی حرمت ونحوست	۴۲۲
حرام مال کی بے برکتی ونقصان	۴۲۴
حرام کھانے والے کے اعمال مقبول نہیں	۴۲۷
حرام کھانے کی اُخروی سزا	۴۳۰
حضراتِ صحابہ کی حرام سے احتیاط	۴۳۲
بزرگانِ دین کی حرام سے احتیاط	۴۳۵
حلال وحرام کے بارے میں اقوال اکابر	۴۳۷
ہمارا معاشرہ غلط روِش پر	۴۳۹
حصولِ حلال کے چند اہم اصول	۴۴۰
سود کی حرمت	۴۴۱
آیات کے بعد احادیث بھی لیجئے	۴۴۳
بینک انٹرسٹ کا رواج	۴۴۵
مارٹ گیج کا حکم	۴۴۷
چیٹ فنڈ یا چٹھی	۴۴۹
رشوت خوری	۴۴۹
قمار یعنی جوابازی	۴۵۲
جوا کیا ہے اور کیوں حرام ہے؟	۴۵۴

جوے کا مسلم معاشرہ میں چلن	۴۵۷
انشورنس اسکیم	۴۵۸
لاٹری ٹکٹ	۴۶۰
بند ڈبوں کی خرید وفروخت	۴۶۰
بیع بالقسط کی بعض صورتیں	۴۶۰
چوری کرنا یا ڈکیتی	۴۶۱
غصب یا ظلم سے کسی کا مال لینا	۴۶۶
جوڑے جہیز کا مطالبہ	۴۶۹
میراث میں خیانت	۴۷۱
چند اہم احادیث	۴۸۶
حرام کمائی کی چند رائج صورتیں	۴۸۸
ایک حدیث نبوی	۴۹۰
رزقِ حلال ووسیع کے لیے اعمال ودعائیں	۴۹۱
فقر وحاجت کی خاص دعائیں	۴۹۸
چند دعائیں اور اذکار	۵۰۱
ایک مغالطہ اور اس کا علمی جائزہ	
ابتدائیہ	۵۰۴
ایک مغالطہ اور اس کا علمی جائزہ	۵۰۵
علما کا تحقیقی جواب	۵۰۵
علما کی دلیل	۵۰۶
علما کے سکتے کی وجہ	۵۰۸

علما کی تشریح اور مدعیانِ تحقیق کی کج فہمی	۵۰۹
کیا یہ بے کارکی اور سطحی باتیں ہیں؟	۵۱۰
خود ساختہ فلسفہ اور اس پر تبصرہ	۵۱۱
مسلمان اور حقوق العباد	۵۱۴
ایک سازش ہے یہ!	۵۱۶
زمانۂ رسالت اور گناہ گار	۵۱۷
مساجد پر کس کا قبضہ ہونا چاہیے؟	۵۱۹
علما کا اختلاف اور جہالت کا کرشمہ	۵۲۰
علمائے دنیوی علوم سے نابلد ہیں	۵۲۱
مساجد اور سادگی	۵۲۴
قذافی کا ارشاد	۵۲۴
تبلیغی جماعت پر ناروا حملے	۵۲۷
تبلیغی جماعت پر پہلا اعتراض اور جواب	۵۲۸
تبلیغی جماعت پر دوسرا اعتراض اور جواب	۵۲۹
تیسرا اعتراض اور جواب	۵۳۱
چوتھا اعتراض اور جواب	۵۳۲
صیاد اپنے ہی دام میں!	۵۴۳
چور کی ڈانٹ کوتوال پر!	۵۳۵
مصائب کا اسلامی فلسفہ	۵۳۶
ایک عمدہ مثال!	۵۳۹
کفار کا غلبہ کیوں؟	۵۴۰

عصری تعلیم کے
خطرناک نتائج

بسم اللہ الرحمن الرحیم

عصری تعلیم گاہوں کے نصاب اور نظامِ تعلیم پر بے لاگ تبصرہ اور اہلِ اسلام کے لیے مفید مشورے

یہ بات ہر اس شخص پر واضح وظاہر ہے جو ذرا بھی عقل وشعور رکھتا ہو اور دانش و بینش کا حامل ہو کہ تعلیم، انسانی ضروریات میں سے ایک اہم ترین ضرورت اور روحانی فضائل میں سے ایک بلند ترین فضیلت ہے، علم و تعلیم ہی وہ جوہر لازوال ہے، جس کے سامنے فرشتوں کو سرنگوں ہونا پڑا اور جس کی بنا پر انسان مسجودِ ملائک بنا اور یہی وہ وصف خصوصی ہے کہ شرافتِ انسانی اور کرامتِ انسانی جس پر مرتب ہوتی ہے۔ یہ وہ باتیں ہیں جن میں دورائیں نہیں ہوسکتیں۔

علم کی تعریف ومقصد

مگر یہاں یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ علم وہی ہے جس سے انسان کو انسانیت کا سبق ملے، اخلاق فاضلہ میں رسوخ حاصل ہو، تہذیب وشرافت پروان چڑھے اور اس کے ساتھ وہ حق وباطل میں تمیز، مغز وپوست میں فرق، اور صلاح وفساد میں امتیاز کرنے کی صلاحیت بخشتا ہو اور انسان کو صراط مستقیم پر گامزن کرتا ہو اور رضائے الٰہی اور قرب

خداوندی کی دولت سے مالا مال کرتا ہو، اس کی کوئی پرواہ نہیں کہ وہ سائنس وٹکنالوجی (Science & Tecnology) کے علوم ہوں یا طب وانجینئری کے فنون ہوں، تاریخ وفلسفہ کے اسباق ہوں، یا زبان وادب کے دروس ہوں۔ اگر یہ تمام علوم وفنون انسان کو اس مقصد تک پہنچاتے ہیں جو ابھی مذکور ہوا، تو بلا شبہ یہ علوم وفنون ہیں اور اگر اس مقصد تک نہیں پہنچاتے تو یہ سب ایک شعبۂ جنون ہے۔

علامہ اقبال رحمۃ اللہ نے کہا ہے:

جو ہر میں ہو لا الٰہ تو کیا خوف   تعلیم ہو گو فرنگیا نہ

تعلیم اور ہمارے اسلاف

چناں چہ جس دور میں یہ تمام علوم وفنون اہل اسلام کے ہاتھوں پروان چڑھ رہے تھے، ان علوم وفنون سے انسان کو انسانیت کا سبق، شرافت کا درس، اخلاق فاضلہ میں رسوخ، حق وباطل میں تمیز و پہچان کی صلاحیت، بھرپور طریقے پر حاصل ہوتی رہی اور انسان ہدایت کی شاہراہ پر گامزن اور صراط مستقیم پر قائم تھا، سائنس کا ہر سبق اس کے لیے وجود خداوندی اور توحیدِ باری کا سبق تھا، ٹکنالوجی کے فنون اس کے لئے قدرتِ خداوندی پر یقین کا باعث بن جاتے تھے، تاریخ کے واقعات اور قوموں کے عروج وزوال کی داستانیں اس کے لیے عبرت وموعظت کے اسباق قرار پاتے تھے اور وہ ان سے ہدایت حاصل کرنے پر مجبور ہو جاتا تھا: غرض یہ کہ یہ تمام علوم وفنون اس کی رہنمائی کرتے تھے اور وہ رضائے الٰہی وقرب خداوندی کی دولت سے مالا مال ہو جاتا تھا۔

زوالِ اسپین کے بعد

مگر اسپین کے زوال کے بعد جب یہ تمام علوم وفنون (جن کو ہمارے اسلاف

نے ایمانی فراست اور روحانی حرارت کے ذریعہ پروان چڑھایا تھا اور ان علوم وفنون سے انسانیت کی خدمت لیتے رہے) الحادو دہریت کے شکار لوگوں، خدا اور رسول کے باغیوں، انسانیت وشرافت سے محروم لوگوں، حرص وہوس کے پجاریوں کے ظالمانہ ومجرمانہ پنجے اور قبضے میں چلے گئے، تو ان علوم وفنون کو ان کے اصل مقصد ومنشا، کے خلاف استعمال کیا جانے لگا اور اپنے ذاتی مفادات کے لئے انکا کھلے طور پر استحصال کیا جانے لگا۔اور یہ ملحد وزندیق اور اہل حرص وہوا لوگ اپنی مکاری وعیاری' چالا کی وچال بازی سے شعبۂ تعلیم پر چھاتے ہی چلے گئے، یہاں تک کہ ان علوم وفنون کو انہوں نے خدا اور رسولوں سے بغاوت، مذہب وایمان سے عداوت، انسانیت وتہذیب سے تلعب واستہزاء اور اخلاقی اقدار کی تحقیر وتوہین کے لیے استعمال کرنا شروع کردیا۔

اور آج کے دور میں علم وتعلیم نام ہی اس بات کا ہے کہ مذہب وایمان کو فضول اور بےکار چیز سمجھا جائے، اخلاقی اقدار جیسے شرم وحیاء، تواضع وانکساری، احسان وسلوک وغیرہ کو عجز وکمزوری پر محمول کیا جائے اور انسانی اقدار کو دقیانوسی ٹھہرا جائے اور اس کے برعکس ہر بےحیائی اور بےشرمی کو تعلیم کا لازمہ اور ہر بےایمانی اور بداعتقادی کو عقل وشعور کا نتیجہ اور ہر بداخلاقی وبدتہذیبی کو روشن خیالی کا اثر قرار دیا جائے۔

موجودہ تعلیم کے خطرناک نتائج

یہ افسوس ناک صورت حال جن خطرناک وتباہ کن نتائج پر منتج ہوئی اور برابر ہورہی ہے، وہ آج ہمارے سامنے ہے جن کا خلاصہ درج ذیل ان نمبرات میں پیش کیا جاسکتا ہے۔

(۱) ہمارے بچے جب ان اسکولوں میں جاتے اور وہاں کے نظام ونصاب کے مطابق تعلیم حاصل کرتے ہیں، تو ان کے دلوں سے ایمان واسلام بل کہ مذہب کی عظمت واہمیت یکسر ختم ہوجاتی ہے اور وہ اس کو محض ایک فضول چیز سمجھنے لگتے ہیں۔

(۲) اور جو لوگ کچھ مذہبی قسم کے ہیں، انہوں نے اس تعلیم کا یہ اثر قبول کیا کہ دین و دنیا کو دو خانوں میں بانٹ دیا اور مذہب و دین کو زندگی کا پرائیوٹ معاملہ کہہ کر اس کو مدارس و مساجد اور نماز روزہ تک ہی محدود و مقید کر دیا اور زندگی کے دیگر مراحل و مواقع میں پوری طرح اسلام سے آزاد ہو گئے، حالاں کہ یہ ذہنیت خالص عیسائی اور یہودی ذہنیت ہے۔

(۳) بہت سے تعلیم یافتہ لوگوں میں اسلام کے بنیادی عقائد اور بہت سے احکام کے بارے میں شکوک وشبہات پیدا ہو گئے اور وہ بے اطمینانی و بے اعتمادی کا شکار ہو گئے، پھر ان میں جو بزدل ہیں، وہ تو دل ہی دل میں ان شکوک شبہات کو لیے پھر رہے ہیں اور جو جری ہیں وہ برملا اسلام پر حملہ کرتے رہتے ہیں، چناں چہ اخبارات وجرائد کے کالم اس قسم کے لوگوں کا پتہ دیتے رہتے ہیں۔

(۴) عفت وعصمت، پاکیزگی و پاک دامنی کی کوئی فضیلت واہمیت دلوں میں باقی نہ رہی؛ بل کہ عفت وعصمت کی قدروں کو پامال کرنا، ایک فیشن بن گیا اور جو شرم وحیاء اور عصمت کی بات کرے وہ ان لوگوں کی نظر میں دقیانوسی اور حالات زمانہ سے بے بہرہ اور تاریک خیال ٹھہرایا گیا۔

(۵) اخلاق وشرافت، تہذیب وانسانیت کی جگہ حیوانیت و درندگی اور شیطانیت نے لے لی اور انسانیت واخلاق کی توہین کرنا، ایک محبوب مشغلہ بن گیا، اب یہ لوگ کھڑے ہوکر پیشاب کریں تو روشن خیالی، کوئی بیٹھ کر پیشاب کرے تو دقیانوسی، یہ لوگ کھڑے ہوکر کھائیں، آدھا کھانا گررہا ہو اور بدتہذیبی کا مظاہرہ ہورہا ہو، تو عین روشن دماغی ہے اور کوئی مولوی ان کو بتائے کہ ادب وسلیقہ سے، دسترخوان پر بیٹھ کر، انسان بن کر، نوش فرمائیں، تو یہ مولوی تاریک خیال؛ پھر اس کی تاریک

خیالی کے چرچے، ان روشن دماغوں کے فرائضِ تبلیغ میں داخل، تاکہ کوئی مولوی جیسا تاریک خیال دنیا میں باقی نہ رہے۔

(٦) چوں کہ اس تعلیم کا مقصد محض تن پروری وتن آسانی، عیش پرستی ہی دماغوں میں بٹھایا جاتا ہے، اس لئے ہر تعلیم یافتہ حرص وہوس کا غلام بن کر آتا ہے اور مال و دولت کے جمع کرنے میں اندھا، بہرا ہو کر لگ جاتا ہے؛ نہ حلال وحرام کی تمیز سے اس کو کوئی دلچسپی ہوتی ہے اور نہ انسانی ہمدردی وغم خواری سے کوئی واسطہ۔ ڈاکٹر ہو تو بیماروں سے جتنا اور جس طرح ہڑپ کر سکتا ہے، وہ کرے گا؛ اس کو بیمار کی شفایابی وعلاج سے زیادہ اپنی جیب اور اپنے پیٹ کی فکر ہوگی۔ اسی طرح شادی کے موقعہ پر لڑکی والوں سے بٹورنے کی ہر تعلیم یافتہ کو فکر لگی رہتی ہے، کیوں کہ اس نے ڈاکٹر وانجینئر وغیرہ بننے کے لئے لاکھوں روپیہ خرچ کیا تھا اور وہاں دیا تھا، تو اب یہاں لینے کی فکر ہوتی ہے۔

(٧) اس تعلیم سے مقصد ہی عیش وآرام اور مال ودولت ہے، تو غریبوں سے نفرت اور حقارت کے ناپاک جذبات بھی اس طبقہ میں لازمی طور پر پیدا ہو جاتے ہیں، اس لیے یہ طبقہ اپنی سوسائٹی ہی الگ بناتا ہے، حتیٰ کہ اکثر ان میں ایسے ہیں جو مساجد میں آنا اپنی شان کے خلاف سمجھتے ہیں، کیوں کہ مساجد میں غریب طبقہ ہی زیادہ ہوتا ہے۔ اسی طرح یہ طبقہ علما کی خدمت میں جانے اور ان کے مواعظ وغیرہ سننے سے بھی دور رہتا ہے، کیوں کہ علما کا طبقہ بھی عام طور پر غریب ومسکین اور سادہ سیدھا ہوتا ہے۔ نیز ان کے گھر کی شادیوں اور تقریبات میں بھی صرف کاروں اور بنگلوں والے اور سوٹ بوٹ میں ملبوس لوگ ہی بلائے جاتے ہیں، وہ غریبوں کو بلانے میں اپنی شان کی توہین سمجھتے ہیں۔

یہ چند موٹی موٹی اور بالکل ظاہر و واضح خرابیاں اور برائیاں ہیں، جو آج کی تعلیم سے تعلیم یافتہ طبقے اور پڑھنے والے بچوں میں پیدا ہوتی ہیں، ان میں سے بعض تو ایسی ہیں جن سے ایمان ہی رخصت ہو جاتا ہے اور بعض وہ ہیں جو اسلام کی تعلیم کے خلاف ہونے کی وجہ سے سخت گناہ اور معصیت ہیں۔

عیسائی مشنری اسکول زیادہ خطرناک

یہ تو عصری تعلیم گاہوں اور وہاں کے نظام پر ایک عمومی تبصرہ ہے، لیکن اگر عیسائی مشنری تعلیم گاہوں پر خصوصیت سے نظر کی جائے تو اس کی خطرناکی اور زیادہ محسوس ہوگی، کیوں کہ ان مشنری اسکولوں کا مقصد ہی یہ ہے کہ مسلمانوں میں بداعتقادی کا بیج بویا جائے اور ان کو ان کے مذہبی ورثہ سے دور کر دیا جائے جس کی وجہ سے وہ اگرچہ عیسائی نہ ہوں، تاہم مسلمان بھی باقی نہ رہیں۔

علامہ اقبال رحمہ اللہ کی روشن خیالی اور دور اندیشی سے کس کو اختلاف ہوگا؟ انہوں نے یورپ کی درس گاہوں میں تعلیم حاصل کی وہاں کے اچھے برے کو قریب سے دیکھا، وہاں کی اقوام کا مزاج بھی دیکھا، پھر یہاں کے حالات بھی دیکھتے رہے غرض یہ کہ ایک فلسفی کی حیثیت سے ہر چیز کا بہ نظر غائر مطالعہ کیا، پھر ان عیسائی اسکولوں کی تعلیم اور ان کے نظام پر جو خیال ظاہر کیا، اس کو سنئے:

اور یہ اہل کلیسا کا نظامِ تعلیم
ایک سازش ہے فقط دین و مروت کے خلاف

ایک امریکن خاتون محترمہ مریم جمیلہ نے (جو ۱۹۶۰ء میں یہودیت سے توبہ کر کے مسلمان ہوئیں) اپنی کتاب "اسلام اور آج کی مسلمان خاتون" میں لکھا ہے کہ

The muslim mother on no account ever

Consent to sending her children to christian missonary schools or convent where they are totally alionted from there religious and cultural heritage, although she must realise that the government national schools do not provide a much happier solution . (۱)

(ترجمہ: مسلمان ماں کو کسی بھی قیمت پر اپنے بچوں کو عیسائی مشنری اسکول یا کانونٹ کو بھیجنے راضی نہ ہونا چاہیئے، جہاں ان بچوں کو پوری طرح اپنے مذہبی و معاشرتی ورثہ سے الگ کر دیا جاتا ہے۔ اگرچہ یہ بھی یقین کرنا چاہیے کہ سرکاری اسکول بھی کچھ زیادہ تسلی بخش سامان مہیا نہیں کرتے)

ایک نو مسلم مغربی مصنف کا انتباہ

اسی طرح ایک اور نو مسلم مغربی مصنف محمد اسد نے مغربی نظام تعلیم اور اسکولی تربیت کے متعلق جن خیالات کا اظہار کیا ہے، وہ بھی چونکا دینے والے ہیں۔

چنانچہ وہ اپنی کتاب ’’Islam at the cross road‘‘ میں لکھتے ہیں:

Western education of muslim youth is bound to undermine their will to believe in the mesege of the prophet, their will to regard them selves as representatives of the peculiar,

(۱) Islam and the Muslim women today,p.13

theocratic, civilisation of islam . (۱)

(یعنی مسلم نوجوانوں کی مغربی تعلیم ان کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیغام پر ایمان ویقین رکھنے اور اپنے آپ کو اس مخصوص الٰہی تمدن وتہذیب کا نمائندہ سمجھنے کے قابل نہ رکھے گی جو اسلام لے کر آیا ہے۔)

اس کے بعد پھر آگے چل کر لکھتے ہیں:

There Can be no daubt what ever that religious belief is rapidlyLosing ground among the "intelligentsia" educated on western lines. (۲)

(یعنی جو کچھ بھی ہو، اس میں شبہ نہیں کیا جاسکتا کہ ''ان روشن خیالوں'' کے اندر دینی عقائد بڑی تیزی کے ساتھ کمزور ہوتے جارہے ہیں، جن کی تعلیم مغربی بنیادوں پر ہوئی ہے)

پھر آگے ایک عجیب بات فرماتے ہیں:

ہماری (مسلمانوں کی) پوری تعلیمی پسماندگی اور بے بضاعتی ان مہلک اثرات کے مقابلے میں کوئی حیثیت نہیں رکھتی جو دینی بنیادوں پر مغربی تعلیم کی اندھی تقلید کی وجہ سے مرتب ہوں گے۔(۳)

بعض بل کہ اکثر لوگ آج مسلمانوں کی تعلیمی پس ماندگی کا رونا روتے ہیں اور ان کو مشورہ دیتے ہیں کہ جو کچھ بھی ہو اور جیسا بھی بن پڑے وہ عصری علوم حاصل

---

(۱) Islam at the cross road p: 84

(۲) Islam at the Cross Road, p:100

(۳) Islam at the Cross Road, p:100

کریں، ایسے لوگ محترم محمد اسد صاحب کی اس عبارت کو بار بار پڑھیں اور غور کریں کہ انہوں نے کیا فرمایا ہے؟

بلا شبہ پس ماندگی بری چیز ہے؛ مگر مغربی تعلیم پر اندھا دھند فریفتہ ہونا اور اس کو جوں کا توں از اول تا آخر لے کر خوش ہو جانا، ایمان اور دینی بنیادوں پر کیا مہلک اثرات مرتب کرتا ہے؟ اس کا موازنہ تعلیمی پس ماندگی سے کیا جائے تو اس پس ماندگی کی کوئی حیثیت نہ ہوگی بشرطے کہ ایمان و اسلام کی قدر دل میں ہو۔

نصاب اور مشرکانہ ذہنیت

اس کے بعد عصری تعلیم گاہوں کا ایک سرسری جائزہ لیجئے، تو معلوم ہوگا کہ یہ اسکول ایمان کے لیے کس قدر خطرناک ہیں، ان اسکولوں میں جو نصاب پڑھایا جاتا ہے اس میں انگلش زبان کی ہر کتاب میں مشرکانہ و کافرانہ ذہنیت کارفرما نظر آتی ہے اور یہ ظاہر ہے کہ اس نصاب کو پڑھنے والے بچوں پر اس کے اثرات ضرور مرتب ہوتے ہیں۔

تیسری جماعت کی کتاب ''Rhythm in Reading'' جو کرناٹک اسٹیٹ میں منظور شدہ ہے، اس میں ایک واقعہ اس طرح سے درج ہے:

> ''ایک لکڑھارا اپنی کلہاڑی سے درخت کاٹ رہا تھا' کلہاڑی چھوٹ کر ندی میں گر پڑی جو قریب ہی بہہ رہی تھی، وہ پریشان ہوا تو سورج کا خدا ''اپالو'' ظاہر ہوا اور ندی میں کود گیا اور اسکی کلہاڑی لا کر دیا الخ۔

اس واقعہ کی حکایت میں ''سورج کا خدا'' کے الفاظ ایک سادہ ذہن بچہ پر کس قسم کے اثرات چھوڑیں گے؟ نیز خدا کا سامنے ظاہر ہونا، بات کرنا، دریا میں کودنا، کیا غیر اسلامی ذہن کی پیداوار نہیں؟ اور مشرکانہ و کافرانہ ذوق کی چیزیں نہیں؟

میں نے ایک چھ سات سالہ بچّی کی جو دوسری جماعت میں زیرِ تعلیم تھی، اس کی ایک کاپی دیکھی، اس میں ایک سوال و جواب اس طرح لکھا ہوا تھا:

Who is God ? God is our father .

یعنی خدا کون ہے؟ خدا ہمارا باپ ہے۔

غور کیجئے کہ یہ ''خدا کو باپ قرار دینا'' کیا عیسائی ذہنیت اور مشرکانہ عقیدہ نہیں ہے؟ ہمارے بچّے اس کو پڑھ کر کیا مسلمان باقی رہ سکتے ہیں؟ یہاں یہ بھی عرض کر دوں کہ یہ بچّی کسی عیسائی اسکول کی طالبہ نہیں تھی؛ بل کہ ایک مسلمان کے زیرِ نگرانی چلنے والے اسکول کی طالبہ تھی؛ مگر چوں کہ وہاں کا نصاب و نظام ہی مغربی افکار اور بنیادوں پر مرتب ہوا ہے تو سب اس کے لپیٹ میں آئے ہوئے ہیں۔

مغربی نظامِ تعلیم کے اثرات

اسی وجہ سے اس نظام کے تحت پرورش پانے والے لوگ عام طور پر بے دینی اور الحاد و دہریت، یا کم از کم دین و مذہب کے بارے میں تشکک و تذبذب کا شکار ہو جاتے ہیں اور اسلام اور اس کی تعلیمات پر حملے کرنے میں بھی کوئی باک محسوس نہیں کرتے۔

علامہ شبلی نعمانی رَحِمَہُ اللّٰہ نے اپنے خطبات میں فرمایا ہے:

''جدید تعلیم میں مذہبی اثر نہ ہونے کا یہ نتیجہ ہے کہ سیکڑوں تعلیم یافتہ مذہبی مسائل کو تقویم پارینہ سمجھتے ہیں، اخباروں میں آرٹیکل نکلتے ہیں کہ اسلام کا قانون وراثت خاندان کو تباہ کر دینے والا ہے، اس لئے اس میں ترمیم ہونی چاہئے، ایک صاحب نے مضمون لکھا کہ رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم جب مکہ میں تھے، پیغمبر تھے، مدینہ جا کر بادشاہ ہو گئے اور اس لئے قرآن

مجید میں جو مدنی سورتیں ہیں وہ خدائی احکام نہیں؛ بل کہ شاہانہ قوانین ہیں، ایک موقعہ پر مجھ سے لوگوں نے لکچر دینے کی درخواست کی، میں نے پوچھا کس مضمون پر لکچر دوں؟ ایک گریجویٹ مسلمان نے فرمایا کہ اور چاہے جس مضمون پر تقریر کیجیے؛ لیکن مذہب پر نہ کیجیے، ہم لوگوں کو مذہب نام سے گھن آتی ہے (نقل کفر کفر نہ باشد) یہ صرف دو چار شخص کے خیالات نہیں، مذہبی بے پروائی کی عام وبا چل رہی ہے، فرق یہ ہے کہ اکثر لوگ دل کے خیالات دل ہی میں رکھتے ہیں اور بعض دلیر طبع لوگ ان کو ظاہر بھی کر دیتے ہیں۔ (۱)

علامہ اقبال رحمۃ اللہ جوان ہی کالجوں کے پروردہ اور یورپی دنیا اور وہاں کے لوگوں کی عیاریوں و مکاریوں سے خوب واقف تھے، انھوں نے انہی حالات کے مطالعہ ومشاہدہ کے بعد کہا تھا۔

ہم سمجھتے تھے کہ لائے گی فراغت تعلیم
کیا خبر تھی کہ چلا آئے گا الحاد بھی ساتھ

اس شعر کی تشریح کرتے ہوئے شارح اقبالیات پروفیسر یوسف سلیم چشتی نے لکھا ہے:

"تعلیم حاصل کر کے نوجوانوں کو سرکاری ملازمت تو بیشک مل جاتی ہے؛ لیکن اس مغربی تعلیم کی وجہ سے ان کے اندر الحاد کا رنگ بھی تو پیدا ہو جاتا ہے، مسلمان کے گھر میں دولت آرہی ہے؛ لیکن کفر کی لعنت بھی اس کے ساتھ ساتھ داخل ہو رہی ہے، تو ایسی دولت کس کام کی؟ واضح ہو کہ

(۱) خطبات شبلی: ۵۸-۵۹

مغربی تعلیم کے مضر ہونے پر اقبال نے فیصلہ ۱۳۳۱ھ ۱۹۱۳ء میں صادر کیا تھا،
اور قوم اس وقت سے لے کر تا ایں دم اُسی سمِّ قاتل کو نوشِ جانِ ناتواں
فرما رہی ہے، تو ناظرین خود اندازہ کرلیں کہ مریض اب کس منزل میں
ہوگا؟ (۱)

غرض یہ کہ مغربی تعلیم کی ساخت و پرداخت ہی کچھ اس طرح واقع ہوئی ہے کہ اس سے کفر وشرک اور بغاوت وطغیانی اور الحاد و دہریت کے جذبات وخیالات جنم لیتے اور پرورش پاتے ہیں؛ کیوں کہ ان تعلیم گاہوں میں علوم فنون کی تعلیم کا جو منہج ہے وہ مغربی ثقافت وتھذیب کے مزاج وخصوصیات سے تشکیل پایا ہوا ہے اور ان فکری و فلسفیانہ رجحانات کا آئینہ دار ہے جن سے مغربی ثقافت وتہذیب پروان چڑھی ہے۔

مشنری اسکولوں میں عیسائیت کا پرچار و تعلیم

عیسائی مشنری اسکولوں جن کی ہمارے معاشرے میں خاصی مانگ ہے اور وہ بڑی عزت وتوقیر کی نگاہوں سے مسلم سماج میں بھی دیکھے جاتے ہیں اور مسلمان بچوں کی اکثریت ان میں زیرِ تعلیم ہے، حتیٰ کہ بعض بعض عیسائی کانونٹوں میں ساٹھ سے ستر فیصد تک مسلمان طلبہ وطالبات زیرِ تعلیم ہیں، ان میں سے بیشتر اسکولوں میں باقاعدہ عیسائیت کا پرچار ہوتا ہے؛ بل کہ تعلیم ہوتی ہے اور اس سے بھی آگے چرچ لے جا کر عملی طور پر طلبہ کو ان کے مذہبی مراسم ادا کرنے پر مجبور کیا جاتا ہے۔

اس جگہ اس واقعہ کا ذکر کرتا چلوں کہ ایک خاتون جن سے ہمارے خاندانی مراسم ہیں، وہ میرے گھر اپنے بچوں کو قرآن پاک اور دینیات کی تعلیم کیلئے لایا کرتی تھی، ایک دن آئیں تو روتے ہوئے، جب رونے کی وجہ پوچھی گئی تو بتایا کہ ابھی آتے ہوئے

(۱) بانگ درا مع شرح ص/ ۵۵۷ تا ۵۵۸

راستہ میں اچانک میرے دونوں بچّے نظر نہ آئے تو میں اِدھر اُدھر نظریں دوڑاتی رہی، اچانک میری نظر راستہ میں بنے ہوئے مریم یا عیسیٰ عَلَیْہِ السَّلَام کے ایک بُت پر پڑی، تو وہاں میرے دونوں بچّے بت کے سامنے گھٹنے ٹیک کر ہاتھ جوڑے ہوئے ہیں، یہ دیکھ کر میں وہاں گئی اور ان کو مار کر لے آئی، اس پر بچّے کہتے ہیں کہ ہم نے یہ کیا برا کیا ہے؟ یہ کام تو ہم اسکول میں روزانہ کرتے ہیں۔ وہ خاتون کہنے لگی کہ اس پر مجھے رونا آرہا ہے۔ میں نے کہا کہ قصور بچّوں کا نہیں، آپ والدین کا ہے، جو محض دنیا کے لئے دین سے بے فکر ہو جاتے ہیں۔

بہ ہر حال اس واقعہ سے سمجھا جا سکتا ہے اور سمجھنا بھی چاہئے کہ یہ مشنری اسکول کس طریقہ پر بچّوں کو ایمان و اسلام سے دور اور کفر و شرک و عیسائیت سے قریب کر رہے ہیں؟

مشنری اسکولوں میں بائبل کے اسباق

اسی طرح بہت ساری اسکولوں میں بائبل کے اسباق کو لازم کر دیا گیا؛ بل کہ مجھے ذاتی طور پر معلوم ہے کہ بعض اسکولوں میں، بائبل کے سبجکٹ (Subject) میں ناکام ہو جانا (اگر چہ دوسرے تمام مضامین میں کامیاب ہو) مانع ترقی ہے۔ حالاں کہ اسلامی نقطۂ نظر سے بائبل کا پڑھنا حرام ہے، سوائے اس کے کہ کوئی تحقیق کا کام کرنے والا عالم محقق، تردید کے لئے مطالعہ کرے۔

حدیث میں آتا ہے کہ ایک دفعہ حضرت عمر بن خطاب رَضِیَ اللہُ عَنْہُ توریت کا نسخہ لا کر مطالعہ کرنے لگے، یہ دیکھ کر سرکارِ دو عالم صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ کا چہرۂ انور غصہ کی وجہ سے سرخ ہو گیا، حضرت ابو بکر صدیق رَضِیَ اللہُ عَنْہُ نے حضرت عمر رَضِیَ اللہُ عَنْہُ سے فرمایا کہ عمر! تم اللہ کے نبی عَلَیْہِ السَّلَام کا چہرہ نہیں دیکھتے؟ حضرت عمر رَضِیَ اللہُ عَنْہُ نے جو آپ کا چہرہ

دیکھا، تو پریشان ہوگئے اور بار بار اللہ و رسول کے غضب سے پناہ مانگنے لگے۔ اس سے آپ کا غصہ کم ہوا، پھر آپ علیہ السلام نے فرمایا کہ: اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں محمد کی جان ہے، اگر موسیٰ علیہ السلام بھی تم میں نازل ہو جائیں اور تم مجھے چھوڑ کر ان کی اتباع کر لو، تو تم سیدھے راستے سے بھٹک جاؤ گے۔ (۱)

جب اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرات صحابہ کے لئے اس کو برداشت نہیں فرمایا، تو اندازہ کرو کہ ان بچوں کے لیے جن کی لوحِ دل ہر نقش کو قبول کر لیتی ہے، ان کے لیے اس کی تعلیم پھر اس کے لیے محنت اور تیاری اور اس کے اسباق میں کامیابی کی فکر کو کس طرح جائز قرار دیا جا سکتا ہے؟ یا کس طرح اس کو برداشت کیا جا سکتا ہے؟

بائبل ایک پوپ کی نظر میں

پھر یہ کتاب ''بائبل'' محرف ہونے کے ساتھ سچائی و صداقت سے خالی اور معقولیت و علمیت سے انتہائی دور ہے اور بعض جگہ اس کے مضامین ایمان سوز امور پر مشتمل ہیں۔

اس کے لئے علمائے اسلام کی کتابوں جیسے مولانا رحمت اللہ کیرانوی رحمہ اللہ کی ''اظہار الحق'' وغیرہ کا مطالعہ کرنا چاہئے، میں یہاں پادری یم. اے. پال کی ایک عبارت پیش کرنے پر اکتفا کرتا ہوں، وہ اپنی کتاب ''میں نے اسلام کیوں قبول کیا'' میں لکھتے ہیں:

> ۱۹۲۲ء میں بچوں کے نصابِ تعلیم کے مذہبی حصے پر بحث کرتے ہوئے ڈین مذکور (یعنی ویسٹ منسٹر گرجا کے ڈین) نے ایک جلسہ میں

(۱) مشکاۃ: ۳۲

فرمایا کہ اگر ہم اس نصاب میں کتاب پیدائش (بائبل کی پہلی کتاب)
کی کہانیاں رکھ دیں، تو آئندہ نسل یہی سمجھے گی کہ ہمارا معیارِ صداقت
بہت ہی ادنیٰ درجہ کا ہے۔

اس کے نقل کرنے کے بعد پادری یم .اے. پال نے اس کا خلاصہ ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

''اس معنیٰ خیز فقرہ سے یہ مراد ہے کہ کتابِ پیدائش کی کہانیاں اس
فاضلِ الٰہیات کے نزدیک خالی از صداقت ہیں۔''(۱)

غرض یہ کہ بائبل ایک غلط اور گمراہ کن کتاب ہے اور اسلامی نقطۂ نظر سے اس کے پڑھنے کی اجازت نہیں؛ مگر شہری اسکولوں میں اس کو داخلِ نصاب کیا گیا ہے اور مسلم بچے بھی اس کے پڑھنے پر مجبور کیئے جاتے ہیں، تو اب مسلم والدین کو غور کرنا چاہئے اور اس مسئلہ کا حل تلاش کرنا چاہیے۔

آپ سب کچھ بنئے؛ مگر اسلام کے ساتھ

آپ اپنے آپ کو اور اپنی اولاد کو سب کچھ بنایئے: ڈاکٹر، انجینئر، سائنس داں، تاریخ داں، جغرافیہ داں، ریاضی داں، اور مسلمان کو ان سب علوم وفنون کی ضرورت بھی ہے؛ مگر اس کے ساتھ آپ پر لازم وضروری ہے کہ اپنے آپ کو اور اپنے بچوں کو خدا پرست بنایئے، نبی کا غلام اور سنت کا عاشق بنایئے، دین کا خادم اور داعی بنایئے اور آخرت کا متمنی وطالب بنایئے، وہ صرف نام کے مسلمان نہیں؛ بل کہ نظر وفکر کے لحاظ سے بھی، عمل وکردار سے بھی، صورت وشکل سے بھی، سیرت وحقیقت کے اعتبار سے بھی، ہر لحاظ سے مسلمان ہوں اور اس لیے آپ کو اس پر غور کرنا چاہئے کہ کیا

(۱) میں نے اسلام کیوں قبول کیا؟: ۱۴-۱۵

موجودہ ''مغربی نظام تعلیم'' اس کا ساتھ دے سکے گا؟ یا یوں کہیے کہ کیا آپ اس ''اسلامی نظریہ'' کے ساتھ ''موجودہ مغربی تعلیم'' کا ساتھ دے سکیں گے؟

مغربی نظامِ تعلیم کا اصل مقصد

بہت سارے لوگ اس حقیقت سے بالکل ناواقف ہیں کہ ہندوستان میں انگریزی سامراج نے جو مغربی تعلیم نظام رائج کیا، اس کا مقصد انگریزی تعلیم سے زیادہ انگریزیت کی تعلیم تھی، وہ اس نظام کے ذریعہ ہندوستانی لوگوں میں انگریزی ذہنیت کو قبول کرنے کی صلاحیت پیدا کرنا چاہتا تھا اور اس کی تصدیق ''لارڈ میکالے'' کی رپورٹ سے ہوتی ہے، جو اس نے ۱۸۵۳ء میں مقبوضہ ہندوستان کے گورنر جنرل کو پیش کی تھی، چناں چہ وہ کہتا ہے:

> ''ہمیں اس وقت بس ایک طبقہ پیدا کرنے کی سعی کرنی چاہیے جو ہمارے اور ان کروڑں انسانوں کے مابین ترجمانی کے فرائض سرانجام دے سکے، جن پر ہم اس وقت (ہندوستان میں) حکمران ہیں، ایک ایسا طبقہ جو خون اور رنگ کے اعتبار سے ہندوستانی ہو؛ مگر ذوق، طرزِ فکر، اخلاق اور فہم و فراست کے نقطۂ نظر سے انگریز ہو۔''(۱)

حضرت مولانا تقی عثمانی زید مجدھم نے اپنی کتاب ''ہمارا نظامِ تعلیم'' میں اس رپورٹ کے متعدد اقتباسات نقل کر کے، اس کے نظریہ کا خلاصہ جو پیش کیا ہے، وہ عبرت خیز ہے۔ وہ فرماتے ہیں:

> ''اس کا (میکالے کا) سب سے بڑا مشن یہ تھا کہ ہندوستان کے باشندوں بالخصوص مسلمانوں کو اپنے سارے تہذیبی ورثے کے بارے میں

(۱) میکالے کا نظریۂ تعلیم ص/ ۶۹ بہ حوالہ ''ہمارا نظامِ تعلیم'' ص/ ۵۰

میں شدید احساس کمتری کا شکار بنا کر ان کے دلوں پر مغرب کی ہمہ گیر بالا دستی کا سکہ بٹھا دیا جائے، اور نئی نسل کو ہر ممکن طریقہ سے یہ یقین کر لینے پر مجبور کر دیا جائے کہ اگر دنیا میں ترقی اور سر بلندی چاہتے ہو تو اپنی فکر، اپنے فلسفے، اپنی تہذیب، اپنی معاشرت اور اپنے ماضی پر ایک حقارت بھری نظر ڈال کر مغرب کے پیچھے پیچھے آؤ اور اپنی زندگی کا ہر راستہ اسی کے نقوش قدم میں تلاش کرو۔'' (۱)

محترم محمد اسد جن کا ذکر پہلے بھی آچکا ہے، انھوں نے (ISLAM AT THE CROSS ROAD) میں مغربی طرزِ تعلیم پر بحث کرتے ہوئے لکھا ہے:

''مغربی ادبیات کی تعلیم کا انجام اس کے سوا کچھ نہیں کہ مسلمان کے لیے اسلام ایک اجنبی چیز بن کر رہ جائے، اور یہی بات یورپ کے فلسفۂ تاریخ پر بھی صادق آتی ہے؛ کیوں کہ یورپ کا نظریۂ تاریخ یہ ہے کہ دنیا میں دو ہی گروہ ہیں: رومی و وحشی۔ تاریخ کو اس طرح بیان کرنے سے ان کا مقصد یہ ہے کہ مغربی اقوام کی اور ان کے تمدن و تہذیب کی بالا دستی و فوقیت ثابت کی جائے، اور تاریخ کی اس طرح تعلیم نوجوانوں کے دماغ میں اس کے سوا کوئی بات نہیں چھوڑتی کہ وہ احساس کمتری میں مبتلا ہوں اور اپنی پوری ثقافت و تہذیب اور اپنے مخصوص تاریخی عہد کو حقارت کی نظر سے دیکھیں۔'' (۲)

(۱) ہمارا نظامِ تعلیم: ص/ ۴۸

(۲) ملخصًا از ص: ۹۵-۹۷

اب غور کیجئے کہ مغربی نظامِ تعلیم جو میکالے کے دور سے آج تک اسی نہج پر چلا آرہا ہے، اس کے ساتھ اسلامی نظریات کس طرح ہم آہنگ ہو سکتے ہیں؟ اور کیا اس کا عقلی و منطقی طور پر امکان بھی ہے؟

سادہ لوحی یا خوش فہمی

جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ یہ دونوں ہم آہنگ ہو سکتے ہیں، وہ سادہ لوحی یا خوش فہمی میں مبتلا ہیں، مولانا عبدالماجد دریابادی رحمۃ اللہ جو کالج ہی کے پروردہ اور وہاں کے سرد و گرم چشیدہ بزرگ ہیں اور ایک زمانے میں اسی مغربی تعلیم نے ان کو الحاد کا شکار بنا دیا تھا، وہ اپنی ''آپ بیتی'' میں ایک مقام پر مغربی طرزِ تعلیم پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> لفظ ''تعلیم و اعلیٰ تعلیم'' سے مرعوب؛ بل کہ مسحور ہو کر جو پرانے قسم کے مسلمان والدین اپنی اولاد کو بے تحاشا انگریزی کالجوں میں جھونکتے جاتے تھے، یہ بات ان کے سوچنے کی تھی، تعلیم کو وہ اپنے مکتبوں اور مدرسوں پر، اپنے دیوبند و فرنگی محل پر قیاس کر رہے تھے، جہاں گانے بجانے کی آواز ہی کان میں پڑھ جانا ایک جرم تھا، یہاں تو اس کے برعکس گانا بجانا داخلِ ہنر اور دلیلِ کمال تھا اور نقالی سے بچنا کیسا؟ ایکٹ کرنا سکھایا جاتا تھا، اچھی ایکٹنگ (نقالی) کی تو داد، دل بھر کر دی جاتی اور انعام اور تحفے جو ملتے وہ الگ، ایسے ماحول میں لڑکے کو ڈال کر، سادہ دل مسلمان والدین کا یہ توقع رکھنا کہ لڑکا پارسا، صالح اور کسی درجہ میں متقی ہو کر نکلے گا، کس غضب کی سادہ لوحی تھی؟ (۱)

(۱) آپ بیتی ص/۱۲۰ تا ص ۱۲۱

اس سے یہ بتانا مقصود ہے کہ موجودہ نظام تعلیم کے ساتھ ایک آدمی یہ تمنا رکھے کہ اسلام کے مطابق زندگی گزاری جا سکے گی اور یہ کہ اس کے عقائد و اعمال، اسلام کے مطابق باقی رہ سکیں گے، بڑا مشکل ہے۔

موجودہ نظامِ تعلیم مغرب کی سازش

وجہ یہ ہے کہ مغربی نظام تعلیم فی الواقع ایک سازش ہے، جس کو نہ سمجھنے کی وجہ سے شوق و رغبت؛ بل کہ روپیہ پیسہ صرف کر کے ہم اس سازش کا شکار بن رہے ہیں۔

مفکرِ اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''یہ مغربی نظامِ تعلیم درحقیقت مشرق اور اسلامی ممالک میں ایک گہرے قسم کی؛ لیکن خاموش نسل کشی کے مرادف تھا، عقلائے مغرب نے ایک پوری نسل کو جسمانی طور پر ہلاک کرنے کے فرسودہ اور بدنام طریقہ کو چھوڑ کر، اس کو اپنے سانچے میں ڈھال لینے کا فیصلہ کیا اور اس کام کے لئے جا بہ جا مراکز قائم کیے، جن کو تعلیم گاہوں اور کالجوں کے نام سے موسوم کیا۔''(۱)

ان باتوں کو علما کی زبانوں سے سن کر لوگ علما کو دقیانوسیت کی طرف منسوب کر دیتے ہیں اور خود اپنے آپ کو روشن خیال سمجھ جاتے ہیں، اس لیے یہاں میں نے بعض ان لوگوں کے حوالے بھی دئے ہیں، جن کو لوگ روشن خیال قرار دیتے ہیں اور جو خود اس تعلیم سے اخذ و استفادہ کئے ہوئے ہیں، نیز اس سازش کو سمجھنے کے لیے علامہ اقبال رحمہ اللہ کے یہ اشعار بھی قابل غور ہیں، وہ فرماتے ہیں:

---

(۱) مسلم ممالک میں مغربیت اور اسلامیت کی کشمکش: ۲۴۷

سینے میں رہے رازِ ملوکانہ تو بہتر
کرتے نہیں محکوم کو تیغوں سے کبھی زیر
تعلیم کے تیزاب میں ڈال اس کی خودی کو
ہو جائے ملائم تو جدھر چاہے اسے پھیر
تاثیر میں اکسیر سے بڑھکر ہے یہ تیزاب
سونے کا ہمالیہ ہو تو مٹی کا ہے اک ڈھیر

اسی بات کو اکبرالہ آبادی مرحوم نے اس طرح ادا کیا ہے ؎

مشرقی تو سر دشمن کا کچل دیتے ہیں
مغربی اس کی طبیعت بدل دیتے ہیں

حاصل یہ ہے کہ مغربی ذہنیت یہ ہے کہ اپنے دشمنوں اور مخالفوں کو زیر کرنے کے لیے تیغ وسنان کے بہ جائے، تعلیم کے نام پر دماغوں اور مزاجوں کو بدل دیتے ہیں اور اپنے نظریات وخیالات کے مطابق ان کو ڈھال لیتے ہیں۔ میں اوپر اس نظام تعلیم کے بانی" لارڈ میکالے" کی تصریح نقل کر چکا ہوں کہ وہ اس نظام سے ایک ایسا طبقہ پیدا کرنا چاہتا تھا، جو رنگ ونسل کے اعتبار سے تو ہندوستانی ہو؛ مگر مزاج اور فکر اور نظریات وخیالات کے لحاظ سے انگریز ہو، کیا اس کے بعد بھی کسی کو ہماری بات کی صداقت میں شک وشبہ کی گنجائش ہے؟

لیجیے گھر کی شہادت حاضر ہے

انگریزی تعلیم کے اس نتیجہ کے لیے میں خود انگریز کے گھر کی شہادت پیش کرتا ہوں اوپر بھی بعض شہادتیں گذری ہیں، اب یہ بھی پڑھ لیجیے:

"ڈاکٹر ڈبلو ہنٹر کہتا: ہمارے اسکولوں اور کالجوں سے پڑھا ہوا کوئی

نوجوان ہندو یا مسلمان ایسا نہیں ہے جس نے اپنے بزرگوں کے عقائد
کو غلط سمجھنا نہ سیکھا ہو۔‘‘(۱)

ان تمام شہادتوں سے یہ بات **کالشمس فی نصف النہار** واضح ہے کہ مغربی نظام تعلیم و نصاب تعلیم چند مخصوص نظریات اور مقاصد پر مبنی کیا گیا ہے اور وہ مقاصد و نظریات کھلے طور پر اسلامی نقطۂ نظر سے اور شرعی مقاصد سے متصادم و متخالف ہیں۔

موجودہ مسلم عصری تعلیم گاہیں

اس کے بعد ہمیں اس طرف نظر کرنا ہے اور اس کا جائزہ لینا ہے کہ آج مسلمانوں کی جانب سے جو عصری تعلیم گاہیں جاری کی گئی ہیں، ان کا کیا حال ہے؟

ہم جب اس پہلو پر غور کرتے ہیں تو بڑے دکھ اور افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ عام طور پر مسلمانوں کی نگرانی و سرپرستی میں چلنے والے تعلیمی ادارے بھی نصابِ تعلیم، طرزِ تعلیم اور نظامِ تعلیم کے لحاظ سے عیسائی اور سرکاری تعلیم گاہوں سے کچھ بھی مختلف نہیں اور وہ ساری برائیاں اور خرابیاں جو اوپر ذکر کی گئیں، ان مسلم عصری تعلیم گاہوں میں بھی علی وجہ الاتم موجود و باقی ہیں اور اس کی وجہ یہ ہے کہ ان اداروں کے بانی مبانی اور ان کے سرپرست و نگران اور ان کے اندر کام کرنے والا عملہ، یہ سب اگرچہ مسلمان ہیں؛ مگر ان کا فکر و نظریہ بعینہ وہی ہے جو غیر مسلم دانش وروں کا ہے اور ان لوگوں نے ان اداروں کے لیے وہی سب کچھ درآمد کیا ہے جو انگریزوں اور یہودیوں نے تیار کیا ہے اور شعوری طور پر یا غیر شعوری طور پر ان لوگوں نے ’’مغربی نظامِ تعلیم و تربیت‘‘ کو اس طرح قبول کرلیا ہے جیسے کہ یہ کوئی آسمانی والٰہی پیغام ہو،

---

(۱) بہ حوالہ نقش حیات، حضرت شیخ الاسلام مدنی رحمۃ اللہ جلد دوم: ۱۴۰

جس سے انحراف وتجاوزنہیں کیا جا سکتا، حتیٰ کہ مغربی نظامِ تعلیم ؛ بل کہ نظریہ تعلیم کوان لوگوں نے اس کی ساری خامیوں اورخرابیوں کے ساتھ قبول کرلیا اوراس کے کسی نقطہ اورشوشہ کوبھی تبدیل کرنا، ان کے نزدیک اسی طرح ناروا جسارت قرار پائی جیسے کلام اللہ میں کسی طرح کی تبدیلی حرام وناجائز ہے، حالاں کہ یہ مغربی نظریۂ تعلیم ان لوگوں کے ذہن کی پیداوار ہے جن کے عقائد واصول، جن کے اخلاقی اقدار وانظار، جن کے معاشرتی طور وطریقے، جن کے اقتصادی افکار ونظریئے، از اول تا آخر اور مکمل طور پر اسلامی اقدار وعقائد اور نظریوں اور طریقوں سے مختلف ہیں۔

ظاہر ہے کہ جب سب کچھ مغرب سے درآمد کیا گیا ہے اوراس کو جوں کا توں قبول کر کے نافذ العمل قرار دیا گیا ہے، تو ان مسلم اداروں اور دانش گاہوں کا حال، عیسائی مشنری یا سرکاری اسکولوں سے کس طرح اور کیوں کر مختلف ہوسکتا ہے؟

ایک مسلم اسکول میں بچوں کو ڈانس کرایا جاتا ہے اوراس کا نام فنونِ لطیفہ رکھا گیا ہے، ایک مسلم اسکول میں بچیوں کے لئے پردہ کو ممنوع قرار دیا گیا ہے اور ایک اسکول ایسا ہے جہاں کا یونیفارم انتہائی بے حیائی اور بچیوں کے لیے نیم عریانی کا ذریعہ ہے۔ ایک مسلم اسکول میں جو ایک مسجد سے منسلک اور مسجد کے ماتحت چلتا ہے، اس میں جلسہ کے موقعہ پر باقاعدہ میوزک کے ساتھ بچوں کو نچایا گیا۔

یہی نہیں ؛ بل کہ ان مسلم اسکولوں میں عموماً اسلام کے فرائض وبنیادی احکامات تک کی پرواہ نہیں کی جاتی، نمازوں کا وقت ہوتا رہتا ہے اور نماز وجماعت کا کوئی نظام اسکول کی جانب سے نہیں ہوتا ؛ بل کہ بعض اسکولوں میں یہ بھی سنا گیا کہ طلبہ نماز پڑھنا چاہتے ہیں ؛ مگر اسکول والے اپنے اوقاتِ تعلیم میں کوئی فرق وتبدیلی کرنا نہیں چاہتے، جس کی وجہ سے ان کی نمازیں غارت ہوجاتی ہیں۔

مسلم اسکولوں کے ان حالات سے بہ خوبی اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ ان اداروں کے ذمے داروں اور سرپرستوں کی ذہنیت کس قدر مغرب زدہ ہے۔

مسلم ممالک کی صورت حال

مسلم ممالک کا حال بھی وہی ہے، بیروت، قاہرہ، بغداد، ترکی، کویت، دبئی وغیرہ مسلمانوں کے مراکز پر عیسائی منادیوں اور مشنریوں نے مشن اسکولوں اور کالجوں کو قائم کر کے مغربی تہذیب و ثقافت، مغربی آداب و رسوم اور مغربی طرز معاشرت کا ایک جال بچھا دیا ہے اور اس وقت پورا عالمِ اسلام اس کی لپیٹ میں آچکا ہے، اور ہمارے افکار ونظریات، اور ہماری ثقافت وتہذیب صد فی صد مغربی ثقافت وتہذیب کے سانچے میں ڈھل چکی ہے۔

اوران کی نقالی وتقلید میں جو اسکول و کالج مسلمانوں نے قائم کئے ہیں، ان کا حال ان سے کچھ بھی مختلف نہیں؛ بل کہ درحقیقت یہ لوگ اس سلسلہ میں مغرب کو اپنا امام اور خود کو اس کا غلام سمجھتے ہیں، اس لئے وہاں کے تعلیمی شعبے اوران سے منسلک افراد نے نہ صرف یہ کہ مغربی نظریۂ تعلیم کے مطابق، نصاب ونظامِ تعلیم وتربیت کو درآمد کرلیا؛ بل کہ انہوں نے اپنے تعلیمی منصوبوں کی تکمیل اور علمی اداروں کی تشکیل میں مغربی ممالک کے ماہرین تعلیم کو مکمل طور پر اختیار دے رکھا ہے کہ وہ اپنا نصاب اور نظام جس طرح چاہیں، وہاں نافذ و جاری کریں، مزید برآں یہ کہ یہ لوگ ان مغربی ملکوں میں اپنے تعلیمی وفود بھیجتے ہیں، تاکہ وہاں کہ ماہرین تعلیم کی آغوش تربیت رہ کر وہ لوگ علمی نشو ونما حاصل کریں اور پھر اپنے ملک میں آکر اسی کے مطابق تعلیمی نقشہ ونظام طے کریں اوراس کو نافذ کریں۔

اس طرز عمل کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہاں ایک طبقہ (بل کہ بہت بڑا طبقہ) ایسا پیدا ہو گیا

جومغربی نظریات سے متأثر؛ بل کہ مرعوب ہوکر اسلامی عقائد وافکاراور دینی وشرعی اقدار وانظار سے کلیۃً دست بردار ہوگیا، یا کم ازکم اس سلسلہ میں تذبذب اور فکری و ذہنی انتشار کا شکار ہوگیا۔

اس جگہ مفکرِ اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رَحمہُ اللہُ کی ایک بات جوآپ نے اسی سلسلہ میں فرمائی ہے، نقل کرنا مناسب ہوگا، آپ فرماتے ہیں:

''آپ کوترکی سے لے کرانڈونیشیا تک مسلمان ممالک کے جتنے سربراہ اور رہنما نظر آئیں گے وہ سب اسی مغربی نظامِ تعلیم کی پیداوار ہیں، ان میں سے جن کو براہ راست کسی مغربی ملک یا یورپ کے کسی مشہور تعلیمی مرکز میں پڑھنے اور پروان چڑھنے کا موقع نہیں ملا، انھوں نے اپنے ملک میں رہ کر اس نظام تعلیم سے (اس کے مخلص نمائندوں کی نگرانی و سرپرستی میں) پورا فائدہ اٹھایا، ان میں سے متعدد اشخاص نے ملٹری کالجوں میں تعلیم پائی، جہاں مغربی طرز کی تعلیم وتربیت کا خصوصی اہتمام ہوتا ہے۔ (۱)

پھراس طبقے نے جواسکول، کالج، جامعات اور یونیورسٹیاں قائم کی ہیں، اندازہ کیجیے کہ ان کا حال مغربی طرز سے کیوں کر مختلف ہوسکتا ہے؟ لازماً وہاں بھی وہی ہوا اور ہونا چاہئے تھا کہ اسی مغربی طرز کے ادارے قائم ہو گئے اور اس میں روز بروز اضافہ ہوتا جاتا ہے۔

مسئلہ کا حل کیا ہے؟

اب سوال یہ ہے کہ اس صورت حال سے نکلنے کی کیا صورت ہے اور تعلیمی مسئلہ کو

(۱) مسلم ممالک میں مغربیت اور اسلامیت کی کشمکش: ۲۴۷

حل کرنے کی سبیل کیا ہے؟ جس سے ایک طرف علوم وفنون سے وابستگی وتعلق؛ بلکہ ان میں اختصاص ومہارت پیدا ہو، اور دوسری طرف یہ سارے علوم وفنون، معرفت ِخداوندی کا ذریعہ بن جائیں، اخلاق فاضلہ کے حصول کا سبب بن جائیں اور شرافت وتہذیب کی طرف گام زن کردیں۔

اس سوال کا جواب یہ ہے کہ اس صورت حال سے چھٹکارا پانے کے لیے بڑی سنجیدگی اور غور وفکر کے ساتھ یکے بعد دیگرے تین باتیں طے کرنی ہوں گی:

(۱) اولاً ہم کو ہماری حیثیت وحقیقت پر نظر ڈالنا ہوگا اور یہ طے کرنا ہوگا کہ ہم کون ہیں اور کیا ہیں، ہمارا مقصد وجود کیا ہے۔

(۲) پھر ہمیں تعلیم کے مقاصد کو متعین کرنا ہوگا، کہ تعلیم حاصل کرنے یا دوسروں کو تعلیم دینے کا مقصد کیا ہے اور کیا ہونا چاہئے؟

(۳) پھر اسی کے مطابق نصاب اور نظام طے کرنا ہوگا، کیوں کہ تعلیم ہماری حیثیت وحقیقت اور ہمارے طے شدہ مقاصد کے مطابق ہونا چاہئے۔ اب میں اس اجمال کی وضاحت کرتا ہوں:

پہلی بات

پہلی بات میں نے یہ کہی کہ ہمیں اولاً اپنی حقیقت وحیثیت پر نظر ڈالنا چاہئے، اس کی تفصیل یہ ہے کہ ہمیں یہ یاد رکھنا چاہئے کہ ہم مسلمان ہیں، ہمارا مذہب اسلام ہے، جس میں ہمیں کچھ عقائد وافکار اور احکام واقدار کا پابند کیا گیا ہے اور ہمارے لئے یہ پابندی ناگزیر ہے۔ اور ہمیں جاننا اور ماننا ہے کہ اسلام کوئی قومیت نہیں ہے؛ بل کہ وہ ایک پاکیزہ دین ہے جو عقائد اقدار کا حامل بھی ہے اور داعی بھی، اور وہ تمام

سعادتوں کا جامع بھی ہے اور کفیل بھی اور ہدایت وسعادت اسی دین کی پیروی میں منحصر ہے اور یہ ایک نظامِ حیات ہے جو انسانیت کے لئے آبِ حیات ہے اور مسلمان وہ امت ہے جو اللہ کے اس آخری ودائمی پیغام پر ایمان ویقین رکھتی ہے، اور اسی کے مطابق زندگی کا کارواں آگے بڑھاتی ہے۔

ظاہر ہے کہ جو امت ایسے دین کی پابند وحامل ہے، اس کو بہ ہر صورت اپنے عقائد واعمال، اپنے افکار واقدار کی ہر میدان میں اور ہر موقعہ پر حفاظت کرنا لازم ہے، ورنہ وہ اس دین کی حامل ہی نہ رہے گی۔

اسی کے ساتھ ساتھ ایک اور بات کو بھی اِسے فراموش نہیں کرنا چاہیے، وہ یہ کہ اس امت کی ذمے داری صرف یہ نہیں ہے کہ اس دین پر عمل پیرا ہو جائے؛ بل کہ اس کے ساتھ اس کی یہ بھی ذمے داری ہے کہ وہ اس کے ابدی پیغام کو دوسروں تک پہنچائے، اس کے لئے اس کو اپنے عمل اور کردار سے بھی، اور زبان وقلم سے بھی کام لے کر اس ذمے داری کو پورا کرنا اس کے فرائض منصبی میں داخل ہے۔

دوسری بات

دوسری بات یہ ہے کہ تعلیم کے مقصد پر نظر کرنا اور اس کو متعین کرنا بھی ضروری ہے، یہ کام بہت ہی ضروری ہے، کیوں کہ ہر کام اپنے مقصد کے تابع ہوتا ہے، جب تک مقصد متعین نہ ہوگا اس وقت تک تعلیم اپنے اثرات ونتائج ظاہر نہیں کرتی۔

انگریزی ومغربی تعلیم نے اقتصادی ترقی اور عیش کوشی اور حصول مال ودولت کو اپنا مقصد قرار دیا ہے۔ لہذا اس تعلیم کے زیر اثر پروردہ لوگ اور اس کی آغوشِ تربیت سے تربیت پاکر نکلنے والے افراد اپنے مقاصد کو پیش نظر رکھتے ہیں۔ اس کے برخلاف

اسلام کا نقطۂ نظر تعلیم کے سلسلے میں یہ ہے کہ تعلیم کے ذریعے انسان حق و باطل کی تمیز، اخلاقی اقدار کی تحصیل اور معرفت خداوندی کے حصول کے راستے تلاش کرے اور انسانی ہم دردی و غم خواری کا جذبہ لے کر انسانوں کی خدمت کرے۔ الغرض ہمیں تعلیم کے مقاصد کو شرعی انداز پر متعین کرنا چاہیے، تاکہ اسی کے مطابق نصاب و نظامِ تعلیم مقرر کیا جا سکے۔

تیسری بات

اب تیسری بات کو لیجیے کہ نصاب ونظام کیا اور کیسا ہو؟ یہ بات پہلی دو باتوں کے تابع ہے، کیوں کہ نصاب وہ بنے گا جو ہماری حیثیت اور حقیقت سے مناسبت رکھنے والا ہو اور نظام بھی وہ تجویز ہو گا جو ہماری ذات سے ہم آہنگ ہو گا اور اسی طرح نصاب و نظام تعلیم، ان مقاصد کے موافق ہو گا جن کو ہم نے ہماری تعلیم کے مقاصد قرار دیا ہوا ہے۔

یہ بات بالکل ظاہر ہے کہ ایک وہ شخص جس کو اللہ پر ایمان و یقین نہ ہو اور وہ ایک آزاد اور من مانی زندگی گذارنے کو روا و جائز رکھتا ہو، اس کا نصاب و نظام تعلیم ایک ایسے شخص کے لیے مفید و کارآمد نہیں ہو سکتا، جو اللہ پر ایمان و یقین رکھتا ہو اور اپنے لیے اسلامی طرز کی زندگی کو ضروری سمجھتا ہو۔

جب یہ بات واضح ہو گئی تو اب یہ سمجھنا آسان ہے کہ ہمیں مسئلہ کے حل کے لیے مغربی نصاب و نظام تعلیم کو یکسر ختم کر کے ایک ایسے نصاب اور نظام کی تشکیل کرنی ہو گی؛ جو ہماری ذات اور ہمارے مقاصد سے مناسبت و ہم آہنگی رکھتا ہو اور اس میں ان باتوں کا لحاظ رکھا گیا ہو جن کا ایک مسلمان کو لحاظ رکھنا ہے اور اس کی طبیعت سے ان کو مناسبت ہو۔

ہم یہاں اس سلسلے میں حضرت مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی رحمۃ اللہ کی بات پیش کرنا مناسب سمجھتے ہیں، جو آپ نے اسی مسئلہ کے حل کے لئے فرمائی ہے:

''اس غیر فطری اور غیر ضروری صورت حال سے چھٹکارا پانے کی اس کے سوا اور کوئی صورت نہیں کہ اس پورے تعلیم نظام کو یکسر تبدیل کر دیا جائے اور اس کو ختم کر کے نئے سرے سے ایک نیا نظام تعلیم تیار کیا جائے، جو اپنی ملّت اور امت کے قد وقامت پر راست آتا ہو اور اس کی دینی و دنیوی ضروریات پوری کر سکتا ہو، اس مسئلہ کا حل خواہ کتنا ہی دشوار نظر آتا ہو اور صبر آزما اور دقت طلب ہو، اس کے سوا کچھ نہیں کہ اس نظامِ تعلیم کو از سر نو ڈھالا جائے اور اس کو امت مسلمہ کے عقائد، زندگی کے نصب العین، مقاصد اور ضروریات کے مطابق بنایا جائے اور اس کے تمام اجزا سے مادیت، خدا سے سرکشی، اخلاقی و روحانی قدروں سے بغاوت اور جسم وخواہشات کی پرستش کی روح اور اسپرٹ کو ختم کیا جائے اور اس کے بہ جائے تقویٰ، انابت الی اللہ، آخرت کی اہمیت اور فکر اور پوری انسانیت پر شفقت کی روح جاری ساری کر دی جائے، اس مقصد کے لئے زبان و ادب سے لے کر فلسفہ اور علم النفس تک، اور علومِ عمرانیہ سے لے کر اقتصادیات و معاشیات تک صرف ایک روح پیدا کرنی ہوگی، مغرب کے ذہنی غلبہ اور تسلط کا خاتمہ کرنا ہوگا، اس کی قیادت اور امانت کا انکار کرنا ہوگا، اس کے علوم ونظریات پر علمی تحلیل و تجزیہ اور بے لاگ تنقید کا مسلسل اور جرأت مندانہ عمل کرنا ہوگا۔ (۱)

(۱) اسلامی ملکوں میں نظامِ تعلیم کی اہمیت: ص۲۱-۲۲

نیز ایک اور کتاب ''اسلامی ممالک میں مغربیت واسلامیت کی کشمکش'' میں تقریباً یہی بات فرماتے ہوئے مزید یہ بھی کہتے ہیں:

''زبان وادب سے لے کر فلسفہ ونفسیات تک اور علوم عمرانیہ سے لے کر معاشیات وسیاسیات تک سب کو ایک نئے سانچے میں ڈھالا جائے، مغرب کے ذہنی تسلط کو دور کیا جائے، اس کی معصومیت وامامت کا انکار کیا جائے، اس کے علوم ونظریات کو آزادانہ تنقید اور جرات مندانہ تشریح (پوسٹ مارٹم) کا موضوع قرار دیا جائے، مغرب کی سیادت وبالاتری سے عالمِ انسانی کو جو عظیم الشان نقصانات پہنچے، ان کی نشان دہی کی جائے غرض مغرب کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اس کے علوم وفنون کو پڑھا جائے اور اس کے علوم وتجارب کو موادِ خام (Raw - Material) فرض کر کے اپنی ضرورت اور اپنے قد وقامت اور اپنے عقیدہ ومعاشرت کے مطابق سامان تیار کیا جائے۔ (۱)

اس تفصیل سے یہ بات روز روشن کی طرح واضح ہوگئی کہ ہم مغرب سے استفادہ اسی صورت میں کر سکتے ہیں جب کہ ہم اس کے نصاب اور نظام کو حذف وترمیم اور اصلاح وتجدید کی راہ سے مکمل طور پر گذاریں گے اور اس کو اس قابل بنائیں گے کہ وہ ہمارے قد وقامت پر راست آسکے۔

یہ ہے وہ عظیم ونازک ترین کام جس کے بغیر یہ امت یا تو ناکارہ رہے گی یا مغرب کی غلام بن جائے گی، یہ کام اگرچہ طویل المیعاد ہے؛ مگر ہے ضروری، اس لئے بہ ہر حال اس کام کو کرنا چاہئے۔

---

(۱) اسلامی ممالک میں مغربیت واسلامیت کی کشمکش

دو غلط فہمیوں کا ازالہ

اس تفصیل سے بعض غلط فہمیوں کا بھی ازالہ ہو گیا، جو عام طور پر ان لوگوں کو ہو جاتی ہیں جو جدید تعلیم کے موجودہ اثرات سے مرعوب و متأثر ہو جاتے ہیں۔

ایک تو یہ کہ جب ہم یہ بات کہتے ہیں کہ مغرب کا نصاب و نظام تعلیم، اسلام کے حق میں مفید نہیں، تو یہ لوگ یہ اس پر یہ اشکال کرتے ہیں کہ یہ علوم وفنون سب کی میراث ہے، اس کو حاصل کرنے میں آخر کیا برائی ہے؟

اس کا ازالہ یہ ہے کہ بلا شک یہ علوم وفنون سب کی میراث ہیں اور یہ علوم وفنون درحقیقت نہ مشرقی ہیں نہ مغربی، اور نہ کسی کی کوئی خاص جاگیر، اس لئے اہلِ اسلام ان پر اپنا پورا پورا حق رکھتے ہیں؛ بل کہ غور کیا جائے اور تاریخ کا مطالعہ کیا جائے، تو یہ حقیقت واضح طور پر سامنے آجائے گی کہ ان علوم وفنون کی تخم ریزی اور ان کو پروان چڑھانے کا سہرا اہلِ اسلام کی نمایاں اور عظیم شخصیات کے سر بندھتا ہے۔

لیکن یہاں بحث ان علوم وفنون کی نہیں ہے؛ بل کہ ان علوم وفنون کی اس خاص وضع وترتیب اور اس خاص نظام کی ہے جس کو اسلام دشمن طاقتوں نے اسلام دشمنی میں یا اپنی بے بصیرتی کی بنیاد پر اس طرح قائم کیا ہے جو اہلِ اسلام کے قد وقامت پر کسی طرح راست نہیں آتا، اس لئے ہمیں اس نصاب کو ایک خام مال کی حیثیت سے لے کر اپنے قد وقامت اور اپنے مزاج و مذاق کے موافق تیار کرنا چاہئے۔

دوسری غلط فہمی ان جدید تعلیم یافتہ حضرات کو یہ ہو جاتی ہے کہ وہ جب بھی تعلیم اور اعلیٰ تعلیم کا نام لیتے ہیں، تو اس کے ساتھ اس مغربی نظام اور مغربی تہذیب کو اس کے جزء لاینفک کی حیثیت سے دیکھتے ہیں۔ اور اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ یا تو اس تمدن وتہذیب کو تعلیم کے نام پر اختیار کرنے کو ضروری خیال کرتے ہیں یا اس تہذیب و

تمدن کے بغیر عصری تعلیم کی تحصیل کو ناممکن سمجھتے ہیں، حالاں کہ تعلیم ایک چیز ہے اور مغربی تہذیب وتمدن اور اس کا وضع کردہ نظامِ عمل بالکل دوسری چیز ہے، اور ان دونوں میں کوئی تلازم نہیں۔

جولوگ یہ سمجھتے ہیں کہ عصری تعلیم اور مغربی تہذیب وتمدن میں کوئی تلازم ہے وہ اس تعلیم کے ساتھ بے حیائی و بے پردگی، فحاشی وعریانی، ناچ ورنگ، لباس وپوشاک میں انگریزی وضع قطع، کھانے اور پینے میں غیروں کا طریقہ؛ بل کہ اس سے آگے احکام شرع کی پامالی وتوہین کو بھی لازم سمجھتے ہیں۔ اور ہم یہ کہنا چاہتے ہیں کہ تعلیم کے حصول کے لئے اور تعلیم یافتہ ہونے کے لئے ان امور کی کوئی ضرورت نہیں، یہ اس تعلیم کا نہیں؛ بل کہ اس نظامِ تعلیم کا اثر ولازمہ ہے جو انگریزی تہذیب کی کوکھ سے جنم لیا ہوا ہے، اس لئے اہل اسلام کو چاہئے کہ وہ اس تعلیم کو اسلامی تہذیب وتمدن اور اس کے مزاج وانداز کے موافق ڈھال کر استعمال کریں۔

فقط

محمد شعیب اللہ خان

(جامعہ اسلامیہ مسیح العلوم، بنگلور)

دینی تعلیم کی
فضیلت وضرورت

بسم اللہ الرحمن الرحیم

المقدمۃ

تمام تعریفیں اللہ تعالیٰ کے لیے خاص ہیں، جس نے اپنا مبارک ومعجز کلام نازل فرما کراوراپنے برگزیدہ انبیا کومبعوث کر کے بندوں کی صلاح وفلاح اور ہدایت ونجات کا سامان کردیااور درودوسلام نازل ہواللہ کے حبیب محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم پر جنھوں نے اپنی واضح ہدایات اور ناصحانہ تعلیمات کے ذریعے طریق فلاح وراہ نجات کومشخص فرمایااور دوزخ کے گڑھے میں گرنے اور جہل توجہالت کی وادیوں میں بھٹکنے سے ہم کوبچالیا۔

امابعد: مادیت پرستی کے اس دورمیں اکثرلوگ جس طرح مادہ کے پیچھے لگے ہوئے ہیں اوراس کی ترقی کواپنی ترقی، اس کے حسن کواپنا حسن، اس کے بارے میں غوروفکراور جدوجہد کواپنی زندگی کا نصب العین خیال کیے ہوئے ہیں، یہ کوئی ڈھکی چھپی چیزنہیں ہے اوراسی مادیت پرستی کا نتیجہ ہے کہ لوگوں میں نیکیوں سے غفلت ولاپرواہی، منکرات ومحرمات میں انہاک ومشغولی، معروفات سے اعراض وروگردانی خدااوررسول سے بغاوت وسرکشی اورنفس وشیطان کی اطاعت وپیروی جیسے مہلک وخطرناک روگ جنم لے رہیں ہیں؛ بل کہ جڑ پکڑرہے ہیں۔

مادیت پرستی کے ان ہول ناک وخطرناک نتائج میں سے ایک یہ بھی ہے کہ علم

دین کی تحصیل کولغواور فضول؛ بل کہ (نعوذ باللہ) بے ہودہ حرکت خیال کیا جارہا ہے، اس کے برخلاف دنیوی علوم وفنون کی تحصیل کو نہ صرف یہ کہ اچھا اور پسندیدہ؛ بل کہ ضروری ولازمی قرار دیا جاتا ہے۔ نیز والدین اور سرپرست اپنے بچوں کو اور ماتحتوں کو مادی وفانی زندگی کے بنانے سنوارنے، اس میں ترقی کرنے اور نام کمانے کی ترغیب اور حکم دیتے ہیں، فانی لذتوں کی تحصیل کا سبق پڑھاتے ہیں، اس کے لیے انہیں تدبیریں سکھاتے ہیں، نیز مادی ودنیوی تکالیف اور مصائب سے ان کو بچنے کی تاکید کرتے ہیں اور ان سے محفوظ رہنے کی شکلیں اور تدبیریں بتاتے ہیں، لیکن یہی شفیق ماں باپ اور کرم فرما سرپرست اپنے بچوں اور ماتحتوں کو علم دین سے آراستہ کرنے اور ان کی آخرت کی حقیقی ودائمی زندگی کے بنانے اور جہنم کی ہول ناکیوں اور پریشانیوں سے بچانے کی فکر نہیں کرتے۔

چناں چہ دیکھا جاتا ہے کہ ماں باپ اور بچوں کے سرپرست اپنے بچوں اور ماتحتوں کو علم دنیویہ وفنون طبعیہ سے آراستہ کرنے کے لیے ان کو اسکولوں، کالجوں اور دوسرے اداروں میں داخلہ کرواتے ہیں اور پورے اہتمام سے پڑھنے اور سیکھنے روانہ کرتے ہیں، اس میں ان کی طرف سے کوتاہی ہو جائے تو اسکولوں اور کالجوں اور اداروں سے منت سماجت کرتے پھرتے ہیں اور بچوں سے کوتاہی ہو جائے تو بچوں کو ڈانٹ ڈپٹ کرتے اور سزائیں دیتے ہیں۔

مگر ہائے افسوس! یہی ماں باپ اور سرپرست حضرات دین کے بارے میں اس قدر سرد مہری اور لاپرواہی کا مظاہرہ کرتے ہیں کہ ہم خود اس کی توجیہ کرنے سے قاصر ہیں، اولاً تو بچوں کو دین کی تعلیم ہی نہیں دیتے، اگر دیتے ہیں تو نہایت لاپرواہی اور غفلت سے کہ دل میں آیا تو مدرسہ بھیج دیا، جی چاہا تو نہ بھیجا، پھر بہانے ہزار کہ کبھی

شادی بیاہ میں شرکت کا بہانہ، کبھی دادا دادی، نانا نانی کی زیارت وملاقات کا حیلہ، کبھی بیماری کا عذر، کبھی اسکول میں امتحان کا بہانہ وغیرہ وغیرہ، پھر پڑھتے کیا ہیں۔ قرآن کریم دیکھ کر اور بس، نہ نماز سیکھی، نہ روزہ کو جانا، نہ فرائض کا علم ہوا، نہ واجبات وسنن سے واقفیت، پھر اگر استاد کی طرف سے کچھ سزا ہو جائے تو استاذ سے لڑنے تیار، استاذ کا احسان ماننا تو دور کی بات ہے۔

غور کیجئے کہ دین ودنیا کے معاملات میں یہ فرق کیوں پایا جارہا ہے؟ کہ ایک طرف دنیا اور دنیوی علوم کو ترجیح دی جارہی ہے، اس کے لیے روپیہ پیسہ بھی بے دریغ خرچ کیا جارہا ہے، صرف ایک ایک سیٹ کے حاصل کرنے کے لیے ہزاروں نہیں، لاکھوں خرچ کیے جارہے ہیں، مصائب وتکالیف برداشت کیے جارہے ہیں اور ان علوم وفنون اور مادی وفانی عہدوں اور منصبوں کی عظمت کے گیت گائے جارہے ہیں، جو ان کو حاصل نہ کرے، اس کو بے وقوف، احمق اور ذلیل کہا جارہا ہے، دوسری طرف دین اور علم دین کی تحقیر وتوہین ہورہی ہے، اس کے لیے خرچ کرنا تو دور رہا، خرچ دے کر پڑھایا جائے تو بھی اس طرف آنا مشکل ہے۔ دین اور علم دین کے علم بردار وں کو بہ نظرِ تحقیر دیکھا جارہا ہے، ان کو ذلیل وخوار سمجھا جارہا ہے، علم دین کو ایک فضول چیز خیال کیا جارہا ہے، اس کی تحصیل کو بے ہودہ رحمت قرار دیا جارہا ہے۔ اس کی وجہ سوائے اس کے اور کیا ہے کہ مادیت لوگوں پر غالب آگئی ہے۔ لہٰذا لوگ جب بھی سوچتے ہیں تو مادی زندگی ہی کے متعلق سوچتے ہیں اور جب بھی کچھ کرتے ہیں تو اسی دنیوی زندگی کے لیے کرتے ہیں، لہٰذا ان کا سب کچھ صرف اسی مادی زندگی کے لیے ہے اور اس کا علاج یہی ہے کہ لوگوں کی توجہ مادہ سے ہٹا کر روح وروحانیت کی طرف لگا دی جائے۔

ہم یہ نہیں کہتے کہ دنیوی علوم وفنون اور مادی کاروبار سے بالکلیہ الگ ہوجایا جائے؛ بل کہ کہنا یہ ہے کہ ان کو اصل مقصودِ زندگی کا نصب العین نہ خیال کرلیا جائے، ان کو ضروری ضرور سمجھئے؛ لیکن ایسا ضروری نہیں جیسے انسان کے لیے کھانا، پانی؛ بل کہ ایسا جیسا انسان کے لیے بیت الخلا؛ مگر کون نہیں جانتا کہ دونوں کی نوعیت وضرورت میں زمین وآسمان کا فرق ہے؟ اسی فرق کے پیشِ نظر انسان کھانے پینے کے سلسلے میں بڑی جد وجہد وکوشش وسعی کرتا ہے اور زیادہ وقت اس کے لیے لگاتا ہے اور بیت الخلا کے لیے ایسا نہیں کرتا کہ بار بار وہاں جا کر بیٹھ جائے اور وہاں زیادہ وقت لگائے؛ بل کہ جب ضرورت لاحق ہوئی، جاتا ہے اور فراغت پا کر فوراً واپس آجاتا ہے۔ اسی طرح ہم کو چاہیے کہ علومِ دنیویہ کو اور مادی کاروبار کو ضرورت کی حد تک ضروری سمجھیں یہ نہیں کہ سب کچھ اس کے لیے لگادیں اور علومِ دین اور دین کو غذا کے درجہ میں سمجھیں۔

الغرض! آج اس کی بڑی ضرورت ہے کہ لوگوں کو علمِ دین سے وابستہ کیا جائے اور خصوصاً والدین اور سرپرستوں کو اپنے بچوں اور ماتحتوں کی تعلیم وتادیب کی طرف متوجہ کرایا جائے اور اس کی اہمیت وضرورت کو ان کے سامنے واشگاف انداز میں پیش کیا جائے۔ اسی غرض کو سامنے رکھ کر یہ مختصر رسالہ پیش کرنے کی سعادت حاصل کررہا ہوں۔ اللہ تعالیٰ اس کو مفید اور نافع اور میرے لیے ذخیرۂ آخرت وسامانِ نجات بنائیں، آمین۔

فقط

محمد شعیب اللہ خان

۱۰ر محرم الحرام ۱۴۱۰ھ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

فصل اول

علم دین حاصل کرنے کی ضرورت

ہم اور آپ یہ بات بہ خوبی جانتے ہیں کہ ہم اللہ کے بندے اور اس کے غلام ہیں، اور اللہ تعالیٰ ہمارا آقا اور معبود ہے اور یہ بھی ہم کو معلوم ہے کہ بندہ اور غلام پر اپنے آقا کی غلامی لازم ہے اور غلامی کا مطلب یہ ہے کہ آقا جو حکم دے، اس کو بجالائے اور جس سے وہ منع کرے اس سے رک جائے، لہٰذا ہم پر ضروری ہے کہ ہم اللہ کے حکموں کو بجالائیں اور اس نے جن باتوں سے منع کیا ہے اس سے بچیں؛ مگر سوال یہ ہے کہ ہم کو کیسے معلوم ہوگا کہ اللہ کا کیا حکم ہے اور اس نے کن باتوں سے ہم کو منع کیا ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کن باتوں کا حکم دیا ہے اور کن چیزوں سے منع فرمایا ہے، یہ سب قرآن اور حدیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں تفصیل کے ساتھ بیان کر دیا گیا ہے اور جو باتیں ذرا مشکل تھیں اور ان کو عام لوگ سمجھ نہیں سکتے تھے، ان کو حضرات علما و فقہا نے اپنی کتابوں میں وضاحت سے بیان کر دیا ہے، ان میں بہت سی کتابوں میں صرف روزمرہ کی زندگی کے مسائل جمع کر دیئے ہیں، ان کو فقہ کی کتابیں کہتے ہیں۔ الغرض ہم کو اللہ تعالیٰ کے احکام قرآن، حدیث اور فقہ کی کتابوں میں ملیں گے، لہٰذا ہم کو اللہ کے غلام اور بندے بننے کے لیے پہلے قرآن اور حدیث اور فقہ کی کتابوں کو پڑھنا اور سمجھنا ضروری ہوگا، اس کے بغیر ہم صحیح معنی میں

اللہ کے بندے اور غلام نہیں بن سکیں گے۔

اس سے معلوم ہوا کہ دین اور شریعت کا علم یعنی قرآن وحدیث اور فقہ کا علم حاصل کرنا ہر مسلمان کے لیے ضروری ہے، بغیر اس کے کوئی شخص صحیح معنی میں اللہ کا غلام اور مسلمان نہیں بن سکتا، کیوں کہ مسلمان ہونے کے معنی یہی ہیں کہ اللہ کی اطاعت و بندگی اور غلامی کے لیے اپنے آپ کو پیش کردے اور یہ بات اس وقت تک پوری نہیں ہوسکتی جب تک آدمی اللہ کے احکام پر نہ چلے اور اللہ کے احکام پر چلنے کے لیے پہلے اللہ کے احکام کا جاننا ضروری ہے اور اللہ کے احکام قرآن وحدیث اور فقہ میں ملیں گے، تو پہلے ان کا جاننا اور علم حاصل کرنا ضروری ہوا۔

اس تفصیل سے یہ بات معلوم ہوئی کہ انسان کو اللہ کا بندہ بننے اور صحیح معنی میں مسلمان بننے کے لیے علم دین کا حاصل کرنا ضروری ہے۔ اب ہم قرآن اور حدیث اور فقہ کی کتابوں اور علما کے اقوال سے یہ بتائیں گے کہ علم دین حاصل کرنا ضروری اور مسلمانوں کا فرض ہے۔

علم دین کی ضرورت قرآن سے

اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:

﴿ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قُوْٓا اَنْفُسَكُمْ وَاَهْلِيْكُمْ نَارًا وَّقُوْدُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ عَلَيْهَا مَلٰٓئِكَةٌ غِلَاظٌ شِدَادٌ لَّا يَعْصُوْنَ اللّٰهَ مَآ اَمَرَهُمْ وَيَفْعَلُوْنَ مَا يُؤْمَرُوْنَ ﴾ (التحریم: ٦)

”اے ایمان والو! تم اپنے کو اور اپنے اہل وعیال کو (دوزخ کی) آگ سے بچاؤ جس کا ایندھن آدمی اور پتھر ہیں، جس پر سخت مزاج اور مضبوط فرشتے (مقرر) ہیں، جو خدا کی کسی بات میں جس کا ان کو حکم دیا گیا ہے، نافرمانی نہیں کرتے اور جو کچھ ان کو حکم دیا جاتا ہے، وہ اس کو بجالاتے ہیں“۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں سے مطالبہ کیا ہے کہ تم اپنے آپ کو اور اپنی آل واولاد کو دوزخ کی آگ سے بچاؤ، یہاں دوزخ سے بچنے بچانے کا مطلب یہ ہے کہ قرآن وحدیث میں جن باتوں کو دوزخ میں لے جانے والی قرار دیا گیا ہے، ان سے خود بھی بچے اور اپنے اہل وعیال کو بھی بچائے اور دوزخ میں لے جانے والی چیزیں کون کون سی ہیں، یہ قرآن وحدیث پڑھنے سے معلوم ہوگا۔ لہٰذا اس آیت سے معلوم ہوا کہ قرآن حدیث اور دین کا علم حاصل کرنا مسلمانوں پر ضروری ہے تا کہ وہ دوزخ میں لے جانے والی باتوں سے بچ سکیں اور دوسروں کو بھی بچا سکیں۔

پھر اس آیت سے یہ اشارہ بھی ملا کہ اگر ہم نے قرآن وحدیث سے دوزخ میں لے جانے والی چیزوں کو معلوم نہ کیا اور اس سے نہ بچے تو جہنم میں جانا پڑے گا اور یہ جہنم بھی کیسی کہ اس کی آگ آدمی اور پتھر سے دھکائی گئی ہے اور اس پر بڑے غصہ والے اور سخت جسم کے فرشتے مقرر ہیں۔ لہٰذا جہنم سے بچنے کے لیے ضروری ہے کہ ہم قرآن وحدیث کا علم حاصل کریں اور اس کے مطابق زندگی گذاریں اور اللہ کی غلامی وبندی کا حق ادا کریں۔

ایک دوسرے موقع پر قرآن کریم میں آیا ہے:

﴿فَاسْئَلُوْا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ﴾ (النحل:۴۳)

(پس تم علما سے پوچھ کر (معلوم کرلو) اگر تم کو علم نہ ہو)

امام غزالی رحمۃ اللہ نے اس آیت سے علم حاصل کرنے کی فضیلت پر استدلال کیا ہے۔[۱]

اور ہم نے علم حاصل کرنے کی ضرورت پر استدلال کیا ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ بے علم پر لازم ہے کہ وہ علما سے علم حاصل کرے، یہ اس پر

(۱) احیاء العلوم:۱/۸

ضروری ہے، کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے علم حاصل کرنے کا حکم دیا ہے اور اللہ کا حکم واجب التعمیل اور ضروری ہوتا ہے اور اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ علم اہل علم یعنی عالموں سے حاصل کرنا چاہئے، جاہل اور بے علم لوگوں سے حاصل نہیں کرنا چاہئے، کیوں کہ وہ خود علم کے محتاج ہیں تو دوسروں کو کیا سکھائیں گے؟

علم دین کی ضرورت حدیث سے

(۱) حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ تم لوگ فرائض اور قرآن کا علم حاصل کرو اور لوگوں کو سکھاؤ، کیوں کہ میں عن قریب اٹھالیا جانے والا ہوں۔ (۱)

اس حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دو چیزوں کا علم حاصل کرنا ضروری قرار دیا ہے۔ ایک قرآن کا علم، دوسرے فرائض کا، فرائض سے مراد وہ تمام باتیں ہیں جن کا معلوم کرنا اور سیکھنا ضروری ہے۔ (۲)

اس سے علم دین کا حاصل کرنا ضروری ثابت ہوا۔

(۲) حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ دو خصلتیں ایسی ہیں کہ منافق میں جمع نہیں ہوتیں، ایک اچھے اخلاق، دوسرے دین کی سمجھ (علم دین)۔ (۳)

اس حدیث کا ایک عام مطلب یہ ہے کہ منافق میں اخلاق اور دین کی سمجھ جمع نہیں ہوسکتے، اگر دین کا علم ہے تو اخلاق نہ ہوں گے اور اخلاق ہوں، تو دین کا علم نہ

---

(۱) رواہ الترمذی کذافی المشکوۃ:۳۵

(۲) حاشیہ مشکوٰۃ عن المرقاۃ:۱/۳۰۰

(۳) مشکوۃ:۳۴

ہوگا اور اس حدیث کا ایک معنی یہ بھی ہے کہ منافق میں یہ دونوں چیزیں نہ ہوں گی، نہ وہ اخلاق والا ہوگا، نہ علم دین سے آراستہ ہوگا، اس صورت میں جمع نہ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ یہ دو خصلتیں نفاق کے ساتھ جمع نہیں ہوسکتیں، جو منافق ہوگا اس میں نہ علم ہوگا نہ اخلاق ہوں گے، اس معنی کے لحاظ سے اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ علم نہ ہونا منافق کی علامت ہے، لہٰذا علم مسلمان کے لیے ضروری ہے تاکہ وہ نفاق سے دور رہو، اس سے بھی مسلمان کے لیے علم کی ضرورت ثابت ہوتی ہے۔

(۳) حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ہر مسلمان پر علم کا طلب کرنا فرض ہے۔(۱)

اس حدیث سے صاف معلوم ہوا کہ علم دین کا حاصل کرنا ہر مسلمان پر لازم اور ضروری ہے اور جو ضروری ہو اس میں کوتاہی کرنا گناہ کی بات ہے، اس لیے چاہیے کہ ہر مسلمان علم دین حاصل کرے۔

صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے ارشادات

احادیث کے بعد ہم حضرات صحابہ کرام کے اقوال وارشادات بھی نقل کرتے ہیں:

(۱) حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ انہوں نے فرمایا تم فرائض اور اعراب (قرآن پر زیر، زبر، پیش لگانا) اور حدیث کا علم حاصل کرو، جیسے تم قرآن سیکھتے ہو۔(۲)

(۲) حضرت عمر رضی اللہ عنہ ہی سے یہ بھی نقل ہے کہ آپ نے فرمایا کہ تم فرائض کا علم

---

(۱) مشکوٰۃ:۳۴ یہ روایت سند کے لحاظ سے کمزور ہے؛ مگر اس کے متعدد طرق ہیں؛ لہٰذا اس کا ضعف منجبر ہوسکتا ہے اور معنی کے لحاظ سے اس میں کوئی اشکال نہیں۔

(۲) سنن سعید بن منصور، قسم اول:۲/۳

حاصل کرو کیونکہ یہ بھی تمہارے دین میں سے ہے۔ (۱)

(۳) حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ جو قرآن سیکھتا ہے اس کو چاہئے کہ وہ فرائض بھی سیکھے۔ (۲)

(۴) حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ فرائض سیکھو اور لوگوں کو سکھاؤ۔ (۳)

ان سب روایتوں میں فرائض کے لفظ سے بہت سے علما میراث کے مسائل مراد لیتے ہیں؛ مگر ملا علی قاری نے اس حدیث کے تحت فرمایا ہے جو ہم نے اوپر حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے نقل کی ہے (جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی یہی لفظ فرائض میں استعمال فرمایا ہے) کہ مراد اس سے وہ تمام ضروری باتیں ہیں جن کا سیکھنا واجب ہے اور یہی بات صحیح ہے۔ (۴)

اس صورت پر ان روایات کا خلاصہ یہ ہے کہ قرآن کے ساتھ وہ تمام باتیں سیکھنا بھی مسلمان کے ذمہ ہے، جو فرض و واجب اور ضروری ہیں، اسی طرح حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ارشاد سے معلوم ہوا کہ حدیث کا علم حاصل کرنا اور زیر زبر پیش وغیرہ لگانے کا سیکھنا بھی ضروری ہے کہ اس کو کیسے پڑھا جائے گا۔

(۵) حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے فرمایا: اے لوگو! تم پر علم حاصل کرنا لازم ہے، اس سے پہلے کہ علم اٹھا لیا جائے۔ (۵)

---

(۱) ایضاً
(۲) ایضاً
(۳) فتح الباری: ۱۲/۵
(۴) حاشیہ مشکوۃ: ۳۵
(۵) بیہقی کذافی مفتاح الجنۃ للسیوطی: ۳۵

حضرات علما کے اقوال

قرآن کریم کی آیات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث اور صحابہ کے ارشادات کے پیش نظر علما اور فقہانے علم دین کو ضروری اور لازم قرار دیا ہے۔

علامہ محمود آلوسی بغدادی رحمۃ اللہ آیت ''**یاایھاالذین آمنوا قوا انفسکم**'' الخ کے تحت فرماتے ہیں:

''**واستدل بها على أن الرجل تعلم ما يجب من الفرائض وتعليمه لهولاء**''.(۱)

(اس آیت سے اس پر دلیل پکڑی ہے کہ آدمی پر فرائض وواجبات کا علم حاصل کرنا اور اپنے اہل وعیال کو ان کی تعلیم دینا واجب ہے۔)

اسی آیت کے تحت علامہ جلال الدین السیوطی رحمۃ اللہ فرماتے ہیں:

''**ففيهاان الرجل يجب عليه ان تعلم مايجب عليه من الفرائض. وتعليمه زوجه وولده وعبده وامته**.(۲)

(اس آیت میں یہ مسئلہ ہے کہ مرد پر فرائض وواجبات کا سیکھنا اور اپنی بیوی، بچے، غلام اور باندی کو سکھانا ضروری ہے۔)

شیخ الاسلام محمد بن عبدالوہاب رحمۃ اللہ فرماتے ہیں:

''جاننا چاہئے کہ ہم پر چار باتوں کا جاننا ضروری ہے۔ (ان میں سے) پہلی بات علم ہے، یعنی اللہ تعالیٰ، اس کے نبی علیہ السلام اور دین

(۱) روح المعانی: ۱۵۹/۲۸

(۲) الاکلیل فی استنباط التنزیل: ص:۲۱۴

اسلام کو دلیلوں سے جاننا۔‘‘(۱)

علامہ شامی رحمہ اللہ درمختار کی شرح میں فرماتے ہیں:

’’اسلام کے فرائض میں سے ان باتوں کا علم حاصل کرنا بھی ہے جن کی دین کے قائم کرنے، اخلاص للہ اور لوگوں سے میل جول اور سلوک کرنے میں بندہ کو ضرورت پڑتی ہے، اس کے بعد ہر مکلّف مرد وعورت پر وضو، غسل، نماز، روزہ، (کے مسائل) کا جاننا اور صاحب نصاب کے لیے زکوۃ کا اور جس پر حج فرض ہو اس کا حج کا اور تجارت کرنے والے پر خرید وفروخت کے مسائل کا جاننا فرض ہے۔ اسی طرح دوسرے پیشہ والوں اور کسی بھی کام میں مشغول ہونے والوں پر اس سے متعلق علم دین حاصل کرنا فرض ہے تاکہ وہ حرام سے بچ سکے۔(۲)

حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

’’جاننا چاہئے کہ جس کام کا کرنا بندہ پر فرض ہے اس کام کے کرنے کا طریقہ بھی سیکھنا فرض ہے اور جس کام کا کرنا مستحب ہے اس کا طریقہ سیکھنا بھی مستحب ہے۔ پس جب نماز فرض ہوگی اس کے مسئلے سیکھنا بھی فرض ہوں گے، اسی طرح روزہ وغیرہ کا حال ہے اور جب نوکری تجارت وغیرہ کرے گا تو نوکری، تجارت وغیرہ کے متعلق جو شریعت کے حکم ہیں، ان کا سیکھنا اور ان پر عمل کرنا لازم ہوگا‘‘۔(۳)

---

(۱) ثلاثة الاصول:
(۲) ردالمختار للشامی: ۱/۱۴۲
(۳) بہشتی زیور: ۱/۶۷

حضرات علما وفقہا کے ان بیانات سے بہ خوبی یہ ثابت ہوگیا کہ دین کی ضروری باتوں کا علم حاصل کرنا اسلام کے فرضوں میں سے ایک فرض اور ہر مسلمان پر لازم و ضروری ہے۔

صاحبو! غور کرو کہ ہم نے اتنے بڑے فرض کو ادا کرنے کے لیے کچھ محنت وجدوجہد کی ہے؟ کیا ہم خدا کے غلام نہیں ہیں؟ اگر ہیں جیسا کہ یہ مسلم اور ایک حقیقت ہے تو پھر اللہ تعالیٰ کی غلامی اور بندگی کرنے کے لیے اس کی مرضیات ونامرضیات کو معلوم کرنا اور مرضیات کے مطابق عمل کرنا اور نامرضیات سے دور رہنا ضروری نہیں؟ پھر ہم کیسے غلام ہیں کہ ہم کو یہی معلوم نہیں کہ ہمارا آقا اور معبود ہم سے کیا چاہتا ہے، وہ ہمیں کن باتوں کا حکم دیتا ہے اور کن باتوں سے منع کرتا ہے؟

اس لیے ہمیں چاہیے کہ ہم جلد سے جلد قرآن، حدیث اور فقہ کا علم حاصل کرکے، اس کے مطابق زندگی گزاریں۔

فصل دوم

علم دین حاصل کرنے والے کی فضیلت

جب علم دین حاصل کرنا اتنا بڑا فرض اور اہم فرض ہے تو اس کام میں لگنے والے کی فضیلت بھی ضرور ہوگی، جیسے نماز اہم کام ہے تو نمازی کا رتبہ اور مقام ہے، اسی طرح علم حاصل کرنے والے کی بھی بڑی فضیلت ہے، اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:

﴿ يَرْفَعِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ ۙ وَالَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ دَرَجٰتٍ ۭ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ﴾ (سورة المجادلة: ١١)

(اللہ تعالیٰ ان لوگوں کے درجات بلند کرتا ہے جو تم میں سے ایمان لائے اور جن کو علم دیا گیا ہے، اللہ تعالیٰ تمہارے کاموں کو جانتا ہے۔)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حدیث میں فرمایا:

''اللہ تعالیٰ جس کے ساتھ بھلائی کا ارادہ فرماتے ہیں اس کو دین کی سمجھ عطا فرما دیتے ہیں، میں تو (علم) تقسیم کرنے والا ہوں اور اللہ تعالیٰ ہی دینے والے ہیں''۔(۱)

اس حدیث پاک سے معلوم ہوا کہ دین کا علم وہی لوگ حاصل کرتے ہیں جن کے ساتھ اللہ تعالیٰ بھلائی کرنا چاہتے ہیں، اس کا مطلب یہ ہوا کہ دین کا علم حاصل کرنے والوں کے ساتھ اللہ تعالیٰ بھلائی کا ارادہ فرماتے ہیں، اور جو علم دین حاصل نہیں کرتے، وہ اللہ کی طرف سے بھلائی اور رحمت سے محروم رہتے ہیں۔ کس قدر

---

(۱) بخاری کتاب العلم: ١٦/١

خوش قسمت ہے وہ شخص جو دین کا علم حاصل کر کے اللہ کی رحمتوں اور برکتوں کو حاصل کرتا ہے، پھر اس حدیث میں غور کرو کہ اس میں یہ نہیں فرمایا ہے کہ آخرت کی بھلائی ہی علم دین حاصل کرنے والے کو ملتی ہے، بلکہ صرف یہ فرمایا گیا ہے کہ اس کو بھلائی ملتی ہے، لہٰذا دین اور دنیا دونوں کی بھلائی علم دین حاصل کرنے والے کو ملتی ہے۔

بھائیو اور بہنو! کیا اس سے زیادہ کوئی اور چیز چاہیے، اس سے بڑی کوئی نعمت ہے کہ اللہ کی طرف سے دین و دنیا کی بھلائی مل جائے؟ ہرگز نہیں، لہٰذا اتنی بڑی نعمت کو نہ ٹھکراؤ، بلکہ اس کو حاصل کرنے کی کوشش کرو اور اس کا طریقہ یہی ہے کہ علم دین حاصل کرنے میں لگ جاؤ، دنیا کا علم تم کو صرف دنیا کی چند روزہ زندگی میں تھوڑی بہت فانی راحت ولذت دے گا اور یہ بھی کوئی ضروری نہیں، بہت سے لوگ دنیا کا علم حاصل کر کے پھر بھی پریشان رہتے ہیں اور دین کا علم حاصل کرنے والے کو دین و دنیا دونوں کی بھلائی مل جاتی ہے اور اس کا گویا خدا کی طرف سے وعدہ ہے اور خدا کا وعدہ ٹلتا نہیں۔

ایک اور حدیث میں حضرت محمد رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے فرمایا:

''جو شخص علم کی تلاش میں چلتا ہے، اللہ تعالیٰ اس کے لیے جنت کا راستہ آسان فرما دیتا ہے۔''(۱)

اس حدیث میں علم حاصل کرنے والے اور اس کی تلاش میں نکلنے والے کو جنت کی بشارت سنائی گئی ہے۔ نیز اس میں اشارہ ہے کہ علم حاصل کرنے والے کے لیے جنت کا راستہ آسان ہو جاتا ہے، یعنی عمل کا راستہ آسان ہو جاتا ہے جس سے وہ جنت میں داخل ہو سکتا ہے۔

---

(۱) مسلم: ۲/۳۴۵

صاحبو! اس سے بڑی کیا چیز چاہئے کہ اللہ تعالیٰ علم دین حاصل کرنے والے کے لیے جنت کا راستہ آسان فرمادیتے ہیں، دنیوی علم حاصل کرنے سے ممکن ہے کہ دنیا کی زندگی میں چند مشکلات آسان ہوجائیں۔ کھانے پینے، رہنے سہنے کی منزلیں آسان ہوجائیں؛ لیکن کیا اس سے جنت مل جائے گی؟ نہیں، تو پھر اس فانی زندگی کی چند منزلوں کو آسان کرنے کے لیے ہم جنت کے راستہ سے غافل ہوجائیں تو کیا یہ ہماری نالائقی شمار نہ ہوگی؟ پس ہر مسلمان کو چاہئے کہ وہ جنت کا راستہ آسان کرنے کے لیے علم دین حاصل کرکے، اس پر عمل کرے۔

ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم نے فرمایا:

"جس شخص کی موت آگئی اس حال میں کہ وہ اسلام کو زندہ کرنے کی غرض سے علم دین حاصل کر رہا تھا تو اس کے اور نبیوں کے درمیان جنت میں صرف ایک درجہ کا فرق ہوگا"۔ (۱)

دیکھو! اس حدیث سے علم حاصل کرنے والے کی کس قدر فضیلت معلوم ہوتی ہے کہ اگر علم حاصل کرتے کرتے، اس کا انتقال ہوگیا تو جنت میں وہ نبیوں کے قریب ہوگا اور اس کے اور نبیوں کے درمیان صرف ایک درجہ کا فرق ہوگا۔

بھائیو اور بہنو! یہ نہ سوچو کہ مدرسہ میں داخلہ لے کر ہی ہم طالب علم بن سکتے ہیں؛ بل کہ کسی بھی صحیح طریقہ سے علم حاصل کرنے میں لگ گئے تو اس کی یہی فضیلت ہے، مثلاً گھر میں کتابوں کا مطالعہ کرکے یا کسی عالم سے پوچھ پوچھ کر، یا مدرسہ میں داخل ہوکر، یا تبلیغی جماعت میں نکل کر، غرض کسی بھی صحیح طریقہ سے علم حاصل کرنے میں لگ گئے تو یہ فضیلت مل جائے گی اور اس طرح ہم عمر بھر طالب علم رہ سکتے ہیں۔

---

(۱) رواه الدارمي مرسلاً عن الحسن مشکوٰۃ:ص:۳۶

اور جب بھی مریں گے یہ بات ہمارے لیے مقدر ہوگی، مرنا تو، بہ ہر حال ہے، کیوں نہ علم دین حاصل کرتے ہوئے مریں اور یہ فضیلت پائیں۔

بہ ہر حال دین کا علم حاصل کرنے والے کی بڑی فضیلت اور اس کا بڑا مرتبہ و مقام ہے، ہم جب دنیا کے عہدوں، مرتبوں اور فانی و مادی چیزوں کے حاصل کرنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگاتے ہیں اور پھر بھی ان کا مل جانا یقینی نہیں ہوتو اس یقینی مرتبہ و مقام کو حاصل کرنے کے لیے ذرا محنت کیوں نہ کریں۔ اور خدا اور رسول کا قرب کیوں نہ پائیں۔

خوب سمجھ لینا چاہئے کہ بڑی سے بڑی دولت وسیع سے وسیع سلطنت وحکومت، بلند قامت وفلک بوس عمارات، حیرت انگیز ایجادات، محیر العقول اوزار وہتھیار، لذیذ ترین مطعومات، روح فزا آفریں سامان واسباب معزز ترین عہدے ومناصب، اونچی اونچی ڈگریاں، بلند پرواز ذہانت، قوی سے قوی مادی استعداد وقابلیت، وسیع ترین تجارت اور دور دور تک کی شہرت، کسی قوم وملت یا کسی فرد وشخص کی فتح وکامیابی، عزت وسربلندی، عظمت وسرفرازی کے ضامن نہیں ہیں؛ بل کہ فتح وکامرانی، عزت وکامیابی عظمت وسربلندی، ودوام وسرفرازی کا سارا راز پوشیدہ اور مضمر ہے۔ حق شنائی یعنی ایمان اور تقویٰ شعاری، یعنی عمل صالح پر اور یہی ایمان وعمل کا خلاصہ ہے اور دین وشریعت کا۔ لہٰذا نجات کا مدار شریعت اور دین کی پیروی پر ہے اور یہ بغیر علم دین وشریعت کے حاصل نہیں ہوسکتا، لہٰذا علم دین ضروری ہے۔

اسی پر فضیلت وبزرگی کا دارومدار ہے، اس کے بغیر دنیا کی تمام چیزیں ہیچ و ذلیل اور ناقابل توجہ ہیں۔

فصل سوم

اہل وعیال کو علم سکھانے کی ضرورت وفضیلت

جس طرح اپنے آپ کو علم دین سے آراستہ کرنا ضروری ہے، اسی طرح اپنے بچوں، گھر والوں، ماتحتوں کو بھی علم دین سکھانا فرض وضروری ہے، پہلی فصل میں یہ آیت گذر چکی ہے، جس میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ اے مسلمانو! اپنے آپ کو اور اپنے اہل وعیال کو آگ سے بچاؤ، اس سے معلوم ہوا کہ اپنے اہل وعیال، بیوی بچے اور ماتحت لوگوں کو دوزخ سے بچانے کی سبیل کرنا ضروری ہے۔ اور ان کو دوزخ سے بچانا یہی ہے کہ ان کو علم سے آراستہ کرے، اللہ کے حکموں پر چلنے کی نصیحت کرے، چناں چہ اس آیت کی تفسیر میں علمانے جو روایتیں بیان فرمائی ہیں، ان سے یہی معلوم ہوتا ہے۔ مثلاً:

(۱) حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ انہوں نے آیت بالا کے نازل ہونے پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ یارسول اللہ! ہم اپنے نفس کو بچالیں گے؛ لیکن اپنی بیوی بچوں کو کیسے بچائیں؟ آپ نے فرمایا کہ ان کو ان چیزوں سے منع کرو جن سے تمہیں منع فرمایا اللہ تعالیٰ نے، اور ان باتوں کا ان کو حکم دو جن کا اللہ تعالیٰ نے تم کو حکم دیا ہے۔ (۱)

(۲) ابن المنذر نے حاکم نے تصحیح کے ساتھ اور ایک جماعت نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے روایت کی ہے کہ آپ نے اس آیت کی تفسیر میں فرمایا کہ مراد یہ ہے

(۱) روح المعانی: ۲۸/۱۵۶، تفسیر القرطبی: ۱۸/۱۹۵

کہ اپنے آپ کو اور اپنے اہل وعیال کو خیر وبھلائی (نیکی) کی باتوں کا علم سکھاؤ اور ان کو ادب دو۔(۱)

(۳) ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اپنے اہل وعیال کو دعا وذکر کا حکم دو، تاکہ اللہ تعالیٰ تمہارے ذریعہ ان کو بچالے۔(۲)

(۴) امام بخاری رحمہ اللہ نے تعلیقاً اور فریابی نے موصولاً حضرت مجاہد رحمہ اللہ سے نقل کیا ہے کہ اپنے آپ کو اور اپنے اہل وعیال کو اللہ سے ڈرنے کی وصیت کرو اور ان کو ادب سکھاؤ۔(۳)

ان سب روایتوں سے ثابت ہوا کہ اہل وعیال کو دوزخ سے بچانے کا مطلب یہ ہے کہ ان کو علم وادب سکھایا جائے، اللہ کے حکموں پر عمل کرنے کی تاکید ووصیت کی جائے، یہ ہر مسلمان کی ذمے داری ہے اور اس کا حکم صاف طور پر قرآن مجید میں دیا گیا ہے۔ چناں چہ اسی آیت سے علما نے یہ مسئلہ نکالا ہے جیسا کہ اوپر ہم نے لکھا ہے۔ اس کے علاوہ اور حدیثوں میں بھی اس کا حکم دیا گیا ہے۔ چناں چہ بخاری ومسلم میں ہے:

”رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ خبردار تم میں سے ہر ایک حاکم ہے اور قیامت کے دن وہ اپنی رعایا کے بارے میں سوال کیا جائے گا، مرد اپنے اہل وعیال پر حاکم ہے اور اس سے ان کے بارے

---

(۱) روح المعانی:۲۸/۱۵۶، وذکرہ فی الفتح بدون لفظ انفسکم معزیا الی الحاکم وقال رواتہ ثقات، فتح الباری:۸/۶۵۹

(۲) قرطبی:۸/۱۹۴

(۳) بخاری:۲/۷۳۰ وفتح الباری:۸/۶۵۹

میں سوال کیا جائے گا اور عورت اپنے شوہر کے گھر والوں اور بچوں پر حاکم ہے اور اس سے بھی ان کے بارے میں پوچھ ہوگی۔ (۱)

اس حدیث میں بتایا گیا ہے کہ عورت ومرد دونوں سے اپنے ماتحتوں کے بارے میں پوچھ ہوگی؛ مگر کیا پوچھ ہوگی، اس کا ذکر نہیں ہے؛ لیکن یہ بالکل ظاہر ہے کہ ہر ایک سے اس کے ماتحتوں کے بارے میں یہ سوال ہوگا کہ بتاؤ تم نے ان کے حقوق ادا کیے یا نہیں؟ اور ان حقوق میں سے یہ بھی ہے کہ ان کو علم وادب سکھائے، لہٰذا اگر اپنے بچوں کو یا بیوی کو علم دین نہ سکھایا تو پوچھ ہوگی اور پوچھ تو ان ہی باتوں کی ہوتی ہے جو فرض وواجب اور ضروری ہوں، اس سے معلوم ہوا کہ اہل وعیال کو علم وادب سکھانا ضروری ہے۔

حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

”جاننا چاہئے کہ جس طرح نفقاتِ حسیہ (کھانا، پانی، کپڑا، مکان) سے بی بی اور اولاد اور متعلقین کی جسمانی تربیت ضروری ہے، اسی طرح علوم اور اصلاح کے طریقوں سے ان کی روحانی تربیت اس سے زیادہ ضروری ہے۔“ (۲)

عورت بھی ذمے دار ہے

اوپر جو حدیث گذری، اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ عورت بھی اپنے بچوں اور ماتحتوں کی ذمے دار ہے، اور اس سے بھی ان کے بارے میں سوال ہوگا، چناں چہ علما نے اس حدیث سے یہ مسئلہ نکالا ہے کہ ہر مکلّف سے بازپرس ہوگی اگر وہ اس شخص

---

(۱) بخاری کتاب الاحکام: ۲/۱۰۵۷، ومسلم کتاب الامارۃ: ۲/۱۲۲
(۲) اصلاح انقلاب امت: ۱۹۴

کے بارے میں کوتاہی کرے جو اس کے ماتحت ہے۔ (۱)

اور یہ بات شرعاً وعرفاً معلوم ہے کہ بچے ماں کے ماتحت ہوتے ہیں، اس لیے اگر وہ ان کے بارے میں کوتاہی کرے گی اور ان کو علم وادب نہ سکھائے گی، ان کی اصلاح نہ کرے گی تو اس سے ان کے بارے میں سوال ہوگا۔ عورتیں عام طور پر اس میں بڑی کوتاہی کرتی ہیں، وہ اپنے بچوں کو کھلانے پلانے، پہنانے اڑھانے، سیر و تفریح کرانے اور ان کی دل جوئی کی خاطر ان کی خواہشوں کو پوری کرنے میں جس قدر چست ہوتی ہیں، ان کو علم وادب سکھانے اور ان کی اصلاح کرنے میں اسی قدر سست ہوتی ہیں۔

ماؤں و بہنو! یہ تمہاری بہت بڑی اور اہم ذمے داری ہے، اس میں تم نے اگر غفلت کی اور تمہاری اولاد دین سے دور ہوگئی اور دنیا کے بکھیڑوں میں پڑ گئی تو وہ دوزخ میں جائے گی، کیا تم اپنی اولاد کو دوزخ میں دیکھنا پسند کرو گی؟

تمہارا بچہ اگر کبھی چولھے کے قریب آجائے تو تم فکرمند ہو جاتی ہو، اس کو فوراً چولھے سے دور لے جا کر بٹھا دیتی ہو، نیز اگر تمہارے بچوں کو کچھ درد و تکلیف ہو جائے تو تمہاری نیند حرام ہو جاتی ہے، اگر یہی تمہارا بچہ جہنم میں پڑا ہوا ہو اور روتا پلاتا تم کو دکھائی دے تو کیا تم کو آرام مل جائے گا، کیا تم پریشان نہ ہوگی؟

اس لیے تم اپنی اولاد کو نیک بنانے، اللہ والا بنانے، رسول اللہ کا چاہنے والا بنانے، دین کا خادم بنانے کی فکر کرو، اس میں تمہارے لیے بھی راحت ہے اور بچوں کے لیے بھی نجات ہے۔

الغرض! عورت ہو یا مرد ہر ایک کو اپنی اس ذمے داری کا احساس ہونا چاہئے اور

(۱) فتح الباری: ۱۳/۱۱۳

اپنے بچوں کو دینی تعلیم وتربیت کی فکر کرنا چاہیے۔

ہماری افسوس ناک حالت

مگر ہماری حالت نہایت افسوس ناک ہے کہ ہم بچوں کو تعلیم وتربیت کے بہ جائے ان کو بگاڑتے اور غلط راہوں پر ڈالتے ہیں۔ چناں چہ دیکھا جاتا ہے کہ بچہ بولنے لگتا ہے تو اس کو فحش گانے سکھائے جاتے ہیں اور وہ گائے تو ماں باپ اور گھر والے اس کو خوش ہوکر ہاتھوں ہاتھ لیتے پھرتے ہیں، سنیما اور ٹیلی ویژن کے فحش پروگرام اس کو دیکھنے دیتے ہیں؛ بل کہ خود دکھاتے ہیں اور یوروپ کے دل دادہ لوگ بچوں کو صرف دنیوی تعلیم میں لگادیتے ہیں اور دینی تعلیم کو فضول خیال کرتے ہیں؛ بل کہ کبھی کہتے بھی ہیں، اور پڑھ کر فارغ ہوا تو ساری کوشش اس کو کسی اچھی جگہ نوکر بنانے کے لیے کوشش کرتے ہیں اور دنیا سے یوں ہی چلے جاتے ہیں۔

بھائیو، بزرگو! آپ جس طرح اپنے بچوں اور ماتحتوں کو دنیا میں خوش حال دیکھنا چاہتے ہیں، کیا ان کو آخرت میں اچھا دیکھنا آپ کو پسند نہیں ہے؟ اگر ہے تو بس اس کا ایک ہی طریقہ ہے کہ ان کو دین کے علم سے آراستہ کرائیے۔

اہل وعیال کو تعلیم دینے کی فضیلت

اپنے بچوں اور ماتحتوں کو تعلیم دینے کی بڑی فضیلت ہے۔

ایک حدیث میں اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

”جو شخص قرآن پڑھا اور اس پر عمل کیا، اس کے والدین کو قیامت کے دن ایسا تاج پہنایا جائے گا کہ اس کی روشنی، اس سورج کی روشنی سے زیادہ خوبصورت وحسین ہوگی جو بالفرض تمہارے گھروں میں ہو،

پس کیا خیال ہے تمہارا اس کے بارے میں جس نے خود عمل کیا ہے قرآن پر''۔(۱)

اس حدیث میں غور کرنے کی بات یہ ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم خبر دیتے ہیں کہ بچہ قرآن پڑھ کر عمل کرتا ہے تو قیامت کے دن اس کے ماں باپ کو تاج پہنایا جائے گا، یہ کیوں؟ ظاہر ہے کہ اس کی وجہ یہی ہے کہ والدین نے اس کو تعلیم دینے اور ادب سکھانے کا اہتمام کیا تھا، اس کی وجہ سے ان کو یہ فضیلت حاصل ہوئی ہے۔ اگر انہوں نے کچھ نہ کیا ہوتا تو ان کو ثواب وفضیلت کیوں حاصل ہوتی؟ اس سے معلوم ہوا کہ بچوں کو قرآن اور علم دین سکھانا اور اس پر عمل کی ان کو عادت ڈالنا بڑے درجہ کا کام ہے۔

ایک حدیث میں ارشاد ہے:

''اللہ تعالیٰ اس مرد پر رحم فرمائے جو رات کو اٹھے، نماز پڑھے اور اپنی بیوی کو جگائے اور وہ انکار کرے تو اس کے چہرے پر پانی چھڑکے اور اللہ تعالیٰ اس عورت پر رحم کرے جو رات کو اٹھے، نماز پڑھے اور اپنے خاوند کو جگائے اور اگر وہ انکار کرے تو اس کے چہرے پر پانی چھڑکے۔''(۲)

ایک دوسری حدیث میں ہے:

''جب مرد اپنی بیوی کو رات میں جگائے اور دونوں یا صرف مرد دو رکعت نماز پڑھے تو ان میاں بیوی کو اللہ تعالیٰ ذاکرین میں لکھ لیتا ہے''۔(۳)

---

(۱) احمد، ابو داؤد، مشکوٰۃ:۱۸۶

(۲) ریاض الصالحین: ۴۳۴

(۳) ریاض الصالحین: ۴۳۴

ان حدیثوں سے معلوم ہوا کہ اپنی بیوی کو اور عورت اپنے خاوند کو نیکی کی طرف بلاتی ہے تو اس کے لیے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا ہے کہ اللہ اس پر رحم کرے اور آپ کی دعا تو ضرور قبول ہوگی تو اللہ کا اس پر رحم بھی ضرور ہوگا، نیز ان کو اللہ تعالیٰ ذاکرین (ذکر کرنے والوں) میں لکھ لیتا ہے۔ اللہ اکبر! کس قدر بڑی یہ فضیلت ہے بہ ہر حال دین کا علم اور دین پر عمل کرنے کی تاکید کرنا، بڑی فضیلت کا کام ہے، اس میں سب کو حصہ لینا چاہیے غفلت نہ کرنا چاہیے۔

فصل چہارم

بچوں کی تربیت وتعلیم کا طریقہ

بچوں کی تربیت وتعلیم کا طریقہ کیا ہے؟ یہ ایک اہم بحث ہے؛ مگر اس مختصر رسالے میں اس پر چوں کہ زیادہ تفصیل سے لکھنے کی گنجائش نہیں ہے، اس لیے چند حدیثوں اور علما کے اقوال پر اکتفا کرتا ہوں، اس سے خود بہت سی باتیں سمجھ لی جا سکتی ہیں۔

(۱) حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تمہارے بچے جب بولنے لگیں تو انہیں لا الہ الا اللہ سکھاؤ، پھر مرنے تک پرواہ نہیں۔ (۱)

(۲) نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب بنی عبد المطلب کے خاندان میں کوئی بچہ بولنے لگتا تو اس کو یہ آیت سکھاتے:

﴿ وَقُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ لَمْ یَتَّخِذْ وَلَدًا وَّلَمْ یَکُنْ لَّهٗ شَرِیْکٌ فِی الْمُلْکِ وَلَمْ یَکُنْ لَّهٗ وَلِیٌّ مِّنَ الذُّلِّ وَکَبِّرْهُ تَکْبِیْرًا ﴾

(اور کہہ دو کہ سب تعریفیں اللہ کے لیے ہیں، جس کی کوئی اولاد نہیں اور اس کی بادشاہی میں کوئی اس کا شریک نہیں اور اس کا کوئی کمزوری کی وجہ سے مددگار نہیں اور اس کی بڑائی بیان کرو۔) (الاسراء)

(۳) حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اپنے بچوں کو تین باتوں پر ڈھالو، ایک تمہارے نبی (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) کی محبت، دوسرے نبی کے اہل بیت (گھر وخاندان والوں) کی محبت، تیسرے قرآن

---

(۱) عمل الیوم واللیلة، لابن السنی:۲۲۲

کریم کی تلاوت، کیوں کہ قرآن کے حامل (پڑھنے اوراس پر عمل کرنے والے) انبیا ومقربین کے ساتھ، اللہ کے عرش کے سایہ میں ہوں گے، اس دن کہ اس میں سوائے اس کے سایہ کے کوئی اور سایہ نہ ہوگا۔ (۱)

(۴) عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اپنی اولاد کو نماز کا حکم کرو جب کہ وہ سات سال کے ہوجائیں اور اس پر ان کو مارو، جب کہ وہ دس سال کے ہوجائیں اور ایک روایت میں اس طرح فرمایا کہ جب بچہ دائیں سے بائیں کو پہچان لے تو نماز کا حکم کرو۔ (۲)

اس حدیث میں حکم دیا گیا ہے کہ سات سال کے بچوں کو نماز کی تاکید کی جائے اور دس سال کے ہوکر بھی وہ نماز نہ پڑھیں تو ان کو ماریں، علما نے لکھا ہے کہ یہی حکم تمام فرائض مثلاً روزہ وغیرہ میں بھی ہے۔ (۳)

نیز اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ بچپن ہی سے بچوں کو نماز و روزہ وغیرہ فرائض اوران کے مسائل بھی سکھادینا ضروری ہے، کیوں کہ بغیر سکھائے حکم دینے اور نہ کرنے پر سزادینے کا کیا مطلب ہے؟ پھر یہ بھی معلوم ہوا کہ فرائض پر اور فرائض کی تعلیم پر سزا دینا اور مارنا بھی درست اور جائز ہے، جیسا کہ علما نے تصریح فرمائی ہے۔ (۴)

(۵) حدیث میں ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بیٹے حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے ایک مرتبہ زکاۃ کے کھجوروں میں سے ایک کھجور اٹھا کر منہ میں ڈال لیا (اور چوں کہ سیدوں

---

(۱) طبرانی من کنوز السنۃ: محمد علی صابونی، ۱۳۸

(۲) جمع الفوائد: ۱/۵۴

(۳) شامی: ۱/۳۵۲

(۴) درمختار وشامی: ۴/۷۸، البحر الرائق: ۵/۴۹، الفقہ علی مذاہب الاربعۃ: ۵/۶۳۷

کوزکاۃ کا مال لینا، کھانا، ناجائز ہے) اس لیے رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے ان کے منہ میں ہاتھ ڈال کر اس کو نکال دیا اور فرمایا کہ ہم آل محمد کے لیے زکاۃ حلال نہیں ہے۔(۱)

علما نے اس حدیث کے تحت لکھا ہے کہ بچوں کو حرام چیزوں کے استعمال سے روکنا اور منع کرنا چاہیے، نیز نفع کی چیزوں کی تعلیم دینا چاہیے، جیسا کہ اللہ کے رسول صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے حضرت حسن رضی اللہ عنہ سے فرمایا تھا، یہ سرپرستوں پر لازم وضروری ہے۔(۲)

ان سب احادیث اور علما کے اقوال کو سامنے رکھنے سے یہ خلاصہ نکلتا ہے کہ بچوں کو ابتدا ہی سے ''لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ''اور اس کا مطلب ومعنی سکھانا چاہیے، نیز اللہ کی وحدانیت اور اس کی بڑائی وعظمت دل میں بٹھانا چاہیے، جب ذرا عقل والا ہو جائے تو قرآن کی تلاوت، محبت رسول ومحبت صحابہ وعلما کی تعلیم دینا چاہیے، نیز حدیث اور فقہ کے ضروری مسائل جو نماز روزہ وغیرہ فرائض سے متعلق ہیں، ان کی تعلیم دینا چاہیے، حرام اور ناجائز کاموں اور باتوں سے ان کو روکنا چاہیے۔

اس کے علاوہ علما نے لکھا ہے کہ بچوں کو کھانے پینے کے آداب، رہن سہن کے طریقے بات چیت اور معاشرت کے طریقے، اخلاق اور تہذیب کی باتیں بھی سکھانا چاہیے اور بری صحبتوں اور غلط ماحول سے روکنا چاہیے۔(۳)

---

(۱) بخاری:۱/۲۰۲،مسلم:۱/۳۴۳، طحاوی:۱/۲۵۱
(۲) فتح الباری:۳/۳۵۵،شرح مسلم للنووی:۱/۳۴۴
(۳) احیاء العلوم للغزالیؒ :۳/۷۲تا:۷۴

فصل پنجم

شوق علم کے چند واقعات

اس فصل میں ہم چند واقعات بیان کرتے ہیں جن میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا علم کا شوق اور اس کے لیے ان کی محنت و مشقت اور مجاہدہ معلوم ہوتا ہے۔

(۱) حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ کو معلوم ہوا کہ ملک شام میں ایک صحابی ہیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت بیان کرتے ہیں، انہوں نے اس حدیث کو سننے کے شوق سے ایک اونٹ خریدا اور ایک مہینہ تک چلتے رہے اور ملک شام کو پہنچ کر ان صحابی سے جن کا نام عبداللہ بن انیس رضی اللہ عنہ ہے وہ حدیث سنی اور واپس آئے۔(۱)

(۲) حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ کو معلوم ہوا کہ مصر میں حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ کے پاس ایک حدیث ہے جو انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنی ہے۔ ابوایوب رضی اللہ عنہ نے مصر کا سفر فرمایا اور حضرت عقبہ رضی اللہ عنہ کا گھر معلوم نہ ہونے کی وجہ سے وہاں کے گورنر حضرت مسلمہ بن مخلد کے پاس گئے، انہوں نے ان کو روکا کہ ٹھہرو؛ مگر ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ میں حضرت عقبہ رضی اللہ عنہ کے گھر جانا چاہتا ہوں، کسی واقف کو، میرے ساتھ بھیج دو۔ چناں چہ ایک شخص کے ساتھ حضرت عقبہ کے گھر گئے اور حدیث سنی اور واپس چلے آئے، وہ حدیث یہ تھی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص مسلمان کا عیب چھپاتا ہے، اللہ تعالیٰ

---

(۱) بخاری:۱/۱۷، فتح الباری:۱/۱۷۴، مفتاح الجنۃ:۲۷

قیامت کے دن اس کا عیب چھپائے گا۔(۱)

(۳) حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور ان کے ایک پڑوسی نے جن کا نام بعض علما نے عتبان نقل کیا ہے، آپس میں باری مقرر کر رکھی تھی اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ایک دن وہ، اور ایک دن یہ حاضر ہوں گے اور آپ سے سنی ہوئی حدیث اور باتیں ایک دوسرے کو بتائیں گے تاکہ وہ باتیں جو نہ سن سکے ہیں، وہ بھی معلوم ہو جائیں۔(۲)

(۴) حضرت عقبہ بن الحارث رضی اللہ عنہ نے ابواھاب کی لڑکی سے جب شادی کرلی تو ان کی رضاعی ماں نے آکر ان سے کہا کہ میں نے تم کو بھی اور اس لڑکی کو بھی دودھ پلایا ہے (لہٰذا تمہارا اس لڑکی سے نکاح درست نہیں۔ یہ سن کر حضرت عقبہ مکہ مکرمہ سے رسول اکرم علیہ السلام کی خدمت میں مدینہ حاضر ہوئے اور اس سلسلے میں مسئلہ دریافت کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یہ نکاح کیسے ہوسکتا ہے؟ چناں چہ انہوں نے اس لڑکی کو الگ کر دیا۔(۳)

---

(۱) معرفة علوم الحديث للحاكم:۱۰، ومفتاح الجنة:۲۷
(۲) بخاری:۱/۱۹
(۳) بخاری:۱/۱۹

فصل ششم

علم دین سے غفلت کی سزا

علم دین سے غفلت کی سزا یہ ہے کہ آدمی جہنم (دوزخ) میں ڈالا جائے گا، چناں چہ شروع میں جو آیت گذری جس میں فرمایا گیا ہے کہ تم اپنے آپ کو اور اپنے اہل وعیال کو دوزخ کی آگ سے بچاؤ، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر ہم نے علم وعمل کے ذریعہ دوزخ سے بچنے کا اہتمام نہ کیا تو دوزخ کی ہولناکیوں میں ہم کو بھی اور ہماری اولاد اور بیوی اور ماتحتوں کو ڈال دیا جائے گا۔

بھائیو اور بہنو! غور کرو اور سوچو کہ ہم دنیا کی معمولی آگ اور یہاں کی مصیبت کو برداشت نہیں کر سکتے اور ہماری اولاد اور بیوی یا رشتہ داریوں کو تکلیف ہو جائے تو ہم بے چین ہو جاتے ہیں تو پھر دوزخ کی آگ میں ہم کو یا ہماری اہل وعیال کو ڈال دیا جائے تو کیا ہوگا اور ہم کیسے برداشت کر سکیں گے؟ معلوم بھی ہے کہ جہنم کی آگ دنیا کی آگ سے تقریباً (۷۰) گنا زیادہ تیز ہے۔ چناں چہ حدیث میں ہے کہ دنیا کی آگوں سے دوزخ کی آگ کی گرمی انہتر (۶۹) درجہ بڑھی ہوئی ہے۔ (۱)

ایک حدیث میں ہے کہ دوزخ کی آگ کافر کے منہ کو بھون دے گی، اس کا اوپر کا ہونٹ اوپر کو سمٹ جائے گا، یہاں تک کہ آدھے سر تک چلا جائے گا اور نیچے کا ہونٹ لٹک جائے گا جو ناف تک پہنچ جائے گا۔ (۲)

---

(۱) مشکوٰۃ: ۵۰۲

(۲) ایضاً

ایک طبی حدیث میں ہے کہ حضرت جبرئیل علیہ السلام نے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو دوزخ کی حالت بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ اگر سوئی کے سوراخ کے بہ قدر بھی جہنم کو دنیا میں کھولا جائے تو اس کی گرمی سے سارے زمین والے مرجائیں گے۔(۱)

بھائیو اور بہنو! کیا اس ہول ناک جہنم سے بچنے کے لیے تیاری کی ضرورت نہیں ہے؟ اگر ہے تو سمجھو کہ وہ علم دین حاصل کرنے اور اس پر عمل کرنے سے پوری ہوتی ہے۔

اسکولوں میں ایمان پر ڈاکہ اور اس کا علاج وتدبیر

آخر میں ایک بہت ہی توجہ کے قابل بات عرض کرتا ہوں وہ یہ کہ آج کل لوگ دنیوی تعلیم کے لیے بچوں کو جن اسکولوں میں بھیجتے ہیں، ان میں دین کے لیے بڑا خطرہ ہے اور خاص طور پر عیسائی مشنری اسکولوں میں تو اسلام کے خلاف سازش جاری ہے، جیسا کہ معتبر ذرائع سے اور خود ہمارے تجربوں سے ثابت ہے، مثلاً ایک اسکول کے بارے میں ہمارے ایک دوست نے بتایا کہ وہاں اوپر کی جانب سے پردہ کھلنے پر مٹھائیاں گرتی ہیں، بچوں کو یہ کہہ کر وہ دی جاتی ہیں کہ عیسیٰ علیہ السلام نے تم کو دی ہیں، سمجھنے والے سمجھ سکتے ہیں کہ اس کا کیا مقصد ہے، اس کے علاوہ بعض جگہ بائبل کے سبق بھی پڑھائے جاتے ہیں؛ بل کہ گھروں کو بھی ایسے خطوط اسکول کی طرف سے آتے ہیں کہ گھر میں بھی بچوں کو بائبل کا سبق یاد کرایا جائے۔ حالاں کہ اسلام میں اس کی کوئی گنجائش نہیں، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ہاتھ میں تورات کا نسخہ دیکھ کر اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ناراضگی ظاہر فرمائی تھی اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس کو

---

(۱) جمع الفوائد: ۲/ ۳۰۷

لے جا کر تنور میں جھونک دیا تھا۔ (۱)

اس سے معلوم ہوا کہ بائبل پڑھنے کی اجازت نہیں ہے۔ الغرض آج اسکولوں میں ایمان کو کمزور یا ختم کرنے کی کوشش کی جارہی ہے اور یہ دنیوی علوم بھی ضروری ہیں تو اس کا حل کیا ہے کہ ایمان بھی برقرار رہے اور یہ علوم بھی حاصل ہو جائیں؟ اس کا حل یہی ہے کہ مسلمان خود اپنی اسکول جاری کریں، میں علما اور مسلم رہنماؤں سے درخواست کرتا ہوں کہ وہ اس سلسلہ میں کوشش کریں اور کم از کم مسلمانوں کو چاہئے کہ اپنے بچوں کو صبح وشام دینی مدرسوں میں بھیج کر ان کو دین کا علم سکھائیں اور ان کے ایمان کو مضبوط کرنے کی فکر کریں، یہی طریقہ ہے جہنم سے بچنے کا۔

فقط

محمد شعیب اللہ خان مفتاحی

---

(۱) الطرق الحکمیۃ فی السیاسۃ الشرعیۃ:۳۹۹

دعا- مؤمن کا
عظیم ہتھیار

بسم اللہ الرحمن الرحیم

المقدمۃ

ألحمد للّٰہ علی ما انعم علینا من نعمہ الظاھرۃ و الباطنۃ،و علیٰ الائہ العظیمۃ و الجسیمۃ والصلوٰۃ و السلام علیٰ من بُعِث بالھُدٰی الحسن و بالھدایۃ الصالحۃ و علیٰ من تبعہ الی یوم القیامۃ .

امابعد: یہ رسالہ ایک اہم مسئلہ کی طرف عام لوگوں کی توجہات مبذول کرانے کے لیے تحریر کیا گیا ہے،جس سے آج بہت زیادہ صرفِ نظر کیا جا رہا ہے،اوروہ ہے ’’دعا کا مسئلہ‘‘ اس میں آج کل جس انداز سے غفلت وتکاسل اور بے تکی باتیں ہورہی ہیں اس سے دعا جیسی اہم عبادت ضائع ہورہی ہے؛ بل کہ بہت سے لوگ ایسے ہیں جن کے یہاں دعا کا کوئی خاص اہتمام ہی نہیں ہے اوراس کوایک فضول چیز خیال کر رکھا ہے،اسی طرح بعض کے یہاں دعا میں خرافات اور بدعات کوشامل کرلیا گیا ہے جس سے دعا بے اثر ہوکر رہ گئی ہے اوربعض جاہلوں نے دعا کے آداب کوضائع کرر کھا ہے اور دعا کے قبول نہ ہونے سے اللہ کا شکوہ وشکایت کرتے پھرتے ہیں اس طرح متعدد بیماریاں اورخرابیاں اس سلسلہ میں پھیلی ہوئی ہیں،زیرِنظر رسالہ اسی کے پیش نظر لکھا گیا ہے،جس میں دعا کی اہمیت وضرورت،اس کے ثمرات وبرکات،اس کے

آداب وطریقے بیان کئے گئے ہیں اور اسی کے ساتھ ساتھ اس سلسلہ میں رائج اغلاط وغیر شرعی رسومات کو بھی بیان کیا گیا ہے، تاکہ لوگ ان سے بچیں اور اللہ کے دربارِ عالی میں ہماری دعائیں درجۂ قبولیت کو پہنچ جائیں اور رسالہ کے شروع میں احقر کی نظم کی ہوئی ایک مناجات بھی درج رسالہ کر دی گئی ہے، تاکہ کوئی صاحبِ ذوق پڑھنا چاہے تو پڑھ لے۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ ہمیں اپنے ان بندوں میں شامل فرمالے، جن کو اس کی بارگاہِ عالی وقار میں بندگی اور غلامی کا شرف حاصل ہے اور جو حقیقی معنی میں اس کے بندے اور اس کے غلام ہیں، اور یہ بھی دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ میری اس کاوش کو شرفِ قبول عطا فرمائے اور لوگوں کے لیے اس کو نافع ومفید بنائے۔

فقط:

محمد شعیب اللہ خان	۱۲ر جمادیٰ الاولیٰ ر ۱۴۲۴ھ ہجری
(مہتمم جامعہ اسلامیہ مسیح العلوم، بنگلور)	۱۳ر جولائی ر ۲۰۰۳ عیسوی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مناجات بدرگاہِ رب کائنات

از: محمد شعیب اللہ خان ظرفی

حمد کثیر تیری، شکرِ تمام تیرا
اے مالکِ دو عالم، رحمان نام تیرا

تعریف کا ہے تو ہی، حقدار دو جہاں میں
ادراک سے ہمارے بالا مقام تیرا

فاراں کی چوٹیوں سے ماہِ عرب جو نکلا
اس پر صلوٰۃ تیری، اس پر سلام تیرا

رحم و کرم کیوالی، نظرِ کرم تو کر دے
غفّار ذات تیری ، بخشش ہے کام تیرا

عجز و نیاز لیکر، ہوش و حواس کھو کر
حاضر ہوا ہے در پر ادنیٰ غلام تیرا

جاؤں کدھر الٰہی ، گر چھوڑ دوں میں تجھ کو
در ایک ہی ہے جھکنے ذی احترام تیرا

ابتک بھٹک رہا ہوں،شیطاں کی وادیوں میں
اے ساقیٔ ھدایت، کر مست جام تیرا

سجدے میں تیرے آگے، میں پڑ گیا ہوں آقا
منظور کر لے گر چہ ،بندہ ہوں خام تیرا

ہو جائے جو عنایت ،مجھ پر تری خدایا
پڑ جائے راہِ حق پر ، یہ سست گام تیرا

نظرِ کرم جو مجھ پر ہو جائے گر ذرا بھی
نفس شریرو سرکش ہو جائے رام تیرا

عزت کی زندگی دے دنیا و آخرت میں
ہم مانگتے ہیں تجھ سے انعامِ تام تیرا

میں چاہتا نہیں ہوں نام و نمو دمولا
بندہ بنا رہوں بس دل سے مدام تیرا

خلقت کے روبرو ہم رسوا نہ ہوں الٰہی
قائم ہو جب معظم دربارِ عام تیرا

مشغول کر لے شاہا، اپنے میں مجھکو اتنا
بنجائے میرا دل بھی بیت الحرام تیرا

گر پوچھ لے یہ مولا ، کیا چاہتے ہو کہہ دو
کہدوں گا بس عطا ہو عشقِ دوام تیرا

فتنوں کی اس زمیں پر فتنوں کے اس زماں میں
مل جائے ہم سبھی کو فضلِ تمام تیرا

کرلے قبول عرضی ظرفیؔ کی ان کے صدقے
جن پر ہوا ہے نازل خیر الکلام تیرا

بسم اللہ الرحمن الرحیم

دعا

مؤمن کا عظیم ہتھیار

تمہید

دعا ایک اہم ترین عبادت؛ بل کہ عبادت کا مغز وخلاصہ ہے، اس کی طرف توجہ دینا اور اس کا اہتمام کرنا، بندۂ مؤمن کے لیے ضروری ہے؛ مگر جیسا کہ ظاہر ہے جب تک اس کی حقیقت واہمیت کا علم نہ ہوگا، اس کی طرف کما حقہ توجہ نہ ہوگی، یہی وجہ ہے کہ آج بہت سے؛ بل کہ اکثر مسلمان اس اہم عبادت سے غافل ہیں، اور طرح طرح کی بداعتقادیوں اور بداعمالیوں میں مبتلا ہو گئے ہیں، بعض لوگ دعا کی حقیقت و اہمیت اور اس کے ثمرات وبرکات سے ناواقف ہونے کے سبب دعا ہی کا اہتمام نہیں کرتے، بعض لوگ دعا کو چھوڑ کر جھوٹے سچے عاملوں اور دھوکے باز پیروں کے چکر میں پڑ جاتے ہیں، اور بعض خدا کو چھوڑ کر مخلوقِ خدا میں سے اولیاء ومشائخ اور ان کی قبروں سے استمداد واستعانت کرتے ہیں، یہ ساری بداعتقادی اور بدعملی اس لیے ہے کہ یا تو دعا کی حقیقت واہمیت سے واقفیت نہیں ہے، یا اس کے ثمرات وبرکات سے لاعلمی وجہالت ہے، اس لیے ضروری معلوم ہوا کہ اس عنوان پر کچھ عرض کیا جائے۔

دعا کی حقیقت

دعا کے اصل معنی طلب کرنے اور مانگنے کے ہیں؛ مگر اس کے ساتھ عاجزی اور

انکساری، تواضع وتذلل بھی شامل ہونا چاہیے۔

ملا علی قاری رحمہ اللہ دعوت ودعا کے معنیٰ بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

”وهو طلب الأدنى بالقول من الأعلى شيئًا على جهة الاستعانة“

(یعنی دعا یہ ہے کہ حقیر وادنی آدمی اپنے سے اعلی وبلند ہستی سے کوئی چیز انکساری وعاجزی کے طریقہ پر مانگے۔(۱)

اس سے ایک بات تو یہ معلوم ہوئی کہ دعا اپنے سے اعلیٰ وارفع ہستی سے کی جاتی ہے اور ظاہر ہے کہ وہ اعلیٰ وارفع ذات اللہ تعالیٰ ہی کی ہے، دوسری یہ بات بھی معلوم ہوئی کہ دعا میں عاجزی وتذلل کا مفہوم بھی شامل ہے، اس لیے دعا وہی ہے جو عاجزی وخاک ساری اور تذلل وانکساری کے بھرپور جذبات سے کی جائے۔

ایک حدیث کی شرح

اس کی جانب ایک حدیث میں اشارہ فرمایا گیا ہے، چناں چہ حضرت نعمان بن بشیر اور حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«اَلدُّعَاءُ هُوَ الْعِبَادَةُ» (دعا تو عبادت ہی ہے)(۲)

اور ایک حدیث میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«اَلدُّعَاءُ مُخُّ الْعِبَادَةِ» (یعنی دعا عبادت کا مغز ہے)(۳)

---

(۱) المرقاة المفاتيح:۳/۳۳

(۲) ترمذي:۳۲۹۳، ابن ماجه:۳۸۱۸، الادب المفرد:۱/۳۷۶

(۳) ترمذی:۳۲۹۳، مشکوة:۱۹۴

ان احادیث کی شرح میں علامہ عبدالرؤف مناوی رحمۃ اللہ فرماتے ہیں کہ:

”عبادت سوائے دعا کے کچھ اور نہیں ہے، بعض علما نے فرمایا کہ اس حدیث کا معنی یہ ہے کہ دعا اعظم عبادات میں سے ہے اور یہ اس لیے کہ دعا کرنے والا اپنی ذات کے ساتھ خدا کی طرف متوجہ ہوتا ہے اور تمام ماسوی اللہ سے منہ موڑ لیتا ہے اور اس (دعا) کو عبادت اس لیے فرمایا گیا کہ دعا کرنے والا تواضع کرے اور اپنی ذلت و عاجزی اور محتاجی کا اظہار کرے کیونکہ عبادت ذلت اور عاجزی کا نام ہے۔ (۱)

غرض یہ کہ حدیث پاک میں دعا کو عبادت؛ بل کہ عبادت کا مغز فرمایا گیا، اس کی وجہ یہی ہے کہ دعا میں عاجزی و عبودیت کا مفہوم شامل ہے؛ بل کہ دعا میں یہی اصل ہے۔

امر اور دعا میں فرق

اس سے امر اور دعا میں بھی فرق کیا گیا ہے، کہ امر میں بھی ایک چیز کی طلب ہوتی ہے اور دعا میں بھی ایک چیز کی طلب ہوتی ہے اور صیغہ اور لفظ بھی دونوں کے لئے ایک ہی استعمال کیا جاتا ہے: مثلاً اللہ نے ہم کو حکم دیا اور امر فرمایا کہ میری اور میرے رسول کی اطاعت کرو، اس کے لیے بھی ” أطیعوا “ امر کا لفظ استعمال فرمایا اور ہمیں جو دعائیں سکھائی گئی ہیں ان میں بھی امر کا لفظ ہی استعمال فرمایا، جیسے ﴿ اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ ﴾ اور ﴿اَفْرِغْ عَلَیْنَا صَبْرًا﴾ وغیرہ، پھر دونوں میں فرق کیا ہوا؟ علما نے فرق یہی بتایا ہے کہ امر و حکم میں شانِ ترفع ہوتی ہے اور دعا میں شانِ تواضع ہوتی ہے، گویا ایک ہی لفظ بڑائی سے ادا کیا جائے تو وہ امر و حکم ہے اور وہی لفظ

---

(۱) فیض القدیر شرح الجامع الصغیر :۳/۵۴۰

انکساری سے ادا کیا جائے، تو وہ دعا ہے۔(۱)

اس کو ایک مثال سے سمجھا جا سکتا ہے، وہ یہ کہ ایک استاذ اپنے شاگرد سے کہتا ہے ''کتاب دو'' تو چوں کہ استاذ شاگرد سے اعلیٰ و اشرف ہے اور شانِ ترفع سے یہ جملہ ادا کر رہا ہے، لہٰذا یہ حکم و امر ہے اور یہی جملہ اگر شاگرد استاذ سے کہتا ہے تو یہ عاجزانہ و متواضعانہ طریق سے ہوتا ہے، لہذا اس کو دعا کہا جاتا ہے۔

ہماری کوتاہی

جب یہ واضح ہوگیا کہ دعا میں عاجزی و انکساری کا شامل ہونا ضروری ہے اور اصلی دعا وہی ہے، تو اس سے یہ بھی معلوم ہوگیا کہ اس کے بغیر دعا تو دعا ہی نہیں، جیسا کہ آج اکثر و بیشتر لوگوں کی حالت ہے کہ دعا کے وقت اپنی عاجزی و درماندگی، بے کسی و بے بسی، اپنی محتاجی و فقیری کا احساس و استحضار نہیں ہوتا؛ بل کہ بعض کے انداز و طریقے سے ایسا لگتا ہے کہ وہ اللہ سے مانگتے نہیں ہیں؛ بل کہ اللہ کو حکم و آرڈر دے رہے ہیں اور پوری شانِ استغنا و بے نیازی کا مظاہرہ کرتے ہیں، ظاہر ہے کہ یہ دعا ہی کہاں ہوئی؟ یہ تو آرڈر اور حکم ہوا، پھر دعا قبول نہ ہو تو خدا پر کیا اعتراض؟ کیا خدا تعالیٰ ہمارا محکوم و مامور ہے کہ ہم آرڈر دیں اور وہ اس کی تعمیل کرے؟ ارے، وہ تو غنی مطلق ہے، بے نیاز ہے، حاکم علی الاطلاق ہے، بڑے چھوٹے سب اس کے محکوم ہیں، وہ کسی کا محکوم نہیں، ہاں اس سے پوری عاجزی سے درخواست کی جا سکتی ہے، دعا کی جا سکتی ہے، پھر وہ اپنی مرضی کا مالک ہے، یہ نہیں کہ ہم اس کو آرڈر دیں، یہ متکبرانہ طریق ہے نہ کہ عاجزانہ جس سے دعا کی حقیقت ہی باطل ہو جاتی ہے۔

---

(۱) البلاغة الواضحة:۱۷۴

ایک ناشکرے کی حکایت

اس پر ایک حکایت یاد آ گئی، کہ ایک شخص ایک جگہ بیٹھ کر کھانا کھایا، اس کے کھانے میں سوکھی روٹی اور دال تھی، کھانے کے بعد اس نے حسبِ معمول دعا پڑھی کہ اللہ کے لیے تعریف ہے جس نے مجھے کھلایا، پلایا اور مسلمان بنایا، اس کے قریب ایک شخص بیٹھا تھا، اس نے کہا کہ دال روٹی کھا کر تم اللہ کا شکر ادا کرتے ہو، اسی وجہ سے اللہ میاں کی عادت بگڑ گئی (نعوذ باللہ) اور وہ تم کو بس دال روٹی ہی دیتا ہے، پھر کہنے لگا کہ میں تو اس وقت تک اس کا شکر ادا ہی نہیں کرتا جب تک کہ مرغ پلاؤ نہ کھلائے۔

أستغفر اللّٰه! گویا اس نے خدا کو اپنا محکوم و مامور سمجھ لیا ہے، یہ سب دراصل خدا تعالیٰ کی صحیح معرفت نہ ہونے اور عظمت و جلالِ خداوندی سے واقفیت نہ ہونے کا نتیجہ ہے۔

غرض یہ کہ دعا میں پوری عاجزی اور تواضع اور ذلّت و مسکنت کا پورا پورا مظاہرہ ہونا چاہئے۔

دعا افضل ہے یا ترکِ دعا؟

یہیں سے حضراتِ صوفیائے کرام کے مابین ایک اختلافی مسئلہ کا بھی تصفیہ ہو جاتا ہے، وہ یہ کہ بعض حضراتِ صوفیا اور علما نے فرمایا کہ دعا نہ کرنا افضل ہے، کیوں کہ اللہ کو ہماری تمام حاجات وضروریات کا علم ہے اور وہ حکیم بھی ہے اور قدیر بھی ہے، لہٰذا جب ہماری ضرورت وحاجت کا پورا کرنا، حکمت و مصلحت کا تقاضا ہوگا، وہ اپنی قدرت سے اس کو پوری کردے گا، اس لیے دعا نہ کرنا چاہئے؛ مگر جمہور صوفیا و علما نے فرمایا کہ دعا کی اصل و حقیقت اللہ کے سامنے اپنی عاجزی محتاجی اور ذلت و مسکنت کا اظہار ہے

نہ کہ اپنی ضرورت وحاجت کا بتانا، علامہ قشیری رحمۃ اللہ نے جمہور کی دلیل میں اس کا ذکر کیا ہے اور نقل کیا ہے کہ کثرتِ دلائل سے اسی کو ترجیح ہونا چاہئے، کیوں کہ دعا میں عاجزی ومحتاجی کا اظہار ہے۔(۱)

غرض یہ کہ دعا میں چوں کہ اپنی عاجزی و بے بسی کا اظہار ہوتا ہے، اس لیے جمہور نے ترکِ دعا کے بہ جائے دعا کو ترجیح دی ہے اور افضل قرار دیا ہے، من جملہ ان دلائل کے جن کو جمہور نے پیش کیا ہے، ایک حدیث یہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا :

« لَيْسَ شَيْءٌ أَكْرَمَ عَلَى اللّٰهِ مِنَ الدُّعَاءِ » (۲)

(یعنی اللہ کے نزدیک دعا سے افضل کوئی شئی نہیں)

اس حدیث میں دعا کو تمام عبادات واذکار میں افضل قرار دیا گیا ہے، ملا علی قاری رحمۃ اللہ فرماتے ہیں کہ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس میں اپنے عجز وافتقار کا، اپنی ذلت وانکساری کا اظہار ہے اور اللہ کی قوت وقدرت کا اور اس کے غنی ومستغنی ہونے اور اس کی کبریائی کا اعتراف ہے۔(۳)

دعا کی فضیلت

جب دعا کی حقیقت معلوم ہوگئی تو اب دعا کی فضیلت بھی ملاحظہ فرمائیے،

(۱) حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

---

(۱) فتح الباری:۱۱/۹۵

(۲) ترمذی:۳۲۹۲، ابن ماجہ:۳۸۱۹، الادب المفرد :۱/۲۷۶

(۳) مرقاۃ المفاتیح:۳/۳۸

«مَنْ فُتِحَ لَهُ مِنَ الدُّعَاءِ مِنْكُمْ فُتِحَتْ لَهُ أَبْوَابُ الْإِجَابَةِ »(۱)

(یعنی جس کے لیے تم میں سے دعا کا دروازہ کھول دیا گیا، اس کے لیے قبولیت کے دروازے کھول دیئے گئے)

مطلب یہ ہے کہ جس آدمی کو دعا کی توفیق مل گئی، اس کے لیے قبولیت کے دروازے کھول دیئے گئے اور ظاہر ہے کہ جس کے لیے قبولیت کے دروازے کھول دیئے گئے، اس کی عبادات بھی اور دعائیں بھی قبول کی جائیں گی، ورنہ قبولیت کے دروازے کیوں کھولے جاتے؟ دعا کی اس سے بڑھ کر اور کیا فضیلت چاہیے۔

(۲) حضرت ابن عمرہی سے ایک روایت میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«إِنَّ الدُّعَاءَ يَنْفَعُ مِمَّا نَزَلَ وَ مِمَّا لَمْ يَنْزِلْ، فَعَلَيْكُمْ عِبَادَاللّٰهِ بِالدُّعَاءِ»

(یعنی دعا ان مصائب و پریشانیوں کے لیے بھی نفع دیتی ہے جو نازل ہو چکی ہیں اور ان مصائب کے لیے بھی جو نازل نہیں ہوئیں، لہذا اے اللہ کے بندو! تم پر دعا لازم ہے)(۲)

ملا علی قاری رحمۃ اللہ فرماتے ہیں کہ جو بلا نازل ہوگئی دعا کرنے سے وہ یا تو اٹھالی جاتی ہیں یا صبر کی توفیق دے دی جاتی ہے، جس سے اس کو سہنا آسان ہو جاتا ہے اور وہ اس پر صبر کرتا یا اس سے راضی ہو جاتا ہے، حتی کہ کبھی اس بلا سے اس کو لذت حاصل ہوتی ہے۔(۳)

---

(۱) ابن ابی شیبہ: ۲۳/۷

(۲) ترمذي: ۳۹/۳

(۳) مرقاۃ المفاتیح: ۳۴۷/۱

(۳) حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

《 اَلدُّ عَاءُ سِلَاحُ ا لْمُؤْمِنِ وَ عِمَادُ ا لدِّ يْنِ وَ نُوْرُا لسَّمٰوٰتِ وَالْاَرْض 》 (۱)

(یعنی دعا مومن کا ہتھیار اور دین کا ستون اور آسمانوں اور زمین کا نور ہے)

اس حدیث میں دعا کو مومن کا ہتھیار فرمایا، کیوں کہ جس طرح ہتھیار سے انسان اپنے دشمن کا مقابلہ کرتا ہے، اسی طرح مومن دعا کے ذریعہ بلاؤں اور مصیبتوں؛ نیز وسوسوں کا مقابلہ کرتا ہے۔ دعا بلا کو رد کر دیتی ہے، وسوسوں کو ختم کر دیتی ہے، شیطان کو بھگا دیتی ہے۔ اسی طرح اس کو دین کا ستون کہا گیا ہے، کیوں کہ دعا کے ذریعہ آدمی اپنے دین کو مضبوط کرتا ہے، پھر اس سے یعنی دین سے زمین وآسمان میں نور پھیلتا ہے، لہٰذا آخری جملہ میں اس کو" نور ا لسمٰوٰت و الارض" فرمایا۔

(۴) طبرانی نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مرفوعاً روایت کیا کہ اللہ تعالیٰ دعا میں الحاح یعنی اصرار کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔(۲)

معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کو دعا پسند ہے، پھر دعا میں اصرار وتکرار بھی پسند ہے کہ مسلسل اور لگاتار کرتا رہے۔

دعا کی تاکید

پھر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اور خود اللہ تعالیٰ نے دعا کی تاکید فرمائی ہے۔ چناں چہ قرآن میں فرمایا گیا:

---

(۱) الحاکم:۱/۶۶۹،مسند الفردوس:۲/۲۲۳
(۲) فتح الباری:۱۱/۹۵

﴿اُدْعُوْنِیْ اَسْتَجِبْ لَکُمْ﴾ (المؤمن :آیت:۶۰)
(تم مجھ سے سوال کرو میں تمہاری دعا کو قبول کروں گا)

اس آیت میں دعا کا حکم اور اس کی تاکید بھی ہے اور دعا کے قبول کرنے کا وعدہ بھی کہ تم مجھ سے مانگو، پوچھو، سوال کرو، میں تمہاری دعائیں قبول کروں گا؛ مگر آج ہم اس عبادت سے اور اللہ کے وعدہ سے غافل ہوکر، دنیا بھر میں ٹھوکریں کھا رہے ہیں۔ اپنی حاجت وضرورت مخلوق کے سامنے رکھ کر، اس کے پورا ہونے کی تمنا کر رہے ہیں۔ مخلوق کے سامنے ہاتھ جوڑ رہے ہیں، کوئی دھتکار بھی دے تو اس کے سامنے عاجز ہو رہے ہیں؛ مگر ان کو خبر نہیں کہ ان سب کا خالق دعا کرنے پر خوش ہوتا اور دعا قبول کر کے نوازتا ہے، اے کاش! یہ در بدر بھٹکنے والے، اس کو جانتے تو یہ مصیبت ان پر نہ آتی۔

حدیث پاک میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«مَنْ لَّمْ یَسْأَلِ اللّٰهَ یَغْضَبْ عَلَیْهِ» (۱)
(کہ جو اللہ سے سوال نہیں کرتا، اللہ اس پر غصہ ہوتے ہیں)

ملا علی قاری رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

نا مانگنے پر خدا کا غصہ اس لیے ہوتا ہے کہ ترکِ دعا میں تکبر اور استغنا ہے اور یہ بات بندے کے لیے جائز نہیں۔ (۲)

غور فرمائیے کہ اس حدیث میں دعا کی کس قدر تاکید آئی ہے اور دعا نہ کرنے پر کتنی سخت وعید ہے۔ معلوم ہوا کہ دعا بڑی اہم چیز ہے، آج لوگ ایسے مہربان و رحمٰن

(۱) ابن ابی شیبہ :۴/۱۷۵، الادب المفرد:۱/۳۴۵، ترمذی:۳۲۹۵، ابن ماجہ:۳۸۱۷
(۲) مرقاۃ المفاتیح :۳/۴۰

کا در چھوڑ کر ان لوگوں سے امید وابستہ کیے ہوئے ہیں جو مانگنے سے ناراض ہوتے، کبھی دھتکار بھی دیتے ہیں، اور اللہ کی شان یہ ہے کہ وہ مانگنے سے خوش اور نہ مانگنے سے ناراض ہوتے ہیں۔

کسی عربی شاعر نے خوب کہا ہے:

اَللّٰہُ یَغْضَبُ اِنْ تَرَکْتَ سُوَالَہٗ ❁ وَبَنِیُ آدَمَ حِیْنَ یُسْئَلُ یَغْضَبُ

(اللہ غصہ ہوتا ہے اگر تو اس سے سوال نہ کرے اور بنی آدم اس وقت غصہ ہوتے ہیں جب ان سے سوال کیا جاتا ہے)

دعا کے ثمرات و برکات

دعا جس کی فضیلت وضرورت واہمیت اور اس کی ترغیب وتاکید ثابت ومعلوم ہے، ظاہری و باطنی دونوں قسم کے ثمرات وبرکات کا سبب وذریعہ ہے۔ ایک تو وہ خود عبادت ہے، جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا؛ بل کہ ایک حدیث میں دعا کو" **اشرف العبادۃ** "فرمایا گیا ہے۔

چناں چہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشادِ مبارک نقل فرمایا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا :

«اَشْرَفُ الْعِبَادَۃِ الدُّعَاءُ» (کہ اشرف العبادۃ دعا ہے) (۱)

دوسرے اس کی تاکید وترغیب بھی وارد ہوئی ہے، جیسا کہ گذرا، لہٰذا اس عظیم عبادت پر ظاہری وباطنی ثمرات کا مرتب ہونا طبعی سی بات ہے، میں یہاں اس کے چند ثمرات اور برکات کا ذکر کرنا مناسب سمجھتا ہوں۔

---

(۱) الادب المفرد للبخاری:۱/۳۷۶

دعا پر قبولیت کا وعدہ

دعا کے ظاہری ثمرات و برکات میں سے سب سے اہم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن میں اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حدیث پاک میں دعا کی قبولیت کا وعدہ اور بشارت سنائی ہے۔

چناں چہ قرآن پاک میں فرمایا گیا ہے:

﴿ اُجِيْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ ﴾ (البقرۃ: ۱۸۶)

(میں دعا کرنے والے کی دعا قبول کرتا ہوں، جب وہ مجھے پکارتا ہے)

اس آیت میں دعا کی قبولیت کا وعدہ فرمایا گیا ہے، جو کہ دعا کرنے والے کے لیے ایک عظیم بشارت ہے۔

ایک حدیث میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«اِنَّ اللّٰهَ حَيِيٌّ كَرِيْمٌ يَسْتَحْيِيْ اِذَا رَفَعَ الرَّجُلُ اِلَيْهِ يَدَيْهِ اَنْ يَّرُدَّهُمَا صِفْرًا خَائِبَتَيْنِ »(۱)

(تمہارا رب باحیا اور کریم ہے، جب بندہ اس کی طرف ہاتھ اٹھا کر دعا کرتا ہے تو اس کو خالی ہاتھ واپس کرنے سے حیا کرتا ہے)

قبولیتِ دعا کی مختلف صورتیں

مگر اس پر بہ ظاہر شبہ ہوتا ہے کہ ہم لوگ بہت سی دعائیں کرتے ہیں اور سب قبول نہیں ہوتیں؛ بل کہ بعض دعائیں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ عمر بھر قبول نہیں ہوتیں، پھر اس وعدہ اور بشارت کا کیا مطلب کہ جو دعا کرتا ہے اللہ اس کو قبول کرتا ہے؟

(۱) ترمذی و اللفظ لہ:۳۴۷۹، ابو داؤد:۱۲۷۳، ابن ماجہ:۳۸۵۵، احمد:۲۲۶۰۰

اس کا جواب یہ ہے کہ دعا کی قبولیت کی مختلف صورتیں ہیں، ایک یہ کہ جو مانگا وہ دے دیا جائے ، اور دوسری صورت یہ ہے کہ جو مانگا وہ نہ دیا جائے؛ بل کہ اس کے عوض کسی بُرائی کو دفع و دور کر دیا جائے ، مثلاً ایک شخص نے مال کے لئے دعا کی اس کو مال نہیں دیا گیا، البتہ اس پر آنے والی ایک مصیبت کو دور کر دیا یا بیماری کو دور کر دیا گیا، کیوں کہ اگر اس کو مال مل جاتا اور وہ بیماری بھی آتی (جیسا کہ مقدر تھا) تو وہ مال بھی بیماری میں صرف ہو جاتا ، تو مال مل کر بھی اس کا فائدہ نہ ہوتا، ایک حدیث میں اس مضمون کو بیان کیا گیا ہے۔

چناں چہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«مَا عَلَى الْاَرْضِ مُسْلِمٌ يَدْعُوْ اللّٰهَ بِدَعْوَةٍ اِلَّا اٰتَاهُ اللّٰهُ اِيَّاهُ اَوْ صَرَفَ عَنْهُ السُّوْءَ مِثْلَهَا مَا لَمْ يَدْعُ بِاِثْمٍ اَوْ قَطِيْعَةِ رَحْمٍ الخ» (۱)

(کوئی شخص اللہ سے کوئی دعا نہیں کرتا؛ مگر اللہ اس کو یا تو وہی چیز عطا فرماتے ہیں جو اس نے مانگا ہے یا اس سے اس کے برابر کوئی برائی ہٹا دیتے ہیں، بشرطے کہ وہ گناہ کی یا قطع رحمی کی دعا نہ کرے)

اس حدیث کی شرح میں علامہ عبد الرؤف المناوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ہر دعا قبول کی جاتی ہے؛ لیکن قبولیت مختلف طور پر ہوتی ہے، کبھی تو عین وہ چیز عطا کر دی جاتی ہے جو مانگا اور کبھی اس کے عوض کوئی اور چیز دی جاتی ہے، جو اس کی مصلحت اور حال کا تقاضا ہوتا ہے، لہٰذا اس حدیث سے اشارہ فرمایا ہے کہ بندہ پر اللہ کی رحمت یہ بھی ہے کہ جب وہ دنیوی کام کے لیے دعا کرتا ہے تو اس کو قبول نہ کر کے اس کے عوض اس سے بہتر چیز دی جاتی ہے، مثلاً برائی دور کر دی جاتی ہے یا یہ دعا آخرت میں

---

(۱) ترمذی:۳۴۹۷ وقال حدیث حسن صحیح ، احمد:۲۰۷۲۱

ذخیرہ بنادی جاتی ہے یا اس کے گناہ کی مغفرت ہو جاتی ہے۔ (۱)

اور حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''کوئی مسلمان دعا کرتا ہے تو اللہ تعالے اس کو تین باتوں میں سے ایک عطا فرماتے ہیں، یا تو اس کو وہ چیز دنیا ہی میں دے دیتے ہیں یا اس کو آخرت میں اس کے لیے ذخیرہ بنا دیتے ہیں یا اس سے کوئی برائی دور کر دیتے ہیں''۔ (۲)

اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ دعا کی قبولیت کبھی اس طرح ہوتی ہے کہ وہ دعا اللہ کی جانب سے آخرت کے لیے ذخیرہ بنادی جاتی ہے یا اس سے کوئی برائی دور کر دی جاتی ہے یا اس کے گناہ بخش دیئے جاتے ہیں، غرض مختلف طریقوں سے دعا قبول کی جاتی ہے، لہذا شبہ کا کوئی موقعہ نہیں۔

ایک حدیث سے وضاحت

اس کی وضاحت ایک اور حدیثِ پاک سے ہوتی ہے جس کو امام حاکم نے روایت کیا ہے۔ حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

''قیامت کے روز اللہ تعالیٰ مؤمن بندے کو بلائیں گے حتی کہ اپنے سامنے کھڑا کریں گے اور اس سے فرمائیں گے، کہ اے میرے بندے! میں نے تجھے مجھ سے دعا مانگنے کا حکم دیا تھا اور وعدہ کیا تھا کہ میں تیری

(۱) فیض القدیر: ۵/۴۶۷

(۲) احمد:۱۰۷۰۹، شعب الایمان:۲/۴۸

دعا قبول کروں گا تو کیا تو نے مجھ سے دعا کی تھی؟ وہ بندہ عرض کرے گا کہ ہاں: اے میرے پروردگار! اللہ تعالیٰ فرمائیں گے کہ تو نے جب بھی مجھ سے مانگا میں نے تیری سنی ہے، کیا تو نے فلاں دن اس غم کے لیے دعا نہیں کی تھی، جو تجھے پیش آیا تھا کہ میں تیرا غم دور کردوں؟ وہ عرض کرے گا کہ ہاں اے میرے رب! اللہ تعالیٰ فرمائیں گے کہ یہ میں نے دنیا میں ہی تجھ کو دے دیا ہے اور تو نے فلاں دن دعا کی تھی کہ تیرا غم دور کردوں؛ مگر تیرا وہ غم دور نہیں ہوا تھا، وہ عرض کرے گا کہ ہاں اے رب! اللہ تعالیٰ فرمائیں گے کہ یہ میں نے تیرے لیے جنت میں محفوظ کردیا ہے، پھر اسی طرح اللہ تعالیٰ اس کی تمام دعاؤں کے بارے میں اس کو بتاتے جائیں گے کہ یہ دعا تجھ کو دنیا میں دے دی گئی اور فلاں دعا آخرت کے لیے ذخیرہ بنا کر رکھی گئی ہے۔ حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اس وقت بندہ کہے گا کہ اے کاش! میری کوئی دعا بھی دنیا میں قبول نہ کی جاتی!۔(۱)

اس حدیث نے اس بات کو صاف کردیا کہ بندے کی دعائیں ہر صورت میں قبول ہوتی ہیں، البتہ اس کی صورتیں مختلف ہوتی ہیں اور ان میں سے ایک صورت یہ ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کی دعاؤں کو آخرت کے لیے ذخیرہ بنا دیتے ہیں۔

ایک مثال سے وضاحت

اس کو ایک مثال سے سمجھا جاسکتا ہے۔ وہ یہ کہ مثلاً ایک بچہ باپ سے ایک ایسی چیز مانگتا ہے جو اس کے لیے مضر و نقصان دہ ہے، تو باپ اس کو وہ چیز نہیں دیتا؛ بل کہ

(۱) رواہ الحاکم، کذا فی الترغیب:۲/۴۷۹

اس کے عوض اس کو اس سے بہتر اور اس کے حق میں مفید و نفع بخش چیز دیتا ہے۔ اس پر یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ باپ نے بچہ کی مانگ پوری نہیں کی، کیوں کہ بچہ نے جو مانگا تھا باپ نے اس سے بہتر چیز دے دی۔ اسی طرح اگر فوراً تو وہ کچھ نہ دے؛ لیکن بعد میں کوئی چیز دے تو وہ بھی اس مانگنے کے نتیجہ میں ہے، لہٰذا کہا جائے گا کہ باپ نے بچہ کی مانگ پوری کر دی۔ غرض یہ کہ اسی طرح اللہ تعالیٰ کبھی وہ چیز نہیں دیتے جو مانگی گئی؛ مگر اس سے بہتر چیز عطا فرما دیتے ہیں، لہٰذا شبہ نہ ہونا چاہئے۔

دعا مصائب سے حفاظت کا ذریعہ

دعا کا ایک ظاہری ثمرہ اور اس کی برکت یہ ہے کہ دعا سے مصائب اور بلائیں ٹلتی اور دور ہوتی ہیں، خواہ وہ نازل ہو چکی ہوں یا آئندہ نازل ہونے والی ہوں، چناں چہ حدیث میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«اِنَّ الدُّعَاءَ يَنْفَعُ مِمَّا نَزَلَ وَ مِمَّا لَمْ يَنْزِلْ، فَعَلَيْكُمْ عِبَادَ اللّٰهِ بِالدُّعَاءِ»

(یعنی دعا ان مصائب و پریشانیوں کے لیے بھی نفع دیتی ہے جو نازل ہو چکی ہیں اور ان مصائب کے لیے بھی جو نازل نہیں ہوئیں، لہٰذا اے اللہ کے بندو! تم پر دعا لازم ہے)(۱)

علامہ نواب قطب الدین دہلوی رحمۃ اللہ شرح مشکوٰۃ میں فرماتے ہیں:

''جو چیز (بلاء) پیش آ چکی ہے اس کے لیے دعا کے نافع ہونے کا مطلب یہ ہے کہ جو مصیبت و بلا نازل ہو چکی ہے، اگر وہ معلّق ہے تو دعا کرنے سے دفع ہو جاتی ہے اور انسان سکون و اطمینان پا لیتا ہے اور اگر

(۱) ترمذی: ۳۴۷۱

وہ مبرم ہوتی ہے تو بھی دعا کا نفع ظاہر ہوتا ہے بہ ایں طور کہ اللہ تعالیٰ اسے صبر کی طاقت عطا فرما دیتا ہے جس کے نتیجے میں نہ صرف یہ کہ اس مصیبت و بلا کا تحمل آسان ہو جاتا ہے اور وہ اس پر راضی بھی ہو جاتا ہے؛ بل کہ وہ یہ نہیں چاہتا کہ وہ مصیبت و بلا میں مبتلا نہ ہو، کیوں کہ صبر کی دولت حاصل ہو جانے کے بعد اس کا جذبۂ اطاعت اتنا قوی ہو جاتا ہے جیسا کہ خالص دنیا دار لوگ نعمتوں اور راحتوں میں لذت و کیف پاتے ہیں اور جو چیز پیش نہیں آئی اس کے لیے دعا بہ ایں طور نافع ہوتی ہے کہ اس کو نازل ہونے سے روک دیتی ہے بشرطے کہ اس کا تعلق بھی تقدیر سے ہو۔(۱)

دعا سے تقدیر بدل جاتی ہے

دعا کے فوائد و ثمرات میں سے ایک یہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«لَایَرُدُّ الْقَضَاءَ اِلَّا الدُّعَاءُ وَ لَایَزِیْدُ فِی الْعُمُرِ اِلَّا الْبِرُّ»

(یعنی دعا کے سوا کوئی چیز تقدیر کو روک نہیں سکتی اور سوائے نیکی کے کوئی چیز عمر میں زیادتی نہیں کر سکتی۔(۲)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ دعا ایسی چیز ہے جو تقدیر کو بھی بدل سکتی ہے؛ مگر یہاں یاد رکھنا چاہئے کہ تقدیر دو قسم پر ہے، ایک تقدیرِ مُبرم ایک تقدیرِ معلّق، تقدیر مبرم تو اللہ تعالیٰ کا وہ اٹل اور آخری و حتمی فیصلہ ہوتا ہے جس میں کوئی رد و بدل ممکن نہیں اور تقدیر معلق یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی فیصلہ کو کسی بات پر معلق رکھیں کہ اگر ایسا ہو تو یہ فیصلہ اور اگر

(۱) مظاہر حق جدید:۳/۸۸

(۲) ترمذی:۲۰۲۵، مشکوٰۃ:۱۹۵

ایسا نہ ہوتو دوسرا فیصلہ، تو اس تقدیر معلق میں حتمی فیصلہ نہیں ہوتا؛ بل کہ فیصلہ ایک بات پر موقوف ہوتا ہے، یہاں حدیث میں تقدیر کے بدل جانے کا یہی معنیٰ ہے کہ جو تقدیر دعا پر معلق و موقوف ہوتی ہے وہ بدل جاتی ہے، مثلاً کسی کے حق میں اللہ تعالیٰ نے یہ فیصلہ فرمایا کہ اگر اس بندہ نے دعا نہ کی تو اس پر بیماری و مصیبت آئے گی تو اگر یہ بندہ دعا کرے گا تو یہ تقدیر بدل جائے گی اور مصیبت نہ آئے گی، ہاں اللہ کے علم میں یہ بھی ہوتا ہے کہ بندہ دعا کرے گا یا نہیں یہ الگ بات ہے، غرض یہ کہ تقدیر معلق دعا سے بدل جاتی ہے لہٰذا یہ بھی بہت بڑا نفع اور ثمرہ ہے جو دعا سے حاصل ہوتا ہے۔

دعا کے روحانی ثمرات

دعا کے ظاہری ثمرات میں سے کچھ عرض کیے گئے، اب اس کے باطنی اور روحانی ثمرات و برکات پر بھی نظر ڈالیے۔

دعا کی حقیقت جو اوپر عرض کی گئی، اس سے معلوم ہوا کہ دعا دراصل اللہ کے سامنے بندہ کی عاجزی وانکساری اور تذلل و تعبّد کا نام ہے، لہٰذا جب بندہ اس نیت سے دعا کرے تو اس کے اندر یہ اوصاف پیدا اور ظاہر ہوتے ہیں اور وہ اسی عاجزی وانکساری کے ذریعہ اللہ کا قرب و وصال پا لیتا ہے، کیوں کہ سب سے بڑی چیز جو وصال و قرب میں مانع بنتی ہے وہ یہی بڑائی اور تکبر ہے جس کے نتیجہ میں شیطان راندۂ درگاہ ہوا، اور جب وہ بڑائی وتکبر نکل کر عاجزی وانکساری پیدا ہو گئی، تو اب قرب و وصول الی اللہ کی راہ میں کوئی مانع نہیں، لہٰذا قرب و وصول کی دولت پا لے گا، نیز اس کی وجہ سے جو تعلق مع اللہ نصیب ہو گا تو وہ قلب کو قوت دے گا جس سے سکون و راحت میسر آئے گی اور ہزاروں ظاہری تکالیف و مصائب اور پریشانیاں ہوں؛ مگر وہ اس سے پریشان نہ ہو گا۔

نیز ایک برکت دعا کی یہ ہے کہ دعا مؤمن کا ہتھیار ہے جس سے شیطان لرزتا اور کانپتا ہے، کیوں کہ دعا کا ہتھیار اس کے وسوسوں کو تباہ و برباد کر کے رکھ دیتا ہے چناں چہ بعض دعاوں سے متعلق حدیث میں آیا ہے کہ وہ شیطان سے حفاظت و پناہ کا ذریعہ ہیں۔(۱)

الغرض دعا بے شمار روحانی و ظاہری ثمرات و برکات کی ضامن و حامل ہوتی ہے لہٰذا اس کا خوب خوب اہتمام کرنا چاہئے۔

اپنی تمام حاجات، اللہ ہی سے مانگو

اور اپنی تمام حاجات وضروریات صرف اور صرف اللہ سے مانگنا چاہئے، حدیث میں حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

« لِيَسْأَلْ اَحَدُكُمْ رَبَّهُ حَاجَتَهُ كُلَّهَا حَتّٰى يَسْأَلَهُ الْمِلْحَ وَحَتّٰى يَسْأَلَهُ شِسْعَ نَعْلِهِ اِذَا انْقَطَعَ »(۲)

(تم میں سے ہر شخص کو چاہئے کہ وہ اپنی تمام حاجتیں اپنے پروردگار سے مانگے یہاں تک کہ نمک بھی اسی سے مانگے اور اگر جوتے کا تسمہ ٹوٹ جائے تو بھی اسی سے مانگے)

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ بندہ کو اپنی تمام حاجات وضروریات میں اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرنا چاہئے، خواہ وہ چھوٹی سے چھوٹی حاجت وضرورت ہی کیوں نہ ہو، جیسے نمک کی حاجت ہو یا جوتے کا تسمہ ٹوٹ جائے تب بھی اللہ تعالیٰ ہی سے مانگنا چاہیے۔

---

(۱) مشکوۃ:۲۰۱

(۲) ترمذی:۳۵۳۷، مشکوۃ:۱۹۶

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دو دعائیں

حضرت ابوعلی دقّاق رحمہ اللہ نے فرمایا کہ اپنی ہر چھوٹی بڑی حاجت وضرورت کو صرف اللہ کے سامنے پیش کرنا معرفت کی نشانیوں میں سے ہے، حضرت ابوعلی دقاق رحمہ اللہ نے اس جگہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی بڑی عمدہ مثال بیان فرمائی ہے، وہ یہ کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ایک دفعہ ایک بہت بڑی چیز کا اللہ تعالیٰ سے سوال کیا، وہ یہ کہ انہوں نے اللہ سے عرض کیا ﴿ رَبِّ اَرِنِیْ اَنْظُرْ اِلَیْکَ ﴾ (اے اللہ! مجھے اپنا دیدار کرادیجئے کہ میں آپ کو دیکھوں) یہ بہت بڑا اور عظیم سوال تھا کہ اللہ کا دیدار ہو جائے، اس لیے کہ اس سے بڑی کوئی نعمت نہیں کہ کسی کو اللہ تعالیٰ کا دیدار نصیب ہو جائے، جیسا کہ حدیث میں ہے کہ جنت میں جب جنتیوں کو اللہ تعالیٰ کا دیدار ہوگا تو جنتیوں کو جنت کی ساری چیزیں اس کے سامنے حقیر نظر آئیں گی اور اللہ کے دیدار کی لذت ساری لذتوں پر بھاری ہوگی۔ غرض حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ایک طرف اللہ سے اتنی بڑی چیز کا سوال کیا اور دوسری طرف ایک اور موقعہ پر دنیوی معمولی حقیر چیزوں کے لیے اللہ ہی کی طرف رجوع کیا اور اپنی محتاجی ظاہر فرمائی، چناں چہ عرض کیا ﴿ رَبِّ اِنِّیْ لِمَا اَنْزَلْتَ اِلَیَّ مِنْ خَیْرٍ فَقِیْرٌ ﴾ (القصص ۲۴) (اے میرے رب! میں ان چیزوں کا محتاج ہوں جو آپ میری طرف (کھانا وغیرہ) نازل فرمائیں)

معلوم ہوا کہ ہر چھوٹی یا بڑی حاجت اللہ تعالیٰ سے مانگنا چاہئے اور ہر حال میں اللہ ہی کی طرف رجوع کرنا چاہئے، اس لیے کہ در تو صرف اسی کا ہے، اس کے در کے سوا کسی کا کوئی در نہیں جہاں ہماری حاجات پوری ہوتی ہوں، اسی کا ہم کو مکلّف بنایا گیا ہے۔

حضرت موسیٰ عَلَیْہِ السَّلَام کا ایک واقعہ

اور یہ وہ ادا ہے بندے کی جس پر اللہ تعالے کی طرف سے عنایتیں ہوتی ہیں، حضرت سیدنا موسیٰ عَلَیْہِ السَّلَام کا ایک واقعہ مولانا رومی رَحِمَہُ اللّٰہ نے لکھا ہے کہ آپ پر اللہ کی وحی آئی کہ اے موسیٰ! ہم نے تم کو اپنا مقرب بنالیا ہے اور تم کو اپنے لیے چن لیا ہے، حضرت موسیٰ عَلَیْہِ السَّلَام نے عرض کیا کہ اے پروردگار! وہ کیا خصلت ہے جس کی بنا پر آپ اپنے بندوں کو اپنا برگزیدہ و مقرب بنا لیتے ہیں؟

اللہ تعالے کی جانب سے اس کا جواب ارشاد ہوا:

گفت چو طفلے بہ پیش والدہ وقتِ قہرش دست ہم بروے زدہ

یعنی مجھے اپنے بندے کی یہ بات اور ادا بہت پسند ہے کہ وہ مجھ سے وہ معاملہ کرے جو ایک چھوٹا بچہ اپنی ماں کے ساتھ اس وقت کرتا ہے جب اس کی ماں اس پر غصہ ہوتی ہے۔

اس وقت بچہ اپنی ماں کے ساتھ کیا معاملہ کرتا ہے؟ اس کو سنئے:

مادرش گر سیلئے بروے زند ہم بمادر درآید و بروے تند

فرمایا کہ جب ماں بچہ کو طمانچہ مارتی ہے تو وہ ماں ہی کی طرف دوڑتا ہے اور اسی سے لپٹ کر چلاتا ہے۔

از کسے یاری نخواہد غیرِ او او ست جملہ شرّ او و خیر او

یعنی یہ بچہ اپنی ماں کے سوا کسی سے مدد بھی نہیں چاہتا اور اپنی ماں ہی کو تمام خیر و شر کا سرچشمہ خیال کرتا ہے، اللہ تعالے نے فرمایا کہ اے موسیٰ! یہ ہے وہ ادا جس کی وجہ سے میں بندے پر عنایت کرتا ہوں، اس سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالے کو بندے کی یہ ادا پسند ہے کہ وہ صرف اسی کو پکارے اور ہر وقت اسی سے لو لگائے۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا ایک عجیب واقعہ

اس سلسلہ میں حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا ایک عجیب واقعہ بھی سن لیجئے، آپ کے دورِ خلافت میں سنہ اٹھارہ ہجری میں پورے جزیرۂ عرب میں بڑا سخت قحط پڑا، جس کی وجہ سے لوگ مرنے لگے، حتیٰ کہ جانوروں کے جسم میں خون تک خشک ہو گیا، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو اطلاع ملی کہ مصر میں اناج وغلہ کی پیداوار خوب ہو رہی ہے، آپ نے وہاں کے گورنر حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کو خط لکھا کہ یہاں حجاز میں غلہ کی کمی ہے اور مصر میں اس کی فراوانی ہے اس لیے تم یہاں والوں کے لیے غلہ روانہ کرو، حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ نے جواب میں لکھا کہ

"آپ مطمئن رہیں، میں اونٹوں پر لدوا کر اتنا غلہ بھجواؤں گا کہ اگر پہلا اونٹ مدینہ میں ہوگا تو آخری اونٹ مصر میں ہوگا۔"

غرض یہ کہ غلہ آیا اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس کو تقسیم کر دینے کا حکم فرمایا اور لوگ آ کر غلہ لے جا رہے تھے، ایک صحابی حضرت بلال بن الحارث رضی اللہ عنہ جو جنگل میں رہتے تھے، انہوں نے جب غلہ کے بارے میں سنا تو چاہا کہ وہ بھی آ کر غلہ لے جائیں، ان کے پاس ایک بکری تھی، اس کو ذبح کیا کہ کچھ کھا پی کر چلیں؛ مگر اس بکری میں خون کا ایک قطرہ تک نہ نکلا، یہ دیکھ کر وہ صحابی رو پڑے اور اسی حالت میں ان کو نیند آ گئی اور سو گئے، خواب میں دیکھا کہ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم آئے ہیں اور فرماتے ہیں:

《ابشر بالحیاۃ ، اِئت عمر، فاقرئه منی السلام و قل له انی عهدتک و انت وفی العهد شدید العقد ، فالکیس الکیس یا عمر》

(حیات کی خوش خبری سنو، اور عمر کے پاس جا کر میرا سلام کہو اور ان سے کہو کہ میں نے تم سے ایک عہد لیا تھا، اور تم وعدہ کے پورا کرنے میں سخت اور پکے ہو، پس عقل سے کام لو، عقل سے کام لو۔)

حضرت بلال بن الحارث رضی اللہ عنہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دروازہ پر حاضر ہوئے اور ان کے خادم سے فرمایا کہ حضرت عمر سے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قاصد کے لیے اجازت لو، حضرت عمر یہ سن کر خود باہر تشریف لائے، انہوں نے ساری بات آپ کو بتائی، حضرت عمر گھبرا گئے، اور باہر نکل کر لوگوں کو جمع کیا اور منبر پر کھڑے ہوئے اور فرمایا کہ میں تم کو اللہ کی قسم دے کر پوچھتا ہوں کہ کیا میرے طرز عمل میں آپ حضرات کوئی بات بُری اور مکروہ دیکھتے ہیں؟ لوگوں نے کہا کہ نہیں، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے صورتِ حال بیان کی تو بعض صحابہ نے کہا کہ آپ کی غلطی یہ ہے کہ آپ نے قحط سالی کے اس موقعہ پر اللہ سے مانگنے کے بہ جائے، اپنے گورنر سے غلہ طلب کیا، اور اللہ سے استسقا (پانی طلب) نہیں کیا، یہ بات آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو پسند نہیں آئی، اور اس پر آپ کو تنبیہ کی گئی ہے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ ہاں، یہی بات ہے، پھر آپ نے نمازِ استسقا پڑھی اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا حضرت عباس رضی اللہ عنہ کا واسطہ دے کر اللہ سے دعا فرمائی، اتنے میں لوگوں نے دیکھا کہ بادل منڈلا رہا ہے، پھر بارش ہونے لگی۔(۱)

اللہ ہی حاجت روا و مشکل کُشا

اس واقعہ سے معلوم ہوا کہ اللہ ہی کی طرف ہر معاملہ میں رجوع کرنا چاہئے کیوں کہ اللہ ہی حاجت روا و مشکل کشا ہے، کوئی نبی و ولی، کوئی پیر و فقیر، کوئی مولوی

(۱) الکامل لابن الاثیر:۲/۳۸۳، تاریخ الطبری:۴/۲۶۳، البدایة و النهایة:۷/۷۴

وعالم، کوئی شیخ وصوفی، نہ کسی کی بگڑی بنا سکتا ہے نہ کسی کی حاجت روائی کر سکتا ہے اور نہ دست گیری کر سکتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کی حمد میں میرے اشعار ہیں:

ہیں غوث وقطب سب غلام اس خدا کے	نبی یا ولی ہوں، اسی سے ہیں لیتے
جسے چاہے دیدے، جسے چاہے نہ دے	بنادے وہ جس کا بنے گا مقدر
ھو اللّٰہ اکبر ، ھو اللّٰہ اکبر	ھو اللّٰہ اکبر ھو اللّٰہ اکبر
اسی کے ہے ہاتھوں میں حاجت روائی	اسی کے ہے بس میں یہ مشکل کشائی
اسی کو ہے حاصل یہ شانِ عطائی	ہوا ہے نہ ہوگا، کوئی اس کا ہمسر
ھو اللّٰہ اکبر ، ھو اللّٰہ اکبر	ھو اللّٰہ اکبر ھو اللّٰہ اکبر

غرض یہ کہ وہی حاجت روا و مشکل کشا ہے، لہٰذا صرف اور صرف اللہ سے مانگو، ایک لمبی حدیث میں آیا ہے کہ حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

«يَا عِبَادِيْ ! كُلُّكُمْ ضَالٌّ اِلَّا مَنْ هَدَيْتُهٗ فَاسْتَهْدُوْنِيْ اَهْدِكُمْ ، يَا عِبَادِيْ! كُلُّكُمْ جَائِعٌ اِلَّا مَنْ اَطْعَمْتُهٗ فَاسْتَطْعِمُوْنِيْ اُطْعِمْكُمْ يَا عِبَادِيْ ! كُلُّكُمْ عَارٍ اِلَّا مَنْ كَسَوْتُهٗ فَاسْتَكْسَوْنِيْ اَكْسُكُمْ الخ»

(یعنی: اے میرے بندو! تم سب گمراہ ہو، سوائے اس کے جس کو میں ھدایت سے نوازوں، پس تم مجھ ہی سے ھدایت مانگو، میں تم کو ھدایت دوں گا۔ اے میرے بندو! تم سب بھوکے ہو، سوائے اس کے جس کو میں کھانا دوں، لہٰذا تم مجھ ہی سے کھانا طلب کرو، میں تم کو کھانا

دوں گا۔ اے میرے بندو! تم سب ننگے ہو سوائے اس کے جس کو میں
کپڑا پہناؤں، پس تم مجھ ہی سے کپڑے طلب کرو، میں تم کو کپڑے
دوں گا۔ الخ)(۱)

معلوم ہوا کہ سب کچھ اللہ ہی سے مانگنا چاہئے اور اللہ تعالیٰ سے مانگنے کے لیے درمیان میں کسی وسیلہ و واسطہ کی حاجت نہیں کہ پیر و فقیر، شیخ و استاذ، نبی یا ولی کو واسطہ بنایا جائے۔ بعض لوگ اللہ تعالیٰ کو دنیوی بادشاہوں پر قیاس کرتے ہیں کہ دیکھو کسی بادشاہ سے ہم خود بات نہیں کر سکتے؛ بل کہ اپنی ضرورت پیش کرنے کے لیے وزیر یا کسی اور کا درمیان میں واسطہ بننا ضروری ہوتا ہے، اسی طرح اللہ تعالیٰ سے بھی ہم خود اپنی ضرورت کا سوال نہیں کر سکتے، لہٰذا کسی اور کے واسطے سے مانگنا چاہئے؛ مگر یہ قیاس صحیح نہیں، کیوں کہ وزیر وغیرہ کا واسطہ اس لیے بنایا جاتا ہے کہ بادشاہ بھی ہم جیسا ایک انسان ہے، جو سب کی بات سن کر سب کے کام نہیں بنا سکتا، لہٰذا بادشاہ لوگ اپنی احتیاج کی بنا پر واسطہ مقرر کر کے ان سے کام لیتے ہیں؛ لیکن اللہ کی ذات کسی کی محتاج نہیں، لہٰذا اس کو سنانے اور اپنی حاجت پیش کرنے کے لیے کسی کو واسطہ بنانے کی بھی ضرورت نہیں، تمام انسان بیک وقت اپنی اپنی بولیوں میں اللہ کو پکاریں اور اپنی ضروریات و حاجات پیش کریں، تو وہ سب کی یکساں طور پر سنتا ہے۔

چناں چہ ایک حدیث قدسی جس کا ابھی اوپر ذکر کیا گیا، اس میں آگے اس طرف اشارہ ہے، چناں چہ حضرت نبی کریم صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نے فرمایا:

”اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اے میرے بندو! اگر تمہارے اگلے
وپچھلے اور تم میں سے انسان و جنات، سب ایک میدان میں کھڑے

---

(۱) مسلم:۴۶۷۴

ہو کر مجھ سے مانگیں اور میں تم سب کی حاجات پوری کر دوں، تب بھی میرے خزانہ میں کچھ کمی نہ ہوگی؛ مگر جیسے کہ سمندر میں سوئی ڈالنے سے سوئی کی بقدر پانی کم ہو جاتا ہے''۔(۱)

ایسے قادر وقاہر بادشاہ کو دنیوی بادشاہوں پر قیاس کرنا کیسے صحیح ہو سکتا ہے؟ غرض یہ کہ اللہ تعالیٰ سے اپنی حاجات وضروریات میں دعا مانگنے کا اہتمام کرنا چاہیے خواہ وہ ضروریات حقیر وصغیر ہوں یا عظیم وکبیر ہوں اور اس کی حقیقت کو بھی پیش نظر رکھتے ہوئے دعا کا التزام کرنا چاہیے۔

ہمارا ہاتھ سرکاری پیالہ ہے

یہاں ایک بات یہ بھی سمجھ لینا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ نے مانگنے کے لیے ہمیں ہاتھ عطا فرمائے ہیں، جیسے بھیک مانگنے والوں کا پیالہ ہوتا ہے، جس کو وہ لوگوں کے سامنے پیش کر کے اس میں بھیک لیتے ہیں، اللہ تعالیٰ نے ہمیں یہ سرکاری پیالہ دیا ہے کہ ہم اس بھیک کے پیالہ کو صرف اللہ کے سامنے پیش کر کے اس سے بھیک لیا کریں اور اس میں تعلیم ہے کہ یہ سرکاری پیالہ کسی اور کے سامنے نہ لے جاؤ، کیوں کہ سرکاری چیز کو سرکاری کاموں میں اور سرکاری اجازت سے استعمال کیا جاتا ہے، اس کے خلاف اس کا استعمال اس کی ناقدری بھی ہے اور قانون شکنی بھی۔ اسی طرح یہ ہاتھ صرف اس کے سامنے پھیلائے جائیں جو ہمارا خالق و مالک، رازق و وکیل ہے، جو رب العالمین ہے، جو آقا بھی ہے، جو داتا بھی ہے، لہٰذا تمام حاجات وضروریات میں اسی کے سامنے ہاتھ پھیلاؤ اور تمام مشکلات ومصائب میں اسی کی طرف رجوع کرو، اگر اس پیالہ کو ہم نے مخلوق کے سامنے بھی پھیلایا تو خدا کی قسم ہم نے اس کی

(۱) مسلم:۴۶۷۴

توہین اور ناقدری کی جس پر عنایت کے بہ جائے عتاب ہونا چاہئے۔

اللہ سے دین و دنیا دونوں مانگو

یہیں سے یہ بھی سمجھ لینا چاہئے کہ اللہ تعالیٰ سے دنیا بھی مانگنا چاہئے اور دین بھی مانگنا چاہئے؛ اس لیے کہ وہ اللہ ہر چیز کے دینے پر قادر ہے، بعض لوگ دعا میں یہ غلطی کرتے ہیں کہ صرف دنیا مانگتے ہیں، دین نہیں مانگتے، قرآنِ کریم میں دعا مانگنے والوں کی دو قسمیں بیان کی گئی ہیں۔ ایک ان لوگوں کی جو اللہ تعالیٰ سے صرف دنیا مانگتے ہیں، دوسرے ان لوگوں کی جو دین و دنیا دونوں مانگتے ہیں۔

چناں چہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ رَبَّنَا آتِنَا فِي الدُّنْيَا وَمَا لَهٗ فِي الْآخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ وَ مِنْهُمْ مَّنْ يَّقُوْلُ رَبَّنَا آتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّ فِي الْآخِرَةِ حَسَنَةً وَّ قِنَا عَذَابَ النَّارِ أُولٰٓئِكَ لَهُمْ نَصِيْبٌ مِّمَّا كَسَبُوْا وَاللّٰهُ سَرِيْعُ الْحِسَابِ﴾ (البقرۃ: ۲۰۰ تا ۲۰۲)

(اور لوگوں میں سے بعض لوگ وہ ہیں جو کہتے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار! ہم کو دنیا میں دیدیجئے، ان لوگوں کا آخرت میں کوئی حصہ نہیں۔ اور بعض لوگ وہ ہیں جو کہتے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار! ہم کو دنیا میں بھی بھلائی دیجئے، اور آخرت میں بھی بھلائی دیجئے اور ہم کو دوزخ کے عذاب سے بچالیجئے، یہی وہ لوگ ہیں جن کے لیے حصہ ہے ان کی کمائی کا، اور اللہ تعالیٰ بہت جلد حساب لینے والے ہیں)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ بعض لوگ حج کے موقعہ پر اللہ سے صرف دنیا مانگتے تھے، ان کے بارے میں پہلی آیت آئی ہے اور ان کے بارے میں کہا گیا

کہ آخرت میں ان کے لیے کوئی حصہ نہیں اور مومن لوگ اللہ سے دین و دنیا دونوں مانگتے تھے ان کے بارے میں دوسری آیت نازل ہوئی۔(۱)

اس سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ سے جہاں دنیا مانگیں، وہاں دین بھی مانگیں صرف دنیا پر اکتفا کرنا، اہلِ کفر کا کام ہے۔

ایک عمدہ مثال

البتہ اگر صرف دین مانگنے پر اکتفا کیا جائے تو مضائقہ نہیں، کیوں کہ دین مانگنے والے کو بہ قدرِ ضرورت دنیا بھی دے دی جاتی ہے، حضرت مولانا حفظ الکبیر صاحب رحمہ اللہ مبلغ مفتاح العلوم جلال آباد اس بات کو ایک عمدہ مثال میں بیان فرماتے تھے، وہ کہتے تھے کہ اگر کوئی شخص کسی سے گلاس مانگے تو صرف گلاس اس کو پیش کیا جائے گا، گلاس میں کوئی مشروب نہیں پیش کیا جائے گا، اور اگر وہ دودھ یا پانی طلب کرے گا تو دودھ یا پانی کے ساتھ ساتھ خود گلاس بھی پیش کیا جائے گا، میں کہتا ہوں کہ اس کی وجہ یہ ہے کہ گلاس اسباب و وسائل میں سے ہے اور مشروب مقاصد میں سے ہے، مقصد کے مانگنے پر ذرائع اور وسائل خود ہی آجاتے ہیں، اسی طرح دین مقصد ہے؛ بل کہ مقصدِ اعظم ہے اگر ہم اللہ سے دین مانگیں گے تو اس دین پر چلنے کے لیے جتنی ضرورت دنیا کے اسباب و وسائل اور ذرائع کی ہوگی وہ بغیر مانگے اللہ تعالیٰ عطا فرمادیں گے، غرض یہ کہ اللہ تعالیٰ سے دعا میں صرف دنیا مانگنا صحیح نہیں ہے؛ بل کہ دونوں ہی مانگنا چاہیے۔

حضرت مسیح الامت رحمہ اللہ کا ارشاد

یہاں ایک بات یاد آ گئی وہ یہ ہے کہ میرے استاذ و شیخ اول حضرت مسیح الامت

(۱) لباب النقول :۱/۴۰

جلال آبادی رَحمۃُ اللہ کی خدمت میں ایک دفعہ دوپہر کے وقت حاضر تھا، کہ ایک صاحب آئے اور عرض کیا کہ حضرت ایک تعویذ چاہیے حضرت والا رَحمۃُ اللہ نے فرمایا کہ میں تعویذ دیا نہیں کرتا تم بھائی جان (حضرت والا رَحمۃُ اللہ کے صاحب زادے مراد ہیں) کے پاس جا کر لے لو، وہ صاحب باہر گئے اور ایک دو منٹ کے بعد پھر آئے اور کہا کہ حضرت آپ ہی دے دیجیے حضرت نے وہی جواب دہرا دیا، تو وہ صاحب پھر باہر گئے اور دو چار منٹ کے بعد پھر اندر آئے اور عرض کیا کہ حضرت میں آپ سے تعویذ چاہتا ہوں آپ دے دیجیے اس پر حضرت نے فرمایا کہ بھائی میں نے ہی بھائی جان کو سکھایا ہے، تم ان ہی سے لے لو، یہ سن کر وہ تو باہر گئے اور حضرت والا رَحمۃُ اللہ نے مجھ سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ ہم تو سنار تھے لوگوں نے ہم کو لوہار سمجھ لیا ہے۔

میں کہتا ہوں کہ یہ جملہ بڑا معنی خیز اور جامع ہے، حضرت کا مطلب یہ تھا کہ ہم تو دنیا میں اس لیے آئے تھے کہ لوگوں کو اللہ کا راستہ بتائیں، اللہ کی معرفت ومحبت دین و آخرت کی باتیں بتائیں، مگر لوگ علما اور اولیاء اللہ سے بھی صرف دنیا کے مسائل کے لیے تعویذیں اور دعائیں لینے آتے ہیں، دین کے لیے اور اللہ کی محبت وعشق کے لیے ان کی خدمت میں کوئی نہیں آتا، الا ماشاء اللہ، جیسے سنار کے پاس کوئی لوہار کا کام لینے جائے اور سنار سے سونے کا کام نہ لے تو کتنی غلط بات ہے؟

غرض یہ کہ لوگ اللہ سے بھی دنیا مانگتے ہیں اور بزرگوں کے پاس بھی اسی لیے جاتے ہیں کہ ان کی تعویذوں اور دعاؤں سے ہماری دنیا بن جائے، یہ مزاج مؤمنانہ نہیں، اس لیے اس کی اصلاح کرنا چاہیے، اور دنیا کے ساتھ ساتھ اپنی آخرت کی فکر بھی کرنا چاہیے۔

دعا کو مقبول بنائیے

اب آیئے ذرا دعا کے شرائط و آداب پر بھی ایک نظر ڈالیں تا کہ دعا قبول ہو اور اس کی وہ برکتیں اور ثمرات جن کا اوپر ذکر کیا گیا، حاصل ہوں، کیوں کہ حدیث میں ہے کہ حضرت نبی کریم صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم اپنی دعاؤں میں یہ فرمایا کرتے تھے:

« اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُ بِکَ مِنْ دُعَاءٍ لَّا یُسْمَعُ »

(یعنی اے اللہ! میں تجھ سے پناہ چاہتا ہوں ایسی دعا سے جو قبول نہ کی جائے)(۱)

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ دعا کا مقبول نہ ہونا ایک ایسی بات ہے کہ آپ نے اس سے پناہ مانگی ہے اس لیے اس بات کی کوشش کرنا چاہئے کہ دعا اللہ کے دربار میں مقبول ہو اور اس کا طریقہ یہی ہے کہ دعا کے آداب و شرائط کا لحاظ کیا جائے ورنہ دعا کے قبول ہونے میں رکاوٹ پیدا ہو جاتی ہے اور لوگ یہ کہتے رہ جاتے ہیں کہ ہم تو دعا کرتے ہیں؛ مگر قبول نہیں ہوتی، یہ اس لیے ہوتا ہے کہ ہماری دعائیں ان شرائط کا لحاظ کیے بغیر ہوتی ہیں جن پر قبولیت موقوف ہے اور ان آداب کی رعایت سے خالی ہوتی ہیں، جن پر قبولیت کی امید غالب ہوتی ہے، اس لیے چند ضروری باتوں کو بلا ترتیب عرض کیا جاتا ہے۔

حرام سے پرہیز، شرطِ اعظم

سب سے پہلی اور بڑی شرط دعاؤں کی قبولیت کے لیے یہ ہے کہ حرام سے پرہیز کیا جائے، کھانا، پینا اور کپڑے اور تمام چیزیں حلال ہی حلال ہوں، اگر کوئی

(۱) ترمذی: ۳۴۰۴، نسائی: ۵۳۴۷، احمد: ۶۲۷۰

حرام چیز کھا کر، حرام چیز پی کر، حرام لباس پہن کر، اللہ تعالیٰ سے دعا کرے گا تو قبولیت کی امید نہیں ہے۔

چناں چہ حدیث میں آیا ہے کہ حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

ایک شخص جو لمبا سفر کرتا ہوا (کسی مقدس مقام پر ایسی حالت میں جاتا ہے) کہ اس کے بال بکھرے ہوئے ہیں اور وہ گرد آلود ہے اور وہ آسمان کی طرف ہاتھ اُٹھا کر دعا کرتا ہے، **یَا رَبِّ یَا رَبِّ**، حالاں کہ اس کا کھانا حرام ہے، اس کا پینا حرام ہے اور اس کے کپڑے حرام ہیں، اور وہ حرام غذا سے سیراب ہوا ہے، تو اس کی دعا کہاں قبول ہوگی؟ (یعنی قبول نہ ہوگی۔)(۱)

اس سے معلوم ہوا کہ حرام سے بچنا قبولیتِ دعا کے لیے شرط ہے، حرام کھانے پینے والوں اور حرام کمائی کرنے والوں کی دعائیں اللہ کے پاس قبول نہیں کی جاتیں۔

گناہ کی دعا نہ کرے

دعا کی قبولیت کے لیے ایک شرط یہ ہے کہ دعا میں کسی گناہ کی درخواست نہ کی جائے اور نہ قطعِ رحمی کی دعا کی جائے۔ حدیث میں آیا ہے کہ حضرت عبادۃ بن الصامت رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«مَا عَلَى الْاَرْضِ مُسْلِمٌ يَدْعُوْ اللّٰهَ بِدَعْوَةٍ اِلَّا اٰتَاهُ اللّٰهُ اِيَّاهُ اَوْ صَرَفَ عَنْهُ السُّوْءَ مِثْلَهَا مَا لَمْ يَدْعُ بِاِثْمٍ اَوْ قَطِيْعَةِ رَحْمٍ الخ»(۲)

---

(۱) مسلم:۱۶۸۲، ترمذی:۲۹۱۵، احمد:۷۹۹۸، دارمی:۲۶۰۱

(۲) ترمذی:۳۴۹۷ وقال حدیث حسن صحیح، احمد:۲۱۷۲۰

(زمین پر کوئی مسلمان ایسا نہیں ہے کہ وہ اللہ سے کوئی دعا کرے؛ مگر اللہ اس کو وہ چیز عطا فرما دیتے ہیں یا اس سے اس کے برابر کوئی برائی دور فرما دیتے ہیں، جب تک کہ وہ گناہ کی یا قطع رحمی کی دعا نہ کرے)

اور حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''نہیں ہے کوئی ایسا مسلمان جو اللہ سے کوئی دعا کرے، جس میں گناہ اور قطعِ رحمی کی دعا نہ ہو؛ مگر اللہ تعالیٰ اس کو تین باتوں میں سے ایک ضرور دیتے ہیں، یا تو اس کو دنیا ہی میں وہ چیز دے دیتے ہیں یا آخرت کے لیے اس کو اُٹھا رکھتے ہیں یا اس کے برابر اس سے کوئی برائی دور فرما دیتے ہیں''۔ الخ (۱)

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ قطعِ رحمی یا کسی اور گناہ کی دعا کرنے سے اللہ تعالیٰ قبول نہیں کرتے، اس لیے دعا کرتے وقت اس پر بھی توجہ دینا چاہیے کہ کوئی گناہ کی بات دعا میں نہ آجائے اور اس دوسری حدیث کے الفاظ سے اس طرف بھی اشارہ ملتا ہے کہ اگر دعا میں دیگر باتوں کے ساتھ گناہ کی دعا کی گئی تو اللہ تعالیٰ اس پوری ہی دعا کو قبول نہیں کرتے۔ (واللہ اعلم)

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر

احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ دعا کی قبولیت کے لیے ایک اہم شرط یہ بھی ہے کہ جہاں اور جب امر بالمعروف و نہی عن المنکر کی ضرورت ہو، اس فریضہ کو انجام دیا جائے اور اس میں کسی قسم کی کوتاہی اور غفلت نہ کی جائے، اگر امت امر بالمعروف و

(۱) احمد:۱۰۷۰۹، شعب الایمان:۲/۴۸

نہی عن المنکر کو چھوڑ بیٹھے گی، تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے دعا کی قبولیت کا دروازہ بند کر دیا جائے گا۔

چناں چہ حدیث میں آیا ہے حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ نے روایت کیا ہے کہ حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«وَ الَّذِیْ نَفْسِیْ بِیَدِہٖ لَتَأْمُرُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ وَ لَتَنْھَوُنَّ عَنِ الْمُنْکَرِ اَوْ لَیُوْشِکَنَّ اللّٰہُ اَنْ یَبْعَثَ عَلَیْکُمْ عَذَابًا مِّنْہُ فَتَدْعُوْنَہٗ فَلَا یَسْتَجِیْبُ لَکُمْ»

(اُس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں میری جان ہے، تمہیں نیک باتوں کا حکم کرنا ہوگا اور برائی سے روکنا ہوگا ورنہ کچھ بعید نہیں کہ اللہ تعالیٰ تم پر اپنا عذاب نازل فرمائیں پھر تم اللہ سے دعائیں بھی کرو گے تو قبول نہ ہوں گی)(۱)

دعا میں پہلے حمد و صلوٰۃ ہونا چاہئے

ادب وسنت یہ ہے کہ دعا سے پہلے خوب اللہ کی حمد وثنا کی جائے، پھر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر درود پڑھا جائے پھر دعا کی جائے۔

ایک حدیث میں حضرت فُضالہ بن عبید رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ایک دفعہ حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تشریف فرما تھے کہ ایک شخص داخل ہوا اور اس نے نماز پڑھی، پھر دعا کی کہ " اَللّٰھُمَّ اغْفِرْلِیْ وَ ارْحَمْنِیْ " آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اے مصلّی! تو نے جلد بازی سے کام لیا ہے، جب تو نماز پڑھے اور بیٹھے تو پہلے اللہ کی اس طرح حمد وثنا کر جیسا کہ وہ اس کا مستحق ہے، پھر مجھ پر درود بھیج، پھر دعا

(۱) ترمذی:۲۰۹۵

کر، اس کے بعد اس شخص نے نماز پڑھی پھر اللہ کی حمد کی اور درود پڑھا تو آپ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نے فرمایا کہ اب دعا کر قبول ہوگی۔(۱)

اس سے واضح ہوا کہ دعا کا ادب یہ ہے کہ اولاً اللہ کی تعریف کی جائے، جیسے بعض روایات میں ہے کہ حضرت نبی کریم صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اس طرح اللہ کی حمد فرماتے تھے:

« اَللّٰهُمَّ لَکَ الْحَمْدُ كُلُّهُ وَ لَکَ الشُّكْرُ كُلُّهُ وَ لَکَ الْمُلْکُ كُلُّهُ وَ لَکَ الْخَلْقُ كُلُّهُ بِيَدِکَ الْخَيْرُ كُلُّهُ وَ اِلَيْکَ يَرْجِعُ الْاَمْرُ كُلُّهُ » (۲)

(اے اللہ! تیرے ہی لیے ساری تعریف ہے اور تیرے ہی لیے سارا شکر ہے اور سارا ملک تیرا ہے اور تمام مخلوق تیری ہے، تیرے ہی قبضہ میں سارا خیر ہے اور سارے معاملات آخر کار تیرے ہی سامنے آتے ہیں)

حمد کے بعد نبی اکرم صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ پر درود شریف پڑھا جائے، پھر دعا مانگی جائے۔علما نے فرمایا ہے کہ درود ایسی چیز ہے جو اللہ کے نزدیک مقبولیت کا درجہ حاصل کر چکی ہے، اس کے قبول نہ ہونے کا کوئی خدشہ نہیں اس لیے دعا سے پہلے اگر درود پڑھ لیا جائے تو اس کے ساتھ کی جانے والی دعاؤں کے قبول ہونے کی بھی اُمید غالب ہو جاتی ہے۔

---

(۱) ترمذی:۳۳۹۸ و قال حسن ،نسائی:۱۲۶۷

(۲) الحزب الاعظم:ص۱۱۷

دعا سے پہلے توبہ واستغفار

حمد وثنا اور درود کے بعد پہلے اپنے گناہوں سے توبہ کی جانی چاہیے اور اللہ سے اس سلسلے میں استغفار کرنا چاہئے۔ عاجزی و ندامت کے ساتھ، روتے اور گڑگڑاتے ہوئے اور آئندہ کے لیے ترکِ گناہ کا عزمِ مصمم کرتے ہوئے، معافی مانگنی چاہئے، پھر اپنی حاجات وضروریات کو پیش کیا جائے، یہ نہیں کہ دعا شروع کرتے ہی اپنی ضروریات وحاجات کا سوال کیا جائے، کیوں کہ ذرا سوچئے کہ ہم سے روزانہ کتنے گناہ سرزد ہوتے رہتے ہیں، اللہ کی ناراضی کے کتنے کام صادر ہوتے ہیں اور اس کے کس قدر احکامات ہم سے فوت ہوتے رہتے ہیں؟ اگر ان گناہوں اور خدا کی ناراضی کے ساتھ دعا کی جائے، تو کیسے قبول ہوگی؟ یہ الگ بات ہے کہ اس رحمان و رحیم کی بے پناہ عنایات واحسانات اور اس کے بے انتہا افضال وانعامات کے پیشِ نظر یہی اُمید ہے کہ وہ ہمارے گناہوں کے باوجود ہماری سنتا ہے اور قبول کرتا ہے؛ مگر ادب کا تقاضا یہی ہے کہ ہم دعا کرتے ہوئے پہلے اپنے گناہوں کی معافی مانگیں اور اپنے آقا و مالک کو راضی کرنے کی کوشش کریں، کیوں کہ اگر وہی ناراض ہو تو پھر ہم کو ساری کائنات بھی دے دی جائے تو وہ بے فائدہ اور بے مزہ ہے اور اگر وہ راضی ہو تو چاہے کچھ بھی نہ ملے، تب بھی سب کچھ حاصل ہے۔

علامہ ابن الجوزی رحمۃ اللہ نے ”صید الخاطر“ میں فرمایا:

”میں نے اپنے نفس کی طرف سے عجیب معاملہ دیکھا کہ وہ اللہ تعالیٰ سے اپنی حاجات مانگتا ہے اور اپنے گناہوں کو بھول جاتا ہے، میں نے اس سے کہا کہ اے بُرے نفس! کیا تجھ جیسا (گناہ گار) بھی (اللہ کے سامنے) بولتا ہے؟ اگر بولے بھی تو تیرا سوال صرف اپنے گناہوں کی معافی

کا ہونا چاہیے، نفس نے کہا کہ پھر میں اپنی حاجات و مرادات کس سے طلب کروں؟ میں نے کہا کہ میں تجھ کو اللہ سے اپنی حاجات کا سوال کرنے سے منع نہیں کر رہا ہوں؛ بل کہ میں تو یہ کہتا ہوں کہ پہلے توبہ کرلے، پھر اپنی حاجات کا سوال پیش کرنا۔(۱)

غرض یہ کہ اپنی مراد و حاجت کے مانگنے سے پہلے توبہ واستغفار کر کے اللہ کو راضی کرلینا دعا کا ایک اہم ادب ہے، اس کو فراموش نہیں کرنا چاہیے۔

اللہ سے لگ لپٹ کر مانگنا چاہیے

دعا کا ایک ادب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ سے لگ لپٹ کر دعا کرنا چاہیے یعنی دعا سرسری طور پر نہ ہونا چاہیے؛ بل کہ اس طرح ہونا چاہیے جیسے بچے اپنے والدین سے لگ لپٹ کر مانگتے ہیں اور جب تک لیتے نہیں، ٹلتے نہیں، حضرت مرشدی مولانا شاہ ابرار الحق صاحب رحمہ اللہ فرمایا کرتے ہیں کہ دعا کرنا بچوں سے سیکھو کہ جس طرح وہ اپنے ماں باپ سے لگ لپٹ کر مانگتے ہیں، اس طرح مانگو۔

اور قرآن پاک میں ایک جگہ ارشاد فرمایا گیا ہے:

﴿ وَ اذْكُرُوا اللّٰهَ كَذِكْرِكُمْ اٰبَآئَكُمْ اَوْ اَشَدَّ ذِكْرًا ﴾

(اور تم اللہ کو یاد کرو جیسا کہ تم اپنے باپوں کو یاد کرتے ہو)

(البقرۃ: آیت:۲۰۰)

اس آیت کی متعدد تفسیریں ہیں، ان میں سے ایک مطلب حضرت عطاء، حضرت ضحاک و حضرت ربیع سے یہ منقول ہے کہ تم اللہ کو اس طرح پکارو جس طرح تم اپنے والدین کو لگ لپٹ کر پکارتے ہو اور اس سے اس طرح استغاثہ کرو جیسے تم اپنے بچپن

---

(۱) صید الخاطر: ۱۳۰

میں اپنے والدین سے استغاثہ کرتے تھے۔(۱)

مطلب یہ ہے کہ والدین سے جس طرح پیار و محبت اور ذوق وشوق سے مانگتے ہو، اسی طرح؛ بل کہ اس سے زیادہ پیار و محبت اور ذوق وشوق سے اللہ سے مانگو۔

آج کل لوگ اللہ تعالیٰ سے دعا میں وہ ذوق ورغبت اور شوق ومحبت کا مظاہرہ نہیں کرتے جو ہونا چاہئے؛ بل کہ نہایت سرسریت وسطحیت اور انتہائی بے ذوقی کے ساتھ دعا کرتے ہیں۔

ایک حدیث میں حضرت نبی کریم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے فرمایا:

«اِذَا دَعَا اَحَدُکُمْ فَلَا یَقُلْ: اَللّٰھُمَّ اغْفِرْلِیْ اِنْ شِئْتَ وَ لٰکِنْ لِیَعْزِمِ الْمَسْئَلَةَ وَ لْیُعَظِّمِ الرَّغْبَةَ،فَاِنَّ اللّٰہَ تَعَالٰی لَا یَتَعَاظَمُهٗ شَیْئٌ اَعْطَاہُ» (۲)

(جب تم میں سے کوئی دعا کرے تو یوں نہ کہے کہ اے اللہ! اگر تو چاہے تو میری مغفرت کردے؛ بل کہ پورے عزم سے سوال کرے، اور اس کی طرف پوری طرح رغبت ومیلان ظاہر کرے، کیوں کہ اللہ کو کوئی چیز بڑی نہیں جو وہ عطا کرے)

اس حدیث کا مطلب بھی یہی ہے کہ بے توجہی اور بے ذوقی کے ساتھ دعا نہ کی جائے؛ بل کہ پورے ذوق وشوق اور رغبت ومیلان کے ساتھ دعا کی جائے۔

دعا غفلت کے ساتھ نہ ہو

اسی طرح ایک ادب دعا کا یہ ہے کہ حضورِ قلب اور توجہ کے ساتھ دعا کی جائے،

(۱) دیکھو طبری:۲/ ۲۹۷،قرطبی:۲/ ۴۳۱

(۲) مسلم:۴۸۳۸،احمد:۹۵۲۱

اگر کوئی شخص کسی بادشاہ کے دربارِ عالی میں جائے اور بادشاہ سے اپنی کچھ حاجت و ضرورت پیش کرنا چاہے تو کیا وہ غفلت و بے توجہی کے ساتھ پیش کرے گا یا پوری توجہ اور حضورِ قلب کے ساتھ پیش کرے گا؟ پھر سوچو کہ اگر کسی نے بادشاہ کے پاس جا کر بے توجہی اور غفلت کا مظاہرہ کیا تو کیا وہ بادشاہ کی جانب سے مستحقِ انعام و احسان ہوگا یا مستحقِ عقاب وعتاب ہوگا؟

دوستو! جب ہم جیسا ایک معمولی انسان جو عارضی وفانی ومجازی حکومت کا عارضی ومجازی مالک ہے، اس سے بھی غفلت کے ساتھ مانگنا جرم ہے، تو حقیقی ودائمی ازلی و ابدی حکومت کے حقیقی بادشاہ اللہ عزوجل سے اگر غفلت کے ساتھ مانگا جائے تو کیا یہ جرمِ عظیم نہ ہوگا؟ اسی لیے حدیثِ پاک میں صاف طور پر فرمایا گیا ہے:

« وَاعْلَمُوْا اَنَّ اللّٰهَ لَا يَسْتَجِيْبُ لِعَبْدٍ دَعَاهُ عَنْ ظَهْرِ قَلْبٍ غَافِلٍ »

(جان لو کہ اللہ تعالیٰ اس بندے کی دعا قبول نہیں کرتے جو غافل دل سے دعا کرے۔)(۱)

ایک اور حدیث میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت سے یہی مضمون ان الفاظ سے نقل کیا گیا ہے:

« وَاعْلَمُوْا اَنَّ اللّٰهَ لَا يَسْتَجِيْبُ دُعَاءً مِّنْ قَلْبٍ غَافِلٍ لَاهٍ »

(جان لو کہ اللہ تعالیٰ بے پرواہ اور غافل دل کی دعا قبول نہیں فرماتے)(۲)

لہٰذا دعا میں خشوع وخضوع کا، توجہ وانابت کا اور حضورِ قلب کا، پورا پورا اہتمام

---

(۱) احمد: ۶۳۶۸، حسّن اسناده المنذری فی الترغیب: ۴۹۱/۲

(۲) ترمذی: ۳۴۰۱، حاکم: ۶۷۰/۱

کرنا چاہئے، تا کہ ہماری دعائیں قبولیت کا درجہ پاسکیں اور وہ "دعا لا یسمع" بن کر نہ رہ جائے، جس سے اللہ کے رسول صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے پناہ مانگی ہے۔

دعا میں رونا بھی چاہئے

اسی سلسلہ کی ایک بات یہ ہے کہ دعا میں اللہ کے سامنے خوب رونا اور گڑگڑانا بھی چاہئے، احادیث اور آثار صحابہ میں رونے کا حکم بھی دیا گیا ہے۔

چناں چہ حضرت نبی کریم صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے فرمایا:

« یَآ اَیُّھَا النَّاسُ ابْکُوْا فَاِنْ لَمْ تَبْکُوْا فَتَبَاکُوْا ، الخ »

(یعنی تم رویا کرو اور اگر رونا نہ آئے تو رونے کی صورت ہی بنالو) (۱)

ایک اور حدیث حضرت عبد اللہ بن عمرو رَضِیَ اللہُ عَنْہُ سے مروی ہے کہ حضور نبی کریم صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے فرمایا کہ میں جو جانتا ہوں وہ اگر تم جان لیتے تو تم بہت زیادہ روتے اور بہت کم ہنستے اور جو میں جانتا ہوں، وہ اگر تم جان لیتے تو تم میں سے ایک ایک بھی سجدہ میں پڑ جاتا، حتیٰ کہ اس کی پیٹ ٹوٹ جاتی اور وہ (اللہ کے سامنے روتے ہوئے) چیختا، حتیٰ کہ اس کی آواز ہی بند ہو جاتی، پس تم رویا کرو اور اگر نہ رو سکو تو رونے کی صورت ہی بنالو (۲)

ان احادیث میں اگر چہ بالخصوص دعا میں رونے کا ذکر نہیں ہے؛ لیکن اتنا تو معلوم ہوا کہ رونے کی ضرورت ہے اور اس کا ایک اہم موقعہ دعا بھی ہے۔

ایک بزرگ کی حکایت

مولانا رومی رَحِمَہُ اللہُ نے ایک بزرگ کی حکایت لکھی ہے کہ وہ حاجت مندوں

(۱) ابن المبارک فی الزھد عن انس:۱/۸۵،و ابن ماجہ عن سعد بن ابی وقاص:۴۱۸۶

(۲) الزھد لھناد رَحِمَہُ اللہُ :۱/۲۷۰

کو کبھی مایوس نہ کرتے اور ہر سائل کی ضرورت پوری کرتے اور اپنے پاس ہوتا تو دے دیتے اور اگر نہ ہوتا تو کسی سے قرض لے کر دے دیتے، اس طرح ان بزرگ کے ذمے بہت سے لوگوں کا قرض ہوگیا اور ایک دن سارے قرض خواہ آپس میں مشورہ کر کے آپ کے پاس جمع ہو گئے اور عرض کیا کہ آج ہم آپ سے اپنا اپنا قرض وصول کرنے آئے ہیں اور جب تک آپ دیں گے نہیں، ہم یہاں سے واپس نہ ہوں گے، ان بزرگ نے فرمایا کہ آپ حضرات تشریف رکھیں، اللہ تعالیٰ دیں گے، تو میں دے دوں گا، سارے قرض خواہ بیٹھ گئے اور انتظار کرنے لگے، اسی درمیان باہر سڑک کی طرف سے آواز محسوس ہوئی، بزرگ نے خادم سے معلوم کیا کہ کیا آواز ہے؟ خادم نے بتایا کہ ایک بچہ ہے جو حلوا بیچ رہا ہے، فرمایا کہ بھائی اس کو بلاؤ اور ان مہمانوں کی خاطر داری کرو، خادم نے اس بچہ کو بلایا اور معلوم کیا کہ حلوا کتنا ہے اور کتنے کا ہے؟ اور پھر ان بزرگ کو اس کی اطلاع کی، انہوں نے اس بچہ سے فرمایا کہ سارا حلوا تول دو، اور ان سب کو کھلا دو، اور تم بھی کھاؤ، چناں چہ اس بچہ نے حلوا تولا اور سب کو کھلا دیا، جب سب کھا چکے تو اس بچہ نے حلوے کی قیمت مانگی، ان بزرگ نے فرمایا کہ اگر پیسے ہوتے تو یہ لوگ یہاں کیوں بیٹھے ہوتے؟ یہ لوگ اسی لیے یہاں بیٹھے ہیں کہ ہمارے پاس پیسے نہیں ہیں، تو بھی ان کے ساتھ بیٹھ جا، اگر اللہ نے دیا تو تجھے بھی دے دیں گے، یہ سن کر وہ بچہ زور زور سے رونے لگا اور کہا کہ میری ماں مجھے مارے گی اگر میں پیسے لیکر نہ جاؤں۔

ابھی یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ کسی نے ان بزرگ کے دروازے پر دستک دی، خادم نے دیکھا تو ایک صاحب ہیں، جو اپنے ہاتھ میں ایک تھیلی لیے کھڑے ہیں اور فرماتے ہیں کہ حضرت کے لیے یہ تحفہ لایا ہوں، اس کو آپ تک پہنچا دو، خادم اس کو

لے آیا اور حضرت کی خدمت میں پیش کر دیا، آپ نے فرمایا کہ اس کو کھولو اور دیکھو کہ کیا ہے؟ جب دیکھا تو اس میں اشرفیاں تھیں، فرمایا کہ اللہ نے ان قرض خواہوں کے لیے بھیج دی ہیں، ان کو گن گن کر سب کا قرضہ ادا کر دو، خادم نے ان کو گنا اور قرض خواہوں کو دے دیا، اس تھیلی میں اتنی رقم تھی کہ سارے قرض خواہوں کا قرض ادا ہو گیا اور ساتھ ہی اس بچہ کے حلوے کی رقم بھی ادا ہو گئی اور سب لوگ چلے گئے، اس کے بعد ان بزرگ نے اللہ کی جناب میں عرض کیا کہ اے اللہ! مجھے یقین تھا کہ آپ ضرور دیں گے؛ مگر یہ سمجھ میں نہیں آیا کہ آپ نے اتنا رُسوا کر کے کیوں دیا؟ اس پر ان کو اللہ کی طرف سے الہام ہوا کہ ہم تو دینا ہی چاہتے تھے اور یہاں مانگنے والے تو سب تھے؛ مگر کوئی رونے والا ہی نہیں تھا، اس لیے ہم نے تاخیر کر دی اور جب یہ بچہ رونے لگا تو ہم نے اسی کی برکت سے دے دیا، یہ قصہ اس بات کے سمجھنے کے لیے کافی ہے کہ اللہ کو رونا بہت پسند ہے اور رونے پر اللہ کی عنایت متوجہ ہوتی ہے، اس لیے دعا میں خوب رونا اور گڑگڑانا چاہیے۔

زَرْ، زَوْر، اور زارِی

ایک بزرگ کی بات یاد آئی، وہ فرمایا کرتے تھے کہ کسی سے کام نکالنے کے تین طریقے ہیں، یا تو زور دکھاؤ یا زَر دکھاؤ یا زاری کرو، دنیا میں لوگوں سے کام ان تینوں طریقوں سے نکالا جاتا ہے، چناں چہ بعض وقت کام بنانے کے لیے زور دکھانا پڑتا ہے اور زور کی بنا پر دوسرا آدمی ڈر کر ہمارا کام کر دیتا ہے اور بعض اوقات کام بنانے کے لیے زَر دکھانے کی نوبت آجاتی ہے اور لالچی آدمی زر کو دیکھ کر ہمارا کام کر دیتا ہے، جیسے عموماً سرکاری دفاتر میں ہوتا ہے کہ افسر کو آپ رشوت کا لالچ دیں تو کام کرے گا ورنہ نہیں، یہ دونوں طریقے اللہ تعالے کے دربار میں نہیں چلیں گے، اس لیے کہ وہ

آقا ساری طاقتوں کا منبع ہے اس کو کس کا زور مرعوب کرسکتا ہے؟ اسی طرح وہ مالک دو عالم ہے جس کے پاس سارے خزانے ہیں، وہ کسی کی دولت و مال سے کیا متأثر ہوسکتا ہے؟ اس کو نہ کسی کا خوف مرعوب کرسکتا ہے اور نہ کسی کا لالچ متأثر کرسکتا ہے، اس لیے اللہ کے دربار میں نہ زور دکھانے سے کام چلے گا اور نہ زر دکھانے سے کام چلے گا۔ فرمایا کہ اس کے دربار میں تو صرف اور صرف زاری سے کام نکلے گا، یعنی رونے اور گڑگڑانے اور عجز و نیاز سے اللہ کے یہاں کام نکلے گا، اس لیے اللہ سے مانگنا ہو تو زاری سے کام لینا چاہیے۔

دعا قبولیت کے یقین سے کی جائے

اس سلسلے کا ایک اہم ادب یہ ہے کہ دعا کرتے ہوئے اس کا یقین رکھنا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ ہماری دعایں قبول فرمائیں گے، اس بارے میں شک و شبہ اور تذبذب نہ ہونا چاہیے، کیوں کہ حدیث میں حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:

« اُدْعُوا اللّٰهَ وَ اَنْتُمْ مُوْقِنُوْنَ بِالْاِجَابَةِ » (۱)

(تم اللہ سے دعا کرو اس حال میں کہ تم قبولیت کا یقین رکھو)

مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ سے سوال وطلب کے وقت، دل میں بے یقینی کی کیفیت نہ ہونا چاہیے؛ بل کہ اس کی جگہ اللہ سے اُمید اور حسنِ ظن ہونا چاہیے کہ وہ ہماری دعا کو قبول کریں گے۔

جلدی مچانا بُرا ہے

بعض لوگ دعا تو کرتے ہیں؛ مگر اللہ تعالیٰ کی طرف سے جب بعض مصلحتوں کی

(۱) ترمذی:۳۴۰۱، احمد:۶۳۶۸

وجہ سے اس کی قبولیت میں تاخیر ہوتی ہے، تو مایوسی کا شکار ہو جاتے ہیں اور بعض تو اس سے بڑھ کر دعا کرتے ہی واویلا مچانا شروع کر دیتے ہیں کہ ہم نے دعا کی؛ مگر قبول ہی نہیں ہوئی، اصل میں یہ سب شیطانی وساوس اور فریب کاری کا ایک حصہ ہے، شیطان اللہ کے بندوں کو اللہ سے کاٹ کر مختلف قسم کی گمراہیوں میں مبتلا کرنا چاہتا ہے، اس لیے وہ اس تدبیر سے بندے کو اللہ سے مایوس کراتا ہے، یہی وجہ ہے کہ حضرت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

« يُسْتَجَابُ لِاَحَدِكُمْ مَالَمْ يَعْجَلْ، يَقُوْلُ دَعَوْتُ فَلَمْ يُسْتَجَبْ لِيْ »(۱)

(یعنی تمہاری دعا قبول کی جائے گی جب تک کہ جلدی نہ مچائی جائے (اور جلدی مچانا یہ ہے کہ بندہ) یوں کہے کہ میں نے دعا کی؛ مگر قبول نہیں ہوئی۔)

معلوم ہوا کہ دعا کے بارے میں جلدی مچانا اور اس طرح کہنا کہ میں نے دعا کی؛ مگر قبول نہیں ہوئی، مایوسی کی پیداوار ہے، اس لیے اس سے بچنا چاہئے۔

بددعا نہ کرو

دعا کا ایک ادب یہ بھی ہے کہ برائی کی دعا نہ کرے، یعنی بددعا نہ کرے، نہ اپنے اوپر اور نہ کسی دوسرے پر، بعض لوگوں کی اور بالخصوص عورتوں کی عادت ہے کہ بات بات پر بددعا کرنے لگتے ہیں، یہ طریقہ اسلام کا نہیں ہے، ہمارے نبی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

« لَا تَدْعُوْا عَلٰى اَنْفُسِكُمْ وَلَا تَدْعُوْا عَلٰى اَوْلَادِكُمْ وَلَا تَدْعُوْا عَلٰى اَمْوَالِكُمْ، لَا تُوَافِقُوْا مِنَ اللّٰهِ سَاعَةً يُسْأَلُ فِيْهَا عَطَاءً فَيَسْتَجِيْبَ لَكُمْ »(۲)

---

(۱) بخاری: ۵۸۶۵، مسلم: ۴۹۱۶، ترمذی: ۳۳۰۹، ابو داود: ۱۳۶۹، ابن ماجہ: ۳۸۴۳، احمد: ۸۷۸۴، مالک: ۴۴۶

(۲) مسلم: ۵۳۲۸، ابن حبان: ۵۲/۱۳

(تم اپنے حق میں اور اپنی اولاد کے حق میں اور اپنے مالوں کے حق میں بد دعا نہ کرو، مبادا وہ وقت دعا کی قبولیت کا ہو اور تمہاری دعا اللہ قبول کر لے)۔

اسی طرح ایک حدیث میں فرمایا گیا کہ اپنے اوپر موت کی دعا بھی نہ کرو، چناں چہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

« لَا يَتَمَنّٰى اَحَدُكُمُ الْمَوْتَ وَلَا يَدْعُ بِهٖ مِنْ قَبْلِ اَنْ يَّأْتِيَهٗ اِنَّهٗ اِذَا مَاتَ اِنْقَطَعَ عَمَلُهٗ وَ اِنَّهٗ لَا يَزِيْدُ الْمُؤْمِنَ عُمُرُهٗ اِلَّا خَيْرًا » (۱)

(تم میں سے کوئی اپنی موت کی تمنا نہ کرے اور نہ موت کے آنے سے پہلے اس کی اللہ سے دعا کرے، کیوں کہ جب موت آجائے تو عمل کا سلسلہ ختم ہو جاتا ہے اور مؤمن کی عمر تو اس کے لیے خیر میں اضافہ ہی کرتی ہے۔)

غرض یہ کہ اللہ تعالیٰ سے خیر اور بھلائی ہی کے لیے دعا کرنا چاہیے، بد دعا کرنا اور موت کی دعا کرنا، ادب کے بھی خلاف ہے اور شرع کے بھی خلاف ہے۔

عام طور پر مائیں اپنی اولاد پر جب غصہ ہوتی ہیں، تو ان پر بد دعا کرتی اور ان کو کوس دیتی ہیں اور ان کی توجہ اس طرف نہیں ہوتی کہ اگر یہ بد دعا قبول ہو جائے تو کیا ہوگا؟ کیا یہ بد دعا دینے والی مائیں اس کو بہ دل و جان قبول کر لیں گی؟ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حدیث میں یہ بتایا ہے کہ بعض اوقات ایسے ہوتے ہیں، جس میں دعاؤں کی قبولیت مقدر ہوتی ہے اور ایسے اوقات میں جو دعا بھی کی جائے

(۱) مسلم: ۴۸۴۳، احمد: ۷۸۴۲

وہ اللہ کے یہاں قبول ہو جاتی ہے، اس لیے دعا کرنے والا اس کا خیال رکھے کہ دعا خیر اور بھلائی کی کی جائے، بددعا نہ کی جائے، ورنہ کہیں بعد میں پچھتانا پڑے۔

امامِ حرم قاری سدیس کا واقعہ

یہاں ایک عبرت خیز واقعہ موجودہ امامِ حرم قاری سدیس صاحب حفظہ اللہ کے بارے میں بعض معتبر ذرائع سے مجھے معلوم ہوا کہ ان کی والدہ محترمہ جب کسی بات پر غصہ ہوتیں تو ان کو یوں بددعا دیتیں، کہ اللہ تم کو حرم کا امام بنائے، اللہ اکبر! کیسی عجیب بددعا ہے یہ! جس میں سراسر رحمت اور برکت ہے اور یہ دراصل اسلامی تعلیم و تربیت کا اثر ہے، پھر دیکھیے اللہ تعالیٰ نے ان کی یہ دعا قبول بھی فرما لی اور قاری سدیس کو امامِ حرم بھی بنا دیا اور ساری دنیا میں ان کو شہرت بھی دے دی، اس واقعہ سے میں اس طرف توجہ دلانا چاہتا ہوں کہ ماؤں کو ہمیشہ اس کا خیال رکھنا چاہئے کہ اپنی اولاد کو کوسہ نہ دیں؛ بل کہ اگر کبھی غصہ آ جائے تو بھی ایسی دعا دیں، جس سے اپنی اولاد کا فائدہ ہو، جیسا کہ قاری سدیس صاحب کی والدہ نے کیا۔

دعا میں وسیلہ کا حکم

دعا میں اللہ کے مقرب بندوں کا وسیلہ لینا بھی جائز ہے، اور اس کی صورت یہ ہے کہ دعا تو ہر حال میں اللہ ہی سے ہو اور اس میں یوں کہا جائے کہ اے اللہ! ہماری دعا کو حضرت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے صدقہ اور وسیلہ سے قبول فرما لیجیے۔ شریعت میں اس طرح کا وسیلہ لینا جائز ہے اور حدیث سے ثابت ہے۔ چناں چہ ایک حدیث میں ہے کہ ایک نابینا صحابی حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آئے اور عرض کیا کہ میں نابینا ہوں، آپ میرے لیے دعا فرما دیجیے کہ اللہ تعالیٰ میری بینائی

لوٹا دے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یا تو صبر کرو اور یہ تمہارے حق میں بہتر ہے اور اگر چاہو تو دعا کر دوں، ان صحابی نے عرض کیا کہ دعا فرما دیں، اس پر آپ نے ان کو اچھی طرح وضو کرنے کا اور دو رکعت نماز ادا کر کے اس طرح دعا کرنے کا حکم دیا:

« اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَتَوَجَّهُ اِلَیْکَ بِنَبِیِّکَ مُحَمَّدٍ نَبِیِّ الرَّحْمَةِ یَا مُحَمَّدُ اِنِّیْ تَوَجَّهْتُ بِکَ اِلیٰ رَبِّیْ فِیْ حَاجَتِیْ هٰذِه فَتُقْضٰی لِیْ اَللّٰهُمَّ شَفِّعْهُ فِیَّ (و فی بعض الروایات زیادة) وَشَفِّعْنِیْ فِیْهِ » (۱)

امام ترمذی نے اس حدیث کو صحیح اور امام حاکم نے صحیح علی شرط الشیخین قرار دیا ہے، اس حدیث سے علما نے اس پر استدلال کیا ہے کہ اللہ کے مقرب بندوں جیسے حضرات انبیا اور اولیا کے وسیلہ سے دعا کرنا جائز ہے، جیسا کہ حضرت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان صحابی کو اس کی تعلیم دی، علامہ شوکانی رحمۃ اللہ نے بھی اسی کو اختیار کیا ہے، جیسا کہ مشہور اہلِ حدیث عالم مولانا عبد الرحمٰن مبارک پوری نے علامہ شوکانی کی کتاب ''تحفة الذاکرین'' کے حوالہ سے ذکر کیا ہے۔ (۲)

جمہور اہلِ سنت کا یہی مسلک ہے، ہاں جاہلوں میں وسیلہ کے نام پر جو اولیاء اللہ سے براہِ راست مانگنے کا طریقہ رائج ہے، یہ سراسر حرام اور شرک ہے۔ بدعقیدہ لوگ انہی اولیاء اللہ کو حاجت روا اور مشکل کشا سمجھ کر ان ہی سے مانگتے ہیں، یا یہ سمجھتے ہیں

---

(۱) ترمذی:۳۵۰۲، ابن خزیمة: ۲/ ۲۲۵، ابن ماجه: ۱۳۷۵، مستدرک حاکم: ۱/ ۴۵۸، عمل الیوم و اللیلة للنسائی: ۱/ ۴۱۷

(۲) دیکھو تحفة الاحوذی: ۱۰/ ۲۵ تا ۲۷

کہ اللہ نے ان کو پورا اختیار دے دیا ہے، اس لیے انہی کے توسط اور وسیلہ سے ہم کو ملے گا، جو بھی ملے گا۔ اس لیے ان اولیاء اللہ کی منتیں مانتے اور ان کی مزارات پر سجدے کرتے ہیں تا کہ یہ خوش ہو کر ہمارا کام بنا دیں۔ یاد رکھو اللہ نے کسی کو اپنا کام سونپ نہیں دیا ہے اور اس طرح کا عقیدہ دراصل زمانۂ جاہلیت کے مشرکوں کا تھا، جس کو اسلام نے گمراہی قرار دیا ہے، اس کی مزید تفصیل حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمہ اللہ کی کتاب" الفوز الکبیر" میں دیکھی جا سکتی ہے۔ اور احقر کے رسالہ" دیوبندیت و بریلویت، دلائل کے آئینہ میں" میں بھی اس مسئلہ پر تفصیلی کلام موجود ہے۔

آمین پر دعا کا اختتام ہو

دعا کا ایک ادب یہ ہے کہ دعا کا اختتام آمین پر ہونا چاہیے، چناں چہ ابوداود کی ایک حدیث میں اس کا ذکر ہے، حضرت ابوزھیر النمیری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

"ایک رات ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نکلے اور ہمارا گذر اللہ کے ایک بندے پر ہوا جو بڑے الحاح و عاجزی کے ساتھ اللہ سے دعا کر رہا تھا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کھڑے ہو کر اس کی دعا سننے لگے، پھر آپ نے ہم لوگوں سے فرمایا کہ اگر اس نے دعا کا خاتمہ صحیح کیا اور مُہر بھی ٹھیک لگائی، تو جو اس نے مانگا ہے، اس کا اس نے فیصلہ کرا لیا، ہم میں سے ایک نے عرض کیا کہ حضور! صحیح خاتمہ اور مُہر ٹھیک لگانا کیا ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ آخر میں آمین کہہ کر ختم کرے"۔(۱)

(۱) ابو داؤد :۸۰۳

معلوم ہوا کہ دعا کے آخر میں آمین کہنا مستحب و پسندیدہ امر ہے اور اس سے دعا کی قبولیت کی امید ہو جاتی ہے۔

ماثور دعاؤں کا اہتمام کریں

اخیر میں ایک اہم بات کا ذکر کرنا مناسب ہوگا، وہ یہ کہ حضرت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ کی جناب میں جو دعائیں کی ہیں، ان کے پڑھنے کا معمول بنالینا بہت اچھا ہے، کیوں کہ یہ ساری نبوی دعائیں اللہ کے یہاں مقبول و منظور ہیں، لہذا جو ان کو پڑھے گا، امید ہے کہ اس کے حق میں بھی اللہ کے یہاں یہ قبول ہوں گی۔ اور میں تو یہ کہتا ہوں کہ جیسے ایک اللہ کا کلام ہے، جو اللہ نے بہ راہِ راست حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل فرمایا، اسی طرح ایک کلام، اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا بہ راہِ راست اللہ سے ہے اور وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعائیں ہیں، اس لیے کہ یہ دعائیں در اصل آپ کا وہ کلام ہے جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود بہ راہِ راست اللہ تعالیٰ سے فرمایا ہے، اس لیے اس میں بہت برکت ہے۔ اور اگر کسی کو اتنا نہ ہو سکے تو اس کو کم از کم اتنا تو کرنا چاہئے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک جامع دعا جس میں آپ کی تمام دعاؤں کا خلاصہ اور نچوڑ آجاتا ہے، اس کا اہتمام کرلیا جائے اور وہ یہ ہے:

«اَللّٰهُمَّ اِنَّا نَسْأَلُكَ مِنْ خَيْرِ مَا سَأَلَكَ مِنْهُ نَبِيُّكَ مُحَمَّدٌ صلی اللہ علیہ وسلم وَ نَعُوْذُ بِكَ مِنْ شَرِّ مَا اسْتَعَاذَكَ مِنْهُ نَبِيُّكَ مُحَمَّدٌ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، وَاَنْتَ الْمُسْتَعَانُ وَعَلَيْكَ الْبَلَاغُ وَلَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ» (۱)

(۱) ترمذی: ۳۴۴۳

(اے اللہ ہم تجھ سے اس خیر میں سے مانگتے ہیں جس کا تیرے نبی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے سوال فرمایا ہے اور اس شر سے ہم پناہ مانگتے ہیں، جس سے تیرے نبی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے تجھ سے پناہ مانگی ہے اور تجھ ہی سے مدد مانگی جا سکتی ہے اور تیرا ہی حق کو پہنچانا ہے اور تیری مدد کے بغیر کسی میں نہ نیکی کرنے کی طاقت ہے اور نہ بُرائی سے بچنے کی قوت ہے۔)

اور اس دعا سے متعلق حدیث میں آیا ہے کہ ایک دفعہ حضرت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بہت ساری دعائیں کیں، اس پر صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! آپ نے بہت سی دعائیں فرمائیں جن کو ہم یاد نہیں رکھ سکے۔ اس پر آپ نے فرمایا کہ کیا میں تم کو ایک ایسی دعا نہ بتا دوں جو ان تمام دعاؤں کی جامع ہے؟ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اوپر کی دعا سکھائی۔

غرض یہ کہ ان دعاؤں کا اہتمام کرنا جو اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ومنقول ہیں، بہت مبارک ہے اور اگر سب کا اہتمام نہ ہو سکے تو کم از کم اس جامع دعا کا خصوصی اہتمام کرنا چاہیے، جس کا ابھی اوپر ذکر کیا گیا ہے۔

دوسروں کے لیے دعا کا حصہ

دعا کے بارے میں ایک اور اہم بات بھی سن لینا چاہیے، وہ یہ کہ دعا میں دوسرے لوگوں کے لیے بھی دعا کی جائے، خواہ وہ اپنے رشتہ دار ہوں یا دوست احباب ہوں یا اور کوئی ہو، اس کی بڑی فضیلت حدیث میں آئی ہے، چناں چہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

« دعوة المرء المسلم لاخيه بظهر الغيب مستجابة ،

عند رأسه ملک مؤکل، کلما دعا لاخیه بخیر قال الملک المؤکل به اٰمین و لک بمثل »

مسلمان آدمی کا اپنے بھائی کے حق میں غائبانہ دعا کرنا مقبول ہے، اس کے سرہانے ایک فرشتہ مقرر ہوتا ہے، جب بھی یہ اپنے مسلمان بھائی کے حق میں دعا کرتا ہے تو یہ مقرر فرشتہ کہتا ہے: اللہ قبول کرے اور تجھے بھی اسی جیسی چیز عطا ہو)(۱)

اس لیے دعا میں بخل نہ کرے اور صرف اپنے لیے دعا کی تخصیص نہ کرے؛ بل کہ سارے مسلمانوں کے لیے اور والدین و بھائی ، بہنوں ، دوست احباب ، و دیگر رشتہ داروں کے لیے بھی دل کھول کر دعا کرے۔

اختتام و دعا

حاصل کلام یہ کہ دعا ایک اہم ترین عبادت ہے اس کا اہتمام کرنا چاہئے اور اپنی ہر دینی و دنیوی حاجت وضرورت اللہ ہی کے سامنے پیش کرنا چاہئے۔آخر میں یہ بندۂ حقیر وفقیر قارئین کرام کی خدمات میں گذارش کرتا ہے کہ اپنی دعاؤں میں اس حقیر کو بھی یاد رکھیں اور بالخصوص خاتمہ بالخیر کے لیے دعا فرمائیں۔

---

(۱) مسلم:۴۹۱۴،ابن ماجہ:۲۸۸۶،احمد:۲۰۷۱۷

بسم اللہ الرحمن الرحیم

منتخب نبوی دعائیں

المقدمۃ

حامداً و مصلیاً : یہ چند منتخب دعائیں ہیں جو حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم سے مختلف کتب میں منقول ہیں۔ میں نے ملّا علی قاری رحمہ اللہ کی "**الحزب الاعظم**" اور حضرت اقدس مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ کی "مناجاتِ مقبول" سے ان کا انتخاب کیا ہے۔ صرف ایک دعا جو "**اللھم اجعل صباحنا صباح الصالحین**" الخ کے الفاظ سے ہے اس کو "**مجموعۃ الاذکار**" سے لیا ہے؛ مگر یہ دعا حدیث میں منقول نہیں ہے، دعا کے عمدہ ہونے کی وجہ سے اس کو لے لیا گیا ہے۔ اور دعاؤں سے پہلے اللہ تعالے شانہ کے اسمائے حسنٰی لکھ دیئے ہیں، کیوں کہ حدیث پاک میں ان کی فضیلت آئی ہے اور ان ناموں کی برکت سے دعائیں بھی قبول ہونے کی قوی امید ہے۔ ان دعاؤں کا ورد اور اہتمام ان شاء اللہ تمام دینی و دنیوی حاجات وضروریات کے لیے کافی ہے۔ اس سے استفادہ کرنے والے حضرات سے گذارش ہے کہ اس حقیر کو بھی اپنی دعاؤں میں یاد فرمالیں۔

محمد شعیب اللہ خان عفا اللہ عنہ

۳/ ربیع الثانی/ ۱۴۲۴

بسم اللہ الرحمن الرحیم

﴿ اسماء اللہ الحسنیٰ ﴾

هُوَ اللّٰهُ الَّذِىْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَالرَّحْمٰنُ، الرَّحِيْمُ ،الْمَلِكُ، الْقُدُّوْسُ،السَّلَامُ، الْمُؤْمِنُ، الْمُهَيْمِنُ،الْعَزِيْزُ،الْجَبَّارُ، الْمُتَكَبِّرُ، الْخَالِقُ،الْبَارِئُ،الْمُصَوِّرُ، الْغَفَّارُ، الْقَهَّارُ، الْوَهَّابُ، الرَّزَّاقُ، الْفَتَّاحُ، الْعَلِيْمُ ،الْقَابِضُ، الْبَاسِطُ،الْخَافِضُ، الرَّافِعُ، الْمُعِزُّ، الْمُذِلُّ، الْسَمِيْعُ، الْبَصِيْرُ، الْحَكَمُ ،الْعَدْلُ ،اللَّطِيْفُ، الْخَبِيْرُ، الْحَلِيْمُ ،الْعَظِيْمُ ،الْغَفُوْرُ، الشَّكُوْرُ، الْعَلِيُّ، الْكَبِيْرُ، الْحَفِيْظُ، الْمُقِيْتُ، الْحَسِيْبُ، الْجَلِيْلُ، الْكَرِيْمُ، الرَّقِيْبُ، الْمُجِيْبُ، الْوَاسِعُ ،الْحَكِيْمُ ،الْوَدُوْدُ، الْمَجِيْدُ ،الْبَاعِثُ،الشَّهِيْدُ، الْحَقُّ ، الْوَكِيْلُ، الْقَوِىُّ ،الْمَتِيْنُ، الْوَلِىُّ، الْحَمِيْدُ، الْمُحْصِى، الْمُبْدِئُ، الْمُعِيْدُ، الْمُحْيِ، الْمُمِيْتُ،الْحَىُّ، الْقَيُّوْمُ ،الْوَاجِدُ الْمَاجِدُ، الْوَاحِدُ، الْاَحَدُ ،الصَّمَدُ، الْقَادِرُ، الْمُقْتَدِرُ، الْمُقَدِّمُ ،الْمُؤَخِّرُ ، الْاَوَّلُ، الْاٰخِرُ، الظَّاهِرُ، الْبَاطِنُ، الْوَالِىْ ،الْمُتَعَالِى، الْبَرُّ، التَّوَّابُ ،الْمُنْعِمُ ،الْمُنْتَقِمُ ، الْعَفُوُّ،الرَّءُوْفُ، مَالِكُ الْمُلْكِ، ذُوالْجَلَالِ وَ الْاِكْرَامِ ،الرَّبُّ، الْمُقْسِطُ، الْجَامِعُ ،الْغَنِىُّ الْمُغْنِى ،الْمُعْطِى، الْمَانِعُ ،الضَّآرُّ، النَّافِعُ، النُّوْرُ، الْهَادِى ، الْبَدِيْعُ ،الْبَاقِى ،الْوَارِثُ ، الرَّشِيْدُ، الصَّبُوْرُ.

﴿دعائیں﴾

اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی سَیِّدِنَا مَوْلانَا مُحَمَّدٍ وَّ عَلٰی اٰ لِ سَیِّدِنَا مُحَمَّدٍ کَمَا صَلَّیْتَ عَلٰی اِبْرَا ھِیْمَ وَ عَلٰی اٰلِ اِبْرَاھِیْمَ اِنَّکَ حَمِیْدٌ مَّجِیْدٌ . اَللّٰھُمَّ بَارِکْ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّ عَلٰی اٰلِ مُحَمَّدٍ کَمَا بَارَکْتَ عَلٰی اِبْرَا ھِیْمَ وَعَلٰی اٰلِ اِبْرَاھِیْمَ اِنَّکَ حَمِیْدٌ مَّجِیْدٌ .

(اے اللہ! رحمت نازل فرما محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر اوران کے آل پر جیسا کہ تو نے رحمت فرمائی ابراہیم علیہ السلام پر اوران کی آل پر۔ بلاشبہ تو تعریف کے لائق بڑی بزرگی والا ہے۔ اے اللہ تو برکت نازل فرما محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر اوران کی آل پر جیسا کہ تو نے برکت نازل فرمائی ابراہیم علیہ السلام پر اوران کی آل پر۔ بلاشبہ تو تعریف کے لائق بڑی بزرگی والا ہے)

۞ اَللّٰھُمَّ لَکَ الْحَمْدُ کُلُّهٗ وَلَکَ الشُّکْرُ کُلُّهٗ وَ لَکَ الْخَلْقُ کُلُّهٗ وَلَکَ الْمُلْکُ کُلُّهٗ، بِیَدِکَ الْخَیْرُ کُلُّهٗ وَ اِلَیْکَ یَرْجِعُ الْاَمْرُ کُلُّهٗ .

(اے اللہ! سب تعریفیں تیرے ہی لیے ہیں اور سارا شکر بھی تیرے لیے ہے اور سب ملک تیرا ہے اور تمام مخلوق تیری ہے، سب بھلائی تیرے ہی قبضہ میں ہے، اور ہر معاملہ آخر کار تیرے ہی سامنے آتا ہے۔)

۞ اَللّٰھُمَّ لَکَ الْحَمْدُ حَمْدًا دَائِمًا مَّعَ دَوَامِکَ، وَلَکَ الْحَمْدُ حَمْدًا خَالِدًا مَّعَ خُلُوْدِکَ، وَ لَکَ الْحَمْدُ حَمْدًا لَّا مُنْتَھٰی لَهٗ دُوْنَ

مَشِیْئَتِکَ، وَلَکَ الْحَمْدُ حَمْدًا دَائِمًا لَّا یُرِیْدُ قَائِلُهٗ اِلَّا رِضَاکَ، وَلَکَ الْحَمْدُ حَمْدًا عِنْدَ کُلِّ طَرْفَةِ عَیْنٍ وَ تَنَفُّسِ کُلِّ نَفْسٍ .

(اے اللہ! تیری ہمیشگی کے ساتھ ہمیشہ رہنے والی سب تعریف تجھ ہی کو زیبا ہے اور تیری ہمیشگی کے ساتھ باقی رہنے والی سب تعریف تجھ ہی کو زیبا ہے، اور (اے اللہ!) تیرے ہی لیے وہ سب تعریف ہے جس کا تیری مشیت سے پہلے کہیں خاتمہ نہ ہو، اور اے اللہ! تیرے ہی لیے ہمیشہ ہمیشہ ایسی تعریف زیبا ہے جس کا کرنے والا تیری رضامندی کے سوا اور کوئی نیت نہ رکھتا ہو اور تیرے ہی لیے اتنی بار سب تعریف زیبا ہے جتنی بار آنکھ جھپکے اور جاندار سانس لے)

❁ سُبْحَانَ الَّذِیْ تَعَطَّفَ بِالْعِزِّ وَ قَالَ بِهٖ، سُبْحَانَ الَّذِیْ لَبِسَ الْمَجْدَ وَ تَکَرَّمَ بِهٖ ، سُبْحَانَ الَّذِیْ لَا یَنْبَغِی التَّسْبِیْحُ اِلَّا لَهٗ، سُبْحَانَ ذِی الْفَضْلِ وَ النِّعَمِ ، سُبْحَانَ ذِی الْمَجْدِ وَ الْکَرَمِ، سُبْحَانَ ذِی الْجَلَالِ وَ الْاِکْرَامِ .

(پاک ہے وہ ذات، عزت جس کی چادر ہے اور عزت اس کا فرمان ہے اور پاک ہے وہ ذات، بزرگی جس کا لباس ہے اور بزرگی جس کی بخشش ہے، پاک ہے وہ ذات کہ ہر عیب سے پاکی صرف اسی کے شایان شان ہے، پاک ہے وہ ذات جس کے علم میں ہر چیز ہے، پاک ہے وہ ذات جو بڑے فضل اور بخشش والی ہے، پاک ہے وہ ذات جو بڑے احسان اور انعامات کی مالک ہے، پاک ہے وہ ذات جو بڑے شرف و کرم والی ہے اور پاک ہے وہ ذات جو بڑے جلال و اکرام کی مالک ہے)

❁ اَللّٰهُمَّ اَحْسِنْ عَاقِبَتَنَا فِی الْاُمُوْرِ کُلِّهَا وَ اَجِرْنَا مِنْ خِزْیِ الدُّنْیَا وَ عَذَابِ الْاٰخِرَةِ .

(الٰہی! ہمارے تمام کاموں کا انجام بہتر فرما اور ہم کو دنیا کی رسوائی اور آخرت کے عذاب سے پناہ عطا فرما۔)

۞ اَللّٰھُمَّ اِنَّکَ سَئَلْتَنَا مِنْ اَنْفُسِنَا مَا لَا نَمْلِکُهٗ اِلَّا بِکَ، فَاَعْطِنَا مِنْھَا مَا یُرْضِیکَ عَنَّا .

(اے اللہ! تو نے ہم سے وہ چیز طلب فرمائی ہے جس کے ہم مالک نہیں ہیں مگر تیری ہی مدد کے ساتھ، لہٰذا اب تو اس میں سے ہم کو وہ عمل عطا فرما جو تجھ کو ہم سے راضی کردے)

۞ اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَسْئَلُکَ مِنَ الْخَیْرِ کُلِّهٖ عَاجِلِهٖ وَ اٰجِلِهٖ، مَا عَلِمْتُ مِنْهُ وَ مَا لَمْ اَعْلَمْ ، وَ اَعُوْذُ بِکَ مِنَ الشَّرِ کُلِّهٖ عَاجِلِهٖ وَ اٰجِلِهٖ ، مَا عَلِمْتُ مِنْهُ وَ مَا لَمْ اَعْلَمْ .

(اے اللہ! میں تجھ سے ساری بھلائیاں مانگتا ہوں جو اس دنیا میں جلدی ملنے والی ہیں وہ بھی اور جو آخرت میں دیر سے ملنے والی ہیں وہ بھی ، ان میں سے جو میں جانتا ہوں وہ بھی اور جو نہیں جانتا ہوں وہ بھی اور تیری پناہ مانگتا ہوں ہر برائی سے، جو جلدی یا دیر سے پیش آنے والی ہو، جس کو میں جانتا ہوں اس سے بھی اور جس کو میں نہیں جانتا اس سے بھی)

۞ اَللّٰھُمَّ اغْفِرْ لِیْ مَا قَدَّمْتُ وَ مَآ اَخَّرْتُ وَ مَآ اَعْلَنْتُ وَ مَآ اَسْرَرْتُ وَمَآ اَنْتَ اَعْلَمُ بِهٖ مِنِّیْ .

(اے اللہ! میرے سب گناہ بخش دے جو میں نے پہلے کیئے تھے اور جو میں نے بعد میں کیئے اور جو چھپ کر کیئے اور جو کھلم کھلا کیئے اور جن کو تو مجھ سے زیادہ جاننے والا ہے)

۞ اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُ بِکَ مِنْ عِلْمٍ لَّا یَنْفَعُ وَ مِنْ قَلْبٍ لَّا یَخْشَعُ وَ

مِنْ دُعَاءٍ لَّا یُسْمَعُ وَمِنْ نَفْسٍ لاتَشْبَعُ وَمِنْ ھٰؤُلاءِ الْاَرْبَعِ

(اے اللہ! میں پناہ مانگتا ہوں ایسے علم سے جو نفع نہ دے اور ایسے قلب سے جو تجھ سے نہ ڈرے اور ایسی دعاء سے جو قبول نہ کی جائے اور ایسے حریص نفس سے جو کبھی سیر نہ ہو، غرض ان چاروں باتوں سے پناہ مانگتا ہوں)

۞ اَللّٰھُمَّ افْتَحْ لَنَآ اَبْوَابَ رَحْمَتِکَ وَ سَھِّلْ لَنَآ اَبْوَابَ رِزْقِکَ .

(اے اللہ! ہمارے لیے اپنی رحمت کے دروازے کھول دے، اور اپنے (مقدر کردہ) رزق کے دروازوں (تک رسائی) آسان فرمادے)

۞ اَللّٰھُمَّ اکْفِنَا بِحَلَالِکَ عَنْ حَرَامِکَ وَ اَغْنِنَا بِفَضْلِکَ عَمَّنْ سِوَاکَ .

(اے اللہ! حرام کے بدلے تو ہمیں ہماری ضرورت کے مناسب حلال روزی عطافرما اور اپنے فضل سے اپنے ماسوا سے بے نیاز کردے)

۞ اَللّٰھُمَّ اِنِّیٓ اَعُوْذُ بِکَ مِنْ زَوَالِ نِعْمَتِکَ وَ تَحَوُّلِ عَافِیَتِکَ وَ فُجَائَۃِ نِقْمَتِکَ وَ جَمِیْعِ سَخَطِکَ .

(اے اللہ! میں تجھ سے پناہ مانگتا ہوں تیری نعمت زائل ہونے اور تیری عافیت کے رخ پھیر لینے اور تیرے عذاب کے اچانک آجانے اور تیری تمام تر ناراضی سے)

۞ اَللّٰھُمَّ اِنَّا نَعُوْذُ بِکَ مِنْ جُھْدِ الْبَلَاءِ وَ دَرْکِ الشَّقَآءِ وَ سُوْءِ الْقَضَاءِ وَ شَمَاتَۃِ الْاَعْدَاءِ .

(اے اللہ! ہم تیری پناہ لیتے ہیں آزمائش کی سختی اور بدبختی کے پانے سے اور برے فیصلے سے اور دشمنوں کے ہنسی اڑانے سے)

۞ اَللّٰھم اجْعَلْنَا مِمَّنْ تَوَ کَّلَ عَلَیْکَ فَکَفَیْتَهٗ وَ اسْتَهْدَاکَ فَهَدَیْتَهٗ وَ اسْتَنْصَرَکَ فَنَصَرْتَهٗ .

(اے اللہ! تو ہمیں ان لوگوں میں بنالے جنہوں نے تیری ذات پر بھروسہ کیا تو تو ان کے لیے کافی ہوگیا اور جنہوں نے تجھ سے ہدایت مانگی تو تو نے ان کو نصیب فرمادی، اور جنہوں نے تجھ سے مدد چاہی تو تو نے ان کی مدد فرمائی)

۞ اَللّٰهُمَّ اجْعَلْنَا مِنَ الَّذِیْنَ اِذَآ اَحْسَنُوْا اسْتَبْشَرُوْا وَ اِذَآ اَسَآؤُا اسْتَغْفَرُوْا .

(اے اللہ! ہمیں ان بندوں میں سے بنالے جو نیکی کریں تو خوش ہوں اور جب برا کام کریں تو مغفرت مانگیں)

۞ اَللّٰهُمَّ اِنِّیْٓ اَسْئَلُکَ الصِّحَّةَ وَ الْعِفَّةَ وَ الْاَمَانَةَ وَ حُسْنَ الْخُلُقِ وَ الرِّضٰی بِالْقَدْرِ .

(اے اللہ! میں تجھ سے تندرستی اور پاکدامنی کا طالب ہوں اور دیانت داری اور اچھے اخلاق کا اور قضاوقدر پر راضی رہنے کا طلب گار ہوں)

۞ اَللّٰهُمَّ اجْعَلْنِیْٓ اَخْشَاکَ کَاَنِّیْٓ اَرَاکَ اَبَدًا حَتّٰٓی اَلْقَاکَ وَ اَسْعِدْنِیْ بِتَقْوَاکَ وَ لَا تُشْقِنِیْ بِمَعْصِیَتِکَ .

(اے اللہ! مجھے ایسا بندہ بنالے کہ تجھ سے اس طرح ڈرا کروں جیسا کہ تجھ کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہوں اور مجھ کو تقوی کی سعادت نصیب فرما اور اپنی نافرمانی کی وجہ سے مجھ کو بد بخت نہ بنا)

۞ اَللّٰهُمَّ ارْزُقْنَا مِنْ رِّزْقِکَ الْحَلَالِ الطَّیِّبِ الْمُبَارَکِ مَا تَصُوْنُ بِهٖ وُجُوْهَنَا عَنِ التَّعَرُّضِ اِلٰی اَحَدٍ مِّنْ خَلْقِکَ .

(اے اللہ! ہم کو اپنا حلال وطیب اور برکت والا رزق عنایت فرما، جس کی وجہ سے تو ہمیں اس بات سے بچالے کہ ہم اپنا منہ تیری مخلوق میں سے کسی کے سامنے سوال کے لیے لے کر آئیں)

❁ اِلَیْکَ رَبِّ فَحَبِّبْنِیْ وَ فِیْ نَفْسِیْ لَکَ فَذَلِّلْنِیْ وَفِیْ اَعْیُنِ النَّاسِ فَعَظِّمْنِیْ وَمِنْ سَیِّیءِ الْاَخْلَاقِ فَجَنِّبْنِیْ .

(اے میرے رب! تو مجھے اپنی بارگاہ میں پسند فرمالے، اور تو اپنے لیے مجھ کو میری نظروں میں ذلیل کردے اور دوسروں کی نظروں میں عزت والا کردے اور برے اخلاق سے مجھ کو محفوظ فرمادے)

❁ اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَسْئَلُکَ اِیْمَانًا دَائِمًا وَّ ھُدًی قَیِّمًا وَّ عِلْمًا نَافِعًا.

(اے اللہ! میں تجھ سے ہمیشہ رہنے والا ایمان اور ٹھیک ہدایت اور نفع بخش علم مانگتا ہوں)

❁ اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَسْئَلُکَ عَمَلًا مُّتَقَبَّلاً وَّعِلْمًا نَّجِیْحًا وَّ سَعْیًا مَّشْکُوْرًا وَّ تِجَارَۃً لَّنْ تَبُوْرَ.

(اے اللہ! میں تجھ سے مانگتا ہوں مقبول عمل اور درست علم اور قابل قدر جدوجہد اور ایسی تجارت جو گھاٹے میں نہ رہے)

❁ اَللّٰھُمَّ ارْزُقْنَا مِنْ فَضْلِکَ وَلَا تَحْرِمْنَا رِزْقَکَ وَ بَارِکْ لَنَا فِیْمَا رَزَقْتَنَا وَ اجْعَلْ غِنَائَنَا فِیْ اَنْفُسِنَا وَ اجْعَلْ رَغْبَتَنَا فِیْمَا عِنْدَکَ .

(اے اللہ! ہم کو اپنے فضل سے رزق عطا فرما اور ہمیں اپنے رزق سے محروم نہ فرما اور جو رزق تو نے ہم کو عطا فرمایا ہے اس میں ہمیں برکت دے اور ہم کو دل کی تونگری عطا فرما اور ہمارے دل میں ان نعمتوں کی رغبت ڈال دے)

۞ اَللّٰهُمَّ اٰنِسْ وَحْشَتِیْ فِیْ قَبْرِیْ ، اَللّٰهُمَّ ارْحَمْنِیْ بِالْقُرْآنِ الْعَظِیْمِ وَاجْعَلْهُ لِیْ اِمَامًا وَّ نُوْرًا وَّ هُدًی وَّ رَحْمَةً ، اَللّٰهُمَّ ذَكِّرْنِیْ مِنْهُ مَا نَسِیْتُ وَ عَلِّمْنِیْ مِنْهُ مَا جَهِلْتُ وَارْزُقْنِیْ تِلَاوَتَه اٰنَآءَ اللَّیْلِ وَ اٰنَآءَ النَّهَارِ وَ اجْعَلْهُ لِیْ حُجَّةً یَّا رَبَّ الْعَالَمِیْنَ .

(اے اللہ! قبر کی وحشت میں میرے لیے انس کا سامان کردے، اور قرآن عظیم کی برکت سے مجھ پر رحم فرما اور اس کو میرا امام اور میرے لیے نور اور ہدایت ورحمت کا سبب بنادے ، اے اللہ !اس کا جو حصہ میں بھول چکا ہوں وہ مجھ کو یاد کرادے اور جس کو نہیں سمجھا اس کا علم عطا فرما اور رات ودن کی ہر ساعت میں اسکی تلاوت نصیب فرما اور قیامت میں اس کو میرے حق میں دلیل بنادے، اے سب جہانوں کے پالنے والے

۞ اَللّٰهُمَّ اِنَّ قُلُوْبَنَا وَ نَوَاصِیَنَا وَ جَوَارِحَنَا بِیَدِكَ ، لَمْ تُمَلِّكْنَا مِنْهَا شَیْئًا فَاِذَا فَعَلْتَ ذَالِكَ بِنَا فَكُنْ اَنْتَ وَلِیَّنَا وَاهْدِنَا اِلٰی سَوَآءِ السَّبِیْلِ .

(اے اللہ !ہمارے دل ،ہماری پیشانیاں اور ہمارے سب اعضاء تیرے ہی قبضہ میں ہیں ،ان میں سے کسی کا تو نے ہم کو مالک نہیں بنایا، پھر جب تو نے ہم کو ایسا بے بس پیدا فرمایا ہے تو اب تو ہی ہمارا کارساز بن جا اور ہمیں سیدھے راستے کی ہدایت فرما)

۞ اَللّٰهُمَّ اغْفِرْ لِیْ خَطَایَایَ وَ ذُنُوْبِیْ كُلَّهَا ،اَللّٰهُمَّ انْعِشْنِیْ وَ اَحْیِنِیْ وَارْزُقْنِیْ وَ اهْدِنِیْ لِصَالِحِ الْاَعْمَالِ وَ الْاَخْلَاقِ ، اِنَّهٗ لَایَهْدِیْ لِصَالِحِهَا وَ لَا یَصْرِفُ سَیِّئَهَا اِلَّا اَنْتَ .

(یا اللہ میری کل خطائیں بخش دے اور قصور، یا اللہ مجھے رفعت دے اور مجھے زندہ رکھ اور مجھے رزق دے اور مجھ کو ہدایت کر اچھے اعمال اور اخلاق کی کیوں کہ ہدایت نہیں کرتا ہے عمدہ اعمال و اخلاق کی اور نہیں دور کرتا ہے برے اعمال اور اخلاق کو سوائے تیرے)

❁ اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَسْئَلُکَ الْجَنَّةَ وَمَا قَرَّبَ اِلَيْهَا مِنْ قَوْلٍ اَوْ عَمَلٍ وَ اَعُوْذُبِکَ مِنَ النَّارِ وَ مَا قَرَّبَ اِلَيْهَا مِنْ قَوْلٍ اَوْ عَمَلٍ .

(اے اللہ میں تجھ سے جنت کا سوال کرتا ہوں اور اس قول وعمل کا جو اس کے قریب کر دے، اور میں دوزخ سے تیری پناہ لیتا ہوں اور اس قول وعمل سے جو اس کے قریب کر دے)

❁ اَللّٰهُمَّ اِنَّکَ خَلَّاقٌ عَظِيْمٌ ، اِنَّکَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ، اِنَّکَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ، اِنَّکَ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ ، اِنَّکَ الْبَرُّ الْجَوَّادُ الْکَرِيْمُ اِغْفِرْلِیْ وَ ارْحَمْنِیْ وَ عَافِنِیْ وَارْزُقْنِیْ وَاسْتُرْلِیْ وَاجْبُرْنِیْ وَارْفَعْنِیْ وَاهْدِنِیْ وَلَا تُضِلَّنِیْ وَاَدْخِلْنِی الْجَنَّةَ.

(اے اللہ! تو سب کا پیدا فرمانے والا بڑی عظمت والا ہے، تو بڑا سننے والا اور سب کچھ جاننے والا ہے، بے شک تو بڑا بخشنے والا اور بڑا مہربان ہے، بے شک تو عظمت والے عرش کا مالک ہے، اے اللہ! تو ہی ہے بہت بڑا محسن، بڑا سخی، اور کرم کرنے والا، میرے گناہ بخش دے اور مجھ پر رحم فرما اور مجھے عافیت دے اور مجھے رزق عطا فرما اور میرے عیب چھپالے اور میری اصلاح فرما اور مجھ کو ہدایت نصیب فرما اور گمراہ نہ کر اور مجھ کو جنت میں داخل فرما دے)

❁ اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَسْتَغْفِرُکَ لِمَا تُبْتُ اِلَيْکَ مِنْهُ ، ثُمَّ عُدْتُّ فِيْهِ

وَاَسْتَغْفِرُکَ لِمَا اَعْطَیْتُکَ مِنْ نَفْسِیْ ، ثُمَّ لَمْ اُوْفِ بِہٖ وَ اَسْتَغْفِرُکَ لِلنِّعَمِ الَّتِیْ تَقَوَّیْتُ بِھَا عَلٰی مَعْصِیَتِکَ وَ اَسْتَغْفِرُکَ لِکُلِّ خَیْرٍ اَرَدْتُّ بِہٖ وَجْھَکَ فَخَالَطَنِیْ فِیْہِ مَا لَیْسَ لَکَ .

(اے اللہ! میں تجھ سے ان گناہوں سے معافی مانگتا ہوں جو میں نے توبہ کرنے کے بعد دوبارہ کئے ہیں اور میں تجھ سے ان وعدوں کی بھی معافی مانگتا ہوں جو میں نے اپنی جانب سے تجھ سے کئے تھے اور پھر میں نے تجھ سے وہ پورے نہیں کئے اور میں ان نعمتوں کی بھی معافی مانگتا ہوں جن کو میں نے تیری نافرمانی کرنے کا ذریعہ بنالیا ہو، اور تجھ سے اس بھلائی کی بھی معافی مانگتا ہوں جس کو میں نے تیری نیت سے کرنے کا ارادہ کیا پھر اس میں دوسری نیت شامل ہوگئی جو تیری ذات کے لیے نہ تھی)

۞ اَللّٰھُمَّ حَبِّبْ اِلَیْنَا الْاِیْمَانَ وَ زَیِّنْہُ فِیْ قُلُوْبِنَا وَ کَرِّہْ اِلَیْنَا الْکُفْرَ وَ الْفُسُوْقَ وَ الْعِصْیَانَ وَاجْعَلْنَا مِنَ الرَّاشِدِیْنَ .

(اے اللہ! ہمارے دلوں میں ایمان کی محبت ڈال دے اور اس کو ہمارے دلوں کی زینت بنادے اور ہمارے دلوں میں کفر، گناہ اور نافرمانی سے نفرت ڈال دے اور ہم کو نیک راہ پر چلنے والا بھی بنادے)

۞ اَللّٰھُمَّ رَبِّ اجْعَلْنِیْ لَکَ ذَکَّارًا، لَّکَ شَکَّارًا، لَّکَ رَھَّابًا، لَّکَ مِطْوَاعًا، لَّکَ مُخْبِتًا، اِلَیْکَ اَوَّاھًا مُّنِیْبًا ، رَبِّ تَقَبَّلْ تَوْبَتِیْ وَ اغْسِلْ حَوْبَتِیْ وَ اَجِبْ دَعْوَتِیْ وَ ثَبِّتْ حُجَّتِیْ وَ سَدِّدْ لِسَانِیْ وَ اھْدِ قَلْبِیْ وَ اسْلُلْ سَخِیْمَۃَ صَدْرِیْ .

(اے اللہ، اے میرے پروردگار! مجھ کو بہت زیادہ آپ کو یاد کرنے والا، آپ

کا بڑا شکر گزار، آپ سے بہت ڈرنے والا، آپ کا بہت فرمابردار، آپ کی جناب میں بہت گڑگڑانے والا اور آہ وزاری کے ساتھ متوجہ ہونے والا بنادے، اے میرے پروردگار! میری توبہ قبول کرلے، میرے گناہ دھودے، میری دعا قبول فرما، میری حجت مضبوط کردے، میری زبان کو سیدھا رکھ، میرے دل کو راہ راست پر لگا اور میرے دل کی سوزش (یعنی کینہ) نکال دے)

۞ اَللّٰھُمَّ اِنَّا نَسْئَلُکَ مِنْ خَیْرِ مَا سَئَلَکَ مِنْہُ نَبِیُّکَ وَ حَبِیْبُکَ مُحَمَّدٌ صلی اللہ علیہ وسلم وَ نَعُوْذُبِکَ مِنْ شَرِّ مَا اسْتَعَاذَکَ مِنْہُ نَبِیُّکَ وَ حَبِیْبُکَ مُحَمَّدٌ صلی اللہ علیہ وسلم وَ اَنْتَ الْمُسْتَعَانُ وَ عَلَیْکَ الْبَلَاغُ وَ لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّۃَ اِلَّا بِاللّٰہِ الْعَلِیِّ الْعَظِیْمِ .

(اے اللہ! ہم تجھ سے مانگتے ہیں وہ سب اچھی باتیں جو تیرے نبی محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے تجھ سے مانگی ہیں اوران تمام بری بری باتوں کے شر سے پناہ لیتے ہیں جن سے تیرے نبی محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے تیری پناہ لی ہے، تو ہی وہ ذات ہے جس سے مدد مانگی جاتی ہے، تیرا کام حق پہنچا دینا ہے اوراللہ تعالیٰ کی مدد کے بغیر نہ کسی میں نیکی کرنے کی طاقت ہے، نہ برائی سے بچنے کی قوت)

۞ اَللّٰھُمَّ اجْعَلْ حُبَّکَ اَحَبَّ الْاَشْیَاءِ اِلَیَّ وَ اجْعَلْ خَشْیَتَکَ اَخْوَفَ الْاَشْیَاءِ عِنْدِیْ وَاقْطَعْ عَنِّیْ حَاجَاتِ الدُّنْیَا بِالشَّوْقِ اِلٰی لِقَائِکَ وَ اِذَا اَقْرَرْتَ اَعْیُنَ اَھْلِ الدُّنْیَا مِنْ دُنْیَا ھُمْ فَاَقْرِرْ عَیْنِیْ مِنْ عِبَادَتِکَ .

(اے اللہ! مجھے اپنی محبت سب سے زیادہ پیاری کردے اوراپنا خوف ہر چیز کے خوف سے زیادہ بڑھادے، اوراپنی ملاقات کی تڑپ عطا فرما اور دنیا کی

سب حاجتیں میرے دل سے نکال دے اور جب دنیاوالوں کو دنیا دے کر ان کی آنکھیں ٹھنڈی کرے تو میری آنکھیں اپنی عبادت ٹھنڈی کرنا)

❁ اَللّٰهُمَّ الْطُفْ بِیْ فِیْ تَیْسِیْرِ كُلِّ عَسِیْرٍ، فَاِنَّ تَیْسِیْرَ كُلِّ عَسِیْرٍ عَلَیْكَ یَسِیْرٌ ، وَ اَسْئَلُكَ الْیُسْرَ وَ الْمُعَافَاةَ فِی الدُّنْیَا وَ الْاٰخِرَةِ .

(اے اللہ! تو مہربانی فرما مجھ پر ہر مشکل کے آسان کرنے میں ، بے شک ہر مشکل کو آسان کرنا تیرے لیے بالکل آسان ہے اور میں تجھ سے دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی آسانی اور معافی کا طالب ہوں)

❁ اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَسْئَلُكَ الْفَوْزَ فِی الْقَضَاءِ وَ نُزُلَ الشُّهَدَاءِ وَ عَیْشَ السُّعَدَاءِ وَ مُرَافَقَةَ الْاَنْبِیَاءِ وَ النَّصْرَ عَلَى الْاَعْدَاءِ ، اِنَّكَ سَمِیْعُ الدُّعَاءِ .

(اے اللہ! میں تجھ سے تیرے فیصلے میں کامیابی اور شہیدوں کی مہمانی اور خوش نصیبوں کی زندگانی اور پیغمبروں کی ہم نشینی اور دشمنوں پر فتح مندی مانگتا ہوں، بے شک تو دعاؤں کا بڑا سننے والا ہے)

❁ اَللّٰهُمَّ اِنَّكَ تَسْمَعُ كَلَامِیْ وَ تَرٰی مَكَانِیْ وَ تَعْلَمُ سِرِّیْ وَ عَلَانِیَتِیْ وَلَا یَخْفٰی عَلَیْكَ شَیْءٌ مِّنْ اَمْرِیْ وَ اَنَا الْبَائِسُ الْفَقِیْرُ الْمُسْتَغِیْثُ الْمُسْتَجِیْرُ الْوَجِلُ الْمُشْفِقُ الْمُقِرُّ الْمُعْتَرِفُ بِذَنْبِیْ ، اَسْئَلُكَ مَسْئَلَةَ الْمِسْكِیْنِ وَ اَبْتَهِلُ اِلَیْكَ ابْتِهَالَ الْمُذْنِبِ الذَّلِیْلِ ، وَ اَدْعُوْكَ دُعَاءَ الْخَائِفِ الضَّرِیْرِ وَدُعَاءَ مَنْ خَضَعَتْ لَكَ رَقَبَتُهٗ وَفَاضَتْ لَكَ عَبْرَتُهٗ وَ ذَلَّ لَكَ جِسْمُهٗ وَ رَغِمَ لَكَ اَنْفُهٗ ، اَللّٰهُمَّ لَاتَجْعَلْنِیْ بِدُعَائِكَ شَقِیًّا وَّ كُنْ لِّیْ رَءُوْفًا رَّحِیْمًا یَا خَیْرَ الْمَسْئُوْلِیْنَ

وَ یَا خَیْرَ الْمُعْطِیْنَ .

(اے اللہ! تو میری بات سن رہا ہے اور میری جگہ دیکھ رہا ہے اور میری پوشیدہ اور ظاہر بات کو جانتا ہے، میری کوئی بات تجھ سے چھپی ہوئی نہیں اور میں سختی میں مبتلا ہوں محتاج ہوں، فریاد اور پناہ کا طلب گار ہوں، ڈر رہا ہوں، لرز رہا ہوں، اپنے گناہوں کا پورا پورا اقرار کرتا ہوں، اور میں تجھ سے مسکین کی طرح مانگتا ہوں، اور تیرے سامنے ایک ذلیل مجرم کی طرح گڑگڑاتا ہوں، اور تجھ کو پکارتا ہوں جیسا کہ ایک مصیبت زدہ ڈرنے والا پکارتا ہے اور اس کی طرح پکارتا ہوں جس کی گردن تیرے سامنے جھکی ہوئی ہو اور جس کے آنسو جاری ہوں اور جس کا جسم تیرے سامنے ذلیل پڑا ہوا اور اس کی ناک خاک آلود ہو۔ اے اللہ! تو مجھ کو اس مانگنے میں محروم نہ فرمانا اور میرے لیے بڑا مہربان اور بڑا رحیم ہو جانا۔ اے ان سب سے بہتر جن سے سوال کیا جاتا ہے اور ان سب سے بڑھ کر جود دینے والے ہیں)

۞ اَللّٰھُمَّ یَا کَبِیْرُ یَا سَمِیْعُ یَا بَصِیْرُ یَا مَنْ لَا شَرِیْکَ لَهٗ وَلَا وَزِیْرَ لَهٗ وَیَاخَالِقَ الشَّمْسِ وَ الْقَمَرِ الْمُنِیْرِ وَیَا عِصْمَةَ الْبَائِسِ الْخَائِفِ الْمُسْتَجِیْرِ وَیَا رَازِقَ الطِّفْلِ الصَّغِیْرِ وَیَا جَابِرَ الْعَظْمِ الْکَسِیْرِ اَدْعُوْکَ دُعَاءَ الْبَائِسِ الْفَقِیْرِ کَدُعَاءِ الْمُضْطَرِّ الضَّرِیْرِ، اَسْئَلُکَ بِمَعَاقِدِ الْعِزِّ مِنْ عَرْشِکَ وَ بِمَفَاتِیْحِ الرَّحْمَةِ مِنْ کِتَابِکَ وَ بِالْاَسْمَاءِ الثَّمَانِیَةِ الْمَکْتُوْبَةِ عَلٰی قَرْنِ الشَّمْسِ اَنْ تَجْعَلَ الْقُرْآنَ رَبِیْعَ قَلْبِیْ وَجَلَاءَ حُزْنِیْ.

(اے اللہ، اے بہت بڑے سننے والے، بڑے دیکھنے والے، اے وہ ذات جس کا نہ کوئی شریک ہے نہ وزیر، اے آفتاب اور روشن چاند کے پیدا کرنے والے

،اور اے وہ ذات کہ محتاج ،خوفزدہ ،شاہ کے طالب کو پناہ دینے والی ہے، اور اے چھوٹے بچے کو رزق دینے والے اور اے ٹوٹی ہڈی کو جوڑ دینے والے، میں تجھ کو اس طرح پکارتا ہو جیسا کوئی محتاج فقیر پکارتا ہے، جیسا کوئی مجبور اندھا پکارتا ہے، میں تجھ سے تیرے عرش کے وسیلہ سے جس سے کہ عزت لپٹی ہوئی ہے، اور تیری کتاب میں رحمت کے خزانوں کی کنجیوں کے صدقے میں اور تیرے ان آٹھ ناموں کے طفیل میں جو آفتاب پر لکھے ہوئے ہیں، اس بات کا سوال کرتا ہوں کہ تو قرآن عظیم کو میرے دل کی بہار اور میرے غم کا علاج بنا دے)

❁ یَامُوْنِسَ کُلِّ وَحِیْدٍ وَیَا صَاحِبَ کُلِّ فَرِیْدٍ وَیَا قَرِیْباً غَیْرَ بَعِیْدٍ وَیَا شَاهِدًا غَیْرَ غَائِبٍ وَیَا غَالِبًا غَیْرَ مَغْلُوْبٍ ، یَا حَیُّ یَا قَیُّوْمُ یَا ذَا الْجَلَالِ وَ الْاِکْرَامِ ، یَانُوْرَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ، یَا زَیْنَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ، یَا جَبَّارَ السَّمٰوٰ تِ وَ الْاَرْضِ ، یَا عِمَادَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ، یَا بَدِیْعَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ، یَا قَیَّامَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ، یَا ذَا الْجَلَالِ وَ الْاِکْرَامِ ، یَا صَرِیْخَ الْمُسْتَصْرِخِیْنَ وَ مُنْتَهٰی الْعَائِذِیْنَ وَ الْمُفَرِّ جُ عَنِ الْمَکْرُوْبِیْنَ وَ الْمُرَوِّحُ عَنِ الْمَغْمُوْمِیْنَ وَ مُجِیْبَ دُعَاءِ الْمُضْطَرِّیْنَ ، وَ یَا کَاشِفَ الْکُرَبِ یَآ اِلٰـهَ الْعَالَمِیْنَ یَآ اَرْحَمَ الرَّاحِمِیْنَ مَنْزُوْلٌ بِکَ کُلُّ حَاجَةٍ .

(اے ہر تنہا شخص کے غمخوار، اور اے ہر اکیلے کے ہمدم، اے وہ قریب جو ہم سے کہیں دور نہیں، اے وہ حاضر جو کہیں غائب نہیں اور اے وہ غالب جو کسی سے مغلوب نہیں اور اے ہمیشہ زندہ رہنے والے اور اے دوسروں کو تھامنے والے، اور اے بزرگی و بخشش کے مالک ،اے آسمانوں اور زمین کے نور ،اور اے

آسمانوں اور زمین کی زینت، اے آسمانوں اور زمین کے زبردست مالک اور اے آسمانوں اور زمین کے سہارے، اے آسمانوں اور زمین کو بغیر کسی نمونہ کے بنانے والے، اور اے آسمانوں اور زمین کے کھڑا رکھنے والے، اے ذوالجلال والاکرام، اے فریاد کرنے والوں کے فریادرس، اور پناہ مانگنے والوں کی آخری پناہ، اے دکھی لوگوں کے درد دور کرنے والے، اور اے غم زدوں کے راحت رساں، اور اے مجبوروں کی دعاء قبول کرنے والے، اور اے بے چینیوں کے دور کرنے والے اور اے سارے جہانو ں کے معبود اور اے سب رحم کرنے والوں سے بڑھ کر رحم کرنے والے! ساری ضرورتیں تیرے ہی سامنے پیش ہیں)

❁ اَللّٰھُمَّ اقْسِمْ لَنَا مِنْ خَشْیَتِکَ مَا تَحُوْلُ بِہٖ بَیْنَنَا وَ بَیْنَ مَعَاصِیْکَ وَ مِنْ طَاعَتِکَ مَا تُبَلِّغُنَا بِہٖ جَنَّتَکَ وَ مِنَ الْیَقِیْنِ مَا تُھَوِّنُ بِہٖ عَلَیْنَا مَصَائِبَ الدُّنْیَا وَ مَتِّعْنَا بِاَ سْمَاعِنَا وَ اَبْصَارِنَا وَ قُوَّتِنَا مَا اَحْیَیْتَنَا وَ اجْعَلِ الْوَارِثَ مِنَّا وَ اجْعَلْ ثَاْرَنَا عَلٰی مَنْ ظَلَمَنَا وَ انْصُرْنَا عَلٰی مَنْ عَادَانَا وَ لَا تَجْعَلْ مُصِیْبَتَنَا فِیْ دِیْنِنَا وَ لَا تَجْعَلِ الدُّنْیَا اَکْبَرَ ھَمِّنَا وَ لَا مَبْلَغَ عِلْمِنَا وَلَا غَایَۃَ رَغْبَتِنَا وَ لَا تُسَلِّطْ عَلَیْنَا مَنْ لَا یَرْحَمُنَا ، اَللّٰھُمَّ زِدْنَا وَ لَا تَنْقُصْنَا وَ اَکْرِمْنَا وَلَا تُھِنَّا وَ اَعْطِنَا وَ لَا تَحْرِمْنَا وَ اٰثِرْ نَا وَ لَا تُؤْثِرْ عَلَیْنَا وَ اَرْضِنَا عَنْکَ وَ ارْضَ عَنَّا .

(اے اللہ! ہمیں اپنا اتنا خوف عطا فرما جس کی وجہ سے تو ہمارے درمیان اور اپنی نافرمانیو ں کے درمیان حائل ہوجائے اور اپنی اتنی فرمابرداری کا جذبہ عطا فرما جس کے سبب تو ہم کو اپنی جنت تک پہنچا دے اور وہ یقین دے جس کی وجہ سے تو دنیا کی مصیبتوں کا جھیلنا ہم پر آسان کردے اور جب تک ہم کو زندہ رکھے

ہمارے کانوں اور ہماری آنکھوں اور ہماری قوت سے ہم کو فائدہ اٹھانے کا موقع عطا فرما، اور ہماری زندگی تک ان کو قائم رکھ کر ہمارا وارث بنا، اور ہمارا بدلہ صرف ان لوگوں پر ڈال دے جو ہم پر ظلم کریں اور ہماری مدد فرما ان لوگوں کے مقابلہ میں جو ہم سے دشمنی رکھیں اور ہماری مصیبت ہمارے دین پر نہ ڈال اور دنیا کو ہمارا بڑا مقصد نہ بنا اور نہ اس کو ہمارے علم کی انتہائی پرواز بنا، اور جو ہمارے اوپر رحم نہ کھائے اس کو ہم پر مسلط نہ فرما۔ اے اللہ ہم کو بہت دے، اور کم نہ کر اور ہمیں عزت دے اور ذلیل نہ کر اور ہم کو عطا فرما اور محروم نہ رکھ اور ہم کو ترجیح دے اور ہم پر دوسروں کو ترجیح نہ دے اور ہم کو اپنے سے راضی کر دے اور تو ہم سے راضی ہو جا)

۞ اَللّٰھُمَّ اَعِنِّیْ عَلٰی دِیْنِی بِالدُّنْیَا وَ عَلٰی آخِرَتِیْ بِالتَّقْوٰی وَ احْفَظْنِیْ فِیْمَا غِبْتُ عَنْهُ وَ لَا تَكِلْنِیْ اِلٰی نَفْسِیْ فِیْمَا حَضَرْتُهٗ ، یَا مَنْ لَا تَضُرُّهُ الذُّنُوْبُ وَ لَا تَنْقُصُهُ الْمَغْفِرَةُ ، هَبْ لِیْ مَا لَا یَنْقُصُكَ وَ اغْفِرْ لِیْ مَا لَا یَضُرُّكَ ، اِنَّكَ اَنْتَ الْوَهَّابُ.

(اے اللہ! دنیا کے ذریعہ ہمارے دین میں ہماری مدد فرما اور تقویٰ کے ذریعہ ہماری آخرت میں مدد کر اور میری غیر حاضری میں میرے معاملات کی نگرانی کر اور میری موجودگی میں معاملات میری ذات کے سپرد نہ فرما، اے وہ بے نیاز ذات کہ بندوں کے گناہ جس کا کچھ بگاڑ نہیں سکتے اور جس کی بخشش اس کے یہاں کوئی کمی نہیں کرتی، جو (بخشش) تیرے یہاں کمی کا باعث نہیں ہوتی وہ مجھے عطا کر دے اور وہ چیز (گناہ) جس سے تیرا کچھ بگڑتا نہیں وہ معاف کر دے، بلاشبہ تو بڑا داتا ہے)

۞ اَللّٰھُمَّ اِنَّا نَسْئَلُكَ فَرَجًا قَرِیْبًا وَ صَبْرًا جَمِیْلًا وَ رِزْقًا وَّاسِعًا وَ الْعَافِیَةَ مِنْ جَمِیْعِ الْبَلَاءِ وَ نَسْئَلُكَ تَمَامَ الْعَافِیَةِ وَ دَوَامَ الْعَافِیَةِ وَ

الشُّکْرَ عَلَى الْعَافِيَةِ وَ الْغِنٰى عَنِ النَّاسِ وَ لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ الْعَلِيِّ الْعَظِيْمِ .

(اے اللہ! ہم تجھ سے مال میں کشادگی، صبر جمیل، کشادہ روزی اور ہر بلاء سے عافیت مانگتے ہیں، اور ہم تجھ سے مکمل عافیت، دائمی عافیت اور عافیت پر شکر گزاری، اور لوگوں سے بے نیازی مانگتے ہیں، قوت نہیں ہے اور نہ طاقت مگر اللہ تعالیٰ کی مدد سے، جو بہت بلند اور بڑی عظمت والا ہے)

۞ يَا مَنْ لَا تَرَاهُ الْعُيُوْنُ وَلَا تُخَالِطُهُ الظُّنُوْنُ وَلَا يَصِفُهُ الْوَاصِفُوْنَ وَلَا تُغَيِّرُهُ الْحَوَادِثُ وَلَا يَخْشَى الدَّوَائِرَ ، يَعْلَمُ مَثَاقِيْلَ الْجِبَالِ وَ مَكَائِيْلَ الْبِحَارِ وَ عَدَدَ قَطْرِ الْاَمْطَارِ وَ عَدَدَ وَرَقِ الْاَشْجَارِ وَ عَدَدَ مَا اَظْلَمَ عَلَيْهِ اللَّيْلُ وَ اَشْرَقَ عَلَيْهِ النَّهَارُ وَلَا تُوَارِيْ مِنْهُ سَمَاءٌ سَمَاءً وَلَا اَرْضٌ اَرْضًا وَلَا بَحْرٌ مَا فِيْ قَعْرِهٖ وَلَا جَبَلٌ مَا فِيْ وَعْرِهٖ ، اِجْعَلْ خَيْرَ عُمْرِيْ آخِرَهٗ وَ خَيْرَ عَمَلِيْ خَوَاتِمَهٗ وَ خَيْرَ اَيَّامِيْ يَوْمَ اَلْقَاكَ فِيْهِ يَا وَلِيَّ الْاِسْلَامِ وَاَهْلِهٖ ثَبِّتْنِيْ بِهٖ حَتّٰى اَلْقَاكَ .

(اے وہ ذات جس کو آنکھیں نہیں دیکھ پاتیں اور جس کو خیالات نہیں پاسکتے اور نہ بیان کرنے والے اس کی حمد وثنا بیان کرسکتے ہیں، اور نہ زمانہ کے حوادث اس میں کوئی اثر پیدا کرسکتے ہیں، اور نہ وہ گردش زمانہ سے اس کو کوئی ڈر ہے، پہاڑوں کے وزن، دریاؤں کے پیمانے، بارشوں کے قطرے اور درختوں کے پتے سب اس کے علم میں ہیں، جو ان سب چیزوں کو جانتی ہے جس پر رات کی تاریکی چھاتی ہے اور دن روشنی ڈالتا ہے، جس سے آسمان دوسرے آسمان کو چھپا نہیں سکتا، اور نہ زمین دوسری زمین کو، اور نہ سمندر اس چیز کو چھپا سکتے ہیں جو ان کی تہہ میں ہے، اور نہ

پہاڑ جوان کے پتھریلے جگر میں ہیں! تو میری عمر کا بہترین حصہ آخر عمر میں اور میرے سب سے اچھے عمل خاتمہ کے وقت مقدر فرمادے اور میرے دنوں میں سب سے بھلا دن وہ بنادے جس میں تجھ سے ملوں یعنی قیامت)

۞ اَللّٰهُمَّ اجْعَلْ فِيْ قَلْبِيْ نُوْرًا وَّ فِيْ بَصَرِيْ نُوْرًا وَّ فِيْ سَمْعِيْ نُوْرًا وَّعَنْ يَمِيْنِيْ نُوْرًا وَّعَنْ شِمَالِيْ نُوْرًا وَّمِنْ خَلْفِيْ نُوْرًا وَّمِنْ اَمَامِيْ نُوْرًا وَّمِنْ فَوْقِيْ نُوْرًا وَّمِنْ تَحْتِيْ نُوْرًا وَّاجْعَلْ فِيْ عَصَبِيْ نُوْرًا وَّفِيْ لَحْمِيْ نُوْرًا وَّفِيْ شَعْرِيْ نُوْرًا وَّفِيْ بَشَرِيْ نُوْرًا وَّ فِيْ لِسَانِيْ نُوْرًا وَّفِيْ دَمِيْ نُوْرًا وَّ فِيْ عِظَامِيْ نُوْرًا وَّ فِيْ قَبْرِيْ نُوْرًا ،اَللّٰهُمَّ اَعْظِمْ لِيْ نُوْرًا وَّ اَعْطِنِيْ نُوْرًا وَّ اجْعَلْ لِيْ نُوْرًا وَّ اجْعَلْنِيْ نُوْرًا .

(اے اللہ! میرے دل میں نور ڈال دے، میری آنکھوں اور کان میں نور ڈال دے، میرے دائیں بائیں، پیچھے سامنے نور عطا فرما، اور میرے اوپر سے اور میرے نیچے سے (ہر سمت سے) نور ہی نور کردے۔ اے اللہ مجھے نور عطا فرما اور میرے لیے نور کردے اور میرے پٹھوں میں نور پیدا فرمادے اور میرے گوشت میں نور، میرے خون میں نور، میرے بالوں میں نور، میری کھال میں نور، میری زبان میں نور، اور میری جان میں نور بخش دے، اور مجھ کو نورِ عظیم عطا کردے، اور مجھے سرتاپا نور ہی نور بنادے)

۞ اَللّٰهُمَّ اَصْلِحْ لِيْ دِيْنِيَ الَّذِيْ هُوَ عِصْمَةُ اَمْرِيْ وَ اَصْلِحْ لِيْ دُنْيَايَ الَّتِيْ فِيْهَا مَعَاشِيْ وَ اَصْلِحْ لِيْ آخِرَتِيَ الَّتِيْ فِيْهَا مَعَادِيْ وَ اَحْيِنِيْ مَا كَانَتِ الْحَيٰوةُ خَيْرًا لِّيْ وَتَوَفَّنِيْ اِذَا كَانَتِ الْوَفَاةُ خَيْرًا لِّيْ وَ اجْعَلِ الْحَيٰوةَ زِيَادَةً لِّيْ فِيْ كُلِّ خَيْرٍ وَ اجْعَلِ الْمَوْتَ رَاحَةً لِّيْ مِنْ كُلِّ شَرٍّ .

(اے اللہ! میرا دین سنوار دے جس میں میرے ہر کام کی حفاظت ہے، اور میری دنیا درست کر دے جس میں میرا گزران ہے، اور میری آخرت درست فرما دے جس میں مجھے لوٹ کر جانا ہے، اور مجھے زندہ رکھ جب تک میرے لیے زندگی اچھی ہو اور دنیا سے اٹھا لے جب میرے لیے موت بہتر ہو اور میری زندگی کو ہر بھلائی میں زیادتی کا سبب بنا دے اور موت کو ہر برائی سے راحت کا باعث بنا دے)

❁ **لَاۤاِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ الْحَلِيْمُ الْكَرِيْمُ، سُبْحَانَ اللّٰهِ رَبِّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ، اَسْئَلُكَ مُوْجِبَاتِ رَحْمَتِكَ، وَ عَزَائِمَ مَغْفِرَتِكَ، وَ مُنْجِيَاتِ اَمْرِكَ، وَالسَّلَامَةَ مِنْ كُلِّ اِثْمٍ، وَ الْغَنِيْمَةَ مِنْ كُلِّ بِرٍّ، وَّالْفَوْزَ بِالْجَنَّةِ وَالنَّجَا ةَ مِنَ النَّارِ، اَللّٰهُمَّ لَا تَدَعْلَنَا ذَنْبًا اِلَّا غَفَرْتَهٗ وَلَا هَمًّا اِلَّا فَرَّجْتَهٗ، وَ لَا ضُرًّا اِلَّا كَشَفْتَهٗ ، وَلَا كَرْبًا اِلَّا نَفَّسْتَهٗ ، وَلَا مَرَضاً اِلَّا شَفَيْتَهٗ، وَلَا فَقِيْراً اِلَّا اَغْنَيْتَهٗ، وَلَاضَالًّا اِلَّا هَدَيْتَهٗ، وَلَا حَاجَةً مِّنْ حَوَائِجِ الدُّنْيَا وَ الْاٰخِرَةِ هِيَ لَكَ رِضًى اِلَّا قَضَيْتَهَا يَا اَرْحَمَ الرَّاحِمِيْنَ .**

(تیرے سوا معبود کوئی نہیں، جو بڑا بردبار بڑے کرم والا ہے، اللہ تعالیٰ کی ذات جملہ عیوب سے پاک ہے جو عرش عظیم کا رب ہے، تمام تعریفیں اللہ تعالیٰ کے لیے ہیں جو تمام جہانوں کا رب ہے، میں تجھ سے وہ تمام اسباب جو تیری رحمت کے لیے لازم ہوں اور وہ سب اسباب جن سے تیری مغفرت یقینی ہو جائے اور ہر عیب سے حفاظت اور ہر نیکی کا مال غنیمت اور ہر گناہ سے سلامتی مانگتا ہوں، کوئی میرا گناہ باقی نہ چھوڑ جس کو تو بخش نہ دے اور نہ کوئی فکر جس سے تو رہائی نہ دیدے اور نہ کوئی کڑھن جس کو تو دور نہ فرما دے اور نہ کوئی تکلیف جس کا تو ازالہ نہ فرما دے اور نہ کوئی ایسی ضرورت جو تیری رضامندی کا سبب ہو جس کو تو پورا نہ فرما دے، اے رحم کرنے والوں

میں سب سے بڑھ کر رحم کرنے والے!)

﴿ اَللّٰھُمَّ رَبَّ السَّمٰوٰتِ السَّبۡعِ وَرَبَّ الۡعَرۡشِ الۡعَظِیۡمِ، اَللّٰھُمَّ اکۡفِنِیۡ کُلَّ مُھِمٍّ مِنۡ حَیۡثُ شِئۡتَ وَ مِنۡ اَیۡنَ شِئۡتَ، حَسۡبِیَ اللّٰہُ لِدِیۡنِیۡ، حَسۡبِیَ اللّٰہُ لِمَا اَھَمَّنِیۡ، حَسۡبِیَ اللّٰہُ لِمَنۡ بَغٰی عَلَیَّ ، حَسۡبِیَ اللّٰہُ لِمَنۡ حَسَدَنِیۡ ،حَسۡبِیَ اللّٰہُ لِمَنۡ کَادَنِیۡ بِسُوۡءٍ ، حَسۡبِیَ اللّٰہُ عِنۡدَ الۡمَوۡتِ ،حَسۡبِیَ اللّٰہُ عِنۡدَ الۡمَسۡئَلَۃِ فِی الۡقَبۡرِ، حَسۡبِیَ اللّٰہُ عِنۡدَ الۡمِیۡزَانِ، حَسۡبِیَ اللّٰہُ عِنۡدَ الصِّرَاطِ حَسۡبِیَ اللّٰہُ لَا اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ عَلَیۡہِ تَوَکَّلۡتُ وَھُوَ رَبُّ الۡعَرۡشِ الۡعَظِیۡمِ .

(اے اللہ! ساتوں آسمانوں کے مالک اور عرشِ عظیم کے مالک، اے اللہ! میری ہر مشکل میں کافی ہوجا، جس طرح سے تو چاہے اور جس جگہ سے تو چاہے، میرے دین کے لیے اللہ تعالیٰ ہی مجھے کافی ہے، مجھے فکر میں مبتلا کرنے والی باتوں میں بھی اللہ تعالیٰ ہی کافی ہے، مجھ پر ظلم کرنے والے کے بارے میں اللہ تعالیٰ ہی مجھے کافی ہے، مجھ پر حسد کرنے والے سے اللہ تعالیٰ ہی مجھے کافی ہے، مجھے برائی سے فریب دینے والے سے بھی اللہ تعالیٰ ہی کافی ہے، مجھے موت کے وقت اللہ تعالیٰ ہی کافی ہے، مجھے قبر میں سوال کے وقت اللہ تعالیٰ ہی مجھے کافی ہے، مجھے میزان کے پاس اللہ تعالیٰ ہی کافی ہے، مجھے پل صراط کے اوپر اللہ تعالیٰ ہی کافی ہے، سوائے اس کے معبود کوئی نہیں، اسی پر میں نے بھروسہ کیا ہے، وہی عرشِ عظیم کا مالک ہے)

﴿ اَللّٰھُمَّ اِنِّیۡ اَعُوۡذُ بِکَ مِنَ الشَّکِّ فِی الۡحَقِّ بَعۡدَ الۡیَقِیۡنِ وَ اَعُوۡذُ بِکَ مِنَ الشَّیۡطَانِ الرَّجِیۡمِ وَ اَعُوۡذُ بِکَ مِنۡ شَرِّ یَوۡمِ الدِّیۡنِ .

(اے اللہ! میں یقین کے بعد حق میں شک کرنے سے تیری پناہ چاہتا ہوں، اور شیطان مردود سے بھی تیری پناہ چاہتا ہوں، اور قیامت کے دن کے شر سے تیری پناہ

چاہتا ہوں)

۞ اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُ بِکَ مِنَ الْعَجْزِ وَ الْکَسَلِ وَ الْهَرَمِ وَ الْمَغْرَمِ وَ الْمَأْثَمِ وَ مِنْ عَذَابِ النَّارِ وَ فِتْنَةِ النَّارِ وَ عَذَابِ الْقَبْرِ وَ فِتْنَةِ الْقَبْرِ وَ شَرِّ فِتْنَةِ الْغِنٰی وَ شَرِّ فِتْنَةِ الْفَقْرِ وَ مِنْ شَرِّ فِتْنَةِ الْمَسِیْحِ الدَّجَّالِ وَ مِنْ فِتْنَةِ الْمَحْیَا وَ الْمَمَاتِ وَ مِنَ الْقَسْوَةِ وَ الْغَفْلَةِ وَالْعَیْلَةِ وَ الذِّلَّةِ وَ الْمَسْکَنَةِ وَ الْکُفْرِ وَالشِّرْکِ وَالْفُسُوْقِ وَ الشِّقَاقِ وَ السُّمْعَةِ وَ الرِّیَاءِ وَمِنَ الصَّمَمِ وَالْبَکَمِ وَ الْجُنُوْنِ وَالْجُزَامِ وَ سَیِّئِ الْاَسْقَامِ وَ ضَلَعِ الدَّیْنِ وَمِنَ الْهَمِّ وَ الْحُزْنِ وَالْبُخْلِ وَغَلَبَةِ الرِّجَالِ وَمِنْ اَنْ اُ رَدَّ اِلٰی اَرْذَلِ الْعُمُرِ وَ فِتْنَةِ الدُّنْیَا .

(اے اللہ میں تیری پناہ لیتا ہوں کم ہمتی سے اور سستی سے، اور بزدلی سے اور بہت بڑھاپے سے اور قرض سے اور گناہ سے اور دوزخ کے عذاب سے اور دوزخ کے فتنہ سے اور قبر کے فتنہ سے اور قبر کے عذاب سے اور مالداری کے برے فتنہ سے اور محتاجی کے برے فتنہ سے اور مسیح دجال کے برے فتنہ سے اور زندگی اور موت کے فتنہ سے اور سخت دلی سے اور غفلت سے اور تنگ دستی سے، اور ذلت سے اور خواری سے اور کفر سے اور فسق سے اور ضد اضدی سے اور سنانے سے اور دکھانے سے اور بہرے ہونے سے اور گونگے ہونے سے اور جنون سے اور جذام سے اور بری بیماریوں سے اور بار قرض سے اور فکر سے اور غم سے اور بخل سے اور لوگوں کے دبالینے سے اور اس سے کہ ناکارہ عمر تک پہنچوں اور دنیا کے فتنہ سے)

۞ اَللّٰهُمَّ اجْعَلْ صَبَاحَنَا صَبَاحَ الصَّالِحِیْنَ وَ مَسَائَنَا مَسَاءَ الشَّاکِرِیْنَ وَ اَلْسِنَتَنَا اَلْسِنَةَ الذَّاکِرِیْنَ وَ اَبْدَانَنَا اَبْدَانَ الْمُطِیْعِیْنَ وَ

قُلُوبَنَا قُلُوبَ الْخَاشِعِينَ وَ اَرْوَاحَنَا اَرْوَاحَ الْمُحِبِّينَ وَ سُرُوْرَنَا سُرُوْرَ الْعَارِفِيْنَ وَ اَبْصَارَنَا اَبْصَارَ النَّاظِرِيْنَ وَ خُشُوْعَنَا خُشُوْعَ الْمُذْنِبِيْنَ النَّادِمِيْنَ وَ اَعْمَالَنَا اَعْمَالَ الْمَقْبُوْلِيْنَ دِيْنَنَا دِيْنَ النَّبِيِّ مُحَمَّدٍ صلی اللہ علیہ وسلم سَيِّدِ الْمُرْسَلِيْنَ وَ خَاتَمِ النَّبِيِّيْنَ .

(اے اللہ! ہمارے صبح صالحین کی صبح جیسی ،اور ہماری شام شاکرین کی شام جیسی ،اور ہماری زبانیں ذکر کرنے والوں کی زبانیں جیسی ،اور ہمارے بدن اطاعت شعاروں کے بدن جیسے ،اور ہمارے دل خشوع والوں کے دل جیسے ،اور ہماری روحیں تجھ سے محبت کرنے والوں کی روحیں جیسی ،اور ہماری خوشی عارفین کی خوشی جیسی ،اور ہماری آنکھیں عبرت سے دیکھنے والوں کی آنکھیں جیسی ،اور ہماری عاجزی کو شرمندہ گنہ گاروں کی عاجزی جیسا ،اور ہمارے اعمال کو مقبول بندوں کے اعمال جیسا ،اور ہمارا دین نبی محمد سید المرسلین وخاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کا دین بنادے)

۞ اَللّٰهُمَّ اسْتُرْعَوْرٰتِنَاوَاٰمِنْ رَوْعٰتِنَا

(اے اللہ ہمارے عیوب کی پردہ پوشی فرما اور ہمیں خوف کی چیزوں سے امن نصیب فرما)

۞ اَللّٰهُمَّ اِنِّىْ اَتُوْبُ اِلَيْكَ مِنَ الْمَعَاصِىْ لَآاَرْجِعُ اِلَيْهَااَبَدًا. اَللّٰهُمَّ مَغْفِرَتُكَ اَوْسَعُ مِنْ ذُنُوْبِىْ وَرَحْمَتُكَ اَرْجٰى عِنْدِىْ مِنْ عَمَلِىْ. اَللّٰهُمَّ اِنَّكَ عَفُوٌّ تُحِبُّ الْعَفْوَ فَاعْفُ عَنَّا يَا كَرِيْمُ.

اے اللہ میں تیری جناب میں اپنی تمام نافرمانیوں سے توبہ کرتا ہوں، اب کبھی پھر ایسا نہیں کروں گا ،اے اللہ تیری بخشش میری گناہوں سے کہیں زیادہ گنجائش رکھتی

ہے اور تیری رحمت میرے عملوں سے کہیں زیادہ امید کے لائق ہے۔اے اللہ تو بڑی بخشش کرنے والا ہے تو معاف کرنا پسند کرتا ہے۔لہٰذا ہم سب کو معاف کردے)

۞اَللّٰھُمَّ اِنِّیۡ اَسۡئَلُکَ عِیۡشَۃً نَقِیَّۃً وَمِیۡتَۃً سَوِیَّۃً وَمَرَدًّا غَیۡر مَخۡزِیٍّ وَلَافَاضِحٍ.

اے اللہ میں تجھ سے صاف زندگی اور آسان موت اور ایسی لوٹنے کی جگہ چاہتا ہوں جہاں نہ رسوائی ہو نہ خواری)

۞اَللّٰھُمَّ طَھِّرۡقَلۡبِیۡ مِنَ النِّفَاقِ وَعَمَلِیۡ مِنَ الرِّیَاءِ وَلِسَانِیۡ مِنَ الۡکِذۡبِ وَعَیۡنِیۡ مِنَ الۡخِیَانَۃِ فَاِنَّکَ تَعۡلَمُ خَائِنَۃَ الۡاَعۡیُنِ وَمَاتُخۡفِی الصُّدُوۡرِ.

(اے اللہ میرا دل پاک کردے نفاق سے اور میرا عمل ریاء سے،اور میری زبان جھوٹ سے اور میری آنکھ خیانت سے، کیوں کہ تو خوب جانتا ہے آنکھوں کی چوری اور جو سینوں میں چھپا ہوا ہے)

۞اَللّٰھُمَّ لَکَ الۡحَمۡدُ وَ اِلَیۡکَ الۡمُشۡتَکٰی وَ بِکَ الۡمُسۡتَغَاثُ وَ اَنۡتَ الۡمُسۡتَعَانُ وَ لَا حَوۡلَ وَ لَا قُوَّۃَ اِلَّا بِاللّٰہِ الۡعَلِیِّ الۡعَظِیۡمِ

(اے اللہ! تیرے ہی لیے سب تعریف ہے،اور تیری ہی طرف شکایت جاتی ہے اور تجھ ہی سے فریاد کی جاتی ہے،اور تو ہی مدد چاہے جانے کے قابل ہے،اور کوئی طقت وقوت نہیں ہے مگر اللہ بلند وعظمت والے ہی سے)

فقط

محمد شعیب اللہ خان

دعائے سری و جہری

پر محققانہ نظر

کلمات

حضرت مولانا عبدالجمیل صاحب باقوی رحمہ اللہ

(ناظم جمعیۃ علماء ہندوانمباڑی)

الحمدللّٰہ و کفی وسلام علی عبادہ الذین اصطفیٰ

شریعت نے جن احکام کی ذمہ داری مسلمانوں پر عائد کی ہے، ان میں کلمہ طیّبہ کی شہادت کے بعد نماز کا درجہ اولین ہے، نماز اجتماعی ہو یا انفرادی تکبیر تحریمہ سے شروع ہو کر تسلیم پر ختم ہو جاتی ہے، نماز کے اندر اور باہر کے ارکان وشرائط میں کسی بھی قسم کی کمی ہو تو قطعاً نماز نہیں ہوتی، واجبات، سنن ومستحباب جن کی شریعت نے نشاندہی کی ہے وہ ظاہر ہیں، اور جن حقائق کا ذکر کیا گیا ہے، ان میں امت کے کسی بھی فقہی مسلک کا اختلاف نہیں ہے، البتہ سورہ فاتحہ کی قرأت پر فرض وواجب کی اصطلاح فقہ حنفی وشافعی وغیرہ میں زیر بحث آسکتی ہے، ہاں قرأۃ خلف الامام فاتحہ ایک بنیادی مسئلہ ہے، جس میں صرف حنفی فقہ کے عاملین اپنا انفرادی حق حدیث ہی کی بنا پر محفوظ رکھتے ہیں۔

زیر نظر رسالہ میں جس مسئلہ پر بحث کی گئی ہے وہ بعد نماز دعا بالجہر کا مسئلہ ہے جس کو بعض مصالح پسند حضرات نے نزاعی مسئلہ بنا دیا ہے اور رواج عام کی وجہ سے وہ نماز کا ایک داخلی مسئلہ بن گیا ہے۔

حضرت مولانا مفتی محمد کفایت اللہ صاحب رحمۃ اللہ نے لکھا ہے کہ اگر کسی سنت غیر مؤکدہ اور مستحب فعل پر کثرت سے التزام ہونے لگے تو اس کو گاہے چھوڑ دینا چاہئے، تاکہ اس کی حقیقت فرض کے روبرو واضح ہو جائے اور جو مسنون منصوص ہی نہ ہو اس کی حقیقت واضح ہے، دُعا کی فضیلت اپنی جگہ مسلم ہے اور آپ کو اختیار رہے کہ گھنٹوں بیٹھ کر تسبیحات اور دعائیں اپنی اپنی کرتے رہیں، نہ امام کو آپ مجبور کریں نہ امام آپ کو مجبور کرے، نماز ختم ہوگئی، آپ کیوں بیٹھے امام کو دیکھ رہے ہیں؟

بعض جگہ بعد سلام زور سے ''الحمدللہ'' پھر خاموشی طاری ہو جاتی ہے اور آخر میں ''والحمدللہ رب العالمین'' یہ بھی مناسب نہیں ،امام اپنی دعا کرے، مقتدی اپنی دعا کریں، بعض جگہ؛ بل کہ اکثر جگہ لمبی لمبی غیر ماثور دعاؤں کو زور زور سے پڑھتے ہیں اور مسبوق (پیچھے نماز پوری کرنے والوں) کی نمازوں میں خلل کا وبال اپنے سر لیتے ہیں۔ عزیزم مولوی محمد شعیب اللہ صاحب نے جس مسئلہ ''دعاء بعد الصلوۃ الفریضۃ'' پر بحث فرمائی ہے وہ اپنی جگہ حق وصداقت کی حامل ہے۔

اللہ تعالیٰ قبول کرے اور ہم سب کو اپنی مرضیات پر چلنے کی توفیق دے۔

(مولانا)
محمد عبدالجمیل خطیب باقوی
ناظم جمعیۃ علماء ہندوانمباڑی

التقریظ

حضرت مولانا ذاکر حسن صاحب عبیدی دامت برکاتہم

الحمدللّٰہ و کفیٰ و سلام علی عبادہ الذین اصطفیٰ امابعد:

میں نے رسالہ "**التحقیق الحری فی ندب الدعاء الخفی**" مصنفۂ مولانا محمد شعیب اللہ صاحب مفتاحی حرفاً حرفاً سنا، ماشاء اللہ اپنے موضوع پر محققانہ کلام فرمایا ہے، اور میں اس سے دعاء جہری کے بدعت ہونے میں بالکل متفق ہوں اور میرے نزدیک مروجہ دعاء جہری محدثات بدعیہ میں سے ہے۔

اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو صحیح طریقہ اختیار کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

ابوالناصر ذاکر حسن عبیدی

(غفر اللہ لہٗ)

التقریظ

حضرت استاذی مولانا مفتی مہربان علی صاحب مدظلہ العالی

(مفتی وصدر مدرس مدرسہ امداد الاسلام ہرسولی مظفر نگر)

الحمدللّٰہ المنعم الجواد الذی لارادّلفضلہ والصلوۃ والسلام علی سیدالاولین والآخرین سیدنا ومولانامحمدو آلہ واصحابہ الطاھرین وبعد.

إنی قد طالعت الرسالۃ المساۃ ''القضآء لدفع نزاع الدعآء بین الجھروالخفآء'' الفاضل النبیل، البارع الذکی، الفائق علی أصحابہ ''المولوی محمدشعیب اللہ خان الحنفی'' صانہ اللّٰہ تعالیٰ عن کل شروفساد،فرأیتھاصحیحۃً نافعۃً نافذۃً عنداولی الالباب ومن خالفہ فقدخالف اھل السنۃ بلاارتیاب.

فجزاہ اللّٰہ تعالیٰ خیرالجزآء والثواب فی یوم الحشر والحساب وھواعلم بالحق والصواب والیہ المرجع والمآب .

فقط

کتبہ الأحقر مھربان علي عفی عنہ
خادم التدریس بالمدرسۃ العربیۃ إمداد الإسلام
ھرسولی مظفرنغر، یوبی

نوٹ: یہ تقریظ حضرت استاذی دامت برکاتہم نے میرے اصل عربی مختصر رسالہ پر تحریر فرمائی تھی اس وقت اس کا یہی نام تجویز ہوا تھا جو حضرت نے تحریر فرمایا ہے۔ پھر میں نے اس کا ''التحقیق الحری'' نام رکھا جس میں بعض چیزوں کا اضافہ ہوا تھا اور اردو ترتیب میں تو بہت کچھ اضافہ وترمیم ہوئی ہے، جیسا کہ مقدمہ میں بھی اس کا اظہار کیا گیا ہے۔ فقط: محمد شعیب اللہ خان

بسم اللہ الرحمن الرحیم

تقدمۂ کتاب

الحمدللّٰہ الذی یعلم السر والخفی والصلوۃ والسلام علی افضل اولی النھی وعلی آلہ واصحابہ الذین ھم بدور الھدیٰ.

امابعد: یہ ایک رسالہ ہے جس میں دعاء ''سری'' کا مندوب ومستحب ہونا اور مروجہ دعا ''جہری'' کا بدعت ہونا قرآن، حدیث اور فقہ کی روشنی میں ثابت کیا گیا ہے اور اس کے لکھنے کی وجہ یہ ہوئی کہ جب بعض جگہوں پر مستحب ومندوب طریقہ پر دعاء سری کی گئی تو عوام میں ایک ہیجان وتردد پیدا ہوگیا، کیوں کہ انہوں نے اس کو رواج ورسم کے خلاف پایا، اور بعض جگہ دعاء جہری کو اس درجہ تک پہنچادیا گیا ہے کہ جب وہاں طریق مستحب کو اختیار کرتے ہوئے سری دعا کی گئی تو فساد ونزاع تک نوبت پہنچی اور بعض جگہ اس امام کو جو سری دعاء کرتا ہے برطرف کردیا گیا اور امامت سے الگ کردیا گیا۔

یہ سب حالات دیکھ کر خیال ہوا کہ اس فساد عقیدہ وعمل کی اصلاح نہایت ضروری ہے، چناں چہ راقم السطور نے ایک رسالہ عربی میں لکھ کر حضرت مرشدی مسیح الامت دامت برکاتہم کی خدمتِ اقدس میں پیش کیا، حضرت نے دیکھ کر فرمایا کہ عربی میں نفع عام نہیں ہوتا، اس لیے اس کو اُردو میں منتقل کردیا جائے، اسی حکم کی تعمیل میں یہ اُردو رسالہ لکھا جارہا ہے، جو ترتیب کے لحاظ سے عربی رسالہ سے مختلف ہے، نیز بعض جگہ مضامین میں ترمیم واضافہ بھی ہوا ہے، اس رسالہ کو میں نے چند فصول پر

مرتب کیا ہے۔

فصل اول میں دعاء سری کا استحباب ہونا ثابت کیا گیا ہے، دوسری فصل میں دعاء سری کے فوائد عظیمہ بیان کیے گئے ہیں، تیسری فصل میں ان حضرات کے دلائل کے جوابات دیئے گئے ہیں جو دعاء میں جہر کو افضل قرار دیتے ہیں، چوتھی فصل میں دعاء جہری کے احکام بالتفصیل مذکور ہیں۔

ناظرین کرام سے گذارش ہے کہ اگر کچھ سہو وخطا پائیں تو دامنِ عفو میں جگہ دے کر اطلاع دینے کی زحمت گوارہ فرمائیں اور اپنی دعوات صالحہ میں احقر کو فراموش نہ کریں۔

فقط

محمد شعیب اللہ خان المفتاحی

آرمسٹرانگ روڈ، محلّہ بیدواڑی، بنگلور

بسم اللہ الرحمن الرحیم

فصل اول

دعاء میں سر واخفا کا مستحب ہونا

اصل وافضل دعاء میں سر واخفاء ہی ہے؛ بل کہ سر واخفاء تمام ہی اذکار وادعیہ میں اصل اور مندوب ومستحب ہے اور دعاء سری کا مستحب ہونا ،قرآن، حدیث اور اجماع سب سے ثابت ہے، جس سے خود بخود دعاء میں جہر کا غیر مستحب ہونا معلوم ہوتا ہے۔ ذیل میں ہم دلائلِ شرعیہ ذکر کرتے ہیں۔

دلائل قرآنیہ

سب سے پہلے ہم قرآنی دلائل ذکر کرتے ہیں:

(۱) ﴿اُدْعُوْا رَبَّكُمْ تَضَرُّعاً وَّخُفْيَةً اِنَّهٗ لايُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ﴾ (الاعراف:۵۵)

(اپنے رب سے گڑگڑا کر اور آہستہ سے دعاء کرو، بلاشبہ اللہ تعالیٰ حد سے گذر جانے والوں کو پسند نہیں کرتا)

اس آیت شریفہ میں حضرت حق جل مجدہ نے دعا کا حکم دیتے ہوئے لفظ

''خفیۃ'' کو بصراحت ذکر فرمایا ہے، اور بلاغت کا قاعدہ ہے کہ کلام میں اگر قید مذکورہ ہو تو قید ہی مقصودِ کلام ہوتی ہے، لہٰذا مقصودِ باری تعالیٰ خفیۃً دعاء کا امر کرنا ہے نہ کہ مطلق دعاء کا، پس اس آیت سے صاف معلوم ہوا کہ دعا میں اخفاء مقصود و مطلوب ہے، لہٰذا یہ مندوب واصل ہے۔

چناں چہ امام فخر الدین الرازی رَحِمَہُ اللہُ اپنی تفسیر کبیر میں اسی آیت کے تحت فرماتے ہیں:

''اعلم ان الاخفاء معتبر فی الدعاء ویدل علیه وجوه، الاول هذه الآیة فانها نزل علی أنه تعالی اَمَرَ بالدعاء مقروناً بالاخفاء وظاهر الامرِ الوجوبُ فان لم یحصل فلا اقل من کونه ندباً.'' (۱)

(جاننا چاہیے کہ دعاء میں اخفا کا اعتبار کیا گیا ہے اور اس پر بہت سے دلائل ہیں، اول یہی آیت ہے کہ یہ آیت اس پر دلالت کرتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے دعا کا حکم اخفا کے ساتھ ساتھ دیا ہے اور ظاہر امر وجوب کے لیے ہوتا ہے، اگر وجوب حاصل نہ ہو تو استحباب سے تو کم نہیں)

حاصل یہ کہ اللہ تعالیٰ نے مطلق دعا کا حکم نہیں فرمایا؛ بل کہ اس دعا کا امر فرمایا ہے جو اخفاء کے ساتھ مقرون ہو، اور امر کا اصل تقاضا تو یہ ہے کہ آہستہ دعاء کرنا واجب ہو کیوں کہ اصول فقہ کا قاعدہ ہے کہ امر وجوب کے لیے ہوتا ہے اور اگر بعض دوسرے دلائل کی وجہ سے وجوب حاصل نہ ہو تو پھر استحباب تو حاصل ہو ہی جائے گا، لہٰذا دعاء کا اخفاء کرنا مستحب ومندوب ہوگا، اس سے کم نہیں ہوگا۔

---

(۱) تفسیر کبیر: ۱۴۶/۱۳

(۲)﴿وَاِذَاسَأَلَکَ عِبَادِیْ عَنِّی فَاِنِّی قَرِیبٌ اُجِیْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ﴾ (البَقَرَة:۱۸۶)

(اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ) اے نبی! جب میرے بندے آپ سے سوال کریں میرے بارے میں تو (آپ کہہ دیجئے) کہ میں قریب ہوں میں دعاء کرنے والے کی دعاء جب وہ دعاء کرے قبول کرتا ہوں۔)

اس آیتِ شریفہ کے شانِ نزول سے پتہ چلتا ہے کہ اس آیت میں بھی دعاء میں آواز پست کرنے اور بلند نہ کرنے کی تلقین وتعلیم کی گئی ہے۔ چناں چہ **المحدث البغوی** نے **معالم التنزیل** (۷۳/۱) میں حضرت ضحاک سے اور علامہ سیوطی رحمہ اللہ نے جلالین میں علامہ بیضاوی رحمہ اللہ نے اپنی تفسیر بیضاوی میں اور حافظ ابن القیم رحمہ اللہ نے بدائع الفوائد میں اس کا شان نزول یہ بیان کیا ہے کہ (بعض) صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ یارسول اللہ! کیا ہمارا رب ہم سے قریب ہے کہ ہم اس سے مناجات وسرگوشی کریں یا ہم سے دور ہے کہ ہم اس کو ندا دیں اور پکاریں؟

اس سوال کے جواب میں یہ آیت نازل ہوئی جس میں یہ بتایا گیا ہے کہ حضرت حق جل مجدہ کو پکارنے اور آواز دینے کی ضرورت نہیں کیوں کہ وہ قریب ہے۔ لہٰذا مناجات وسرگوشی پر اکتفاء کرنا چاہیے۔

حافظ ابن القیم رحمہ اللہ اس شان نزول کو نقل کرکے فرماتے ہیں:

”وَهٰذَا يَدُلُّ على إرشادهم المناجاة في الدُّعاء لا لِلنّداءِ الذي هو رفع الصوت فإنهم عن هذا سألوا، فأجيبوا بأنَ

ربَّهُمْ تبارکَ وَتعالیٰ قریبٌ لایحتاجُ فی دعائهٖ الی النداء وإنما یسأل مسئلة القریب المناجی لا البعید المنادی.“ (۱)

(یہ شان نزول اس پر دلالت کر رہا ہے کہ صحابہ کرام کو دعاء میں مناجات (سرگوشی) کی تعلیم دی گئی ہے نہ کہ نداد ینے کی، جو آواز بلند کرنے کا نام ہے کیوں کہ انہوں نے اسی کے بارے میں سوال کیا تھا، پس ان کو یہ بتلایا گیا ہے کہ ان کا رب قریب ہے، اس سے دعاء کرنے میں اس کو پکارنے یا چلّانے کی ضرورت نہیں، لہذا اس سے قریب سے سرگوشی کرنے والے کی طرح مانگے نہ کہ دور سے پکارنے والے کی طرح)۔

اس آیت سے بھی دعاء میں اخفاء کا اصل ومستحب ہونا؛ بل کہ مامور بہ ہونا خوب واضح ہوگیا۔

(۳) ﴿ذِکرُ رَحْمتِ رَبّکَ عَبْدَهٗ زَکَرِیاً اِذنادٰی رَبَّهٗ نِداآءً خَفِیاً﴾ (مریم: ۳۲)

(یہ تذکرہ ہے تیرے پروردگار کی اپنے بندے زکریا (علیہ السلام) پر رحمت کا جب کہ انہوں نے اپنے رب کو آہستہ آواز سے پکارا تھا)۔

حضرت زکریا علیہ السلام نے آخری عمر میں جو دعاء کی تھی کہ میں بوڑھا ہوگیا ہوں، میرے بال پک گئے ہیں اور ہڈیاں ضعیف وناتواں ہو چکی ہیں۔ یہ دعاء جیسا کہ حضرت حق جل مجدہ نے تشریح فرمائی ہے، اخفاء اور پست آواز سے کی تھی۔

یہ اللہ تعالیٰ کو اس قدر پسند آیا کہ اس دعاء سری کا مقام ومدح وتعریف میں تذکرہ

(۱) بدائع الفوائد: ۳/۵۱۹

فرمایا۔جس سے معلوم ہوتا ہے کہ آہستہ دعاء کرنا اللہ تعالیٰ کو محبوب و پسند ہے۔ لہٰذا دعائے خفی وسری مستحب ہوگی۔

ایک شبہ اور جواب

اگر کسی کو شبہ ہو کہ آیت میں کہا گیا ہے کہ حضرت زکریا عَلَیْہِ السَّلَامُ نے نداء دی، جو اس طرف مشیر ہے کہ دعاء میں آواز بلند کی گئی تھی، تو اس کا جواب یہ ہے کہ عرف کے لحاظ سے اگرچہ نداء اس دعاء کو کہتے ہیں جس میں آواز بلند کی گئی ہو، لیکن لغت کے لحاظ سے لفظ نداء عام ہے اور مطلق دعاء کے لیے استعمال ہوتا ہے، اس لیے کہا جائے گا کہ یہاں لفظ نداء لغوی معنی میں استعمال ہوا ہے، یہی وجہ ہے کہ نداء کو خفی سے موصوف ومقید کیا ہے، ورنہ پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ ندا بمعنی عرفی لے کر اس کو خفی سے مقید بھی کریں۔(فافھم)

دلائل حدیثیہ

قرآن کے بعد نمبر ہے احادیث وراویات کا اور ان میں بھی دعاء وذکر کے خفی وسری ہونے کو مستحب وافضل بتایا گیا ہے۔

(۱) حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے جب بلند آواز سے تکبیر کہی اور اللہ کو پکارا تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر تنبیہ کرتے ہوئے فرمایا:

"اِرْبعوْاعَلیٰ اَنْفُسِکُمْ اِنَّکُمْ لاتَدْعُوْنَ اَصَمَّ ولاغَائِباًاِنَّکُمْ تَدْعُوْنَ سَمِیْعاً اَقربَ اِلیٰ اَحَدِکُمْ مِنْ عُنُقِ رَاحِلتِه (او کماقال)." (۱)

(اپنی جانوں پر رحم کرو تم کسی بہرے اور غائب کو نہیں پکار رہے ہو؛ بل کہ تم تو سمیع اور قریب کو پکار رہے ہو جو تم سے ہر ایک کے اس سے زیادہ قریب ہے جتنا کہ کوئی اپنی سواری کی گردن سے قریب ہوتا ہے)

اس حدیث میں صحابہ کرام کو بلند آواز سے تکبیر کہنے پر جو کہ دعاء ہی ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے تنبیہ فرمائی ہے اور اس پر کراہت کا اظہار فرمایا۔ معلوم ہوا کہ دعاء میں آواز کا بلند کرنا محبوب نہیں؛ بل کہ آواز کا پست کرنا ہی افضل ومحبوب ہے۔

ایک شبہ کا جواب

اگر کوئی کہنے لگے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا قول "ارْبَعُوا علیٰ انفسِکُمْ"

(۱) بخاری: ۲۷۷۰، مسلم: ۴۸۴۷

سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ یہ نہی شفقت ہے تو اس سے جہر کی کراہت وعدم مشروعیت کیسے لازم آئی ؟ تو میں کہتا ہوں کہ یہ اگر نہی شفقت ہے تو بلا شبہ جہر کی عدم مشروعیت اس سے ثابت نہیں ہوتی اور نہ ہم اس کی عدم مشروعیت کے قائل و مدعی ہیں ؛ بل کہ ہم جہر کی مشروعیت و جواز پر آگے مستقل فصل میں بحث بھی کریں گے ؛ لیکن یہاں اس فصل میں ہمیں صرف یہ ثابت کرنا ہے کہ جہر مطلقاً افضل و مستحب نہیں ؛ بل کہ واقعہ اس کے خلاف ہے اور اس حدیث سے ہمیں صرف اس قدر بات اخذ کرنی ہے کہ اگر جہر مطلقاً افضل ہوتا اور شرع میں کوئی درجہ استحباب وندب رکھتا تو بہ طور شفقت ہی سہی اس سے منع کیسے کیا جاتا، کیوں کہ ایسی چیز سے منع کرنا گویا ایک اچھی چیز سے روکنا ہے حالاں کہ ایسا ممکن نہیں۔

حاصل یہ کہ نہی شفقت بھی اسی فعل پر ہوگی جو محمود و مستحب فی نفسہٖ نہ ہو۔ پس جہر بالدعاء بھی مستحب نہ ہوگا؛ بل کہ محض جائز ہوگا، جیسا کہ آگے آرہا ہے۔ (فافهم)

(۲) مسند ابو یعلی میں بروایت حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد نقل کیا ہے:

"وہ ذکر خفی جس کو فرشتے بھی نہ سن سکیں ستر درجہ دو چند ہوتا ہے۔ جب قیامت میں حق تعالیٰ شانہ تمام مخلوق کو حساب کے لیے جمع فرمائیں گے اور کراماً کاتبین اعمال نامے لے کر آئیں گے تو ارشاد ہوگا کہ فلاں بندہ کے اعمال دیکھو اور کچھ باقی ہے؟ وہ عرض کریں گے کہ ہم نے کوئی بھی ایسی چیز نہیں چھوڑی جو نہ لکھی ہو اور محفوظ نہ ہو تو ارشاد ہوگا کہ ہمارے پاس اس کی ایسی نیکی ہے جو تمہارے علم میں نہیں، وہ ذکر خفی ہے۔"(۱)

---

(۱) مسند ابو یعلی: ۱۸۲/۸

(۳) حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا ہی سے منقول ہے:

''جس ذکر کو فرشتے بھی نہ سن سکیں وہ اس ذکر پر جس کو وہ سن لیں ستر درجے بڑھا ہوا ہے۔''(۱)

(۴) حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل کرتے ہیں:

''بہترین ذکر، ذکر خفی ہے اور بہترین رزق وہ ہے جو کفایت کا درجہ رکھتا ہو۔''(۲)

(۵) ایک حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد نقل کیا گیا ہے:

''اللہ کو ذکر خامل سے یاد کیا کرو، کسی نے دریافت کیا کہ ذکرِ خامل کیا ہے؟ ارشاد فرمایا کہ مخفی ذکر۔''(۳)

(۶) حضرت عبادہ ابن الصامت رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل کیا ہے:

''بہترین ذکر ذکر خفی ہے اور بہترین رزق وہ ہے جو کافی ہو جائے۔''(۴)

ان پانچ روایات کو حضرت شیخ الحدیث مولانا زکریا صاحب رحمۃ اللہ نے بھی اپنی کتاب فضائل ذکر میں نقل فرمایا ہے اور آخری روایتِ عبادۃ کے بارے میں لکھا ہے:

---

(۱) ابن ابی شیبہ :۶/۸۵،شعب الایمان :۱/۴۰۷

(۲) صحیح ابن حبان :۳/۹۱،موارد الظمآن :۱/۵۷۷،ابن ابی شیبہ :۷/۸۴

(۳) کتاب الزهد ابن مبارک: ۱/۵۰،الجامع الصغیر:

(۴) مسند احمد:۱/۱۸۰،مسندابویعلی :۲/۸۱،شعب الایمان :۷/۲۹۷

''ابن حبان اور ابویعلی نے اس حدیث کو صحیح بتایا ہے۔ ان سب روایات سے بھی ذکر خفی کا افضل و بہتر ہونا ثابت ہوتا ہے۔ اس میں اگر چہ ذکر کا بیان ہے؛ مگر یہ لفظ دعاء کو بھی شامل اور عام ہے؛ بل کہ ایک ابنِ حبان کی روایت میں یہ بھی آیا ہے کہ ''**خیر الدعاء الخفی**'' (کہ بہترین دعاء خفی وسری ہے)''(۱)

(۷) « روی ابن السنی عن ابی امامة رضی اللّٰہ عنه مادنوتُ مِن رَسُولِ اللّٰهِ فِی دُبُرِصَلوٰةٍ مَکتوبةٍ وَلاتَطوّعٍ اِلَّاسَمِعتُه یقول اَللّٰهُمَّ اغفِرلِی ذُنُوبِی وَخَطَائِی کُلَّهااَللّٰهُمَّ انعِشنِی وَاجبُرنِیْ وَاهْدِنِی لِصَالِحِ الاعمالِ والاخلاقِ اِنهُ لایهدِی لِصَالِحِهاوَلَایَصرِفُ سَیِّهَااِلَّا اَنتَ. »(۲)

(محدث ابن السنی رحمہ اللہ نے حضرت ابوامامۃ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ فرمایا میں جب بھی فرض یا نفل نماز کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے قریب ہوا تو ہمیشہ یہ دعا کرتے ہوئے سنا کہ اے اللہ! میرے گناہ اور تمام خطائیں معاف فرما دیجیے۔ اے اللہ! مجھے بلند کیجیے اور میرے نقصان کی تلافی فرمایئے اور مجھے عمدہ اعمال واخلاق کی ہدایت فرمایئے کیوں کہ اچھے اعمال واخلاق کی طرف آپ کے سوا کوئی ہدایت نہیں کرسکتا۔ اور نہ برے اعمال واخلاق کو سوائے آپ کے کوئی ہٹا سکتا ہے۔)

---

(۱) اس حدیث کو بحوالہ بحر الرائق فتح الملهم ۲/۵۲، میں نقل کیا گیا ہے

(۲) معجم کبیر طبرانی: ۸/۲۰۰

اس حدیث سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ خود رسول اللہ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نماز کے بعد آہستہ دعاء فرماتے تھے، ورنہ حضرت ابوامامہ رضی اللہ عنہ کو قریب سے سننے کی کیا ضرورت تھی۔ اور اس حدیث میں اس امر کی بھی تصریح ہے کہ یہ آپ کا دعاء سری کرنا فرض و نفل ہر دو نمازوں کے بعد تھا، صرف سنن ونوافل کے بعد کا عمل نہیں۔ نیز یہ بھی واضح رہے کہ یہ صحابی ابوامامہ رضی اللہ عنہ صرف ایک وقت کا یا کبھی کسی وقت کا نہیں؛ بل کہ آپ کا استمراری ودوامی فعل نقل کر رہے ہیں کہ جب بھی میں قریب ہو کر سنا تو آپ یہ پڑھتے ہوتے۔ معلوم ہوا کہ یہ آپ کا امر اتفاقی نہیں؛ بل کہ دوامی عمل و معمول تھا۔

علامہ ابن القیم رحمۃ اللہ نے بدائع الفوائد میں اور امام رازی رحمۃ اللہ نے تفسیر کبیر میں حضرت حسن بصری (۱) رحمۃ اللہ سے نقل کیا ہے:

"قال الحسن بين دعوة السرودعوة العلانية سبعون ضعفاً." (۲)

(حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ فرماتے ہیں کہ علانیہ دعاء اور سری دعاء کے درمیان ستر درجوں کا فرق ہے)

حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ کی شخصیت سے کون ناواقف ہوگا، سبھی جانتے ہیں

(۱) حافظ ابن قیم اور امام رازی نے اس جگہ مطلقاً بلا نسبت حسن لکھا ہے اور علماء نے فرمایا ہے کہ کتب تفسیر یا ابحاث تفسیریہ میں حسن کا اطلاق کیا جائے تو مراد حسن بصریؒ ہوتے ہیں۔ اس لیے ہم نے یہاں حسن بصریؒ لکھ دیا ہے، پھر اس کے بعد جب معالم التنزيل للمحدث البغوی ۲۴/۸ دیکھا تو اس میں امام بغویؒ نے اس قول کو حسن بن علی رضی اللہ عنہ کی طرف منسوب کیا ہے۔ پس اگر یہ حضرت حسن بن علی رضی اللہ عنہ کا قول ہے تو پھر اس کے وقوع حکمی ہونے میں کوئی کلام نہیں جب کہ اس کے بعد کے راویوں کا حال معلوم ہو جائے۔ فقط

(۲) بدائع الفوائد: ۵۱۷/۳ و تفسیر کبیر: ۱۰۷/۱۴

کہ آپ تابعی اور ایک بلند پایہ محدث اور وقیع النظر فقیہ تھے۔ ان کا بیان ہے کہ دعاء سری میں ستر درجے زیادہ فضیلت ہے اور ظاہر ہے کہ یہ مراتب کا فرق و درجات کا تفاوت کوئی رائے اور قیاس کی چیز نہیں ہے؛ بل کہ یہ امر غیر معقول محض نقل سے متعلق ہے۔ اس لیے حسن بصری رحمہ اللہ جو کہ سب کے نزدیک ثقہ ہیں، اپنی طرف سے تو یہ نہیں کہہ سکتے؛ بل کہ کسی صحابی سے سن کر ہی کہہ سکتے ہیں اور صحابی بھی اس کو اپنی جانب سے نہیں کہہ سکتے؛ بل کہ وہ بھی سرکار دو عالم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سن کر کہہ سکتے ہیں۔ اس بنا پر یہ حکم کہ دعاء سری و جہری میں ستّر درجوں کا تفاوت ہے، مرفوع حدیث کے حکم میں ہوگا؛ کیوں کہ صحابہ کرام کے غیر قیاسی اقوال احادیث مرفوعہ کے حکم میں ہوتے ہیں جیسا کہ محدثین و اصولیین نے تصریح کی ہے، لیکن چوں کہ یہاں صحابی کا نام مذکور نہیں، اس لیے یہ حدیث مرسل کے حکم میں ہوگی؛ کیوں کہ مرسل اس روایت کو کہتے ہیں جس میں تابعی بلا واسطہ صحابی کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کریں۔

چناں چہ حافظ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ نے ایک تابعی حضرت موسیٰ بن طلحہ رحمہ اللہ کا ایک غیر مدرک بالقیاس قول نقل کر کے اپنی کتاب ”التلخیص الکبیر“ میں فرمایا:

”قلت هذاموقوف علىٰ موسىٰ بن طلحةؒ ولكنّه فى حكم المرفوع لان هٰذا لايقال من قبل الراى فهوعلى هذامرسل.“ (۱)

(میں کہتا ہوں کہ یہ (قول) موسیٰ بن طلحہ رحمہ اللہ پر موقوف ہے

(۱) التلخیص الحبیر: ۳۴/۱

لیکن یہ مرفوع کے حکم میں ہے؛ کیوں کہ بات رائے اور قیاس سے نہیں
کہی جاسکتی، پس اس بنا پر یہ مرسل ہے)

مطلب اس عبارت کا وہی ہے جو اوپر کی سطور میں ہم نے وضاحت سے لکھا ہے۔ پس یہ حسن بصری رحمۃ اللہ کا قول بھی مرسل حدیث کے حکم میں ہوگا اور مرسل کی حجیت کے سب قائل ہیں سوائے امام شافعی رحمۃ اللہ کے اور امام شافعی رحمۃ اللہ کے نزدیک بھی اگر مرسل دوسرے مرفوعات ومسندات سے یا آیتِ قرآنی سے یا فتاویٰ صحابہ سے مؤید ہو تو مقبول وقابل احتجاج ہو جاتا ہے اور یہاں ایک مرفوع صحیح حدیث بھی اس کی تائید کرتی ہے کہ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ قول ابوالشیخ نے بسند صحیح روایت کیا ہے کہ ایک سری دعاء ستّر جہری دعاؤں کے برابر ہے (**کذافی العزیزی: ۲/۲۹**) اس طرح جو روایات اوپر گذری ہیں وہ بھی اس قول کی تائید کرتی ہیں، پس یہ مرسل بھی سب کے نزدیک قابل احتجاج ہے۔ البتہ اتنی بات رہ جاتی ہے کہ حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ کے بعد رواۃ کون ہیں اور کیسے ہیں اس کی مجھے تحقیق نہیں۔ پس اگر ان رواۃ کا ثقہ ہونا معلوم ہو جائے تو یہ روایت مرفوع حکمی مرسل ہوگی۔

ایک سوال اور جواب

یہاں کوئی یہ سوال کرسکتا ہے کہ اوپر کے بعض دلائل میں دعاء کا ذکر نہیں ہے۔ بل کہ تکبیر و ذکر اللہ کا بیان ہے اور ذکر ہی کے اخفاء کا استحباب ثابت ہوتا ہے نہ کہ دعاء سری کا تو پھر دعوی اور دلیل میں مطابقت نہ ہوئی کہ دعویٰ تو ہے دعاء سری کا مستحب ہونا اور دلیل میں ذکر سری کا مستحب ہونا ثابت کیا گیا ہے۔

تو اس کا جواب یہ ہے کہ دعاء بھی دراصل ایک ذکر ہی ہے؛ کیوں کہ دعاء کے

معنی طلب کرنے یا پکارنے کے ہیں اور دعاء میں اللہ کو پکارا جاتا ہے اور ذکر میں بھی اللہ کو پکارا جاتا ہے اور اس کو طلب کیا جاتا ہے، اس لیے ذکر کو دعاء کہا جاتا ہے۔ چناں چہ ایک حدیث میں ہے کہ "افضل الدعاء الحمد لله"، یعنی اللہ کی تعریف کرنا سب سے افضل دعاء ہے۔ اس میں آپ نے الحمد للہ کو دعاء؛ بل کہ افضل دعاء فرمایا ہے۔ حالاں کہ الحمد للہ محض ثناء وذکر ہے۔

حافظ ابن القیم رحمۃ اللہ اس کی وجہ بیان کرتے ہیں کہ حمد محبت کو متضمن ہے کہ کسی کی تعریف اس سے محبت ہی کی وجہ سے کی جاتی ہے اور محبت طلب محبوب کے اعلیٰ انواع واقسام میں سے ہے، لہٰذا حمد کرنے والا اپنے محبوب کا طالب ہے، اس لیے حمد کرنے والے کو داعی کہنا زیادہ مناسب ہے اس کو داعی کہنے سے جو اپنی حاجت طلب کر رہا ہے، پس تعریف کرنے والا، ذکر کرنے والا بھی دعاء کرنے والا ہی ہے اور ذکر دعاء ہی ہے۔ (۱)

غرض یہ کہ ذکر تو افضل دعاء ہے، جب افضل دعاء کا حکم معلوم ہو گیا کہ سر واخفاء سے ہونا چاہئے تو دیگر ادعیہ کا حکم بھی معلوم ہو گیا کہ وہ بھی اخفاء سے ہونا چاہئے، یہی مستحب ہے۔

اجماع ائمہ امت

دعاء سری کا مستحب وافضل ہونا قرآن وحدیث سے ثابت ہو گیا۔ اس بنا پر علماء امت وائمہ ملت خصوصاً ائمہ اربعہ کا اس بات پر اجماع ہے کہ دعاء سری وخفی ہی افضل ومستحب ہے، اس میں اختلاف صرف ابن حزم ظاہری رحمۃ اللہ کا ہے۔ علامہ شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ نے فتح الملہم شرح مسلم میں علامہ ابن بطال رحمۃ اللہ سے

(۱) بدائع الفوائد: ۵۲۱/۳

نقل فرمایا ہے۔

''اَصْحَابُ الْمَذَاهِبِ الْمُتبعةِ وَغَيْرُهُمْ مُتَّفِقُوْنَ عَلٰى عَدَمِ اِسْتِحْبَابِ رَفْعِ الصَّوْتِ بِالتَّكْبِيْرِ وَالذِّكْرِ حاشاابن حزم رحمہ اللہ .'' (۱)

(مذاہب (اربعہ) والے جن کی اتباع واقتداء کی جاتی ہے، وہ اوران کے علاوہ دوسرے حضرات اس پر متفق ہیں کہ تکبیر اورذکر میں آواز بلند کرنا مستحب نہیں ہے سوائے ابن حزم رحمہ اللہ کے۔)

اورعلامہ نووی رحمہ اللہ شارح مسلم نے بھی اپنی شرح مسلم میں ابن بطال رحمہ اللہ سے اسی طرح نقل کیا ہےاورحضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ اپنے رسالہ استحباب الدعوات میں فرماتے ہیں:

''اِعْلَمْ اَنَّهٗ لاخلاف بَيْنَ مَذَاهب الْاَرْبَعَةِ فِي نُدُب لِدُعَاءِ سرًّا وَالفذ.'' (۲)

(جاننا چاہئے کہ اس بات میں کہ امام ومنفرددونوں کے لیے دعاءسری مندوب ومستحب ہے، چاروں مذاہب میں سے کسی کا اختلاف نہیں۔)

اورحضرت شیخ الحدیث مولانا زکریا رحمہ اللہ اپنی کتاب ''الابواب والتراجم'' میں نقل فرماتے ہیں:

''ثمّ رفعُ الصّوتِ بالذّکرلمْ یقُلْ بِهٖ اَحَدٌ مِنَ الائمة

---

(۱) فتح الملهم: ۲/۱۷

(۲) استحباب الدعوات مندرجہ امدادالفتاوی:۱۰۸

والفقهاء الاّ ابن حزم." (۱)

(پھر ذکر میں آواز بلند کرنا ائمہ اور فقہاء میں سے کسی کا قول نہیں سوائے ابن حزم کے۔)

ان نقول معتبرہ سے معلوم ہوا کہ فقہاء حنفیہ، شافعیہ، مالکیہ اور حنابلہ اور ان کے علاوہ دیگر علماء وائمہ سب کے نزدیک دعاء سری ہی مستحب ہے اور جہر کے استحباب کا سوائے علامہ ابن حزم ظاہری رحمۃ اللہ اور بعض حضرات کے کوئی قائل نہیں تو یہاں اگرچہ اجماع امت کا تحقق تو نہیں لیکن اس میں کیا شک کہ جمہور ائمہ اور خصوصاً مذاہب اربعہ کا اس پر اتفاق ہے کہ سری ہی مستحب ہے۔

(۱) الابواب والتراجم: ۳۰۴/۲

فصل ثانی

دعائے سری کے فوائد

حافظ ابن القیم رحمہ اللہ نے ”بدائع الفوائد“ میں دعاء سری کے متعدد فوائد بیان کیے ہیں۔ جن کو مولانا ادریس صاحب کاندھلوی رحمہ اللہ نے ”التعلیق الصبیح“ میں نقل فرمایا ہے۔ ہم یہاں پر ان کی تلخیص کرتے ہیں۔

پہلا فائدہ

دعاء سری میں پہلا فائدہ تو یہ ہے کہ یہ اعظم ایمان ہے۔ کیوں کہ دعاء سری کرنے والا (بزبانِ حال گویا یوں کہتا ہے) کہ وہ اس بات کو خوب جانتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس دعاء خفی کو بھی سنتا ہے اور وہ اس جیسا نہیں جس نے یہ کہہ دیا تھا کہ اگر ہم زور سے دعاء کریں تو اللہ تعالیٰ سنتا ہے اور اگر ہم اخفاء کریں تو نہیں سنتا۔ حاصل یہ کہ دعاء سری کرنا گویا اللہ کی صفات پر ایمان کی پختگی کی علامت ہے، اس لیے یہ اعظم الایمان ہے۔

دوسرا فائدہ

یہ ہے کہ اخفاء اور سر ادب و تعظیم میں بڑھا ہوا ہے، اسی لیے بادشاہوں سے بلند آواز سے خطاب و سوال نہیں کیا جاتا۔ البتہ بادشاہوں کے پاس اس قدر اخفاء کیا جاتا ہے کہ وہ اس کو سن سکیں۔ جو شخص ان کے سامنے آواز بلند کرتا ہے وہ ان کے غیض وغضب کا نشانہ بنتا ہے اور خداوند تعالیٰ تو دعاء خفی واخفی کو بھی سنتا ہے تو اس کے بارگاہِ عالی و دربار اقدس میں سوائے اخفاء واسرار کے کوئی چارہ نہیں، کیوں کہ

آواز بلند کرنا ادب اور تعظیم کے خلاف ہے۔

تیسرا فائدہ

یہ ہے کہ اخفاء کرنا، آہ وزاری اور خشوع میں کہ یہی دعاء کی روح اور مغز ہے مبالغہ پیدا کرتا ہے اور خشوع وتضرع کرنے والا دراصل اس مسکین وذلیل کی طرح سوال کرنے والا ہے جس کا قلب ٹوٹا ہوا ہو اور اعضاء نڈھال ہو چکے ہوں اور اس کی آواز دب چکی ہو حتیٰ کہ اس کی وجہ سے اس کی ذلت ومسکنت، انکسار وتضرع اب اس حد تک پہنچنے کے قریب ہو کہ اس کی زبان بھی منکسر ہو جائے اور وہ بول نہ سکے، پس اس کا قلب تو سائل ہے اور زبان ساکت ہے۔ جب دعاء کرنے والے کی یہ حالت ہوتی ہے تو بھلا اس حالت کے ساتھ وہ آواز بلند کیسے کرسکتا ہے جب کہ حالت تخشع وتضرع سے زبان ہی ساکت ہے۔ حاصل یہ ہے کہ دعاء کرنے والا ایسے دعاء کرے جیسے کہ اوپر بیان کیا گیا ہے پھر خود ہی جہر کرنا دشوار ہو جائے گا اور اگر جہر کرے گا تو روحِ دعاء یعنی خشوع وخضوع میں خلل واقع ہوگا۔

چوتھا فائدہ

یہ ہے کہ اخفاء کرنا اور اِسرار کرنا اخلاص میں مبالغہ پیدا کرتا ہے کہ ریاء کا اس میں اندیشہ نہیں یا بہ نسبت جہر کے کم ہے۔ اور اخلاص مطلوب ومامور بہ ہے تو اخفاء بھی کہ اس کا ذریعہ ہے مطلوب ہوا۔

پانچواں فائدہ

یہ ہے کہ اخفاء وسر سے دعاء میں جمعیت قلب بھی پیدا ہوتی ہے، برخلاف اس کے آواز کا بلند کرنا قلب کو منتشر کر دیتا ہے اور دل کو بانٹ دیتا ہے۔

چھٹا فائدہ

جو کہ نکات عجیبہ میں سے ہے یہ ہے کہ اخفاء کرنا اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ دعاء کرنے والا اللہ تبارک وتعالیٰ سے قریب ہے اور وہ اللہ تعالیٰ سے بالکل قریب ہونے کی وجہ سے اس طرح سوال کررہا ہے، جیسے ایک قریب دوسری قریب چیز سے سوال کرتا ہے اور ایک دوست دوسرے دوست سے مناجات وسرگوشی کرتا ہے، اس طرح نہیں جیسے ایک غیر دوسرے غیر سے منادی کرتا ہے۔ پس جس کا قلب اس قرب خداوندی کا استحضار کرے گا اور اس کا تصوّر رلائے گا وہ حتی الامکان اخفاء ہی کرے گا اور آواز بلند کرنے کو غیر مستحسن جانے گا۔ پس یہ ایک خاص قرب ہے عام قرب نہیں جو سب (مومن وکافر) کو حاصل ہے (لہٰذا جو شخص دعاء میں جہر کرتا ہے اس کو یا تو یہ قرب حاصل نہیں یا اس قرب کا استحضار نہیں)

ساتواں فائدہ

اخفاء کرنے میں یہ ہے کہ زبان ملال اور اعضاء وجوارح تعب وتکان محسوس نہیں کرتے جس سے دیر تک دعاء ومناجات میں لگے رہنا ممکن ہے، بخلاف اس کے بلند آواز سے دعا کرنے والا جلد تھک جاتا ہے جس سے آگے ہمت ٹوٹ جاتی ہے اور وہ محروم رہ جاتا ہے۔

آٹھواں فائدہ

یہ ہے کہ اخفاء آدمی کو ہمت توڑنے والی، تشویش میں مبتلا کرنے والی اور ہمت کو پست کرنے والی چیزوں سے دور رکھنے میں مفید ہے کیوں کہ جب وہ اخفاء کرتا ہے تو اس کو کوئی نہیں جانتا لہٰذا تشویش وغیرہ بھی اس کو لاحق نہ ہوگی اور جب

جہر کرے گا تو جنات اور انسانوں کی شریر ارواح اس کو جان کر اسے تشویش میں ڈال دیں گی اور ان ارواح کا تعلق ہی اس شخص کی ہمت کو بانٹ دیتا ہے۔ پس (توجہ کی کمی کی وجہ سے) دعاء کا اثر ضعیف ہو جائے گا اور اس کو دیکھ کر اس کی ہمت ٹوٹ جائے گی اور یہ دعاء ہی سے رک جائے گا، بخلاف اس کے جب اخفاء کرے گا تو اس مفسدہ سے مامون ہوگا۔

نواں فائدہ

جو کہ خاص طور پر سالکینِ طریقت کے لیے انمول جوہر اور نسخۂ بے بہا ہے یہ ہے کہ سب سے بڑی نعمت توجۂ الی اللہ اور اللہ کی عبادت اور دنیا سے منقطع ہو کر اس کی طرف ملتفت و متوجہ ہونا ہے اور یہ سب باتیں دعاء میں ہوتی ہیں، کہ بندہ سب سے الگ ہو کر خدائے عزوجل کی طرف باشتغال کلی متوجہ ہوتا ہے تو دعاء کرنے والے کو یہ نعمت و دولتِ عظیم حاصل ہے جو ساری نعمتوں سے بڑھ کر ہے اور ظاہر ہے کہ ہر نعمت کے خواہ وہ چھوٹی ہو یا بڑی حاسد ہوتے ہیں تو بھلا اس عظیم ترین عبادت کے حاسد کیوں نہ ہوں گے۔ لہٰذا سلامتی کی بات یہ ہے کہ حاسد سے نعمت کو چھپایا جائے اور اس سے اخفاء کیا جائے۔ اسی لیے حضرت یعقوب علیہ السلام نے حضرت یوسف علیہ السلام کو ان کا خواب سن کر فرمایا تھا کہ تمہارے بھائیوں سے اس خواب کو بیان نہ کرنا کہ کہیں حسد کرنے لگیں۔

حافظ ابن القیم رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"کتنے صاحب قلب و صاحب حال تھے کہ جنہوں نے اپنے احوال کو دوسروں سے بیان کر دیا اور انہیں اس کی خبر کر دی تو غیروں نے ان احوال و کیفیات کو سلب کر لیا اور یہ لوگ ہاتھ ملتے رہ گئے۔ پس

یہ دعا جس کے اخفا کا حکم ہے، بڑے خزانوں میں سے ہے جس کو حاسدین کی آنکھوں سے چھپا کر رکھنا چاہئے، اس لیے دعاء خفی و سری ہونی چاہئے۔''

یہ مختلف فوائد ہیں جن کو ہم نے علامہ ابن القیم رحمۃ اللہ کے کلام سے اخذ کر کے اپنے الفاظ میں پیش کیا ہے۔ اس کے علاوہ بھی دعاء سری میں بے شمار فوائد ہیں جو انسان غور کرے تو خود سمجھ میں آسکتے ہیں۔

فصل ثالث

استحباب جہر کے دلائل کا جواب

اب ہم ان لوگوں کے دلائل اور اس کے جوابات کو ذکر کرتے ہیں جو دعاء جہری کے مستحب ہونے کے قائل ہیں۔ ان لوگوں میں سے علامہ ابن حزم ظاہری رحمہ اللہ بھی ہیں۔ ہم یہاں ان کی اصل دلیل کے علاوہ بعض ان دلائل کو بھی معرضِ بحث میں لائیں گے جو ان حضرات کے مستدل بننے کا احتمال بھی رکھتے ہیں۔

استحبابِ جہر کی پہلی دلیل

«عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللّٰه عنه قَالَ كنتُ اَعْرِفُ اِنْقِضَاءَ صَلٰوةِ رَسُوْلِ الله صلی اللہ علیہ وسلم بالتَكْبِيْرِ.» (۱)

(حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز سے فراغت کو تکبیر سے پہچانتا تھا۔)

علامہ ابن حزم ظاہری رحمہ اللہ اور بعض لوگوں نے اس حدیث سے جہر کے مستحب ہونے پر استدلال کیا ہے؛ کیوں کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ ہی سے بخاری شریف میں نقل کیا گیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں بلند آواز سے ذکر ہوتا تھا، جب کہ لوگ فرض نماز سے فارغ ہوتے۔ اس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ تکبیر و ذکر و دعاء میں جہر مستحب ہے۔

---

(۱) مشکوۃ: ۸۸

استدلال مذکور پر نظر

مگراس حدیثِ ابن عباس سے استحباب جہر پر استدلال محل نظراور مخدوش ہے؛ کیوں کہ اس میں سنیت واستحباب کے قرائن و آثار معلوم نہیں ہوتے ؛ کیوں کہ سنیت کے لیے مع ترکہ احیاناً ثبوت استمرار شرط ہے اور استحباب میں اگرچہ استمرار و دوام شرط نہیں۔ مگراس قدر ضروری ہے کہ نبی کریم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کے فعل کے ساتھ یا بلا فعل اس پر آپ سے ترغیب منقول وثابت ہو۔ جیسا کہ کتب فقہ بحرالرائق، درمختار مع ردالمحتار وغیرہ میں اس کی وضاحت اور تحقیق ہے اوراس حدیث سے صرف اتنا ثابت ہوا ہے کہ عہد نبی کریم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم میں جہر بالذکر ہوا ہے اور یہ بات کہ آپ کا یہ عمل استمراری تھا یا صحابہ کا فعل دوامی تھا اس پر نہ تو خود حدیث مذکور دلالت کرتی ہے اور نہ ہی خارج سے اس کی تائید ہوتی ہے اور لفظ وصیغۂ ''کان'' سے استمرار و دوام پر استدلال ممکن نہیں اس (لفظ کان) کی تحقیق کچھ آگے چل کر ہم بیان کریں گے۔

پس حاصل یہ ہے کہ سنیت کے لیے استمرار ضروری ہے اور یہ ثابت نہیں اور استحباب کے لیے کم ازکم ترغیب ضروری ہے، حالاں کہ جہر پر ترغیب تو درکنار اس کے خلاف سر و اخفاء پر ترغیب کا اوپر ثبوت ہو چکا جس سے خود ہی اس کی عدمِ ترغیب ثابت ہوتی ہے، لہٰذا اس سے نہ سنیت ثابت ہوتی ہے اور نہ استحباب۔

پھر اگر یہ بات سنت یا مستحب تھی تو سوال یہ ہے کہ کیا یہی ابن عباس رضی اللہ عنہ جو اس فعلِ رسول صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم وفعلِ صحابہ کے ناقل ہیں اس پر عامل تھے؟ غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ جس وقت حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ یہ بات نقل کر رہے تھے اس وقت نہ آپ جہر پر عامل تھے اور نہ ہی دیگر صحابۂ کرام اس کے پابند تھے، ورنہ حضرت

ابن عباس رضی اللہ عنہ یوں نہ کہتے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں ایسا ہوتا تھا، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ نہ تو ابن عباس کے نزدیک کوئی سنت تھی نہ ہی صحابہ کرام کے نزدیک اور ظاہر ہے کہ صحابہ کرام اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دعاء وذکر میں جہر پر استمرار ومداومت کرتے دیکھتے تو کبھی اس کو ترک نہ کرتے۔

محدث ابن بطال رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"وقولُ ابن عباس رضی اللہ عنہ كَانَ عَلىٰ عهد النبی صلی اللہ علیہ وسلم فِيْهِ دَلالَةاَنّهُ لَمْ يَكنُ يفْعل حِيْنَ حَدَّث بِهِ لِاَنَّهُ لَوْكَانَ يَفعل لَمْ يَكُنْ لِقَوْلِهِ معناًفكان التكبيرُ لَمْ يُوَاظِب الرّسول صلی اللہ علیہ وسلم طولَ حياتهِ. (۱)

(حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کے اس قول "کا ن علی عهدالنبی صلی اللہ علیہ وسلم " میں اس بات پر دلالت ہے کہ جس وقت انہوں نے یہ حدیث بیان کی ہے تو وہ ایسا نہیں کرتے تھے کیوں کہ اگر وہ ایسا کرتے تھے تو اس قول کے کوئی معنی نہ رہیں گے پس تکبیر پر رسول اللہ نے پوری عمر مواظبت اور ہمیشگی نہیں فرمائی ہے)

حاصل یہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس تکبیر کہنے پر مواظبت نہیں فرمائی، اس لیے صحابہ نے بھی اس کو ترک فرمایا تھا، ورنہ کیا مجال کے صحابہ اس کو ترک کرتے، جب تکبیر کہنے کا ہی یہ حال ہو تو جہر بالتکبیر تو بدرجہ اولی اور لازمی طور پر ترک ہوا۔ پس سنیت واستحباب کہاں سے ثابت ہوا۔ اور یہ بات کہ صحابہ کرام نے اس عمل کو ترک کر دیا تھا اس طرح اس روایت سے مستفاد ہوتی ہے ایسے ہی خارج سے بھی

(۱) فتح الملهم: ۲/۱۷۱

اس کی تائید اور اس کا ثبوت ملتا ہے۔ حافظ ابن القیم رحمۃ اللہ ۔حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ (۱) سے صحابہ کرام کا دعاء میں طریق کار نقل فرماتے ہیں:

''وَلَقَدْ كَانَ الْمسلمونَ تَجْهِدُوْنَ فِي الدُّعَاء وَمَايُسْمَعُ لَهُمْ صَوت اِنْ كَانَ اِلَّاهَلْساً بَيْنهم وَبَيْنَ رَبِّهُمْ وَذٰلِک اِنَّ اللّٰهَ تَعَالىٰ يَقُوْلُ اُدعُوْارَبّک تضرعاً وخُفية.'' (۲)

(مسلمان (صحابہ) دعاء کرنے میں بڑی جدوجہد کرتے تھے، اوران کی کوئی آواز نہ سنائی دیتی تھی، بس ان کے اور ان کے پروردگار کے مابین ایک گھس گھسی وکانا پھوسی سی ہوتی اور یہ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ادعوا ربکم تضراً وخفیۃً۔)

حسن بصری رحمۃ اللہ جو صحابہ کرام کے دور میں پلے اور انہیں سے علم وفقہ حاصل کیا یہ فرماتے ہیں:

''صحابہ کرام کا عمل یہ تھا کہ دعاء میں سوائے ایک آہٹ کے ان کی کوئی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔اس سے معلوم ہوا کہ صحابہ کرام نبی کریم اکے اس عمل کو سنت نہیں خیال کرتے تھے ورنہ اس کو ہر گز نہ ترک کرتے اور سنت نہ سمجھنا اسی لیے ہوگا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم یہ عمل استمراری نہ تھا۔''

یہ تو استدلال پر ردوقدح تھا۔اب ہم یہاں حدیث ابن عباس رضی اللہ عنہ سے ثابت شدہ جہر کی مصلحت وحکمت پر کلام کرتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جہر کیوں فرمایا تھا۔

---

(۱) یہاں پر امام بغوی رحمۃ اللہ نے حسن بن علی رضی اللہ عنہ لکھا ہے (معالم التنزیل ۲/۸)

(۲) بدائع الفوائد: ۳/۵۱۷، کشاف: ۲/۱۰۶، تفسیر کبیر: ۱۴/۱۰۷

جہر کی وجہ اول

امام نووی رحمۃ اللہ نے ''شرح مسلم'' اور علامہ شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ نے ''فتح الملہم'' میں نقل فرمایا ہے:

''حَمَلَ الشَافِعِی رحمۃ اللہ هٰذَاالْحَدِیْث عَلیٰ اَنَّهٗ جَهَرَ لیعلمهم صفة الذّکر لااَنَّهٗ کَانَ دَائِما.'' (۱)

(امام شافعی رحمۃ اللہ نے اس (ابن عباس رضی اللہ عنہ کی) حدیث کو اس پر محمول کیا ہے کہ رسول اللہ نے طریقہ ذکر صحابہ کرام کو سکھانے کے لیے جہر فرمایا تھا، یہ بات نہیں کہ ایسا ہمیشہ ہوتا تھا۔)

حاصل یہ ہے کہ آپ نے اس لیے جہر فرمایا تھا کہ لوگوں کو طریقۂ ذکر و دعاء معلوم ہو جائے، کیوں کہ آپ اسی غرض سے مبعوث ہوئے تھے، اگر آپ یہ طریقہ تعلیم نہ فرماتے تو امت کو کیسے معلوم ہوتا کہ ذکر و دعاء کا طریقہ کیا ہے اور ظاہر ہے کہ جو کام کسی ضرورت سے کیا جاتا ہے وہ اس ضرورت کے پورا ہو جانے کے بعد ترک کر دیا جاتا ہے، اسی لیے آپ نے بھی اس کو کبھی کبھی کیا ہے، دائماً و استمراراً نہیں اور احادیث میں اس کی نظیریں ملتی ہیں کہ آپ نے اور آپ کے صحابہ بغرض تعلیم ان چیزوں کو بھی بلند آواز سے پڑھا جو بالاتفاق آہستہ پڑھی جاتی ہیں، تا کہ لوگوں کو ان چیزوں کا علم ہو جائے۔ مثلاً

(۱) حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ظہر اور عصر میں (والسماء والطارق) اور (والسماء ذات البروج) اور اس کے مانند سورتیں

(۱) فتح الملہم: ۲/۱۷۱

پڑھتے تھے۔"(۱)

ظاہر ہے کہ ان صحابی کو ان سورتوں کے پڑھنے کا علم، ظہر اور عصر میں آپ کو پڑھتے ہوئے سنکر ہی ہوا ہوگا اور سننا بلا جہر کے ناممکن، حالاں کہ ظہر و عصر میں اخفاء واسرا احناف کے نزدیک واجب اور شوافع کے نزدیک سنت موکدہ ہے۔

(۲) حضرت ابوقتادہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

"کبھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمیں ظہر وعصر میں آیت سنا دیتے تھے۔"(۲)

اس میں بھی تصریح ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ظہر وعصر میں کبھی کبھی زور سے پڑھتے تھے۔ کیوں کہ سنانا جہر کی صورت میں ہوسکتا ہے۔

(۳) دارقطنی نے اپنی سند سے نقل کیا ہے کہ اسود کہتے ہیں:

حضرت عمر رضی اللہ عنہ جب نماز شروع فرماتے تو (**سُبْحَانَکَ اللّٰھُمَّ وَبِحَمْدِکَ وَ تَبَارَکَ اسْمُکَ وَتَعَالیٰ جَدُّکَ وَلاَاِلٰہَ غَیْرُکَ**) کہتے اور یہ ہم کو سناتے اور ہمیں تعلیم دیتے تھے۔ (۳)

یہ روایت عمر رضی اللہ عنہ مسلم شریف میں بھی ہے جس کو منقطع قرار دیا گیا ہے اس لیے ہم نے دارقطنی کے حوالہ سے بسند صحیح نقل کیا ہے اس میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے ثناء کا زور سے پڑھنا ثابت ہے حالاں کہ کوئی اس کا قائل نہیں؛ بل کہ سب اس کو تعلیم پر محمول کرتے ہیں۔

---

(۱) طحاوی: ۱/۱۰۱

(۲) طحاوی: ۱/۱۰۱

(۳) اخرجه دارقطنی: ۳۰۰، نحوه فی مسلم: ۱/۱۷۲

(۴) بخاری میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

''انہوں نے نماز جنازہ میں سورۂ فاتحہ زور سے پڑھی اور نسائی میں یہ بھی ہے کہ انہوں نے سورہ فاتحہ اور دوسری ایک سورہ کو جہر سے پڑھا۔''(۱)

حالاں کہ جن ائمہ کے نزدیک نماز جنازہ میں سورۂ فاتحہ پڑھی جاتی ہے، ان کے نزدیک بھی جہر کرنا درست نہیں ؛ بل کہ اس کو آہستہ پڑھنا چاہئے، پس یہاں بھی اس کو تعلیم پر محمول کیا جاتا ہے۔

افادہ وانتباہ

اس جگہ یہ بات عرض کردینا مناسب ہے کہ اس حدیث ابن عباس رضی اللہ عنہ سے جو یہ معلوم ہورہا ہے کہ نمازِ جنازہ میں سورۂ فاتحہ پڑھنا چاہئے۔ یہ امام شافعی رحمۃ اللہ کا مسلک ہے اور احناف کے نزدیک نماز جنازہ میں سورۂ فاتحہ نہیں پڑھنا چاہئے۔ یعنی یہ پڑھنا سنت نہیں ہے۔ اور کتب فقہ میں احناف کے مسلک پر مفصل کلام اور ساتھ ہی اس کے دلائل مذکور ہیں۔ جس کو دیکھنا ہو وہ ان کی مراجعت کرے۔ ہم یہاں صرف حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کی اور اس روایت کے یہاں سامنے آجانے کی وجہ سے اس کا ایک جواب دیتے ہیں اور وہ یہ ہے کہ حدیث سے نماز جنازہ میں سورۂ فاتحہ کا پڑھنا اگرچہ ثابت ہے لیکن محض ثبوت سے چوں کہ سنیت کا ثبوت نہیں ہوتا؛ بل کہ اس کے لیے استمرار ومداومت شرط ہے، اس لیے نماز جنازہ میں سورہ فاتحہ بھی سنت نہ ہوگی کیوں کہ اس پر بھی استمرار ومداومت ثابت نہیں البتہ جواز ثابت ہوگا اور احناف اس کے جواز کے قائل ہیں ؛ بل کہ بعض علماء احناف نے بطور دعاء سورہ فاتحہ

(۱) نسائی: ۲۸۱

پڑھنے کو مستحب قرار دیا ہے۔ مگر بطور تلاوت پڑھنا درست نہیں ہے۔

علامہ انور شاہ کشمیری رحمہ اللہ کی امالی ''فیض الباری'' میں ہے:

''یہ (یعنی قرأت سورہ فاتحہ) ہمارے نزدیک بھی جائز ہے جیسا کہ امام قدوری رحمہ اللہ کی ''کتاب التجرید'' میں لکھا ہے اور یحییٰ بن منقاری زادہ نے جو علامہ شرنبلالی رحمہ اللہ کے استاذ ہیں اپنے رسالہ ''**الاتباع فی مسئلہ الاستماع**'' میں اس کے مستحب ہونے کی تصریح فرمائی ہے۔ مگر یہ ہمارے نزدیک مثل ثناء کے ہوگا نہ کہ مثل قرأت کے۔''(۱)

حاصل یہ ہے سورۂ فاتحہ کا پڑھنا محض جائز ہے یا اگر مستحب بھی ہے تو وہ بطور دعاء کے پڑھا جائے نہ کہ بطور قرأت۔ اور چوں کہ عوام ان دو باتوں میں فرق نہیں کرتے؛ بل کہ عام طور پر فاتحہ کو بطور تلاوت ہی پڑھتے ہیں، اس لیے اس سے منع کیا جائے گا۔ اس کے علاوہ خاص ابن عباس رضی اللہ عنہ کے فعل سے اگر شوافع استدلال کرتے ہیں تو یہ ان کے لیے مضر ہے کیوں کہ ابن عباس رضی اللہ عنہ نے تو سورۂ فاتحہ کے علاوہ دوسری سورت بھی تلاوت کی ہے۔ حالاں کہ اس کا کوئی قائل نہیں، تو شوافع کو چاہیے کہ وہ اس کو بھی اختیار کریں۔

الغرض یہ ایک اختلافی مسئلہ ہے جس میں زیادہ کھود کرید کی ضرورت نہیں۔ ہر ایک اپنے دلائل اپنے پاس رکھتا ہے۔ ہم یہاں پر حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ کا ایک فتویٰ ملخصاً نقل کرتے ہیں جس سے انشاء اللہ العزیز ناظرین کو کسی قدر تشفی ہو جائے گی۔

---

(۱) امالی: ۲/۴۷۴

سورہ فاتحہ کے بارے میں حکیم الامت کا فتویٰ

جاننا چاہئے کہ نماز جنازہ میں سنت کا لفظ دو معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ ایک یہ کہ کبھی کبھی بیان جواز کے لیے یا دیگر مصالح شرعیہ کے لیے شارع علیہ السلام نے وہ فعل کیا ہو۔ اس معنی کر نماز جنازہ میں سورۂ فاتحہ کے سنت ہونے کا انکار نہیں کیا جاسکتا۔ دوسرے معنی سنت کے یہ ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بقصد احسان یعنی اچھا سمجھ کر وہ کام کیا ہو اور سنت کا اکثر اطلاق اسی دوسرے معنی پر ہوتا ہے۔ اسی معنی کر نمازِ جنازہ میں سورۂ فاتحہ کے سنت ہونے میں کلام ہے۔ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ نفی فرماتے ہیں۔ اور دیگر فقہاء اس کے ثابت کرنے کے درپے ہیں۔ علاوہ بریں ابن عمر رضی اللہ عنہ جن کو سنت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کی بہت تلاش رہتی تھی اور ان کو اتباع سنت کا شدید اہتمام رہتا تھا، نماز جنازہ میں سورۂ فاتحہ نہیں پڑھتے تھے، جیسا کہ موطا میں امام مالک رحمہ اللہ نے روایت کیا ہے۔ یہ روایت بھی امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کی مؤید ہے۔ نیز حدیث ابن ماجہ کے الفاظ (**فأخلصوا لله الدعاء**) بھی امام صاحب کی رائے کے موید ہیں کہ نماز جنازہ دراصل دعاء ہی ہے اور ''اخلصوا'' میں کسی قدر لطیف اشارہ ہے کہ غیر دعاء کو دعاء کے ساتھ نہیں ملانا چاہئے۔ لہٰذا اگر ثناء ودعاء کی غرض سے سورۂ فاتحہ پڑھیں تو اجازت دیں گے اور شارع علیہ السلام کے فعل کو اسی پر محمول کرلیں تو بہت مناسب ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ مجتہد کا شرحِ صدر ابن عمر رضی اللہ عنہ کی رائے اور حدیث کا لفظ ''اخلصوا'' حضرت امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کی رائے کا موید ہے۔ لہٰذا کتنا اچھا ہے

کہ اگر پڑھیں تو بلا التزام بہ نیت دعاء پڑھیں تا کہ حدیث پر بھی عمل ہو جائے اور ائمہ مجتہدین کے اختلاف سے خروج بھی ہو جائے۔ واللہ اعلم۔ اشرف علی۔ (۱)

اوپر جو نظائر پیش کیے گئے ہیں، ان سے یہ بات واضح ہوگئی کہ بسا اوقات کسی غرض سے ان چیزوں کو بھی جو باتفاق آہستہ ہو جانا چاہئے، بلند آواز سے کیا جاتا ہے۔ علماء احناف نے احادیث سے ثابت جہر بسم اللہ کو اور جہر آمین کو اسی قبیل سے شمار کیا ہے جیسا کہ علامہ کشمیری رحمہ اللہ نے اپنے رسالہ میں تصریح کی ہے۔ (۲)

ایک شبہ کا ازالہ

اگر کسی کو یہ شبہ ہو کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے جہر ثابت ہے اور آپ نے یہ جہر بغرضِ تعلیم کیا ہے تو پھر اس کی تعلیم میں خود جہر بھی داخل ہے۔ لہٰذا جہر بھی سنت ہوا کہ آپ نے اپنے عمل سے اس کو ثابت کیا ہے؟

تو اس کا جواب یہ ہے کہ دوسری آیات واحادیث اس کی نفی کرتی ہیں اور خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا عمل اس کی سنیت کی نفی کرتا ہے، لہٰذا ایسی صورت میں جہر کی سنیت کا ثبوت اس سے نہیں ہوسکتا۔ اب رہا یہ کہ آپ نے اس کی بھی تو تعلیم کی ہے تو جواب یہ ہے کہ یہاں محض اس چیز کی تعلیم مقصود ہے جو دعاء میں پڑھا جاتا ہے نہ کہ جہر کی تعلیم، جہر تو محض بضرورت اختیار کیا گیا ہے جیسا کہ اوپر کی نظائر سے یہ بات واضح ہے۔ چناں چہ علامہ انور شاہ کشمیری رحمہ اللہ عصر میں آیت کے جہر کرنے کے متعلق فرماتے ہیں:

”ثم اِنَّ الْجَهْرَ بِهَا كَانَ لِلتَّعْلِيمِ اَعْنِىْ بِهٖ تَعْلِيْم مَايَقْرأ

---

(۱) امداد الفتاوی : ۱/۲۳۳ تا ۲۳۴

(۲) فصل الخطاب : ۳۱

لاتعْلِيم الْجَهْرِ نفسهٗ وَهكذا كَانَ الْجَهرُ بالتسمية فلَمْ يكن سنةً بل تعليماً لما يقْرأه." (۱)

(پھر یہ (عصر میں آیت) جہر سے پڑھنا تعلیم کے لیے تھا، یعنی اس چیز کی تعلیم جو پڑھا جاتا ہے نہ کہ جہر کی تعلیم اسی طرح بسم اللہ کا جہر بھی ہے، پس جہر کرنا سنت نہ ہوگا؛ بل کہ (یہ جہر کرنا) تعلیم کے لیے تھا کہ کیا پڑھے۔)

حاصل یہ ہے کہ کبھی کبھی تعلیم کے لیے کہ دعاء میں کیا پڑھیں اور کس طرح پڑھیں، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے زور سے دعاء فرمائی ہے؛ مگر اس سے سنیت ثابت نہیں ہوتی، جیسا کہ اور بھی بعض چیزیں آپ نے بلند آواز سے کی ہیں؛ مگر ان کی سنیت کا کوئی قائل نہیں۔

جہر کی دوسری وجہ

بعض علماء نے ابن عباس رضی اللہ عنہ کی حدیث کا جواب دیتے ہوئے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ جہر کرنا بیان جواز کے لیے تھا، نہ کہ بیان سنیت کے لیے۔

چناں چہ علامہ عبدالحی لکھنوی رحمہ اللہ اپنی محققانہ تالیف "سعایہ شرح وقایہ" میں فرماتے ہیں:

"واختار غيره (اى ابن حزم رحمہ اللہ) السر وحملوا حديث ابن عباس رضی اللہ عنہ على الجهراحياناً بياناً للجواز." (۲)

(اور ابن حزم رحمہ اللہ کے علاوہ دوسرے علماء نے سر واخفاء

(۱) فیض الباری: ۲/۲۸۴

(۲) سعاية: ۲/۲۶۱

کو اختیار فرمایا اور ابن عباس رضی اللہ عنہ کی حدیث کو ان علماء (جمہور) نے بیان جواز کے لیے کبھی کبھی جہر کرنے پر محمول کیا ہے۔)

اس کی بھی حدیث میں نظیریں ملتی ہیں کہ کبھی کبھی آپ نے بیان جواز کے لیے غیر احسن و غیر مستحب امر بھی کیا ہے، جیسا کہ بخاری شریف میں آپ کا کھڑے ہو کر پیشاب کرنا (اس حکمت کے تحت) منقول ہے، حالاں کہ اس کا غیر مستحسن ہونا سب کے نزدیک مسلم امر ہے۔ حاصل یہ ہے کہ جہر کرنا محض جائز ہے نہ کہ سنت و مستحب اس جواز کو بتلانے کے لیے کبھی کبھی آپ نے ایسا فرمایا ہے۔

جہر کی تیسری وجہ

بعض علماء وائمہ نے جہر کی ایک وجہ یہ بیان فرمائی ہے کہ یہ جہر سفر غزوہ میں دشمن کو خوف زدہ کرنے کے لیے تھا۔

علامہ لکھنوی رحمۃ اللہ فرماتے ہیں:

”وَبَعْضُهُمْ حَمَلُوْه عَلىٰ اَنَّهٗ كان فى سفر الغزوة لارهاب العدو كذافى عمدة القارى.“ (۱)

(بعض علما نے اس حدیث کو اس پر محمول کیا ہے کہ یہ (جہر کرنا) سفر غزوہ میں تھا تا کہ دشمن کو خوف زدہ کیا جائے۔)

معلوم ہوا کہ جمہور علماء وائمہ کے نزدیک حدیث ابن عباس رضی اللہ عنہ سے جہر کی سنیت پر استدلال صحیح نہیں اور اس کے محامل مختلف ہیں۔ انہیں محامل پر اس حدیث کو رکھنا چاہیے۔ پس اگر تعلیم کی غرض سے باآواز بلند دعاء کی جائے تو درست ہے؛ مگر تعلیم تو ساری عمر نہیں ہوتی، چند دن ہوتی ہے، اس لیے چند دن ایسا کرے تو مضائقہ

(۱) سعایہ: ۲/۲۶۱

نہیں۔ جب لوگ سیکھ لیں تو پھر اس کو ترک کر دینا لازم ہوگا۔

علامہ ابن بطال رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

”واختار(ای الشافعی) للامام والماموم ان یذکراللّٰہ بعدالفراغ من الصلوۃ ویخفیان ذلک الاان یقصد التعلیم فیُعّلماثم یُسرّا.“ (۱)

(امام شافعی رحمہ اللہ نے امام ومقتدی دونوں کے لیے اس بات کو پسند فرمایا ہے کہ نماز سے فراغت کے بعد ذکر کریں اور اخفاء کریں، الا یہ کہ تعلیم کا قصد ہو تو تعلیم کریں، پھر سر و اخفاء اختیار کریں۔)

اسی طرح دوسرے مقاصد صحیحہ کے تحت زور سے دعاء کی جاسکتی ہے، مگر رواج بنانا درست نہ ہوگا؛ بل کہ جوں ہی وہ مقصد حاصل ہو جائے اس کو ترک کرنا بھی لازم ہوگا اور اس کے متعلق پوری بحث اور اس کے احکام آخری فصل میں آئیں گے۔

استحباب جہر کی دوسری دلیل

امام مسلم رحمہ اللہ نے حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب اپنی نماز سے سلام پھیرتے تو بلند آواز سے یہ دعا پڑھتے:

”لَااِلٰہَ وَحُدَہٗ لَاشَرِیکَ لَہٗ لَہُ الْمُلْکُ وَلَہُ الْحَمْدُ وَھُوَ عَلٰی کُلِّ شَیٍٔ قَدِیرٌلاَ حَوْلَ وَلاَ قُوَّۃَ اِلَّا بِاللّٰہِ لاَاَلہ الا اللّٰہ ولا نَعْبُدُاِلَّا اِیَّاہُ له النعمة وَلَهُ الْفَضْلُ وَلَهُ الثَّنَاءُ الْحَسَنُ لاَاِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ وَلَوْكَرِهَ الْكَافِرُوْنَ.“ (۲)

(۱) فتح الملهم: ۱۷۱/۲

(۲) مشكوٰة: ۸۸

اس حدیث میں چوں کہ (بصوتہ الاعلی) کے الفاظ ہیں اس لیے علامہ ابن حزم رحمہ اللہ اور بعض حضرات نے دعاء وذکر میں جہر کو سنت قرار دیا ہے۔

دوسری دلیل کا جواب

مگر یہاں بھی یہ استدلال صحیح نہیں ہے کیوں کہ جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے کہ سنیت واستحباب کے لیے استمرار یا کم ازکم ترغیب کا ثبوت ہونا چاہئے اور یہاں نہ ترغیب کا ثبوت ہے کہ مستحب قرار دیں، نہ دوام واستمرار کا ثبوت کہ سنت قرار دیں۔ لہٰذا اس حدیث سے بھی سنیت جہر یا استحباب جہر پر استدلال صحیح نہیں ہے۔

لفظ کان کی تحقیق

اب رہی یہ بات کہ حدیث میں تو یہ الفاظ ہیں: ’’**کانَ یقول بصوتہِ الاعلیٰ**‘‘ یہاں مضارع پر کان داخل ہے جس سے استمرار ثابت ہوتا ہے کیوں کہ یہ صیغہ ماضی استمراری کا ہے۔

تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہ قاعدہ کہ کان مضارع پر داخل ہوکر استمرار کا فائدہ دیتا ہے مسلم نہیں اور کئی جگہ اس پر نقض وارد ہوتا ہے۔

چناں چہ علامہ نووی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

’’فان المختارالذی علیه الاکثرون والمحققون من الاصولیین ان لفظة کان لایلزم منها الدوام ولاالتکرار وانماهی فعل ماضٍ بدل علی وقوعه مرةً فان دل دلیل علی التکرارعمل به والافلاتقتضیه بوضعها.‘‘ (۱)

---

(۱) شرح مسلم: ۲۵۴/۱

(اکثر محققین اصولیین نے جو اختیار فرمایا ہے وہ یہ ہے کہ لفظ کان
سے دوام وتکرار لازم نہیں آتا۔ وہ (لفظ کان) تو بس فعل ماضی ہے
جو ایک مرتبہ فعل کے وقوع پر دلالت کرتا ہے۔ پس اگر کوئی (دوسری)
دلیل تکرار پر دلالت کرے تو اس کے مطابق عمل ہوگا ورنہ یہ (کان)
اپنی وضع کے اعتبار سے دوام کا تقاضا نہیں کرتا۔)

اس کے بعد علامہ نووی رحمۃ اللہ نے ایک مثال بھی بطور نقض وارد کی ہے وہ یہ ہے کہ حدیث میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں:

''کنت أطیّب رسول اللّٰہ لحله قبل أن یطوف.''

(میں نے رسول اللہ کو (احرام سے) حلال ہونے کے لیے طواف
سے قبل خوشبو لگائی۔)

علامہ نووی رحمۃ اللہ فرماتے ہیں کہ اس جگہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے ''کنت اطیب'' صیغہ استعمال فرمایا ہے جس میں مضارع پر کان داخل ہے، حالاں کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے صحبت کے بعد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے صرف ایک ہی مرتبہ حج فرمایا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ ایک مرتبہ کسی فعل کے وقوع پر بھی ''کان'' استعمال ہو سکتا ہے۔

ایک شبہ کا جواب

اگر یہ شبہ ہو کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو عمرہ میں حالت احرام میں بھی خوشبو لگایا ہو جس کو یہ بیان کر رہی ہیں کہ میں آپ کو عطر لگاتی تھی، تو یہ تکرار، حج وعمرہ کا ملا کر ہے۔

علامہ نووی رحمۃ اللہ اس شبہ کا جواب دیتے ہیں کہ ایسا ہرگز نہیں ہے؛ کیوں کہ

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے یہاں قبل الطّواف خوشبو لگانے کا ذکر کیا ہے جو حج ہی میں جائز ہے۔ عمرہ میں قبل الطّواف خوشبو کا استعمال بالا جماع جائز نہیں تو یہ بات عمرے سے کیسے متعلق ہو سکتی ہے۔

الغرض ''کان'' سے استمرار پر استدلال درست نہیں جب تک خارج سے اس کا ثبوت نہ ہو۔ یہی تحقیق ملا علی قاری رحمۃ اللہ نے مرقات میں اور دوسرے علماء نے اپنی تالیفات میں ذکر فرمائی ہے۔

جب استمرار کا ثبوت نہ ہوا تو سنیت ثابت نہ ہوئی، لہٰذا اس جہر کو بھی ان محامل پر محمول کیا جا سکتا ہے جو اوپر مذکور ہوئے۔

استحباب جہر کی تیسری دلیل

قرآن کریم میں فرمایا گیا ہے۔

﴿وَلاَتَجهَرْ بِصَلوتِکَ وَلاَ تُخَافِتْ بِهَا وَابتَغِ بینَ ذٰلِکَ سَبِیْلاً﴾ (بنی اسرائیل:۱۱۰)

(اور اپنی نماز کو نہ تو بلند آواز سے پڑھیے اور نہ بالکل آہستہ سے پڑھیے؛ بل کہ ان دونوں کے درمیان ایک راستہ اختیار کیجیے۔)

اس آیت سے ممکن ہے کہ کوئی استحباب جہر پر استدلال کرے، کیوں کہ اس آیت میں بہت زور سے پڑھنے کی جس طرح ممانعت کی گئی ہے، اسی طرح اخفاء کی بھی ممانعت کی گئی ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اخفاء بھی مطلوب نہیں؛ بل کہ درست بھی نہیں، لہٰذا کچھ جہر ہونا چاہئے۔ اور یہ آیت حدیث عائشہ رضی اللہ عنہا کے مطابق دعاء ہی کے بارے میں نازل ہوئی ہے، جیسا کہ امام مسلم رحمۃ اللہ نے اس کی تخریج کی ہے۔ لہٰذا دعاء میں بالکل اخفاء کے بجائے کچھ جہر مطلوب ہے اور مستحب ہے۔

جواب

مگر علماء کے کلام سے اس آیت سے استدلال مخدوش ثابت ہوتا ہے، کیوں کہ (۱) بخاری اور ترمذی رحمہما اللہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ یہ آیت بالا نماز میں قرأت کے سلسلہ میں نازل ہوئی ہے اور علما نے اس حدیث ابن عباس رضی اللہ عنہ کو راجح قرار دیا ہے۔ کیوں کہ حدیث عائشہ رضی اللہ عنہا تو مسلم کی ہے اور حدیث ابن عباس رضی اللہ عنہ بخاری کی۔ اور بخاری کی حدیث راجح ہوتی ہے۔

چناں چہ علامہ عثمانی رحمہ اللہ نے فرمایا:

> ''امام نووی رحمہ اللہ نے ابن عباس رضی اللہ عنہ کے قول کو ترجیح دی ہے کہ یہ آیت قرأت کے بارے میں نازل ہوئی ہے اور محدث الطبری نے بھی حدیث ابن عباس رضی اللہ عنہ کو راجح قرار دیا ہے؛ کیوں کہ یہ روایت مخرج کے اعتبار سے اصح ہے۔''(۱)

(۲) بعض علماء کرام نے آیت بالا ''**لاتجهر بصلوتک**'' کو دعاء کے بارے میں مان کر بھی یہ فرمایا ہے کہ یہ آیت اس آیت سے منسوخ ہے جو شروع رسالہ میں گذری، یعنی ﴿**اُدعوا رَبَّكُمْ تَضَرُّعاً وَخُفْيَةً**﴾ جس سے دعا کا اخفاء واسراء مندوب ومستحب ہونا ثابت ہوتا ہے۔ چناں چہ ''**فتح الملهم**'' میں حافظ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ کی فتح الباری سے علماء کا یہ قول بھی نقل کیا گیا ہے کہ آیت ''**ولاتجهر بصلوتک**'' منسوخ ہے آیت ''**ادعوا**'' الخ سے۔(۲)

(۳) بعض علماء نے یہ فرمایا ہے کہ حدیثِ عائشہ رضی اللہ عنہا میں جو آیا کہ یہ آیت بالا

---

(۱) فتح الملهم: ۲/۷۱

(۲) فتح الملهم: ۲/۷۱

دعاء کے بارے میں نازل ہوئی ہے تو اس دعاء سے مراد وہ ہے جو تشہد میں پڑھی جاتی ہے، اور ان حضرات نے اس قول کی تائید میں حاکم کی روایت پیش کی ہے، جس میں ''في التشهد'' کی زیادتی موجود ہے۔

اور سب جانتے ہیں کہ تشہد میں جو دعاء پڑھی جاتی ہے وہ بالاتفاق آہستہ ہوتی ہے تو اس سے اس کا علم ہوا کہ آیت سے دراصل جہر کا استحباب ہی ثابت نہیں ہوتا، ورنہ علماء کے اس قول کا کوئی مطلب ہی نہ رہے گا۔ فافہم

استحباب جہر کی چوتھی دلیل

رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے فرمایا:

''کسی شخص کو یہ حلال نہیں کہ کسی قوم کی امامت کرے اور دعاء میں صرف اپنے کو خاص کر لے، اگر کوئی شخص ایسا کرے تو اس نے قوم کی خیانت کی ہے۔''(۱)

بعض لوگوں سے جہر کے مستحب ہونے پر یہ دلیل سنی گئی؛ کیوں کہ اس میں قوم کو چھوڑ کر صرف اپنے کو دعاء میں خاص کرنا ممنوع قرار دیا ہے اور اس کو خیانت فرمایا ہے۔ اس سے ان لوگوں نے یہ سمجھا کہ دعاء زور سے کر کے قوم کو شامل کرنا چاہئے، ورنہ خیانت ہوگی۔ پس اس سے جہر کا مستحب ہونا ثابت کیا ہے۔

جواب

یہ ہے کہ اولاً تو علماء کو اس حدیث کی صحت میں کلام ہے حتی کہ محدث ابن خزیمہ رَحِمَہُ اللّٰہُ نے اس حدیث کو موضوع تک کہہ دیا۔ کیوں کہ خود رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم

---

(۱) ترمذی: ۸۲/۱

کا عمل اس کے خلاف ہے کہ آپ دعاء میں جہر تو کجا جو صیغے استعمال فرماتے تھے وہ بھی واحد ہی کے منقول ہیں، سوائے چند مواقع کے آپ نے جمع کا صیغہ استعمال نہیں فرمایا، خواہ نماز میں ہو یا نماز کے باہر جیسا کہ علامہ یوسف صاحب بنوری رحمہ اللہ نے معارف السنن (۲/ ۴۰۷) میں اور علامہ عبدالحی لکھنوی رحمہ اللہ نے سعایہ (۲/ ۲۴۵) میں تصریح کی ہے۔ اس وجہ سے بعض علماء نے اس حدیث ہی کو موضوع قرار دے دیا اگر چہ حق یہ ہے کہ یہ حدیث موضوع نہیں؛ بل کہ ثابت ہے اس کے رجال و رواۃ قابل احتجاج ہیں۔ چناں چہ امام ترمذی اور امام ابوداؤد رحمہما اللہ وغیرہ نے اپنی سنن میں اس حدیث کی تخریج کی ہے اور علماء کا فیصلہ ہے کہ ان کتابوں میں اگر چہ ضعیف روایات ہیں۔ مگر موضوع کوئی نہیں اور جن محدثین نے ان کتابوں کی بعض احادیث پر وضع کا حکم لگایا ہے۔ دوسرے علماء محققین نے ان کا مدلل جواب محدثانہ طریقہ پر دے دیا ہے جو اپنی جگہ مذکور ہے۔ اس لیے یہ حدیث ثابت ضرور ہے۔

لیکن اس سے جہر کا استحباب یا سنیت ثابت نہیں ہوتی، کیوں کہ حدیث میں صرف یہ ہے کہ امام مقتدیوں کو بھی دعاء میں شریک کرے ورنہ خیانت ہوگی اور شرکت کے لیے بلند آواز سے دعاء کرنا ضروری نہیں؛ بل کہ بغیر جہر کے بھی شرکت اس طرح ہوسکتی ہے کہ ان کے حق میں دعاء کرے۔ چناں چہ علماء نے اس حدیث کے کئی مطالب بیان کیے ہیں۔ مگر کسی نے اس سے جہر پر استدلال نہیں کیا۔

(۱) چناں چہ اس حدیث کا بعض علماء نے یہ مطلب بیان کیا ہے کہ مراد حدیث کی یہ ہے کہ جن دعاؤں میں امام کے ساتھ مقتدی بھی شریک ہوتے ہیں جیسے دعائے قنوت وغیرہ اس میں صیغہ جمع استعمال کرے صیغۂ افراد کا استعمال اس جگہ درست نہیں۔ علامہ ابن تیمیہ رحمہ اللہ اسی کے قائل ہیں جیسا کہ علامہ ابن القیم

رحمۃ اللہ سے معارف السنن میں نقل کیا گیا ہے۔(۱)

(۲) بعض نے یہ مطلب بیان کیا کہ فرض نمازوں میں جو دعاء پڑھی جاتی ہے وہ بصیغۂ جمع ہونا چاہئے۔

علامہ بنوری رحمۃ اللہ نے اس کو امام اعظم رحمۃ اللہ کا مذہب قرار دیا ہے۔(۲)

(۳) علامہ عبدالحی لکھنوی رحمۃ اللہ فرماتے ہیں کہ:

''ظاہر یہ ہے کہ منع وہ صورت ہے کہ امام تمام ارکانِ صلوۃ اور اس کے بعد کے افعال جو نماز سے متعلق ہیں، سب میں اپنے کو دعاء میں خاص کرے، لیکن اگر امام نے درمیان نماز میں مثل رکوع، سجدہ، تشہد وغیرہ میں اپنے کو خاص کیا اور بعد نماز سب کے لیے دعائیں عموم کرلیا تو پھر وہ اس نہی سے عہدہ برآمد ہو جائے گا۔''(۳)

(۴) راقم کہتا ہے:

''میرے خیال میں حدیثِ پاک کی یہ مراد آتی ہے کہ امام خود ہی دعاء کرتا رہے اور دعاء کرنے میں اپنے آپ کو خاص کرلے اور مقتدیوں کو دعاء کرنے کی فرصت نہ دے تو یہ درست نہیں اور یہ خیانت ہے، اس لیے امام کو چاہئے کہ مقتدیوں کو بھی دعاء کرنے کا موقع دے اور خود آہستہ دعاء کرے یا خاموش رہے۔ کیونکہ نمازوں کے بعد کا وقت قبولیتِ دعاء کا وقت ہے۔ اس توجیہہ پر اس حدیث سے تو سر و اخفاء کا مستحب و مطلوب ہونا ثابت ہوتا ہے نہ کہ جہر کا۔'' فافہم

(۱) معارف السنن: ۳/۴۸

(۲) ایضا

(۳) سعایہ: ۲/۲۴۵

استحبابِ جہر کی پانچویں دلیل

حضرت حبیب بن سلمہ الضمر ی کی حدیث میں ہے:

"لَایَجْتَمِع مَلأفَیَدعوْبَعْضھم وَیُؤمِّنُ بَعْضُھُمْ اِلاَّ اَجَابَھُمُ اللّٰہ." (۱)

(کوئی مجمع جمع ہوکر بعض دعاء اور بعض اس پر آمین نہیں کہتے مگر اللہ (ان کی دعاؤں) کو قبول کر لیتا ہے)

اس حدیث سے ممکن ہے کوئی دعاء جہری کی مندوبیت پر استدلال کرنے لگے کہ اس میں بعض کے دعاء کرنے اور بعض کے آمین کہنے پر قبولیتِ دعاء کو متفرع کیا ہے اور قبولیتِ دعاء مرغوب تو جہر بھی مندوب ہوا۔

جواب

مگر جو دلائل استحبابِ اخفاء وسر کے اوپر مذکور ہوئے ان کے مقابلہ میں صرف اس حدیث کو اختیار کرنا اور ان سب کو ترک کرنا صحیح نہیں، کیوں کہ وہ دلائل صاف وصریح بھی ہیں اور محکم بھی اور یہاں یہ احتمال ہے کہ ملأ پر تنوین نوعیت کے لیے ہو۔ لہٰذا اس سے خاص کسی موقع پر اجتماع مراد ہوگا یا یہ تنوینِ عظمت ہو، جس کا مطلب یہ ہوگا کہ مراد وہ مجمع ہے جو بڑا عظیم الشان ہو اور ممکن ہے کہ یہ تنوین تنویع و تعظیم دونوں کے لیے ہو جیسے لفظ "غشاوۃٌ" جو قرآن میں آیا ہے، اس کی تنوین کے بارے میں بھی علماء نے تنویع و تعظیم کا قول کہا ہے جیسا کہ روح المعانی (۱/۱۳۷) میں ہے کہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اور صحابہ کرام نے اس طرح جمع ہوکر دعاء کرنے کا اہتمام نہیں فرمایا۔ اگر یہ حضرات اس کا اہتمام کرتے تو یہ بات ضرور منقول ہوتی،

---

(۱) کنز العمال: ۱/۱۸۷، کذا فی المعارف: ۳/۱۲۳

حالاں کہ یہ بات منقول نہیں؛ بل کہ اس کے خلاف سر و اخفاء کا اہتمام منقول ہے جیسا کہ حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ کا قول استحباب جہر کی پہلی دلیل کے جواب کے ذیل میں ہم نقل کر چکے ہیں۔

اس لیے اس حدیث کا محمل یہ ہوگا کہ کبھی کبھی جمع ہو کر دعاء بھی کر لی جائے مگر دوام و استمرار کے ساتھ اس طرح کرنا دوسرے دلائل کے خلاف ہوگا۔

استحباب جہر کی چھٹی دلیل

« عن ابی ہریرة رضی اللہ عنہ قال قال : رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم يقول الله تعالىٰ أناعند ظن عبدی بی وأنا معه اذاذكرنی فان ذكرنی فی نفسهٖ ذكرته فی نفسی وان ذكرنی فی ملاءٍ ذكرتهٗ فی ملاءٍ خيرٍ منهم الخ. » (۱)

(حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں کہ میں بندہ کے ساتھ ویسا ہی معاملہ کرتا ہوں جیسا وہ میرے ساتھ گمان رکھتا ہے اور جب وہ میرا ذکر کرتا ہے تو میں اس کے ساتھ ہوتا ہوں، پس اگر وہ مجھے اپنے دل میں یاد کرتا ہے تو میں بھی اس کو اپنے دل میں یاد کرتا ہوں اور اگر وہ مجھے مجمع میں یاد کرتا ہے تو میں اس کو اس سے بہتر مجمع میں (یعنی فرشتوں کے مجمع میں) یاد کرتا ہوں۔)

جواب

اس کا جواب دو طرح دیا جا سکتا ہے: ایک علی سبیل الترجیح دوسرے علی سبیل التطبیق۔

---

(۱) بخاري: ۶۸۵۶، مسلم: ۴۸۳۲، ترمذي: ۳۵۲۷

علی سبیل الترجیح جواب یہ ہے کہ اس حدیث سے جہر کا استحباب وفضیلت اشارۃً ثابت ہوتی ہے اور جو روایات ودلائل فصل اول میں ذکر کیے گئے ان میں اخفاء واسرار کا استحباب وفضیلت صراحتاً مذکور ہے۔ چناں چہ حدیث نمبر (۳) میں دعاء جہری پر دعاء سری کو ستر گونہ فضیلت کا ہونا صراحت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ اس طرح حدیث نمبر (۱) (۴) وغیرہ میں بھی سر واخفاء کا مستحب وافضل ہونا بالتصریح مذکور ہے۔ اور سب جانتے ہیں کہ عبارۃ النص اور اشارۃ النص میں اگر تعارض ہو تو عبارۃ النص کو ترجیح دی جاتی ہے جیسا کہ ''نور الانوار'' (۱۴۷) میں ہے۔ لہٰذا یہاں بھی اس حدیث سے ثابت شدہ جہر کی فضیلت پر ان روایات سے ثابت شدہ استحباب اخفاء کو ترجیح دی جائے گی کیوں کہ وہ عبارۃ النص سے ثابت ہے۔

اور علی سبیل التطبیق اس کا جواب یہ ہے کہ جہر کی فضیلت وہاں ہے جہاں کوئی فائدہ معتد بہا مرتب ہو اور حاصل ہو۔ مثلاً دوسروں کو توجہ الی اللہ وانابت الی اللہ ہو وغیرہ اور اس صورت میں جہر کا مستحب ہونا فصل رابع میں مع دلائل مذکور ہوگا۔

پس حاصل یہ ہے کہ اصل سر واخفاء ہی ہے، مگر کسی جگہ اگر جہر پر فائدہ مرتب وحاصل ہونے کا یقین یا احتمال غالب ہو تو پھر جہر افضل ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ مطلقاً جہر خواہ فائدہ مرتب ہو یا نہ ہو مثلاً تنہا بیٹھ کر بلا کسی غرض صحیح کے جہر کرے تو یہ افضل نہیں ؛ بل کہ افضل ایسے حالات میں سر واخفاء ہی ہے۔ اس کی تائید الفاظ حدیث سے بھی ہوتی ہے؛ کیوں کہ حدیث میں یہ فرمایا گیا ہے کہ جب بندہ اپنے جی میں میرا ذکر کرتا ہے تو میں بھی اپنے جی میں اس کو یاد کرتا ہوں اور اگر وہ مجمع میں میرا ذکر کرتا ہے تو میں اس کا اس سے بہتر مجمع میں ذکر کرتا ہوں یوں نہیں فرمایا کہ اگر وہ میرا ذکر زور سے کرے تو میں ایسا کروں گا؛ بل کہ فرمایا کہ مجمع میں ذکر کرے تو

میں ایسا کرتا ہوں۔ معلوم ہوا کہ مقصود ذکر جہری سے اگر دوسروں کو توجہ دلانا وغیرہ فوائد ہوں تو افضل ہے ورنہ افضل نہیں اگر ملطلقاً ذکر جہری افضل ہوتا تو یوں فرماتے کہ جب میرا ذکر زور سے کرے، حالاں کہ ایسا نہیں فرمایا گیا۔ خوب سمجھ لو۔

اور بعض حضراتِ علماء نے یہ توجیہہ کی ہے کہ جن روایات سے جہر ثابت ہے وہ اس وقت پر محمول ہیں جب کہ ریا نہ ہو اور جن میں سر واخفاء کا استحباب ہونا بیان ہوا ہے، وہ اس وقت پر محمول ہیں جب کہ ریاء ہو۔ مگر یہ محل نظر ہے۔ کیوں کہ ریا کے ہونے کے وقت سر واخفاء مستحب ہی نہیں ؛ بل کہ واجب ہوگا اور اس وقت جہر کرنا غیر مستحب ہی نہیں ؛ بل کہ ناجائز ہوگا تو ریا کے ہونے نہ ہونے پر اگر جہر وسر کا مدار ہوگا تو مسئلہ جواز وعدم جواز کا بنتا ہے نہ کہ افضل وغیر افضل کا۔ لہٰذا اس کو استحباب وعدم استحباب کا مدار قرار دینا صحیح نہیں۔ فافہم ولا تغفل۔

افادہ علمیہ

بعض حضرات نے اس طرح کی بعض احادیث کی بنا پر آیت " **اُدْعُوْا رَبَّكُمْ تَضَرُّعاً وَ خُفْيَةً** " کو منفرد کے ساتھ خاص کیا ہے کہ کوئی تنہا دعاء کرے تو آہستہ کرنا چاہئے اور اگر مجمع میں دعاء کرے تو بلند آوز سے کرنا چاہئے ؛ مگر یہ تخصیص کا قول بچند وجوہ باطل ہے۔

اولًا: تو اس لیے کہ وہ حضرات وجہ تخصیص میں جن روایات کو پیش کرتے ہیں وہ یا تو محض بیان جواز پر محمول ہوسکتی ہیں یا زیادہ سے زیادہ کسی خاص فائدہ کے مرتب ہونے کی وجہ سے خاص موقع اور محل میں استحباب جہر پر نہ کہ مطلقاً ہر مجمع میں فضیلت جہر پر۔ لہٰذا اس سے اس حکم عام کی تخصیص ممکن نہیں۔

ثانیاً: اس لیے کہ تخصیص کا قول ظاہر آیت کے خلاف ہے؛ کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں صیغۂ جمع (أدعوا) سے خطاب فرمایا ہے اور اس سے بظاہر اجتماع [1] ہی مفہوم ہوتا ہے اور ظاہر سے صرف بلا دلیل درست نہیں۔

ثالثاً: اس لیے کہ یہ حکم منفرد وغیر منفرد سب کو عام ہے اور عام کا بلا وجہ خاص کرنا بتصریح اصولیین ناجائز ہے۔ لہٰذا اس کا بھی منفرد کے ساتھ خاص کرنا صحیح نہیں ہے اور جو دلائل تخصیص مذکور ہوئے یہ مفید جواز ہیں، نہ کہ مفید سنیت یا استحباب۔ لہٰذا ان سے اس آیت کا خاص کرنا صحیح نہیں۔

---

(۱) اس سے میرا مطلب یہ نہیں کہ جہاں بھی صیغۂ جمع استعمال ہوگا اس سے اجتماع ہی مراد ہوگا۔ بل کہ صرف یہ مقصود ہے کہ صیغۂ جمع سے ظاہر اجتماع ہے تو اس کے خلاف کی کیا دلیل ہے (فافہم)

فصلِ رابع
جہری دعاء کا حکم

گذشتہ صفحات میں یہ بات واضح طریقہ پر آچکی ہے کہ دعاء میں سر و اخفاء ہی مستحب ہے اور دعاء جہری مستحب نہیں ہے۔ اب یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ دعاء جہری اگر کرلی جائے تو اس کا کیا حکم ہے؟ جائز ہے یا ناجائز؟

اس لیے ہم کسی قدر تفصیل سے اس سوال کا جواب حوالہ قرطاس کرتے ہیں جس سے انشاء اللہ ہر قسم کے اشکالات وتوہمات مندفع ہو جائیں گے۔ سوملاحظہ ہو کہ:

دعاء وذکر میں جہر دو طرح ہوتا ہے۔ ایک تو جہر مفرط یعنی حد اعتدال سے متجاوز جس کو چیخنا چلاّنا کہا جاتا ہے۔ دوسرے جہر معتدل کہ حدِ اعتدال میں ہو چیخنا، چلاّنا نہ ہو۔ اور ہر صورت کا جدا جدا حکم ہے۔

جہر مفرط کا حکم

پہلی صورت یعنی ذکر و دعاء بجہر مفرط بالاتفاق ناجائز ہے اور اس سے صرف وہ مواقع مستثنٰی ہیں جن میں شریعت نے جہر مفرط کی اجازت وتاکید وترغیب دی ہے۔ جیسے ''اذان'' میں جہر مفرط موکد ہے۔ چناں چہ امام بخاری رحمۃ اللہ نے اس کے لیے اپنی جامع میں ''باب رفع الصوت بالنداء'' منعقد فرمایا ہے۔ اسی طرح حج کے موقع پر خوب چیخ چیخ کر ذکر یعنی لبیک کہنا مشروع ہے اور ایسے حج کو جس میں بجہر

مفرط ''لبیک'' کہی گئی ہو حدیث میں افضل حج قرار دیا گیا ہے۔ لہٰذا ان خاص مواقع کے علاوہ دیگر مقامات و مواقع میں جہر مفرط ناجائز اور بدعت مذمومہ ہے۔

علامہ جلال الدین السیوطی علیہ الرحمۃ نے اپنی تفسیر جلالین میں آیت ''اُدْعُوْا رَبَّکُمْ تَضَرُّعاًوَّ خُفْیَةً اِنَّهٗ لَایُحِبُّ الْمُعْتَدِیْنَ'' کی تفسیر میں فرماتے ہیں:

''اِنَّهٗ لَایُحِبُّ الْمُعْتَدِیْنَ فِی الدُّعَاءِ بِالتشدُّق وَرَفْعِ الصَّوتِ.'' (۱)

(بلاشبہ اللہ تعالیٰ دعاء میں چیختے ہوئے اور آواز بلند کرتے ہوئے حد سے گذر جانے والوں کو پسند نہیں فرماتے۔)

اور امام ابن جریج رحمہ اللہ نے فرمایا:

''معتدین یعنی حد سے گذر جانے والوں سے مراد اپنی آوازوں کو بلند کرنے والے ہیں۔ نیز فرمایا کہ چیخنا مکروہ اور بدعت ہے اور فرمایا کہ حد سے تجاوز کرنا (جو آیت میں مذکور ہے) یہ ہے کہ آواز بلند کرے اور دعاء میں چیخے، پکارے۔'' (ھکذا فی حاشیۃ جلالین)

امام فخر الدین الرازی رحمہ اللہ اپنی تفسیر کبیر میں اسی آیت میں واقع ''معتدین'' کی تفسیر کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

''ثم قال تعالیٰ بعده (انه لایحب المعتدین) والاظهران المرادانهٗ لایحب المعتدین فی ترک هذین الامرین المذکورین وهماالتضرع والاخفاء فان الله لایثیبه البتة ولایحسن الیه ومن کان کذلک کان من أهل العقاب لامحالة فظهران قوله تعالیٰ لایحب المعتدین کالتهدید

(۱) جلالین: ۱۳۴

والتشدیدعلی ترک التضرع والاخفاء۔" (۱)

(پھر اللہ تعالیٰ نے (تضرعاً اوراخفاء کاحکم دینے) کے بعد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ بلاشبہ حد سے گذر جانے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ظاہر یہ ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ وہ ایسے لوگوں کو پسند نہیں کرتا جوان مذکورہ دوامور کے ترک کرنے میں حد سے گذر جانے والے ہیں اوروہ دو چیزیں تضرع (گڑگڑانا) اوراخفاء (آہستہ دعاء کرنا) ہیں پس اللہ تعالیٰ (ایسے شخص کو جوان چیزوں کو ترک کردے) ثواب نہیں دیتااوراس پراحسان نہیں کرتا۔اور جوشخص ایسا ہے وہ اہل عقاب میں سے ہے لامحالہ۔پس اس سے یہ بات ظاہر ہوگئی کہ اللہ تعالیٰ کاقول ﴿انه لایحب المعتدین﴾ میں ترک تضرع وترک اخفاء مثل تہدید وتشدید کے ہے۔)

امام المفسرین علامہ محمود آلوسی بغدادی رحمۃ اللہ اپنی نادر تفسیر "روح المعانی" میں اس آیت کے تحت رقمطراز ہیں:

"ومن هنا قال جمع بکراهة رفع الصوت به وفی الانتصاف حسبک فی تعین الاسرار فیه اقترانه فی الایة بالتضرع فالاخلال به کالاخلال بالضراعة الی اللّٰه...... وتری کثیراً من اهل زمانک تعتمدون الصراخ فی الدعاء خصوصاً فی الجوامع حتی یعظم اللغط ویشتد وتستک المسامع وتشدّ ولایدرون انهم جمعوابین بدعتین رفع

(۱) تفسیر کبیر: ۱۴/۱۳۰

الصوت فی الدعاء و کون ذلک فی المسجد." (۱)

(یہیں سے ایک جماعت علماء نے دعاء میں آواز بلند کرنے کو مکروہ کہا ہے اور کتاب الانتصاف میں ہے کہ تجھے دعاء میں اخفاء و سر کی تعیین میں دعاء کا تضرع کے ساتھ آنا ہی کافی ہے۔ لہٰذا اخفاء میں خلل ڈالنا (یعنی جہر کرنا) گویا تضرع میں خلل ڈالنا ہے (کہ جب اخفاء نہ رہا تو تضرع بھی نہ رہا.......... آگے چل کر فرماتے ہیں...... کہ تو تیرے زمانہ والوں میں سے بہت ساروں کو دیکھے گا کہ وہ دعاء میں چیخ پکار کرنے والے پر اعتماد کرتے ہیں۔ خصوصاً مجمعوں (جامع مسجد) میں حتی کہ خوب ہی شوروغوغا ہوتا ہے اور کان بہرے ہوجاتے ہیں اور بند ہوجاتے ہیں۔ اور یہ لوگ اتنا بھی نہیں جانتے کہ انہوں نے دو بدعتوں کو جمع کر رکھا ہے ایک تو دعا میں آواز کا بلند کرنا اور دوسرے اس کا مسجد میں ہونا۔)

اسی طرح ملا علی قاری رحمۃ اللہ نے مسجد میں بلند آواز سے ذکر کرنے کو ناجائز فرمایا ہے اور درمختار میں مسجد میں ذکر جہری کو مکروہات میں شمار کیا ہے۔ یہ سب اسی جہری مفرط پر محمول ہے۔

ان علماء وفقہاء کے اقوال سے بات خوب واضح ہوگئی کہ دعاء میں چیخنا پکارنا جیسا کہ آج کل عام طور پر رائج ہوگیا ہے اور لوگ اس کو پسند کرتے ہیں اور ایسے ہی چیخنے والوں پر اعتماد کرتے ہیں۔ یہ سب ناجائز اور بدعتِ مذمومہ ہے اس کا ترک لازم اور ضروری ہے۔

(۱) روح المعانی: ۱۳۹/۸

جہر معتدل کا حکم

دوسری صورت یعنی جہر معتدل ومتوسط کا حکم یہ ہے کہ وہ فی نفسہٖ جائز ہے۔ چناں چہ جو روایات فصلِ ثالث میں گذری ہیں ان سے جہر کا جواز ثابت ہوتا ہے۔ البتہ ان سے جہر کی سنیت یا اس کا استحباب ثابت نہیں ہوتا جیسا کہ مفصل گذر چکا ہے۔

یہیں سے یہ بات بھی واضح ہوگئی کہ ذکر جہری یا دعاء جہری کو مطلقاً بدعت یا معصیت ونامشروع قرار دینا غلط ہے کیوں کہ جہر کا ثبوت متعدد روایات سے ہوتا ہے۔ پھر اس ثبوت کے بعد اس کا انکار درست نہیں۔ اس لیے اکثر جمہور فقہاء وعلماء نے جس طرح استحبابِ سر واخفاء پر اجماع واتفاق کیا ہے ایسے ہی جہر کے جواز ومشروع ہونے پر بھی اتفاق کیا ہے۔ یعنی جب کہ جہر حدِ اعتدال میں ہو اور بعض حضرات نے جہر کے ممنوع ہونے اور ناجائز ہونے پر اس حدیث سے استدلال کیا ہے کہ رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے بعض صحابہ کرام کو جہراً ذکر کرتے ہوئے دیکھ کر فرمایا تھا کہ اپنے نفسوں پر رحم کرو۔ یہ حدیث فصل اول میں گذر چکی ہے اور اس استدلال کا جواب بھی اشارۃ وہاں پر ہم نے ذکر کر دیا ہے۔ جس کا حاصل یہ ہے کہ یہ نہی شفقت ہے جیسا کہ علماء نے فرمایا ہے۔ اور اس کی تائید الفاظ حدیث سے بھی ہوتی ہے کیونکہ فرمایا گیا ہے "اربعوا علی انفسکم" کہ اپنے نفسوں پر رحم کرو۔ اور نہی شفقت سے اس فعل کا عدم جواز ثابت نہیں ہوتا۔ ہاں البتہ اتنا یاد رہے کہ نہی شفقت امر مستحب پر نہیں ہوسکتی جائز پر ہوسکتی ہے۔ اس لیے اس حدیث سے عدمِ استحبابِ جہر پر استدلال درست ہے اور عدمِ جوازِ جہر پر غلط۔ فافہم

جب یہ بات معلوم ومتحقق ہوچکی کہ دعاء وذکر اگر بجہر معتدل ومتوسط ہو تو فی نفسہٖ جائز ومباح ہے کہ اس جہر کے کرنے سے نہ ثواب ہے اور نہ ترک پر عتاب، تو اب یہ

ملاحظہ فرمائیے کہ امر مباح کبھی تو عارضی کراہت وحرمت کا شکار ہو جاتا ہے اور کبھی امور مستحبہ بل کہ امور واجبہ سے ملحق ہو جاتا ہے بالفاظ دیگر امر مباح کسی عارض کی وجہ سے مکروہ وحرام بھی ہوسکتا ہے اور کبھی مستحب وواجب بھی اس طرح دعاء ذکر جہری بھی جب مباح ٹھہرے تو ممکن ہے کہ کسی عارض غیر مناسب کی وجہ سے مکروہ یا ناجائز ہو جائیں یا کسی عارض محمود یا مقصود کے لحوق سے مستحب یا واجب ہو جائیں۔

تفصیل الاجمال

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ شرع میں فقہی قاعدہ اور اصول مسلم ہے کہ مباح اپنی ذات میں نہ طاعت ہے نہ معصیت، لیکن عوارض کے اعتبار سے ممکن ہے کہ کبھی وہ طاعت بن جائے اور کبھی معصیت ہو جائے مثلاً چلنا کہ ایک مباح فعل ہے کہ نہ اس کے کرنے پر ثواب ہے اور نہ ترک پر عتاب، مگر ممکن ہے کہ اس میں کوئی ایسی مصلحت ومنفعت ہو جس سے یہ عبادت بن جائے مثلاً مسجد یا مجلس وعظ کی طرف چلنا یا بنیت عبادت یا بغرض عیادت چلنا کہ یہ سب عبادت میں داخل ہو کر طاعت ہو گیا۔ اور اسی طرح یہ بھی ممکن ہے کہ اس چلنے میں کوئی مضرت یا مفسدہ ہو جس سے یہ مباح فعل معصیت ہو جائے، مثلاً ناچ دیکھنے کو چلنا یا شراب خوری کے لیے چلنا یہ سب معصیت میں داخل ہے۔

حاصل یہ ہے کہ مباح اگر چہ اپنی ذات میں نہ طاعت ہے نہ معصیت لیکن بعض عوارض خارجیہ کی وجہ سے وہ کبھی معصیت اور کبھی طاعت بن جاتا ہے اگر مفاسد کا لحوق ہوا تو وہ معصیت اور اگر مصالح کا عروض ہوا تو وہ طاعت بن جاتا ہے۔

پھر مفاسد ومصالح بھی متفاوت المراتب ہوتے ہیں۔ بعض مراتب مفاسد اشد اور بعض اخف، ایسے ہی بعض مصالح اعلی اور بعض ادنیٰ ہوتے ہیں۔ اسی

اعتبار سے اس امر مباح کے معصیت وطاعت ہونے میں تفاوت ہوتا ہے کہ کبھی تو امر مباح بعض مفاسد کے منضم ہو جانے سے حرام ہو جاتا ہے، کیوں کہ وہ مفاسد بھی اشد بل کہ اشد ترین ہوتے ہیں جیسے سنیما بینی کے لیے چلنا۔ اور بعض اوقات وہ مکروہ ہو جاتا ہے کیونکہ وہ مفاسد اشد نہیں ہوتے اخف اور ہلکے ہوتے ہیں۔

اور کبھی امر مباح بعض مصالح کی وجہ سے واجب وفرض ہو جاتا ہے، کیوں کہ وہ مصالح اعلی اور مقصود ہوتے ہیں۔ مثلاً حج بیت اللہ کے لیے ہوائی جہاز یا سمندری جہاز کا سفر کرنا کہ یہاں ہندوستان وغیرہ ممالک کے لیے حج کا فریضہ ادا کرنا، اس کے سواء ممکن نہیں۔ جب حج اس پر موقوف ہوا کہ ہوائی جہاز یا سمندری جہاز کا سفر اختیار کیا جائے تو حج کی طرح یہ بھی فرض وواجب ہو گیا، حالاں کہ ہوائی جہاز کا یا سمندری جہاز کا سفر محض ایک مباح کام ہے اور کبھی امر مباح بعض مصالح کے عارض ہونے سے محض مستحب ومندوب ہوتا ہے۔ جیسے دینی وشرعی احکام کا لکھنا اور شائع کرنا کہ چونکہ اس میں فریضۂ تبلیغ ادا ہوتا ہے اور یہ مقصود ہے اس لیے یہ ذریعہ تبلیغ بھی مستحب ہو گا، حالاں کہ لکھنا محض ایک مباح کام ہے۔ اگر کسی کو شبہ ہو کہ جب حج بیت اللہ فرض تھا تو اس کا ذریعہ بھی فرض ہوا اور یہاں جب تبلیغ بھی فرض ہے تو اس کا ذریعہ کیوں نہ فرض ہو؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ ذریعہ دو قسم کا ہے ایک وہ جو مقصود کے حصول کے لیے عقلاً یا عادۃً موقوف علیہ کا درجہ رکھتا ہو۔ اور دوسرا وہ کہ وہ ذریعہ حصولِ مقصود کے لیے موقوف علیہ نہ ہو؛ بل کہ اس کے علاوہ دیگر ذرائع بھی اس کے حصول کے لیے ہوں۔ پس قسم اول کو اگر وہ فرض کا ذریعہ ہو فرض قرار دیں گے اور اگر مستحب کا ذریعہ ہو تو مستحب...... لیکن قسم ثانی میں مطلق ذریعہ تو فرض ہو گا، لیکن کسی خاص ذریعہ کو فرض نہ کہیں گے، اس لیے حج بیت اللہ کے اس خاص ذریعہ کو ہم

نے موقوف علیہ ہونے کی وجہ سے فرض کہا اور ذریعہ تبلیغ چوں کہ ایک ہی نہیں ہے اس لیے خاص اس ذریعہ کو یعنی لکھنے کو فرض نہیں کہا بل کہ مستحب کہا ہے۔ فافہم

جب یہ ممہد ہوگیا کہ امر مباح مفاسد و مصالح کے عروض ولحوق کے اعتبار سے مکروہ، حرام یا مستحب وفرض بھی ہوجاتا ہے، تو اب دعا یا ذکر میں جہر معتدل کا حکم دریافت کرنا نہایت ہی آسان ہے، کیونکہ اب صرف یہ بات دیکھنے کی ہے کہ اس دعاء جہری میں کوئی مفسدہ اعتقادی یا عملی ہے یا نہیں؟ بل کہ یہ تمام مفاسد سے خالی ہے۔

مروجہ دعائے جہری میں اعتقادی مفسدہ

سو غور کرنے سے اور حالات کا جائزہ لینے سے معلوم ہوتا ہے کہ مروجہ دعاء جہری میں اعتقادی و عملی دونوں قسم کے مفاسد منضم ہیں۔

اعتقادی مفسدہ تو اس طرح کہ ہمارے ان علاقوں میں لوگوں نے اس مباح امر کو اس کے درجہ سے گذار کر واجب کا درجہ دے دیا ہے، جس کی علامت یہ ہے کہ اگر کوئی امام نماز کے بعد سری دعاء کرے جو کہ افضل ہے، تو لوگ اس پر ملامت کرتے ہیں اور اسے مجبور کرتے ہیں کہ دعاء جہری کرے اور ظاہر ہے کہ ملامت کسی امر مباح کے ترک پر نہیں کی جاتی؛ بل کہ امور مستحبہ پر بھی اس قسم کی ملامت اور تشدید نہیں کی جاتی کہ مستقل جھگڑا قائم کردیا جائے؛ بل کہ بعض جگہ تو یہاں تک دیکھا گیا کہ ایک عالم امام کے سری دعاء کرنے پر لوگ اس قدر برگشتہ ہوئے کہ اس عالم امام کی جگہ جاہل شخص کو اپنا امام بنادیا، جسے قرآن پاک بھی ٹھیک ٹھاک پڑھنا نہیں آتا تھا۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ لوگ اس مروجہ طریقہ پر دعاء جہری کرنے کو ضروری خیال کرتے ہیں۔

اور اصول میں یہ امر محقق ہوچکا ہے کہ کسی امر مباح بل کہ امر مستحب کو بھی اس

کے درجہ سے گذار کر وجوب کا درجہ دے دینا فساد عقیدہ ہے اور علمائے کرام نے اس کے فساد اعتقادی ہونے کی تصریح کی ہے۔ اسی طرح کسی امر مباح یا مستحب پر اس طرح پابندی کرنا جیسے واجب وفرض پر کرتے ہیں فساد عملی ہے۔ حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ اپنی کتاب ''اصلاح الرسوم'' میں فرماتے ہیں:

''**قاعدہ اول:** کسی امر غیر ضروری کو اپنے عقیدہ میں ضروری اور موکد سمجھ لینا یا عمل میں اس کی پابندی اصرار کے ساتھ اس طرح کرنا کہ فرائض وواجبات کی مثل یا زیادہ اس کا اہتمام ہو اور اس کے ترک کو مذموم اور تارک کو قابل ملامت وشناعت جانتا ہو، یہ دونوں امر ممنوع ہیں؛ کیوں کہ اس میں حکم شرعی کو توڑنا ہے اور تقیید وتعیین وتخصیص والتزام وتحدید وغیرہ اسی قاعدہ اور مسئلہ کے عنوانات وتعبیرات ہیں''۔(۱)

قرآنی استدلال

یہ جو قاعدہ بیان کیا گیا کہ کسی امر مباح کو واجب خیال کرنا فساد عقیدہ ہے اور مذموم وممنوع ہے یہ قرآن پاک کی آیت سے مستنبط ہوتا ہے:

﴿وَلَيْسَ الْبِرُّ بِاَنْ تَاْتُوا الْبُيُوْتَ مِنْ ظُهُوْرِهَا وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنِ اتَّقٰى وَاْتُوا الْبُيُوْتَ مِنْ اَبْوَابِهَا﴾ (البقرۃ:۱۸۹)

(اس میں کوئی نیکی کی بات نہیں کہ گھروں میں ان کی پشت کی جانب سے آؤ ہاں لیکن نیکی یہ ہے کہ کوئی حرام چیزوں سے بچے اور گھروں میں (آنا چاہو) تو ان کے دروازوں سے آؤ۔)

واقعہ یہ ہے کہ اسلام سے پہلے اہل عرب اور بعض انصار احرام حج کی حالت

(۱) اصلاح الرسوم: ۷۳

میں کسی وجہ سے اپنے گھر جانا چاہتے تو گھروں میں ان کے دروازوں کے بجائے گھروں کی پشت کی جانب سے داخل ہوتے اور اس کو فضیلت خیال کرتے تھے۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔ (۱)

اور ان کے اس خیال کی تردید فرمائی کہ پشت کی جانب سے داخل ہونا کوئی نیکی اور فضیلت کی بات ہے اور گھروں کے دروازوں سے داخل ہونا بری بات ہے۔

اس جگہ لائق تامل وقابل التفات یہ امر ہے کہ گھروں میں دروازوں سے جانا بھی ایک امر مباح تھا اور پشت کی جانب سے داخل ہونا بھی ایک امر مباح تھا، لیکن جب ان لوگوں نے ایک مباح کو واجب اور دوسرے کو ناجائز قرار دے دیا تو اللہ تعالیٰ نے ان کی تردید کی اور اس زعم کا باطل ہونا بصراحت بیان فرمایا جس سے بقول حضرت حکیم الامت مجدد الملت تھانوی رحمہ اللہ یہ بات مستفاد ہوئی کہ ''جو شئی شرعاً مباح ہو اس کو طاعت وعبادت اعتقاد کر لینا، اسی طرح اس کو معصیت اور محل ملامت اعتقاد کر لینا شرعاً مذموم ہے اور بدعت میں داخل ہے۔ (۲)

مروجہ دعاء جہری بدعت ہے

پس آیت شریفہ سے یہ واضح ہوگیا کہ مباح کو باعث فضیلت عبادت وطاعت سمجھ لینا مفسدہ اور بدعت ہے۔ اور امر غیر ضروری وغیر مطلوب عندالشرع میں کوئی مفسدہ پیدا ہو جائے تو اس فعل کو ترک کر دینا واجب ہوتا ہے (اس کی تفصیل کے لیے رسالہ اصلاح الرسوم: ۳۷ تا ۴۷ ملاحظہ فرمائیں) جب یہ تین مقدمے ممہد ہو گئے کہ دعاء جہری فی نفسہٖ مباح ہے اور آج کل اس میں اعتقادی مفسدہ منضم ہو گیا ہے اور

(۱) بخاری : ۲/۶۴۸

(۲) تفسیر بیان القرآن: یسئلونک عن الأھلة کے تحت

جوشئ مباح مفسدہ سے مقترن ہو وہ ممنوع وواجب الترک ہے تو خود دعاء جہری کا ممنوع اور بدعت اور واجب الترک ہونا ثابت ہوگیا۔

پس یہ مروجہ دعاء جہری بدعت ہے اور چاہئے کہ اس کو ترک کردیا جائے۔ البتہ اگر کسی علاقے میں عوام کا حال ایسا نہ ہو اور وہ اس دعاء جہری کو واجب نہ سمجھتے ہوں جس کی علامت یہ ہے کہ کہ ترک جہر پر ملامت نہ کرتے ہوں یا بلا التزام جہر نہ کرتے ہوں تو پھر ان لوگوں کے لیے وہ اپنی اصل یعنی جواز پر باقی رہے گی۔

چناں چہ حضرت حکیم الامت تھانوی رحمہ اللہ اپنے رسالہ ''استحباب الدعوات'' میں فرماتے ہیں:

''قدکثرالناس فی ھٰذہ المسئلة اعنی دعاء الامام عقیب الصلوٰة وتامین الحاضرین علیٰ دعائه وحاصل ماانفصل عنه الامام الغبرینی و ابن عرفة ان ذلک ان کان علیٰ نیة انه من سنن الصلوٰة وفضائلها فھوغیرجائز وان کان مع السلامة من ذلک فھوباق علی حکم الاصل.'' (۱)

(لوگوں نے اس مسئلہ یعنی امام کے بعد نماز دعا مانگنے اور حاضرین کے اس پر آمین کہنے میں بہت کلام کیا ہے اور امام غبرینی اور امام ابن عرفہ نے جو تحقیق بیان کی ہے اس کا حاصل یہ ہے کہ یہ نماز کی سنتوں میں سے ہے اور اس کے فضائل میں سے ہے تو پھر نا جائز ہے اور اگر اس (عقیدہ سنیت) سے سلامتی کے ساتھ ہے تو وہ اپنی اصل (یعنی جواز) پر باقی ہے۔)

---

(۱) رسالہ استحباب الدعوات مندرجہ امداد الفتاوی: ۸۰۳

دعاء جہری میں عملی مفاسد

یہاں تک اعتقادی مفسدہ کی تحقیق تھی۔اب ہم دعاء جہری کے عملی مفاسد کا ذکر کرتے ہیں، اگرچہ دعاء جہری کے بدعت وواجب الترک ہونے کے لیے اعتقادی مفسدہ کا تحقق ہی کافی ہے، لیکن تکمیل بحث کی خاطر اور اس کی مزید شناعت وقباحت کی تحقیق کے لیے ان عملی مفاسد کا ذکر بھی مناسب ہے،سواس میں کئی عملی مفاسد جمع ہیں:

(۱) سب سے پہلے اور عظیم مفسدہ تو یہ ہے کہ دعاء جہری سے طریق سنت کا ترک لازم آتا ہے؛ کیوں کہ سنت تو سر واخفاء ہی ہے جیسا کہ اوپر ثابت ہو چکا۔البتہ کبھی کبھی کسی غرض صحیح ومصلحت کی خاطر ترکِ سر خلاف سنت نہیں ، کیوں کہ اس کا ترک بھی ثابت ہے جیسا کہ فصل ثالث میں بتایا گیا ہے۔

(۲) دوسرا عملی مفسدہ اور خرابی یہ ہے کہ بعض حضرات مسبوق ہوتے ہیں یعنی نماز میں اتنی تاخیر سے آتے ہیں کہ ایک دو رکعات جماعت سے چھوٹ جاتے ہیں اور امام کے سلام پھیرنے کے بعد یہ لوگ اپنی باقی ماندہ نماز ادا کرنے کھڑے ہو جاتے ہیں، اب اگر دعاء بلند آواز سے کی جائے تو ان مسبوقین کے خیالات بٹ جاتے ہیں اور منتشر ہونے لگتے ہیں اور ان کے خشوع وخضوع میں خلل واقع ہوتا ہے۔اسی لیے علماء اوقاتِ جماعت کے علاوہ بھی مسجد میں اس وقت بلند آواز سے قرآن پاک کی تلاوت کو ناجائز فرماتے ہیں جب کہ وہاں کوئی نماز پڑھ رہا ہو۔ تو پھر عین اوقات جماعت میں دعاء جہری کی کیونکر اجازت دی جاسکتی ہے؟

(۳) تیسرا عملی مفسدہ وہ ہے کہ جس کی جانب علامہ محمود آلوسی رحمہ اللہ کی منقولہ بالا عبارت میں اشارہ ہے کہ سر واخفاء کے ترک کرنے سے تضرع میں خلل

پڑتا ہے۔اور یہ بات مشاہد و مجرب ہے کہ جہاں سر واخفاء مفقود ہوتا ہے وہاں خضوع بھی اور تضرع بھی رخصت ہوجاتے ہیں۔غالبًا یہی وجہ ہے کہ آیت شریفہ ''اُدْعُوْرَبَّکُم تَضَرُّعاً وَخُفْیَةً'' میں تضرع کا حکم دینے کے بعد فوراً اخفاء کا حکم دیا ہے کہ تضرع بلا اخفاء کے یا تو حاصل ہی نہیں ہوتا یا نہایت ہی مشکل ہے۔

(۴) چوتھا مفسدہ وہ ہے جو رسالہ استجاب الدعوات میں امام مالک رحمہ اللہ کے مذہب کی تحقیق کرتے ہوئے لکھا ہے:

''ففی ابی الحسن علی الرسالة ما نصه القرافی کره مالک رحمہ اللہ وجماعة من العلماء الائمة المساجد والجماعات الدعاء عقیب الصلوات المکتوبة جهراً للحاضرین فتجمع لهذاالامام التقدم وشرف کونہٖ نصب نفسه واسطة بین الله وعباده فی تحصیل مصالحهم علی ید یه فی الدعاء فیوشک ان تعظم نفسه ویفسد قلبه وتعصی ربه فی هذه الحالة اکثر ممایطیعه.''

(امام ابوالحسن رحمہ اللہ کے حاشیۂ رسالہ میں یہ الفاظ ہیں۔قرافی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ امام مالک رحمہ اللہ اور علماء کی ایک جماعت نے مساجد کے اماموں اور جماعت کے اماموں کے لیے جہراً دعا مانگنا مکروہ سمجھا ہے، کیوں کہ اس صورت میں امام کے لیے دو چیزیں بڑائی اور سیادت کی جمع ہوں جائیں گی ایک امامت کے سبب سب سے آگے ہونا دوسرے یہ کہ اس نے اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ اور اس کے بندوں کے درمیان دعاء میں ایک واسطہ بنا کر قائم کر دیا ہے، تو عجب نہیں کہ

اس کے نفس میں تکبر پیدا ہوجائے اوراس کا قلب فاسد ہوجائے۔
لہٰذا اس حالت میں حق تعالیٰ کی جتنی عبادت کررہا ہے اس سے زیادہ
گناہ میں مبتلا ہوجائے)(۱)

راقم السطور کہتا ہے کہ اس مفسدہ کا کچھ مشاہدہ ان دیہاتوں اوران علاقوں میں دورہ کرنے سے ہوسکتا ہے کہ جہاں لوگ امام ومؤذن کے پاس دعاء کرانے اور ایصال ثواب کروانے کے لیے کھڑے رہتے ہیں۔ کیوں کہ ان جاہل اماموں نے عوام کو یہ سمجھا رکھا ہے کہ ایصال ثواب، فاتحہ خوانی اورقرآن خوانی وغیرہ انہیں اماموں کے توسط سے کی جاسکتی ہے، ورنہ فاتحہ خوانی اور قرآن خوانی کا ثواب پہنچنا تو درکنار خود فاتحہ ہی صحیح نہیں ہوتی۔ اس طرح یہ لوگ خدا کی نافرمانی کرکے اپنا پیٹ پالتے ہیں۔

(۵) پانچواں مفسدہ یہ ہے کہ مقتدیوں اور مصلیوں کو اس خاص وقت میں جس میں بحوالہ حدیث نبوی دعائیں قبول ہوتی ہیں (یعنی فرض نمازوں کے بعد کے وقت میں) اپنی حاجات اللہ تعالیٰ کے سامنے پیش کرنے کا موقع نہیں ملتا۔ اگر ایسے ہی موقع میں اپنی ضروریات وحاجات کو اللہ کے سامنے نہ رکھیں گے تو پھر کب رکھیں گے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ قبولیت کے اور مواقع نہیں ہیں؛ بل کہ مطلب یہ ہے کہ یہ نمازوں کے بعد کا وقت تو بہت ہی اہم ہے۔ ایک حدیث میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بات کی تاکید فرمائی ہے کہ فرض نمازوں کے بعد دعا کیا کرو۔ (۲)

(۶) چھٹا مفسدہ یہ ہے کہ آج کل عام طور پر ائمہ مساجد بعض دعاؤں کو رٹ کر

(۱) رسالہ استحباب الدعوات مندرجہ امداد الفتاوی: ۸۰۱

(۲) رسالہ استحباب الدعوات مندرجہ امداد الفتاوی: ۸۰۵

بلا سمجھے ویسے ہی پڑھ دیتے ہیں جس پر بے چارے عوام آمین آمین کہتے جاتے ہیں۔ ان رٹی رٹائی دعاؤں کے مطلب و معنی پر نہ ائمہ ہی توجہ کرتے ہیں نہ عوام، بس ایک رسم کے طور پر چند دعاؤں کو پڑھ دیتے ہیں اور ایسی دعاؤں کے بارے میں حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ جان لو اللہ تعالیٰ غافل قلب سے دعاء قبول نہیں کرتا۔ (۱)

پھر دعا محض پڑھ دینے کا نام نہیں ہے؛ بل کہ دعاء تو مانگنے کا نام ہے۔

پس جب اس مروجہ دعاء جہری میں کئی کئی مفاسد بھرے پڑے ہیں تو اس مباح کے مکروہ و ناجائز ہونے میں کیا تردد ہے؟ کیونکہ جیسا کہ اوپر عرض کر چکا ہوں کہ مباح میں اعتقادی یا عملی مفاسد منضم ہو جائیں تو وہ مباح مکروہ و ناجائز ہو جاتا ہے اور اس کا ترک واجب ولازم ہوتا ہے۔ پس یہ مروجہ دعاء بھی واجب الترک ہے۔

مستحب بھی مکروہ ہوسکتا ہے

مباح تو مباح ہی ہے وہ اگر کسی عارض کی وجہ سے مکروہ و ناجائز ہو جائے تو چنداں تعجب نہیں۔ فقہاء کرام نے بعض امور مستحبہ تک کو فساد عقیدہ یا خرابی عمل کی وجہ سے مکروہ فرمایا ہے جب کہ کبھی کبھی ترک نہ کیا جائے، حالاں کہ بعض سورتوں کا متعین کرنا خود شارع علیہ السلام سے ثابت ہے۔ (۲)

(۱) ترمذی: ۳۴۰۱

(۲) یہیں سے امام کے لیے عمامہ اور خطیب کے لیے عصا کے استعمال کا مسئلہ بھی معلوم ہو گیا کہ چونکہ ہمارے ان علاقوں میں ان چیزوں کو ضروری و واجب سمجھا جاتا ہے اس لیے ان پر بھی مداومت واستمرار مکروہ و بدعت ہوگا۔ اس موقع پر میرے ایک غیر مطبوعہ رسالہ ''اصلاح المفاسد'' سے چند سطور اس سلسلہ میں ملخصاً نقل کرتا ہوں، وہ یہ کہ:

''عمامہ کے بارے میں دو خرابیاں ہیں، ایک تو یہ کہ عوام و بعض خواص کالعوام نے اس کو وجوب کا درجہ دے دیا ہے، یہی وجہ ہے کہ عوام عمامہ کے بغیر امامت پر شدت سے انکار کرتے ہیں۔

....

اس سے بھی عجب یہ ہے کہ ڈاڑھی کٹانے والے کی امامت کو تو بلا نکیر و کراہت درست رکھتے ہیں لیکن کیا مجال کہ کوئی بلا عمامہ نماز پڑھاوے۔ اس سے عوام کے اعتقاد باطل وخیال فاسد کا بخوبی اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ مستحب کو تو واجب گردانا اور واجب کو مباح سے گھٹا دیا۔ یہی حال ہے عصا کے استعمال کا (جس کی تفصیل اصل رسالہ میں ہے)''

کیا اب بھی ان لوگوں کی آنکھیں نہیں کھلتیں، جو مصلحت کی رٹ لگائے عوام کے عقائد باطلہ کی اصلاح سے دست کش ہیں؟ افسوس ہے کہ مصلحت کا نام لے کر بجائے اصلاح کے فساد پھیلایا جاتا ہے۔ اس پر طرہ یہ کہ یہ حضرات بڑے زور سے کہہ دیا کرتے ہیں کہ اصلاح کرنے سے عوام میں فتنہ ہوگا اور قرآن میں فتنہ کو قتل سے اشد قرار دیا ہے۔ مگر میں کہتا ہوں کہ یہ'' **کلمۃ حق ارید بھا الباطل**'' کی قبیل سے ہے۔ کیونکہ قرآن میں لفظ فتنہ عقائد باطلہ یا اعمال قبیحہ یا اخلاق رذیلہ کے لیے استعمال ہوا ہے جس کا مطلب یہ ہوا کہ برے عقائد واعمال واخلاق قتل سے بھی اشد وسخت ہیں۔ قرآن میں اردو والا فتنہ مراد نہیں ہے۔ لہٰذا اس کو مراد لینا اپنی جہالت کا اظہار یا تحریف قرآن کا جرم اپنے سر لینا ہے۔

دوسری خرابی یہ ہے کہ عمامہ نماز وغیر نماز میں اور مقتدی و امام سب کے لیے سنت تھا۔ مگر عوام نے اس کو ایک تو نماز کے ساتھ خاص کر دیا، دوسرے امام کے ساتھ۔

یہ اپنی جانب سے تخصیص وتقیید باطل ہے۔

بعض لوگ نماز میں خصوصیت کے ساتھ عمامہ باندھنے کی فضیلت پر بعض روایات سے استدلال کرتے ہیں۔ مثلاً حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ عمامہ کے ساتھ دو رکعت بلا عمامہ ستر رکعت سے افضل ہے۔ اور ابن عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نفل یا فرض نماز عمامہ کے ساتھ بلا عمامہ کے پچیس درجہ برابر ہے۔ مگر اولاً تو محدثین نے ان روایات کو موضوع قرار دیا ہے (دیکھو فیض القدیر اور موضوعات صغریٰ و کبریٰ)

دوسرے اس میں امام کی تخصیص نہیں ہے اور وہی محل عبث ہے۔

الغرض ان خرابیوں کی وجہ سے ان چیزوں کو مداومۃً نہیں کرنا چاہئے۔ یہ رسوم قابل اصلاح ہیں تا کہ حدود شرع سے تجاوز نہ ہو۔ (**تلک حدود اللہ فلا تعتدوھا**) فقط۔

علامہ شامی رحمہ اللہ اس پر طویل بحث فرمانے کے بعد آخر میں رقمطراز ہیں:

"حاصل کلام هذين الشيخين بيان وجه الكراهة فى المداومة وهوأنه ان راى ذلک حتماً يكره من حيث تغييرالم شروع والايكره من حيث ايهام الجاهل." (۱)

(ان دو بزرگوں (علامہ ابن ہمام وابن نجیم) کے کلام کا حاصل (ان مستحب سورتوں پر) مداومت وہیشگی میں کراہت یہ ہے کہ وہ (مستحب سورتوں پر التزام کرنے والا ان سورتوں کے پڑھنے کو) اگر ضروری خیال کرتا ہے یعنی واجب جانتا ہے تو یہ مکروہ ہے تغییر شرع کی وجہ سے، ورنہ مکروہ ہے جاہل کو (وجوب کے) وہم میں ڈالنے کی وجہ سے (کہ لوگ اس کو واجب سمجھیں گے)

الغرض جہاں تغییر شرع لازم آئے یا عوام جہلا کے واجب سمجھ جانے کا اندیشہ ہو تو اس مستحب کو بھی ترک کرنا لازم ہو جاتا ہے اور وہ مکروہ وممنوع ہو جاتا ہے۔ اسی وجہ سے ایک جلیل القدر وعظیم المرتبت صحابیِ رسول حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ:

"لايجعل أحدكم الشيطان شيئاً من صلوته يرى أن حقاً عليه أن لاينصرف عن يمينه لقد رايث رسول الله ا كثيراً ينصرف عن يساره." (۲)

(تم میں سے کوئی اپنی نماز میں شیطان کا حصہ مقرر نہ کرے کہ اپنے

(۱) رد المختار: ۱/۳۶۶

(۲) بخاري: ۱/۱۱۸

اوپر واجب جاننے لگے کہ سوائے داہنی طرف کے (بعد نماز) دوسری جانب سے نہ گھومے میں نے رسول اللہ کو بہت مرتبہ بائیں جانب سے بھی مڑتے دیکھا ہے)

اس حدیث میں حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے بعد نماز صرف داہنی طرف مڑنے کے ضروری سمجھنے پر اس کو شیطانی حصہ اور شیطانی عمل قرار دیا ہے۔ حالاں کہ داہنی جانب مڑنا رسول اللہ سے بیشتر احادیث سے ثابت ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ کسی سنت کو واجب کا درجہ دیدینا بھی درست نہیں۔ اس حدیث کے تحت علامہ طیبی رحمۃ اللہ شارح مشکوۃ فرماتے ہیں:

''وفيه أن من أصر على مندوب وَجَعلهُ عزماً ولم يعمل بالرخصة فقدأصاب منه الشيطان من الاضلال فكيف من أصرّعلى بدعةٍ اومنكر.'' (۱)

(اس حدیث میں یہ بات بتائی گئی کہ جو شخص امر مستحب پر اصرار اور پابندی (اس طرح) کرے کہ اس کو واجب سمجھے (خواہ اعتقاداً خواہ عملاً) اور رخصت پر عمل بالکل نہ کرے تو شیطان نے اس سے گمراہ کرنے کا حصہ حاصل کرلیا (جب امر مندوب پر اصرار اور اس کو واجب جاننے کا یہ حال ہے) تو بدعت اور منکر پر اصرار کرنے والے کا کیا حال ہوگا؟)

یہیں سے یہ بھی معلوم ہوگیا کہ اگر تھوڑی دیر کے لیے دعاء جہری کو مستحب ہی مان لیں تب بھی آج کل کی مروجہ دعاء جہری ان مفاسد اعتقادی و عملی کی وجہ سے بدعت و واجب الترک ٹھہرتی ہے۔

---

(۱) مرقاۃ المصابیح: ۳۵۳/۲

پس یہ بات واضح ہوگئی کہ مروجہ دعاء جہری بدعتِ مذمومہ وامر منکر ہے، اس کا ترک لازم اور ضروری ہے۔

دعاء جہری مفاسد سے خالی ہوتو؟

یہ سب کلام تھا اس مروجہ دعاء جہری میں جو مفاسد اعتقادیہ وعملیہ سے مرکب ہو لیکن جو دعاء جہری مفاسد سے خالی ہو وہ اپنی اصل پر باقی رہے گی اور جائز ومباح ہوگی جیسا کہ ہم نے رسالہ استحباب الدعوات سے نقل کیا ہے۔

دعاء جہری میں مصالح ہوں تو؟

اور اگر دعاء جہری مفاسد سے خالی ہونے کے ساتھ مصالح مطلوبہ عندالشرع پر مبنی ہو تو پھر یہ دعاء جہری افضل وعبادت ہوسکتی ہے۔ جیسا کہ اوپر معلوم ہو چکا ہے کہ مباح میں اگر مصالح کا اعتبار کیا جاوے تو وہ مباح طاعت بن جاتا ہے۔ جس طرح چلنا ہے کہ یہ فی نفسہٖ مباح ہے، مگر بنیت عبادت یا بغرض عیادت افضل وعبادت ہے۔ اسی طرح دعاء جہری کسی مصلحت پر مشتمل ہو تو وہ بھی افضل ومستحب قرار دی جاسکتی ہے۔ مثلاً:

تعلیم کی غرض سے دعاء میں جہر کرنا درست اور نفع متعدی ہونے کی وجہ سے افضل ہے۔ مگر یہ صرف اسی حد تک کہ غرض تعلیم پوری ہو جب یہ غرض پوری ہو جائے تو پھر اس کو ترک کر دینا چاہیے جیسا کہ اسی رسالہ میں امام شافعی رَحِمَہُ اللہُ کا قول ''فتح الملهم'' سے نقل کیا گیا ہے کہ بقصد تعلیم جہر جائز تو ہے لیکن جب غرض پوری ہو جائے تو پھر دعا میں اسرار واخفاء کرنا چاہیے مگر یاد رہے کہ آج کل جو عام مساجد میں جہری دعاء کا رواج ہے اس میں اول تو یہ قصہ نہیں دوسرے مفاسد ہونے

کی وجہ سے اگر چہ اس میں مصالح ہوں تو یہ درست نہیں ہوگی۔ جیسا کہ عنقریب اس کی وضاحت آتی ہے۔

اس طرح اگر کوئی اس غرض سے جہر کرے کہ قلب میں تیقظ و بیداری پیدا ہو اور سستی دور ہو تو بھی جہر کی اجازت کے ساتھ استحباب کا قول بھی کیا جا سکتا ہے۔ کیوں کہ یہ بھی ایک مطلوب عندالشرع مصلحت ہے۔ اسی مصلحت سے صوفیاء کرام نے ذکر میں جہر کو افضل قرار دیا ہے۔ یہ مطلب نہیں کہ اصل و افضل جہر ہے؛ بل کہ یہ فضیلت و استحباب عارضی ہے، جو ایک غرض صحیح پر مبنی ہے، یہی محمل و مطلوب ہے ان روایات فقہیہ کا جن میں ذکر جہری کو افضل گردانا ہے۔ مثلاً علامہ ابن عابدین الشامی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"فان خلامما ذکرفقال بعض اهل العلم ان الجهر افضل لانه اکثرعملاً ولتعدی فائد ته الی السامعین ویوقظ قلب الذاکرفیجمع همه الی الفکرویصرف سمعه الیه ویطردالنوم ویزید النشاط." (۱)

(اگر (ذکر جہری) مفاسد مذکورہ سے خالی ہو تو بعض اہل علم نے فرمایا کہ جہر افضل ہے، کیونکہ یہ عمل کے اعتبار سے زیادہ ہے۔ نیز اس کا فائدہ سامعین کو بھی پہنچتا ہے اور یہ قلب کو بیدار کرتا ہے جس سے اس کا ارادہ وقصد غور وفکر کی طرف جمع ہوتا ہے اور اس کے کام بھی اس ذکر کی طرف لگ جاتے ہیں اور نیند کو دور کرتا ہے اور نشاط پیدا کرتا ہے)

(۱) ردالمحتار: ۳۴۴/۲

امام فخر الدین الرازی رحمہ اللہ تفسیر کبیر میں حکیم الترمذی رحمہ اللہ کا یہ قول نقل کرتے ہیں:

"وان کان قد بلغ فی الصفاوقوۃ الیقین الی حیث صارآمناً عن شائبۃ الریاء کان الاولیٰ فی حقہٖ الاظہار لتحصیل فائدۃ الاقتداء. (۱)

(اگر (دعایاذکرکرنے والا) مقام صفاوقوت یقین کے اس مرتبہ کو پہنچ گیا ہے کہ ریاء کے شائبہ سے بھی مامون ومحفوظ ہوگیا تو اس کے حق میں اظہار یعنی جہرہی اولی وافضل ہے تا کہ دوسروں کے اقتداء کرنے کا فائدہ حاصل ہو)

علامہ محمود آلوسی رحمہ اللہ نے بھی نقل کیا کہ دعاء جہری اس وقت افضل ہے جب کہ فائدہ متعدی ہو یا کسی مقصود کی تسہیل وغیرہ کا فائدہ حاصل ہو۔ان کی عبارت تقریباً علامہ ابن عابدین رحمہ اللہ کی عبارت کے مثل ہے۔

ان سب عبارتوں اور اس کے علاوہ دیگر عبارات فقہاء میں دعاء جہری یا ذکر جہری کو جوافضل قرار دیا ہے، یہ ان مصالح مطلوبہ کے پیش نظر ہے جو خود ان عبارات میں مجملاً یا مفصلاً ،صراحتاً یا اشارۃً مذکور ہیں۔

ایک شبہ کا جواب

یہاں یہ شبہ نہ ہونا چاہئے کہ جب دعاء سری افضل ہے تو پھر جہری کس طرح افضل ہوجاوے گی۔ کیونکہ اس طرح ہوسکتا ہے کہ کسی عارض کی وجہ سے غیر افضل افضل ہوجاوے اور موخر مقدم ہوجائے چناں چہ اس کی نظیر حدیث میں بھی ملتی ہے۔

(۱) تفسیر کبیر: ۱۴/۱۳۱

وہ یہ کہ حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ اگر بوقت اقامت کھانا حاضر ہو جائے (اور کھانے کا تقاضا بھی ہو تو) تو پہلے کھانا کھالے پھر جماعت میں شریک ہو۔ (۱)

اس مضمون کی احادیث حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا، انس رضی اللہ عنہ و ابن عمر رضی اللہ عنہما وغیرہ سے بخاری وغیرہ میں مروی ہیں۔ اسی بنا پر فقہاء نے لکھا ہے کہ ایسی صورت میں کھانا پہلے کھالینا افضل و مستحب ہے تاکہ نماز میں کھانے کا دھیان رہنے کے بجائے کھانے میں نماز کا دھیان ہو۔ یا یوں کہو کہ خشوع و خضوع میں خلل سے بچنے کے لیے کھانے کو مقدم کرنا افضل ہے۔

اس میں غور کیجیے کہ کھانے پر جماعت کی افضلیت ایک امر مسلم ہے، لیکن ایک مصلحت کی خاطر حدیث میں کھانے کو مقدم و افضل قرار دیا گیا اور وہ مصلحت مطلوب عند الشرع ہے۔ یعنی نماز میں خشوع میں خلل نہ پڑنا۔ مگر اس سے کوئی یہ استدلال ہرگز نہیں کرسکتا کہ مطلقاً کھانا کھانا جماعت میں شرکت سے افضل ہے۔

اس کی دوسری نظیر صوفیاء کرام کا یہ قول ہے جو ان کے یہاں مشہور ہے یعنی ''شیخ کی ریاء مرید کے اخلاص سے بہتر ہے''۔

سب جانتے ہیں کہ اخلاص افضل عبادت بل کہ مغز عبادت ہے اور اس کے مقابلہ میں ریاء افضل تو کیا بدترین چیز بل کہ عبادت کو بھی برباد کر دینے والی ہے، مگر محض ظاہر میں لوگوں کو دکھا کر عمل کرنا اگر شیخ کامل کی طرف سے ہو تو اس میں مفاسد تو ہوتے نہیں اور مصالح مرتب ہوتے ہیں۔

مفاسد تو اس لیے نہیں کہ وہ شیخ کامل قوت یقین و صفا کے اعلیٰ مراتب پر فائز ہوتا ہے۔ لہٰذا دل میں کوئی خرابی مثل لوگوں کو دکھانے یا خوش کرنے کی نہیں ہوتی اور مصالح اس لیے مرتب ہوتے ہیں کہ اس کے معتقدین و منسلکین اس کو دیکھ کر عبادت

(۱) بخاري: ۹۲/۱

میں رغبت حاصل کرتے اور طریقِ عبادت سیکھتے ہیں۔ اس لیے صوفیاء نے اس ریاکاری کو مرید کے اخلاص سے بھی افضل قرار دیا ہے، مگر اس کا کیا یہ مطلب ہوسکتا ہے کہ ریاء افضل ہے اور اخلاص غیر افضل؟ ہرگز نہیں۔

پس معلوم ہوا کہ اگر کوئی غیر افضل چیز مصالح پر مبنی ہو تو وہ بھی افضل ہو سکتی ہے، اس طرح دعاء جہری اگر مصالح شرعیہ پر مبنی ہو تو افضل ہو جائے گی۔

ایک سوال وجواب

یہاں اگر کوئی یہ سوال کرے کہ یہ مروجہ دعاء جہری بھی بعض مصالح پر مبنی ہے مثلاً لوگوں کو اس میں دعاء کی تعلیم ہے تو پھر مروجہ دعاء بھی افضل ہونا چاہئے۔ پھر اس کو بدعت کیوں قرار دیا گیا؟

اس کا جواب اولاً تو یہ ہے کہ آج کل یہ بات بالکل مفقود ہے۔ برسہابرس سے لوگ امام کی دعاء سنتے ہیں مگر خال خال ہی کوئی ہوں گے جو اس سے فائدہ اٹھاتے ہوں، کیونکہ اس کے لیے طالب و متعلم میں قصد و ارادہ کا ہونا شرط ہے، اور لوگ اس نیت سے دعائیں سنتے ہی نہیں، پھر ان کو کیونکر فائدہ ہوگا؟ لہٰذا آج کل یہ محض ایک رسم ہے جس میں کوئی فائدہ نہیں۔

ثانیاً اگر اس فائدہ کو تسلیم کرلیں تو پھر بھی یہ یاد رکھنا چاہئے کہ ان مصالح کی بنا پر دعاء جہری کی وہاں اجازت ہے جہاں کہ اس میں مفاسد عملیہ واعتقادیہ نہ ہوں۔ ہم اس کی طرف اس رسالہ میں اشارہ کر چکے ہیں۔

کیوں کہ فقہی وشرعی اصل اور قاعدہ ہے کہ اگر کوئی عمل مصالح ومفاسد سے مرکب ہو تو اعتبار مفاسد کا ہوگا۔

حضرت مولانا تھانوی رحمہ اللہ اپنی تحریر "مکتوب محبوب القلوب"

میں فرماتے ہیں:

''اب دوسرا قاعدہ سمجھنے کے قابل ہے کہ بعض افعال مباحہ تو ایسے ہوتے ہیں کہ ان میں سرتاپا مفسدہ ہی مفسدہ ہے، اس لیے اس کے ممنوع ہونے میں کلام نہیں ہوتا۔ بعض افعال ایسے ہیں جن میں کچھ مصلحت اور کچھ مفسدہ ہوتا ہے، کسی کی نظر مصلحت پر ہوتی ہے اور مفسدہ کی طرف یا تو التفات نہیں ہوتا یا اس کو قابلِ اعتبار نہیں سمجھتے یا اس میں کچھ تاویل کی گنجائش سمجھ لیتے ہیں۔

ایسا شخص اس کو جائز بل کہ مستحسن کہتا ہے اور کسی کی نظر مفسدہ پر بھی ہوتی ہے خواہ مفسدہ لازم ہو یا متعدی، ایسا شخص اس کو ممنوع ٹھہراتا ہے، خواہ مصلحت پر نظر ہی نہ ہو یا اس پر بھی نظر ہو۔ کیونکہ قاعدہ مقررہ ہے کہ جب حلّت وحرمت کے اسباب کسی شئی میں جمع ہوجاتے ہیں تو وہاں حرمت ہی کو ترجیح ہوتی ہے۔''(۱)

اسی طرح علامہ عمیم الاحسان رحمۃ اللہ نے قواعد الفقہ میں علامہ ابن النجیم المصری رحمۃ اللہ کی مشہور کتاب ''الاشباہ والنظائر'' سے نقل کرتے ہیں:

''اذااجتمع الحلال والحرام والمحرم والمبیح غلب الحرام والمحرم.'' (۲)

(جب (کسی شئی میں) حلال وحرام یا (اسباب حلت وحرمت جمع ہوجائیں تو حرام اور سبب حرمت کو ترجیح ہوتی ہے)

حاصل یہ ہے کہ اگر کسی چیز میں مصالح ومفاسد جمع ہوجائیں تو مفاسد کا اعتبار

---

(۱) قواعد الفقہ : ۵۵

(۲) قواعد الفقہ : ۵۵

کر کے اس کو حرام وناجائز کہیں گے یا مکروہ قرار دیں گے۔ ہاں اگر مفاسد نہ ہوں اور مصالح بھی ملحوظ ہوں تو پھر مصالح معتبر ہوں گے۔ اس لیے جن فقہاء نے دعاء جہری کو افضل کہا ہے انہوں نے یہ بھی قید لگائی کہ مفاسد سے خالی ہو۔ چناں چہ منقولہ بالا علامہ شامی رحمہ اللہ کی عبارت میں ''**فان خلا مما ذکر**'' (اگر مفاسد مذکورہ سے خالی ہو) اور علامہ رازی رحمہ اللہ کی کتاب میں ''**فان کان قد بلغ(الی ان قال) صار آمناً عن شائبة الریاء**'' اس پر صریح دال ہیں کہ مفاسد سے خالی ہونے کی صورت میں مصالح کا اعتبار ہوگا۔

پس مروجہ دعاء جہری کے جواز کی کوئی تاویل نہیں کی جاسکتی، لہٰذا یہ قابل ترک ہے۔ اس جگہ حضرت مفتی شفیع صاحب رحمہ اللہ کا ایک مضمون معارف سے نقل کرتا ہوں جس سے میری تائید ہوتی ہے۔

چناں چہ مفتی صاحب رحمہ اللہ معارف القرآن میں فرماتے ہیں:

''ہمارے زمانے کے ائمہ مساجد کو اللہ تعالیٰ ہدایت فرمادیں کہ قرآن وسنت کی اس تلقین کو اور بزرگانِ سلف کی ہدایات کو یکسر چھوڑ بیٹھے، ہر نماز کے بعد دعا کی ایک مصنوعی سی کارروائی ہوتی ہے، بلند آواز سے کچھ کلمات پڑھے جاتے ہیں جو آدابِ دعاء کے خلاف ہونے کے علاوہ ان نمازیوں کی نماز میں بھی خلل انداز ہوتے ہیں، جو مسبوق ہونے کی وجہ سے امام کے فارغ ہونے کے بعد اپنی باقی ماندہ نماز پوری کررہے ہیں۔ غلبہ رسوم نے اس کی برائی اور مفاسد کو ان کی نظروں سے اوجھل کردیا ہے۔ کسی خاص موقع پر خاص دعاء پوری جماعت سے کرانا مقصود ہو، ایسے موقع پر ایک آدمی کسی قدر آواز

سے دعاء کے الفاظ کہے اور دوسرے آمین کہیں، اس کا مضائقہ نہیں۔ شرط یہ ہے کہ دوسروں کی نماز وعبادت میں خلل کا موجب نہ بنیں۔ اور ایسا کرنے کی عادت نہ ڈالیں کہ عوام یہ سمجھنے لگیں کہ دعاء کرنے کا طریقہ یہی ہے جیسا کہ آج کل عام طور سے یہ ہو رہا ہے۔ یہ بیان اپنی حاجات کے لیے کرنے کا تھا اگر دعا کے معنی اس جگہ (آیت ادعوا) میں ذکر وعبادت کے لیے جاویں تو اس میں بھی علماء سلف کی تحقیق یہی ہے کہ ذکرِ سر ذکر جہر سے افضل ہے۔ اور صوفیاء کرام میں مشائخ چشتیہ جو مبتدی کو ذکر جہر کی تلقین فرماتے ہیں وہ اس شخص کے حال کی مناسبت سے بطور علاج کے ہے تا کہ جہر کے ذریعہ کسل اور غفلت دور ہو جاوے اور قلب میں ذکر اللہ کے ساتھ ایک لگاؤ پیدا ہو جائے، ورنہ فی نفسہ ذکر میں جہر کرنا ان کے یہاں بھی مطلوب نہیں۔ گو جائز ہے اور جواز بھی اس کا حدیث سے ثابت ہے بشرطیکہ ریا ونمود نہ ہو۔"(۱)

خلاصۃ المرام

پوری بحث اور سارے رسالہ کا ماحصل ونچوڑ یہ ہے کہ قرآنی وحدیثی دلائل کی روشنی میں دعاء میں سر واخفاء ہی اصل وافضل ہے اور اس پر جمہور علماء امت کا بالخصوص ائمہ اربعہ کا اتفاق ہے تو گویا یہ مسئلہ قرآن وحدیث کے ساتھ اجماع امت سے بھی مؤید ومدلل ہے۔ اور جن حضرات نے اس میں اختلاف کرتے ہوئے دعاء جہری کو افضل ومستحب کہا ہے، علماء محققین وجمہور ائمہ کے نزدیک ان کا قول نا قابلِ

(۱) معارف القرآن: ۳/۵۷۸

التفات ہے اور جن دلائل پر اس قول مخالف کی بنیاد ہے، علماء نے ان دلائل کو مخدوش اوراپنے مدعی پر غیر صحیح یا غیر صریح وماوّل قرار دے کر ان کے مدلل جوابات دیدیئے ہیں۔لہٰذا دعاء جہری کا حکم کہ اگر کوئی کرے تو کیسا ہے؟

تو اس میں تفصیل یہ ہے کہ دعا اگر جہر مفرط سے ہو تو بالاتفاق ناجائز ہے۔جس پر علمائے کرام کی بے شمار تصریحات ہیں، جن میں سے بعض کو ہم نے بھی نقل کر دیا ہے۔ اور اگر دعاء جہر متوسط و معتدل سے ہو تو پھر اس میں یہ تفصیل ہے کہ مفاسد و مصالح دونوں سے قطع نظر فی نفسہ جائز ہے۔اور اگر اس میں مفاسد اعتقادیہ یا عملیہ منضم ہوں تو پھر ناجائز ہے۔اگر چہ اس میں مصالح بھی ہوں،لیکن ان مصالح کا اعتبار نہ ہوگا۔اور اگر دعاء جہری مفاسد سے خالی اور پھر اس میں مصالح بھی ملحوظ ومضمر ہوں تو افضل واولیٰ ہوگی۔

پس دعا بہ جہر معتدل فی نفسہ جائز ہے،لیکن اس میں کبھی عارضی کراہت آجاتی ہے اور کبھی عارضی فضیلت لاحق ہو جاتی ہے اور اصل اور ذاتی فضیلت دعاء سری ہی کی ہے۔

اس تقریر سے تمام دلائل قرآنیہ وحدیثیہ وروایات فقہیہ میں پوری تطبیق ہوگئی اور مسئلہ کی وضاحت کے ساتھ سبھی قسم کے اشکالات وشبہات کے جوابات بھی ہو گئے۔

ولله الحمد أولاً وآخراً وله الشكر ظاهراً وباطناً على ما وفقني لتحرير هذه العجالة و ألهمني الصواب على وفق طريقة الفقهاء.

هذا ما أردت إيراده في هذا المقام.

محمد شعیب اللہ خان

۱۴۰۳/۱۱/۲۵

تسویۂ صفوف
کی اہمیت

بسم اللہ الرحمن الرحیم

تسویہ صفوف کی اہمیت

الحمد لله و كفىٰ و سلام على عباده الذين اصطفى. امابعد.

آج کل مسلمانوں کی دینی بے شعوری اور احکام شرع سے لاپروائی ظاہر ہی ہے اور یہ لاپروائی اور بے التفاتی دن بہ دن افزوں اور لحہ بہ لحہ مستزاد ہے۔ اسی بے دینی اور لا ابالی پن کا نتیجہ ہے کہ بہت سارے اہم احکام خود مسلم معاشرے میں نا قابل التفات بل کہ لغو وفضول خیال کیے جاتے ہیں۔ ایسے ہی امور میں سے ایک نماز میں صفوف کی برابری و درستی کا مسئلہ ہے۔ احادیث میں اس کی بڑی ہی تاکید اور اس کے ترک پر وعید وارد ہوئی ہے؛ مگر افسوس کہ آج مساجد میں صفوں کے تسویہ و برابری کا کوئی اہتمام نہ رہا اور خواص تک اس سے غافل ہیں اور عام مصلین بے علمی یا کم علمی کی وجہ سے اس اہم چیز سے کوئی دلچسپی نہیں رکھتے اور بعض اس کو کوئی اہم ومؤکد امر خیال نہیں کرتے۔ کئی دنوں سے یہ داعیہ رہا کہ اس مسئلے پر لوگوں کو متوجہ کرنا چاہیے۔ چناں چہ فی الفور تو حتی الوسع زبانی تنبیہ و تعلیم پر اکتفا کیا۔ مگر پھر بھی یہ داعیہ رہا کہ اس مسئلے پر چند سطور معرض تحریر میں لائی جائیں تو ممکن ہے کہ نفع عام ہو۔ اس لیے یہ سطور حوالہ قلم کر رہا ہوں۔ والله المستعان وعليه التكلان.

تسویہ صفوف کی حقیقت واہمیت

نماز جیسا کہ ظاہر ہے کہ خدائے پاک کے حضور میں اعلیٰ درجہ کی مناجات کا نام

ہے اور خداوند ذوالجلال کے سامنے اپنی عاجزی ، ذلت ومسکنت کے اظہار سے عبارت ہے اور مصلی دراصل مسکین وعاجز ہے، جوشہنشاہِ حقیقی کے سامنے سراپا عجز و ذلت بنا کھڑا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ بادشاہ کے سامنے عاجز ومسکین کو اس کے دربار عالی کے مناسب ظاہری وباطنی آداب کا خیال رکھنا ضروری ہے؛ ورنہ دربارِ قدس سے دھتکار دیا جائے گا۔ ان ہی آداب میں سے ایک ظاہری ادب یہ بھی ہے کہ اگر چند آدمی مل کر فریاد کررہے ہوں، تو بے ترتیب و بے محل کھڑے نہ ہوں کہ کوئی آگے ہو گیا ہو، کوئی پیچھے یا ایک پیر آگے کر دیا ہو اور دوسرا پیچھے؛ بل کہ ایسی مرتب صف میں کھڑے ہوں کہ دیکھنے والوں کو دیوار کا شبہ ہونے لگے یا اس طرح جیسے کہا گیا ہے کہ ایک طرف سے اگر تیر مارا جائے، تو کسی کو مس کیے بغیر دوسری طرف پہنچ جائے۔ غالباً حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ کی اس قول سے یہی مراد ہے:

”رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہماری صفوں کو اس طرح سیدھا کرتے تھے کہ گویا آپ ان سے تیروں کو سیدھا کر رہے ہوں“۔ (۱)

پس یہ آداب شاہی میں سے ہے کہ صفوف کی درستی و برابری کی جائے۔ یہیں سے تسویۂ صفوف کی حقیقت بھی واضح ہوگئی کہ یہ ادب شاہی ہے اور پھر اس سے اس کی اہمیت کا بھی اندازہ ہو گیا، کیوں کہ ادب تو بہت ہی اونچی چیز ہے اور ادب ہی سے سب کچھ حاصل ہوتا ہے اور بے ادب ہمیشہ محروم رہتا ہے۔

بے ادب محروم گشت از فضلِ رب

یہی وجہ ہے کہ مجالس میں، مدارس میں، اسکولوں میں؛ بل کہ ہر ادارے و محکمے میں اس بات پر زور دیا جاتا ہے کہ آپس میں ترتیب وتسویہ قائم کریں۔ مدارس اور اسکولوں میں اس پر قانونی پابندی ہے کہ اگر کوئی صف بندی نہیں کرتا ہے اور اس میں

(۱) مسلم:۱/۱۸۱، أبو داود:۱/۹۷

کوتاہی ولاپروائی کرتا ہے،تو درس گاہ سے خارج کردیا جاتا ہےاور کبھی دوسری سزائیں تجویز کی جاتی ہیں اور کبھی عتاب سے نوازا جاتا ہے۔ جب یہاں کا یہ عالم ہے،تو پھر اس خدائے قدوس ذوالجلال کے دربار کے رعب وجلال کا اندازہ لگاؤاور خیال کرو کہ کیا وہاں یہ بے ترتیبی و بے پروائی جائز ہوگی؟ اوراگر کوئی اس کا مرتکب ہوا،تو کیا وہ معتوب ومقہور نہ ہوگا؟ اوراس کا دربارِ عالی سے خارج کردیا جانا عین عدل وانصاف نہ ہوگا!

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا طرزِ عمل

جب یہ واضح ہوگیا کہ نماز کے لیے صفوں کی برابری ودرستی،خداوند ذوالجلال کے دربارقدس کا ادب ہے،تو اب یہ معلوم کرنا بھی آسان ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تسویۂ صفوف پر اتنا زور کیوں دیا اوراس سلسلے میں اس قدر اہتمام کیوں فرمایا؟

وجہ ظاہر ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم بھلا اس ذاتِ ذوالجلال کے دربار میں بے ادبی وگستاخی کو کیوں برداشت فرماتے؟ کیوں کہ آپ تو سراپا ادب تھے۔ بھلا کیوں نہ ہوں جب کہ خود آپ فرماتے ہیں کہ ’’ **أَدَّبَنِيْ رَبِّي فَأَحْسَنَ تَأْدِيبِي** ‘‘ (میرے رب نے مجھے خوب خوب ادب سکھایا۔)تو آپ کے ادب وحسن ادب کا ٹھکانا ہی کیا ہے؟ اس ادب ورعایت کا نتیجہ تھا کہ آپ نے نہایت سختی سے اس کی تاکید فرمائی اور عملاً بھی اس کی تعلیم دی۔ یہاں چند روایات نقل کرتا ہوں،جن سے آپ کا عمل اورساتھ ہی تسویۂ صفوف کی تاکید معلوم ہوتی ہے۔

(۱) حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہماری صفوں کواس طرح برابر کرتے تھے کہ گویا آپ ان سے تیروں کوسیدھا کررہے ہوں۔(۱)

(۲) براء بن عازب رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صفوں کے درمیان ادھر سے ادھر جاتے اور ہمارے مونڈھوں اورسینوں کوچھوتے (یعنی

---

(۱) مسلم:۱/۱۸۱،ابوداود:۱/۹۷

چھوکر برابر کرتے)اور فرماتے اختلاف نہ کرو۔ (۱)

(۳) حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ برابر کرو اپنی صفوں کو، اس لیے کہ صفوں کو درست کرنا اوقات صلوۃ میں سے ہے (یعنی تکمیل نماز کا ایک جزو ہے)۔ (۲)

(۴) حضرت انس رضی اللہ عنہ سے ہی مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے تھے کہ برابر کرو (یعنی صفوں کو) برابر کرو، برابر کرو، اس ذات کی قسم جس کے قبضے میں میری جان ہے، میں تم کو پیچھے سے بھی دیکھتا ہوں، جس طرح سامنے سے دیکھتا ہوں۔ (۳)

(۵) حضرت ابوامامہ رضی اللہ عنہ کی ایک لمبی حدیث میں یہ بھی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اپنی صفوں کو برابر کرو اور اپنے مونڈھوں کو سلائے رکھو اور اپنے بھائیوں کے ہاتھوں میں نرم بن جاؤ (یعنی اگر وہ اِدھر اُدھر ہٹنے کو کہیں، تو اس کو مان لو) اور شگاف کو بند کرو (یعنی درمیانِ صف میں جگہ نہ چھوڑو) اس لیے کہ شیطان بکری کے بچے کی طرح تمھارے درمیان داخل ہو جاتا ہے۔ (۴)

نمونے کے طور پر چند احادیث نقل کی گئی ہیں، جو بہ قول علامہ ابن عبدالبر رحمہ اللہ تواتر کے درجے کو پہنچ چکی ہیں؛ مگر طالب مخلص کے لیے یہ چند بھی کافی ہیں۔

صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم اور تسویۂ صفوف

اب دیکھیے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم پر اس تعلیم کا اثر کہ یہ حضرات صفوں کی درستی و برابری

(۱) نسائي:۱/۹۳

(۲) البخاري:۱/۱۰۰، مسلم:۱/۱۸۲

(۳) أبو داود:۱/۹۷، مسلم:۱/۱۸۲

(۴) مسند احمد:۳/۲۶۰

کا بے حد وانتہا اہتمام کرنے لگے تھے اور واقعی صحابہ کی شان ہی یہ تھی کہ نبی کریم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے جن باتوں کی تعلیم دی، ان پر پورے اہتمام واحتیاط سے عامل ہوگئے۔ اس جگہ صحابہ کرام کے طرزِ عمل کے متعلق چند روایات نقل کرتا ہوں، جن سے صحابۂ کرام کا غایت درجہ تسویۂ صفوف کا اہتمام ظاہر ہوتا ہے۔

(۱) حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے دیکھا کہ ہم میں سے ایک دوسرے ساتھی کے ٹخنے سے ٹخنے ملاتا تھا۔ (۱)

(۲) حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے کہ ہم میں سے ایک دوسرے ساتھی کے کاندھے سے کاندھا اور پیر سے پیر ملاتا تھا۔ (۲)

ان روایات سے حضرات صحابہ کا غایت درجہ تسویۂ صفوف کا اہتمام معلوم ہوتا ہے۔ اسی کمالِ اہتمام کو حضرت نعمان اور حضرت انس رضی اللہ عنہما ٹخنے سے ٹخنے ملانے اور کندھے سے کندھے یا پیر سے پیر ملانے سے تعبیر کر رہے ہیں۔

نوٹ: پیر سے پیر ملانے سے متعلق تحقیق آئندہ صفحات میں ملاحظہ فرمائیں۔

(۳) حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے چند حضرات کو صفوں کی درستی کا حکم دیا تھا (کہ وہ جماعت کھڑی ہونے پر صفوں کو درست کریں،) پس جب وہ آکر خبر دیتے کہ صف درست ہوگئی، تو پھر آپ ''اللہ اکبر'' کہتے یعنی نماز شروع کرتے۔ (۳)

اس سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا تسویۂ صفوف میں غایت اہتمام معلوم ہوا کہ آپ نے اس کام کے لیے مستقل چند آدمیوں کو منتخب کر رکھا تھا۔ اور جب وہ صفوں کو

(۱) البخاري: ۱/۱۰۰

(۲) أبو داود: ۱/۹۷

(۳) موطا للإمام محمد: ۸۸

درست کرنے کے بعد آکر خبر دیتے کہ صفیں درست ہوگئیں، تو اس وقت آپ نماز شروع فرماتے۔

علامہ عبدالحی لکھنوی رحمہ اللہ اس کے حاشیے پر لکھتے ہیں:

''اس کا مقتضا یہ ہے کہ آپ نے یعنی حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے صفوں میں لوگوں کو درست کرنے کے لیے آدمی مقرر کیے ہوں اور یہ مندوب ہے یعنی تسویۂ صفوف کے لیے آدمی مقرر کرنا مستحب ہے''۔(۱)

(۴) حضرت مالک بن ابو عامر تابعی رحمہ اللہ کہتے ہیں:

حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ جمعہ کے خطبے میں تسویۂ صفوف پر توجہ دلانے کے بعد اس وقت تک تکبیر نہ باندھتے، جب تک کہ ان کے پاس وہ لوگ جن کو آپ نے صفوں کی برابری کرنے کے لیے مقرر فرمایا تھا، آکر خبر نہ دیتے کہ صفیں درست ہوگئیں۔ جب وہ خبر دیتے تو آپ تکبیر کہتے اور نماز شروع کرتے۔(۲)

اس سے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا تسویۂ صفوف میں اہتمام معلوم ہوا اور یہ بھی معلوم ہوا کہ آپ بھی مثل حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے چند آدمی مقرر کیے ہوئے تھے، جن کا کام تسویۂ صفوف تھا۔

ائمۂ امّت اور تسویۂ صفوف

صحابۂ کرام کے اس طرزِ عمل و تعلیم کا اثر پھر ان کے شاگردوں اور بعد کے ائمہ پر یہ ہوا کہ وہ لوگ بھی اس کی بے حد تاکید فرماتے تھے اور اس کا ترک برداشت نہیں

(۱) التعلیق الممجد:۸۸

(۲) الموطا للإمام محمد:۸۸

کرتے تھے۔

(۱) حضرت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ اپنے استاذ حضرت حماد رحمۃ اللہ کے واسطے سے حضرت ابراہیم نخعی رحمۃ اللہ کا یہ مقولہ نقل کرتے ہیں کہ آپ فرمایا کرتے تھے کہ اپنے مونڈھوں کو برابر کرو اور آپس میں مل کر کھڑے ہوا کرو کہ صفوں کے درمیان کوئی جگہ نہ رہ جائے؛ ورنہ شیطان بکری کے بچے کی طرح تمھارے درمیان گھس جائے گا۔(۱)

(۲) امام محمد بن حسن شیبانی رحمۃ اللہ اس پر فرماتے ہیں کہ ہم اسی پر عمل کرتے ہیں کہ یہ درست نہیں کہ صف میں جگہ خالی ہوتے ہوئے اس کو چھوڑ دیا جائے، یہاں تک کہ صفوں کو برابر کرلیں اور یہی قول امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ کا ہے۔(۲)

(۳) حضرت امام ابن حزم رحمۃ اللہ تسویۂ صفوف کو واجب اور فرض کہتے ہیں۔ (لہٰذا ان کے نزدیک اس کی نماز ہی نہیں ہوتی جو صف کو برابر نہ کرے؛ کیوں کہ کسی فرض و واجب کے ترک سے نماز نہیں ہوتی) ان کا وجوب کا قول علامہ عبدالحی لکھنوی رحمۃ اللہ نے "**موطا امام محمد**" کے حاشیے پر لکھا ہے۔(۳)

(۴) جمہور علما وائمہ کے نزدیک صفوں میں برابری اور تسویہ سنت موکدہ ہے اور جیسا کہ اوپر معلوم ہوا بعض علما کے نزدیک تسویۂ صفوف فرض ہے۔

حضرت شیخ زکریا صاحب رحمۃ اللہ اپنی کتاب "**اوجزالمسالک شرح موطا امام مالک**" میں رقم طراز ہیں:

"امام شافعی، امام ابوحنیفہ، اور امام مالک رحمہم اللہ تسویۂ صفوف

(۱) کتاب الآثار:۱۷

(۲) الموطاللإمام محمد:۸۹

(۳) الموطاللإمام:۸۸

کو سنت قرار دیتے ہیں اور بعض حضرات فرض وواجب ہونے کے بھی قائل ہیں۔ علامہ ابن عبدالبر مالکی رَحِمَہُ اللّٰہُ نے (اپنی کتاب) ''الاستذکار'' میں فرمایا کہ تسویۂ صفوف کے بارے میں آثار متواترہ وارد ہوئے ہیں۔ جن میں نبی کریم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم سے تسویۂ صفوف کا امر منقول ہے اور اس پر خلفائے راشدین کا عمل بھی ہے اور اس میں کسی کا اختلاف نہیں۔''(۱)

اس سے معلوم ہوا کہ جمہور علما کے نزدیک تسویۂ صفوف سنت موکدہ ہے اور بعض علما: جیسے علامہ ابن حزم وغیرہ واجب فرماتے ہیں۔

اس سے اندازہ لگائیے کہ تسویۂ صفوف کی کس درجہ اہمیت ہے۔ اگرچہ علامہ ابن حزم رَحِمَہُ اللّٰہُ کا مذہب جمہور کے مذہب کے خلاف ہے۔ تاہم اس سے اتنا تو مستفاد ہوتا ہے کہ تسویۂ صفوف نہایت ہی اہم چیز ہے اور پھر جمہور کے مذہب کے مطابق بھی اس کی اہمیت معلوم ہوتی ہے؛ کیوں کہ واجب وسنت موکدہ میں زیادہ فرق نہیں ہے؛ بل کہ تقریباً دونوں کا درجہ ایک جیسا ہی ہے۔ تفصیل کے لیے ''شرح وقایہ'' اور اس کا حاشیہ'' **عمدة الرعاية**'' ملاحظہ ہو۔(۲)

ترکِ تسویہ پر وعید

اسی اہمیت کے پیش نظر احادیث میں صفوں کی برابری نہ کرنے پر وعیدیں وارد ہوئی ہیں۔ ان ہی وعیدوں کی بنا پر علامہ ابن حزم رَحِمَہُ اللّٰہُ نے وجوب کا قول نقل کیا ہے؛ کیوں کہ جس کے ترک پر وعید وارد ہو، وہ واجب گردانا جاتا ہے؛ لیکن چوں کہ بعض

(۱) أوجز المسالک:۲/۱۱۴

(۲) شرح وقایہ۱/۱۵۲

روایات میں تسویۂ صفوف کو ’’تمام صلوۃ‘‘ میں سے فرمایا گیا ہے، نہ کہ ’’قوام صلوۃ‘‘ میں سے، اس لیے جمہور نے اس کو سنت موکدہ قرار دیا ہے، اور بعض روایات میں جو تسویۂ صفوف کو ’’اقامت صلوۃ‘‘ میں سے فرمایا ہے، تو اس کے معنی بھی ’’تکمیل صلوۃ‘‘ کے ہیں اور وعید، سنت موکدہ کے ترک پر بھی ہوتی ہے۔ الغرض تسویۂ صفوف کا ترک موجب عتاب و قابلِ مواخذہ ہے۔

(۱) حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اے اللہ کے بندو! یا تو اپنی صفوں کو برابر کرو یا، تو پھر اللہ تعالیٰ تمھارے چہروں کو بدل دے گا۔ (۱)

فائدہ : اس حدیث میں صفوں کو برابر نہ کرنے کی صورت میں یہ وعید سنائی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ چہروں کو متغیر کر دے گا۔ چہروں کو بدلنے کے مطلب میں کئی اقوال ہیں۔ ملا علی قاری رحمہ اللہ نے ’’**المرقاۃ شرح المشکوۃ**‘‘ میں لکھا ہے:

> ’’چہروں کو بدل دے گا یعنی چہروں کو پشت کی جانب پھیر دے گا یا مطلب یہ ہے کہ حیوانات کی صورت پر مسخ کر دے گا یا چہروں سے مراد پوری ذات یعنی پورا جسم ہی بدل دیا جائے گا یا ’’قلوب‘‘ مراد ہیں یعنی دلوں میں اختلاف ڈال دے گا۔ کسی بھی صورت میں تغیر و تخالف ہو؛ بہ ہر حال ایک عذاب ہے اور سخت بات ہے۔‘‘

(۲) حضرت ابو مسعود انصاری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: سیدھے کھڑے ہو اور اختلاف نہ کرو (یعنی آگے پیچھے مت ہو) کہیں تمھارے دل مختلف ہو جائیں۔ (۲)

---

(۱) مسلم :۱/۱۸۲

(۲) أبو دود:/۷

فائدہ : اس حدیث سے ان علما کی تائید ہوتی ہے، جنھوں نے حدیث سابق سے دلوں کا اختلاف مراد لیا ہے۔ حاصل حدیث کا یہ ہے کہ ظاہری اختلاف کے نتیجے میں باطنی اور قلبی اختلاف رونما ہوگا، جو جڑ ہے معاشرے کے فساد کی، چناں چہ اختلاف سے حسد، بغض، کینہ، عداوت جیسی رذیل خصلتیں پیدا ہوتی ہیں اور معاشرے کو فاسد کر کے رکھ دیتی ہیں۔ آج ہر جگہ ہر شخص کی زبان پر یہ شکایت ہے کہ مسلمانوں میں اتفاق نہیں، اتحاد نہیں اور اِس اختلاف کو ختم کرنے کے لیے مختلف تدابیر اختیار کی جاتی ہیں، کہیں جلسے منعقد ہوتے ہیں، کہیں انجمنیں قائم کی جاتی ہیں، اخبار و رسائل کے ذریعے اتحاد کی دعوت دی جاتی ہے۔ یہ سب اپنی جگہ ٹھیک ہے؛ لیکن اس کے ساتھ اس حدیث پر بھی دھیان دینے کی ضرورت ہے، جو اس بات کی خبر دیتی ہے کہ اختلاف کی ایک وجہ یا یوں کہیے اختلاف کا باعث تسویۂ صفوف میں کوتاہی یا اس کا ترک ہے۔ لہٰذا اب اس بات کی بھی ضرورت ہے کہ اختلاف کو ختم کرنے اور اتحاد و اتفاق پیدا کرنے کے لیے تسویۂ صفوف کا اہتمام کیا جاوے۔

(۳) حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص صف کو ملائے گا؛ اللہ تعالیٰ اس کو (اپنی رحمت سے) ملائے گا (یعنی حصہ عطا کرے گا) اور جو شخص صف کو توڑے گا؛ اللہ تعالیٰ اس کو (اپنی رحمت سے) دور کرے گا۔ (۱)

فائدہ : صف کو ملانا یہ ہے کہ صف کو برابر کریں اور آپس میں مل کر کھڑے ہوں اور درمیان میں فرجہ اور خالی جگہ نہ چھوڑیں، جو ایسا کرے گا؛ اس کے لیے یہ بشارت دی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کو اپنی رحمت میں سے حصہ عطا فرمائے گا۔ اور

(۱) أبو داود :۱/۹۷

صف کو توڑنا یہ ہے کہ درمیان میں جگہ چھوڑ دی جائے یا آگے پیچھے ہو کر صف کو بے ترتیب و بدنما کر دے، جو ایسا کرے گا؛ اس کے لیے یہ وعید سنائی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کو اپنی رحمت سے دور کر دے گا۔

یہ بھی کس قدر بڑی وعید ہے کہ رحمت خداوندی سے دوری ہو جائے؛ بل کہ درحقیقت سب سے بڑی وعید ہے؟ کیوں کہ ہر عذاب وعتاب کی اصل رحمت خداوندی سے دوری ہی ہے، اسی پر عذاب وعتاب وعقاب متفرع ہے؛ مگر یہاں یہ بھی مخفی نہ رہے کہ رحمتِ حق ایک تو عام ہے جو ہر کس و ناکس مومن و کافر سب کو شامل ہے اور ''وَسِعتْ رَحْمَتِي كل شيٍ'' میں یہی مراد ہے اور اسی رحمت عامہ کی وجہ سے کافر کو کھانا، پانی وضروریات بہم پہنچائی جاتی ہیں اور دوسری رحمتِ خاصہ ہے، جو صرف محسنین ومومنین کے ساتھ مخصوص ہے۔ اور ''إِنَّ رَحْمَةَ اللّٰهِ قريبٌ مِنَ الْمُحْسِنِيْنَ'' میں یہی رحمتِ خاصہ مراد ہے۔ اسی طرح یہاں حدیث میں رحمت خاصہ مراد ہے، جس سے دوری پر عذاب ہوا کرتا ہے۔

بہ ہر حال بہت ہی سخت بات ہے کہ رحمت سے دوری سے ہو جائے؛ لہٰذا صفوں میں برابری اور تسویہ کا خوب اہتمام کرنا چاہیے۔

تسویۂ صفوف کے معنی

جب تسویۂ صفوف کی ایک اہمیت معلوم ہوگئی تو اب ضروری ہے کہ تسویہ کے معنی بھی سمجھ لیے جائیں۔ احادیث میں غور کرنے سے تسویۂ صفوف کے معنی، بخوبی یہ سمجھ میں آتے ہیں کہ صف میں اعتدال ہو اور کوئی آگے کوئی پیچھے نہ ہو، ایسے ہی درمیان صف میں جگہ خالی نہ ہو، بل کہ خوب مل کر کھڑے ہوں اور صف میں ٹیڑھ نہ ہو بلکہ صف بالکل سیدھی ہو وغیرہ۔ اسی معبر ومعنون کو احادیث میں مختلف انداز سے

تعبیر کیا گیا ہے۔

(۱) بعض احادیث میں وارد ہوا کہ کندھوں سے کندھے ملاؤ۔

(۲) بعض احادیث میں ہے کہ رسول اللہ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم سینوں کو چھو کر سیدھے کیا کرتے۔

(۳) بعض احادیث میں ہے کہ صحابہ کرام رَضِيَ اللهُ عَنْهُم پیروں سے پیر ملایا کرتے تھے۔

(۴) بعض میں ٹخنے سے ٹخنے ملانے کا ذکر ہے۔

(۵) کسی میں گردنوں کو ملانے کا حکم ہے۔

(۶) کسی روایت میں گھٹنوں سے گھٹنے ملانا صحابۂ کرام رَضِيَ اللهُ عَنْهُم کے عمل میں مذکور ہے۔

(۷) بعض مواقع میں "سدِ خلل" یعنی خالی جگہوں کے بند کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔

(۸) بعض جگہ سینے کو باہر نکالنے سے منع فرمایا گیا۔

(۹) ایک روایت میں فرشتوں کی صفوف کے مانند صف بندی کا حکم ہے۔

(۱۰) کسی جگہ کہا گیا کہ اس طرح صفوں کی برابری کی جاتی تھی، کہ گویا تیروں کو سیدھا کیا جا رہا ہے۔

الغرض ان تمام تعبیرات وعنوانات کا حاصل یہی ہے کہ صف سیدھی ہو جس میں نہ تو بے ترتیبی ہو، نہ کجی ہو، نہ درمیان میں جگہ چھوٹے؛ بل کہ مل ملا کر کھڑا ہوا جائے)

پیر سے پیر ملانے کا مسئلہ

اس تقریر سے یہ بھی واضح ہو گیا کہ مقصود تسویۂ صفوف ہے۔ یہ تعبیرات وعنوانات مقصود نہیں؛ بل کہ ان کی بعض جگہ حقیقت مراد بھی نہیں، مثلاً قدم سے قدم ملانا، جو حضرت انس رَضِيَ اللهُ عَنْهُ کی روایت میں مذکور ہے، تسویے میں غایت درجہ اہتمام کو بتلانے کے لیے استعمال کیا گیا ہے۔ ورنہ صف بندی میں قدم سے قدم ملانا مقصود نہیں۔

جیسے بعض روایات میں صراحتاً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے گردنوں کے ملانے کا حکم دیا ہے۔(۱)

مگر اس کے باوجود یہاں کسی کے نزدیک بھی یہ حکم اپنی حقیقت پر مبنی نہیں ہے اور اس سے حقیقت مراد نہیں ؛ بل کہ تعدیل صف وتسویے میں مبالغہ کا حکم کرنا مقصود ہے؛ ورنہ بھلا گردنوں کو ملانا کس طرح ہوسکتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ شراح حدیث نے ان جیسی احادیث کو حقیقت پر محمول نہیں کیا؛ بل کہ اس کو مجازاً مبالغہ فی التسویہ والتعدیل پر محمول کیا ہے۔

چناں چہ شارح بخاری محدث ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ نے "فتح الباري": (۱۷۶/۲) میں اور محدث قسطلانی نے "شرح بخاری": (۷۶/۲) میں فرمایا:

"کندھے اور قدم ملانے سے مراد صف کی درستی اور برابری میں مبالغہ اور خالی جگہوں کو بند کرنا ہے"۔

اور علامہ انور شاہ کشمیری رحمہ اللہ "فیض الباري": (۲۳/۲) میں فرماتے ہیں:

"صحابہ اور تابعین کے تعامل سے ہم نے سمجھا ہے کہ کندھے ملانے سے صحابی کی مراد صرف آپس میں ملانا اور خالی جگہ نہ چھوڑنا ہے"

علامہ یوسف بنوری رحمہ اللہ "معارف السنن شرح الترمذي": (۲۹۸/۲) میں لکھتے ہیں:

"حاصل یہ کہ مراد تسویہ اور اعتدال ہے تاکہ کوئی آگے اور پیچھے نہ ہو جائے۔ پس کاندھوں کے درمیان برابری اور ٹخنوں کا ملانا تسویۂ صفوف سے کنایہ ہے"۔

---

(۱) نسائي: ۳۹/۱

شراح حدیث کے ان بیانات سے معلوم ہوا کہ پیروں کا ملانا یا ٹخنوں کا ملانا مقصود نہیں؛ بل کہ صفوں کی برابری اور درستی میں مبالغہ بیان کرنے کے لیے صحابی نے یہ تعبیر اختیار فرمائی ہے۔ ورنہ خود غور کیجیے کہ ٹخنے سے ٹخنے ملا کر بھی کس طرح نماز پڑھیں گے؟ اور پھر کندھے سے کندھے ملانا پیروں کو ملاتے ہوئے کس قدر مشقت وتکلف کا کام ہے۔ بھلا اس کے ساتھ خشوع وخضوع کیسے حاصل ہوگا؟ جو کہ اہم ترین چیز ہے۔ نیز بعض روایات میں تو یہاں تک آیا ہے کہ صحابہ گھٹنے سے گھٹنا ملاتے تھے۔ حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں:

"رَأیتُ الرَّجُلَ یَلْزَقُ منکبهُ بمنکب صاحبه ورُکبتهُ برُکبتهِ صاحبهٖ وکعبه بکعبهِ"۔(۱)

(میں نے دیکھا کہ آدمی اپنے کندھے کو اپنے ساتھی کے کندھے سے اور اپنے گھٹنے کو اپنے ساتھی کے گھٹنے سے اور اپنے ٹخنے کو اپنے ساتھی کے ٹخنے سے ملاتا تھا)

ملاحظہ کیجیے وہی حضرت نعمان رضی اللہ عنہ جنھوں نے صحابہ سے ٹخنے سے ملانا نقل کیا تھا، یہاں گھٹنے ملانے کا بھی تذکرہ فرماتے ہیں، تو کیا یہ ممکن ہے کہ گھٹنے سے گھٹنا ملا کر نماز پڑھی جائے؟ اور پھر ساتھ ساتھ کندھے بھی ملیں اور ٹخنے بھی، قدم بھی، تو پھر اس کا حشر کیا ہوگا کہ نماز ایک کھیل بن کر رہ جائے گی۔ پس معلوم ہوا کہ ان تعبیرات سے حقیقت مراد نہیں؛ بل کہ محض تسویۂ صفوف مراد ہے۔

حضرت مفتی مہدی حسن نور اللہ مرقدہ "قلائد الأزهار شرح کتاب الأثار" میں فرماتے ہیں:

"پس ٹخنے سے ٹخنے ملانا اور کندھے سے کندھے ملانا گھٹنے ملانا اور

(۱) أبو داود: ۱/۹۷

قدم سے قدم ملانا اور گردنوں میں برابری اور کندھے میں برابری؛ یہ سب ایک ہی معبّر ومعنون کی تعبیرات ہیں اور وہ اعتدال وتسویہ اور باہم قریب ہونا اور آپس میں برابری واتصال ہے جیسا کہ مخفی نہیں اور یہاں حقیقی معنی مراد نہیں ہیں اور کیسے مراد ہو سکتے ہیں؟ جب کہ گھٹنے سے گھٹنے کا ملانا متحقق ہو ہی نہیں سکتا، جیسا کہ مشاہد ہے، پس مراد محض تسویہ ہے اور اس کا سوائے اس کے، جس کو بصیرت نہ ہو انکار نہیں کر سکتا۔“(۱)

پس تسویہ پر اہتمام ہو اور غیر مقصود چیزوں میں پھنس کر اصل کو ترک نہ کر بیٹھیں۔

خاتمہ

ان سطور بالا سے تسویۂ صفوف کی حقیقت، اہمیت، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا عمل، وصحابہ کرام کا طریقۂ کار وائمہ وعلما کا رویہ معلوم ہو گیا اور اسی طرح ترک تسویہ پر وعیدیں بھی معلوم ہوئیں۔ اس پر نظر کرنے کے بعد امید ہے کہ مسلمان تسویۂ صفوف کا اہتمام کریں گے۔ اللہ تعالیٰ اس تحریر کو نافع بنائے۔ ”آمین“

فقط

حررہ محمد شعیب اللہ خان عفی عنہ

۱۴/ جمادی الاولیٰ ۱۴۰۵

(۱) قلائد الازهار:۲/۷۶

اسلامی نکاح
کے خدوخال

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اسلامی نکاح کے خدوخال

عصر حاضر میں ''نکاح'' کو جس حد تک پیچیدہ اور مشکل بنا دیا گیا ہے اور اس کی بنا پر جو معاشرتی وسماجی خرابیاں، اخلاقی روحانی بیماریاں اور معاشی واقتصادی پریشانیاں رونما ہو رہی ہیں اور پورے سماج اور معاشرے کو ہلاکت وتباہی کے غار میں ڈھکیل رہی ہیں وہ سب پر ظاہر ہیں اور حقیقت یہ ہے کہ اس پیچیدگی اور مشکل کا جب تک صحیح حل نہ نکالا جائے گا۔ معاشرہ کی صلاح وفلاح کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوسکتا۔ کیوں کہ نکاح معاشرہ کی بنیاد اور تعمیر کی پہلی اینٹ ہے اور جب تک یہ صحیح اور مضبوط نہ ہوگی اس وقت تک معاشرے کی عمارت نہ صحیح رخ پر قائم ہوسکتی ہے اور نہ ہی مضبوط ومستحکم ہوسکتی ہے۔

اور میں ایک مسلمان ہونے کی حیثیت سے اس بات کا پورا یقین رکھتا ہوں اور واقعہ بھی اس کی پوری طرح تصدیق وتوثیق کرتا ہے کہ نکاح کے مسئلہ کا صحیح حل صرف اور صرف اسلامی تعلیمات اور نبوی ہدایات کی پیروی میں منحصر ہے، ان کے سوا کوئی اور چیز اس بنیاد کو نہ صحت بخش سکتی ہے اور نہ مضبوطی واستحکام عطا کرسکتی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اسلام نے نکاح کے مسئلہ پر جس صراحت ووضاحت اور حقیقت بینی وواقعیت پسندی کے ساتھ روشنی ڈالی ہے، دنیا کے کسی دستور اخلاق و صحیفہ قانون نے نہیں ڈالی ہے، مگر افسوس کہ آج مسلمانوں کی اکثریت نے نکاح کے سلسلے میں اسلامی ونبوی تعلیمات وہدایات کو سراسر لغو وفضول سمجھ کر نظر انداز کر رکھا ہے

اوران کے مقابلے میں من گھڑت رسومات اورمعاشرے میں پھیلائی ہوئی لایعنی بدعات اورمجرمانہ خرافات درخرافات کواختیا کرر کھا ہےاوران کو ہرفرض سے بڑافرض اور ہرفضیلت سے بڑی فضیلت خیال کرر کھا ہے۔حسن معاشرت کی جوتعلیم اسلام نے پیش کی ہے اس میں نکاح کی اہمیت وضرورت کے پیش نظراس کا صحیح طریقہ زوجین کے انتخاب کا طریقہ اورزوجین کی ازدواجی زندگی کے اصول وآداب بھی بیان کیے گئے ہیں۔یہاں چند اہم امور پرروشنی ڈالی جاتی ہے۔

اسلام میں نکاح کا درجہ

دنیا کے مختلف قوانین اورمذاہب نے نکاح کے بارے میں جوتصورات ونظریئے قائم کرر کھے ہیں،ان سب کے برخلاف اسلام میں اس کا تصورنہایت لطیف اوراس کا درجہ اورمقام نہایت بلند ہے۔اسلام نکاح کومحض جنسی لذت کا ذریعہ یاحصول مال ودولت کا وسیلہ یاجاہ وعزت کے پانے کا طریقہ قرارنہیں دیتا؛بل کہ وہ نکاح کوعفت وعصمت اورپاک دامنی کا ذریعہ اورسماج میں محبت ومودت اورتمدن میں اخلاقی قدریں پیدا کرنے کا وسیلہ قرار دیتا ہے،اس سلسلے میں بہت سی آیات واحادیث پیش کی جاسکتی ہیں؛مگراختصار کے پیش نظرچند پراکتفا کرتا ہوں۔

قرآن کریم نے انسان کی تخلیق اورپھراس کی ازدواجی زندگی کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا ہے:

﴿ يٰاَ يُّهَاالنَّاسُ اتَّقُوْارَبَّكُمُ الَّذِىْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّخَلَقَ مِنْهَازَوْجَهَاوَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيْرًا وَّنِسَاءً وَاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِىْ تَسَاءَلُوْنَ بِهٖ وَالْاَرْحَامَ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلَيْكُمْ رَقِيْبًا ﴾

(النسآء:۱)

(اے لوگو! اپنے پروردگار سے ڈرو جس نے تم کو ایک جان دار (آدم عَلَیْہِ السَّلَام) سے پیدا کیا اور اس جان دار سے اس کا جوڑا (حوا) کو پیدا کیا، پھر ان دونوں سے بہت سے مرد اور عورتیں پھیلائیں، اور تم خدا سے ڈرو جس کے نام سے تم آپس میں سوال کرتے ہو اور رشتہ داری (کے حقوق ضائع کرنے سے) ڈرو، بلاشبہ اللہ تعالیٰ تم پر نگہبان ہے)

اس میں انسان کے جوڑے بنانے کا ذکر اور پھر ان سے بہت سے مرد و عورتوں کے پھیلائے جانے کا تذکرہ کے بعد ''ارحام'' یعنی قرابت داریوں کے حقوق کو ضائع کرنے سے ڈرایا گیا ہے، جو اس طرف اشارہ کرتا ہے کہ نکاح معاشرے میں اخلاقی قدروں کے پیدا کرنے کا ذریعہ ہے۔

ایک جگہ قرآن نے نکاح کے مقاصد و ثمرات کا تذکرہ اللہ کی قدرت کی نشانیوں کے ضمن میں اس طرح کیا ہے:

﴿ وَمِنْ آيَاتِهِ اَنْ خَلَقَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجاً لِّتَسْكُنُوْا اِلَيْهَا وَجَعَلَ بَيْنَكُمْ مَّوَدَّةً وَّرَحْمَةً اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ. ﴾ (الروم :۲۱)

(اللہ کی نشانیوں میں سے یہ ہے کہ اس نے تم ہی میں سے تمہارے جوڑے بنائے تاکہ تم اس سے سکون حاصل کرو اور اس نے تم میں محبت اور رحمت پیدا فرمائی۔ بلاشبہ اس میں غور و فکر کرنے والوں کے لیے نشانیاں ہیں)

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے نکاح کا مقصد تسکین و راحت بتانے کے بعد نکاح کا ثمرہ یہ بیان کیا ہے کہ رحمت و محبت پیدا ہوگی۔

نبی کریم صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم نے ایک حدیث میں ارشاد فرمایا:

''اے نوجوانوں کے گروہ! تم میں جو نکاح کرنے کی استطاعت رکھتا ہے اس کو نکاح کرلینا چاہئے، کیوں کہ نکاح آنکھوں کو پست رکھنے اور شرم گاہ کو محفوظ رکھنے کا ذریعہ ہے۔(۱)

اس سے معلوم ہوا کہ نکاح عفت وعصمت اور پاک دامنی کا وسیلہ وذریعہ ہے۔ الغرض اسلام نے نکاح کو جس نظر سے دیکھا ہے، اس کا حاصل یہ ہے کہ وہ ایک بلند ترین اور پاکیزہ عمل ہے جو انسان کو بے راہ روی اور اخلاقی وروحانی گندگی سے بچاتا ہے، اسی لیے اس کو علما نے عبادت کا ہم پلہ قرار دیا ہے۔ علامہ ابن نجیم المصری رحمہ اللہ نے ''**الاشباہ والنظائر**'' میں لکھا ہے:

''ہمارے لیے کوئی اور عبادت سوائے نکاح اور ایمان کے ایسی نہیں ہے جو حضرت آدم علیہ السلام کے وقت سے اب تک برابر مشروع ہو اور جنت میں بھی باقی رہے۔(۲)

اس میں علامہ موصوف نے نکاح کو عبادت قرار دیا ہے اور ایمان کے ساتھ اس کو جوڑ کر اس کا بلند درجہ بھی ظاہر کردیا ہے اور اس میں کوئی حیرت وتعجب کی بات نہیں ہے، کیوں کہ جب نکاح عفت وعصمت کا ذریعہ اور محبت ورحمت کا سبب اور اخلاقی قدروں کے قائم ہونے کا وسیلہ ہے تو ضرور یہ عبادت کا درجہ رکھتا ہے۔

نکاح ایک عبادت ہے

نکاح کا عبادت ہونا ان احادیث وآثار سے بھی صاف مفہوم ہوتا ہے۔ ان پر غور فرمائیے۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ

---

(۱) مشکوٰۃ:۲۶۷

(۲) الاشباہ:۲/۱۰۲

جب بندہ نکاح کرلیتا ہے تو اس کا آدھا دین مکمل ہوجاتا ہے، اب اس کو چاہئے کہ باقی آدھے دین میں اللہ سے ڈرتا رہے۔(۱)

اس حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نکاح کو تکمیل دین کا ذریعہ قرار دیا ہے اور تکمیل دین بہت بڑی عبادت ہے، تو جو اس کا ذریعہ ہو وہ کیوں کر عبادت کے درجے میں نہ ہوگا؟ معلوم ہوا کہ نکاح عبادت ہے۔

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ:

"لایتم نسک الناسک حتی یتزوج"(۲)

(عبادت کرنے والے کی عبادت مکمل نہیں ہوتی یہاں تک کہ وہ شادی کرلے)

حضرت طاؤس جو مشہور تابعی ہیں وہ فرماتے ہیں کہ:

" لایتم نسک الشاب حتی یتزوج". (۳)

(یعنی جوان کی عبادت مکمل نہیں ہوتی جب تک کہ وہ شادی نہ کرلے۔)

ان اقوال سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ نکاح تکمیل عبادت کا ذریعہ ہے اور جو ذریعۂ عبادت ہو وہ خود بھی عبادت کے درجے میں ہوتا ہے۔

نکاح عبادت کیوں ہے؟

مگر یہاں یہ بات ذہن میں ہونا ضروری ہے کہ اس نکاح سے وہ نکاح مراد ہے جس کا مقصد عفت وعصمت ہو، محض جنسی لذت کی تحصیل یا کسی اور غرض سے نکاح

(۱) مشکوۃ:۲۶۷

(۲) احیاء العلوم:۲/۲۳

(۳) سنن سعید قسم اول:۳/۱۲۳

کرنے کی قطعاً یہ فضیلت اور اس کا یہ درجہ نہیں ہے۔ اسی لیے ایک حدیث میں اس نکاح کو تکمیل ایمان کا ذریعہ قرار دیا گیا ہے جو اللہ کی رضا کے لیے ہو۔ چناں چہ امام احمد رحمۃ اللہ نے معاذ بن انس رضی اللہ عنہ سے یہ حدیث روایت کی ہے کہ:

《من انکح للّٰہ فقد استکمل ایمانہ》

(جس نے اللہ کے لیے نکاح کیا اس کا ایمان کامل ہوگیا۔)(۱)

ایک اور حدیث سے اس پر مزید روشنی پڑتی ہے۔ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عکاف بن بشر رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ کیا تمہاری بیوی ہے؟ عرض کیا کہ نہیں، فرمایا کہ لونڈی بھی نہیں ہے؟ عرض کیا کہ نہیں۔ فرمایا کہ خیریت سے تم صاحب حیثیت بھی ہو؟ عرض کیا جی ہاں میں صاحب حیثیت بھی ہوں، فرمایا کہ پھر تم شیطان کے بھائیوں میں سے ہو، اگر تم عیسائیوں میں سے ہوتے تو ان کے پادری بنائے جاتے، دیکھو ہماری سنت نکاح ہے تم میں سب سے زیادہ بدتر وہ ہیں جو بے نکاحی ہیں اور تمہارے مرنے والوں میں بھی سب سے بدتر بے نکاحی ہیں، کیا تم شیطان کو موقع دیتے ہو؟ اس کا بہترین ہتھیار جو نیک لوگوں میں بھی کارگر ہوتا ہے وہ عورتیں ہی ہیں، سوائے ان لوگوں کے جو نکاح کرنے والے ہیں، یہ لوگ پاک وصاف ہیں۔(۲)

اس سے صاف معلوم ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مقصد اس نکاح کی ترغیب دینا ہے جو عفت وعصمت کا ضامن ہو اور اسی مقصد سے کیا گیا ہو۔ چناں چہ آپ نے اس حدیث میں نکاح نہ کرنے پر اتنی سختی کرنے کی یہی وجہ بتائی ہے کہ

(۱) تخریج الإحیاء للعراقی:۲/۲۲

(۲) مسند احمد:۱/۲۱۶

بے نکاحی لوگ عام طور پر شیطان کا شکار ہوجاتے ہیں کیوں کہ شیطان عورتوں کو اپنا ہتھیار بنا کر لوگوں کو بہکا لیتا ہے۔

ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم میں سے کوئی کسی عورت کو دیکھے اور وہ تم کو پسند آجائے تو تم کو چاہئے کہ اپنی بیوی کے پاس جاؤ اور اس سے صحبت کرلو، کیوں کہ اس سے وہ بات دل سے نکل جائے گی۔ (۱)

ایک روایت میں یہ فرمایا کہ تم میں سے کسی کی نظر عورت پر پڑ جائے تو وہ اپنی بیوی سے مل لے، کیوں کہ اس (غیر عورت) کے پاس وہی ہے جو (اپنی بیوی کے) پاس ہے۔ (۲)

ان احادیث سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اسلام محض جنسی لذت کی تحصیل کے لیے نہیں؛ بل کہ عفت و عصمت اور پاک دامنی کے لیے نکاح کو اہمیت دیتا ہے۔

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

> ''اگر میری عمر میں سے صرف دس دن باقی ہوں اور مجھے اچھی طرح معلوم ہو کہ ان دنوں میں سے آخری دن بھی میری موت ہے اور مجھے ان دنوں میں نکاح کی ضرورت ہو تو فتنہ کے اندیشہ سے میں ضرور نکاح کرلوں گا۔ (۳)

اس میں ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے وضاحت کی ہے کہ وہ نکاح کو اتنا اہم سمجھتے ہیں کہ مرنے کے قریب بھی ضرورت پڑے تو اس سے گریز نہیں کرنا چاہتے، اس لیے کہ اس کے بغیر فتنہ کا اندیشہ ہے، یعنی حرام میں ابتلا کا خوف و اندیشہ ہے۔

---

(۱) مسلم:۱/۴۵۰
(۲) ترمذی:۱۰۷۸
(۳) سنن سعید:۲/۱۲۲

الغرض! اسلام نے نکاح کو عبادت کا ہم پلہ قرار دیا ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کے ذریعہ ایمان ودین اور عبادت تکمیل پاتے ہیں اور آدمی عفیف و پاک باز رہتا ہے۔

آج کل کے نکاح

اوپر کی تمام تر تفصیلات وتوضیحات کا خلاصہ دو باتیں ہیں: ایک یہ ہے کہ اسلام میں نکاح عبادت کا ہم پلہ عمل ہے۔ دوسرے یہ کہ عبادت ہونا اس وجہ سے ہے کہ اس سے عفت اور عصمت حاصل ہوتی ہے، جو ایمان اور عبادات کے کامل ہونے کا ذریعہ اور سبب ہے، ان باتوں کو مدنظر رکھتے ہوئے ذرا اپنے ماحول ومعاشرے پر بھی ایک نظر ڈالیے اور دیکھئے کہ آج کل کے نکاحوں اور اس نکاح میں کیا فرق ہے، جس کی اسلام تعلیم دیتا ہے اور اس کو عبادت کا ہم رتبہ قرار دیتا ہے۔

ذرا سی غور وفکر سے ہم بلا کسی تردد وتذبذب کے کہہ سکتے ہیں کہ آج کل کے اکثر نکاح اس کسوٹی پر نہیں اترتے۔ آج لوگ مال ودولت کی خاطر، عزت وجاہ کے لیے اور نفسانی خواہشات کی تکمیل کی غرض سے نکاح کرتے ہیں۔ انہیں یہ تصور بھی نہیں ہوتا کہ نکاح جس کے رچانے کے لیے اتنی دھوم مچائی جارہی ہے، اس کا عظیم ترین مقصد اسلام کی نظر میں نظر کی حفاظت اور شرم گاہ کا تحفظ ہے، عفت وعصمت کی ملکوتی صفات پیدا کرنا ہے۔ ایمان میں جلا، عبادت میں کمال اور اخلاق میں پاکیزگی کی تحصیل ہے اور جب یہ تصور نہیں تو نکاح کے عبادت ہونے کا خیال کہاں سے آئے گا؟ لہٰذا نکاح کو دنیوی ہنگاموں میں سے ایک ہنگامہ اور اپنے نفسانی جذبات وخواہشات کی تکمیل کے لیے ایک کارروائی سمجھتے ہیں، پھر اسی بنا پر نکاح کی انجام دہی میں اپنے آپ کو مختار کل خیال کرکے شریعت سے بالکل آزاد ہوجاتے ہیں، کیوں کہ وہ اس کو دین وشریعت سے متعلق ہی نہیں مانتے، حالاں کہ یہ بات سراسر غلط ہے جیسا کہ واضح ہو چکا۔

عبادت کا طریقہ سنت پر ہونا ضروری ہے

یہاں میں خاص طور پر اس طرف لوگوں کی توجہ مبذول کرانا چاہتا ہوں کہ نکاح جب عبادت ہے تو اس کا طریقۂ نبوی کے مطابق ہونا لازم وضروری ہے، کیوں کہ عبادت کی سرانجام دہی میں ہمیں اس کا پابند کیا گیا ہے کہ ہم اسوۂ رسول وطریقۂ نبی کی پابندی کریں۔اسی کو اس مشہور حدیث میں بیان کیا گیا ہے:

"من احدث في امرناهذا ماليس منه فهورد"(۱)

(جوشخص ہمارے دین میں کوئی نئی چیز داخل کرے جو اس میں نہ ہو تو وہ مردود ہے۔)

اور جب اوپر یہ ثابت ہو گیا کہ نکاح دینی کام اور عبادت ہے تو ظاہر ہے کہ اس میں بھی کوئی نئی بات اپنی طرف سے داخل کرنا مردود ہوگا؛ بل کہ یہ ضروری ہے کہ ہم طریقۂ نبوی کے مطابق اس کام کو انجام دیں۔

نماز کتنی بڑی عبادت ہے اگر اس کو کوئی من مانے طریقہ پر ادا کرے تو کیا ادا ہو جائے گی؟ روزہ اپنے طریقہ پر رکھنے سے ذمے سے ساقط ہو جائے گا؟ ہرگز نہیں؛ بل کہ اس میں پورے طور پر سنت نبوی کی اتباع لازم ہے۔اسی طرح نکاح بھی ایک عبادت ہونے کی وجہ سے من مانے طریقہ پر کرنے کی اجازت نہ ہوگی؛ بل کہ سنت نبوی وطریقۂ اسلامی کی پابندی لازم وضروری ہوگی۔

مگر افسوس کہ آج نکاح کو بالکل شریعت کی تعلیم اور نبوی ہدایات کے خلاف انجام دیا جارہا ہے جس سے وہ عبادت کے دائرہ سے نکل کر بدعت کے دائرہ میں داخل ہو جاتا ہے۔جیسے اگر نماز میں کوئی شخص بسم اللہ الرحمن الرحیم کو بلند آواز سے پڑھے

---

(۱) مسلم:۲۴۹۹

تو خلاف سنت ہونے کی بنا پر وہ عبادت کے دائرہ سے نکل کر بدعت کے دائرہ میں آجاتا ہے جیسا کہ ایک صحابی نے اس کو بدعت قرار دیا ہے۔ (۱)

نکاح کا اسلامی قانون وطریقہ

اس موقعہ پر میں یہ بتانا ضروری سمجھتا ہوں کہ نکاح کا اسلامی قانون وطریقہ کیا ہے؟ جس سے یہ عمل عبادت کا ہم پلہ وہم رتبہ بن جاتا ہے اوراس کی خلاف ورزی سے وہ دائرۂ عبادت سے خارج ہوجاتا ہے، تاکہ ہمیں یہ فیصلہ کرنا آسان ہو کہ ہمارے آج کل کے نکاح کیا شریعت کے قائم کردہ حدود میں ایک عبادت کہلانے کے مستحق ہیں، یا ان سے خارج ہوکر ایک من گھڑت رسم کہے جانے کے لائق ہیں؛ مگر واضح ہو کہ یہاں اس سلسلے کی تمام تفصیلات پیش کرنا مقصود نہیں ہے؛ بل کہ صرف چند امور کو پیش کرنا مدنظر ہے، جن کا اصلاح معاشرہ کے لیے ذکر کرنا ناگزیر ہے۔

نکاح کا مقصد عفت ہونا چاہیے

سب سے پہلی بات یہ ہے کہ نکاح کرنے کا مقصد عفت وعصمت ہونا چاہیے نہ کہ مال ودولت یا عزت ومنزلت۔ چناں چہ رسول اللہ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے اسی شخص سے برکت ورحمت کا وعدہ فرمایا ہے جو مذکورہ مقصد کے لیے نکاح کرے۔ آپ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے فرمایا کہ:

« من تزوج امرأة لم يردبهاالاان يغض بصره ويحصن فرجه اويصل رحمه بارک الله له فيهاوبارک لها فيه » (۲)

---

(۱) ترمذی:۱/ ۵۷

(۲) الترغیب:۳/ ۳۰

(جو شخص کسی عورت سے صرف اس غرض سے نکاح کرتا ہے کہ اس کی آنکھ نیچی رہے اور شرمگاہ محفوظ رہے اور صلہ رحمی کرے۔ اللہ تعالیٰ اس مرد کے حق میں عورت کو اور اس عورت کے حق میں مرد کو مبارک بنا دے گا)

یہ پوری روایت آگے آرہی ہے، یہاں صرف ایک حصہ نقل کیا گیا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ نکاح کا مقصد عفت وعصمت، احصان و پاک دامنی اور صلہ رحمی ہونا چاہئے یہی اسلامی نکاح ہے، جس کو عبادت کا ہم رتبہ قرار دیا گیا ہے جیسا کہ تفصیل اوپر گزر چکی ہے۔

عورت کا انتخاب دین کی بنیاد پر ہو

دوسری بات یہ ہے کہ عورت کا انتخاب حسب ونسب، مال وزر اور حسن و جمال کی بنا پر نہیں ؛ بل کہ دین کی بنیاد پر ہونا چاہئے۔ اس سلسلے میں متعدد احادیث آئی ہیں، مثلاً حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

”کہ عورت سے چار وجہ سے نکاح کیا جاتا ہے اس کے مال، اس کے نسب، اس کے جمال اور اس کے دین کی وجہ سے، تو دین والی کو اختیار کر، تیرے ہاتھ خاک آلود ہوں“۔ (۱)

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ”عورت سے اس کے حسن کی بنا پر نکاح نہ کرو کہ ممکن ہے کہ اس کا حسن اس کو ہلاک کر دے اور اس کے مال کے لیے بھی اس سے نکاح نہ کرو، کہیں اس کا مال

(۱) مشکوۃ:۲٦۷

اس کو سرکشی پر نہ ابھار دے اور اس کے دین کی بنا پر اس سے نکاح کرو، پس ایک دین دار کالی کلوٹی باندی بے دین حسین وجمیل عورت سے بہتر ہے۔(۱)

ان احادیث سے معلوم ہوا کہ عورت کا انتخاب مال ودولت، حسب ونسب، حُسن وجمال کی بنیاد پر نہیں؛ بل کہ دین ودیانت، تقویٰ وپرہیز گاری، ایمان واسلام، اعمال واخلاق کی بنیاد پر ہونا چاہیے اور یہ حکم جس طرح مردوں کو ہے، اسی طرح عورتوں کو بھی ہے کہ وہ اپنے لیے دین دار شوہر پسند کریں۔ اسی طرح مرد وعورت کے ذمے دار وسرپرستوں کو بھی اس کا حکم ہے کہ وہ اپنے لڑکے یا لڑکی کے لیے دین دار بیوی یا شوہر کا انتخاب کریں۔

نکاح میں خرچ کم کرنا چاہیے

تیسری بات یہ ہے کہ نکاح میں خرچ کم سے کم کرنا چاہیے، ایسے نکاح کو بابرکت قرار دیا گیا ہے۔ چناں چہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ:

« ان أعظم النكاح بركة أيسره مؤنة . » (۲)

(یعنی زیادہ بابرکت نکاح وہ ہے کہ جس کا خرچ کم سے کم اور ہلکا ہو۔)

معلوم ہوا کہ اسلامی نکاح وہ ہے کہ جس میں اخراجات کم سے کم ہوں، نہایت سادگی سے انجام دیا جائے اور جو نکاح ایسا نہ ہو اس میں برکت نہ ہوگی۔

مہر زیادہ نہ باندھا جائے

چوتھی بات یہ ہے کہ مہر میں بہت غلو نہ کیا جائے؛ بل کہ اپنی حیثیت کے مطابق

(۱) سنن سعید: ۳/۱۲۵

(۲) مشكوة: ۲۶۸

قابل ادا مہر مقرر کیا جائے، محض تفاخر کے لیے لمبے چوڑے مہر کا رجسٹر میں لکھ دینا یہ کوئی اسلامی بات نہ ہوگی۔

حدیث میں ہے کہ:

''خیر الصداق أیسرہ''

بہترین مہر وہ ہے جو ہلکا اور آسان ہو۔ (۱)

ایک روایت میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ عورت کی سعادت و برکت اس میں ہے کہ اس کا مہر اور نکاح آسان ہو اور وہ صاحب اولاد ہو۔ (۲)

حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ خبر دار! تم مہر زیادہ نہ باندھا کرو، کیوں کہ اگر یہ بات دنیا میں بھلائی کی یا آخرت میں (ایک روایت میں اللہ کے پاس) تقویٰ کی ہوتی تو اس کے سب سے زیادہ مستحق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہوتے، حالاں کہ آپ نے اپنی بیویوں اور بیٹیوں کا مہر بارہ اوقیہ سے زیادہ نہیں باندھا ہے۔ (۳)

ہمارے زمانے کے نکاحوں پر ایک نظر

ان حقائق کے بعد ہمارے زمانے کے نکاحوں پر ایک نظر ڈال کر دیکھئے کہ کیا وہ اپنی تعلیمات و ہدایات کے مطابق سرانجام دیئے جاتے ہیں یا ان سے ہٹ کر من مانی طریقوں پر کیے جاتے ہیں؟

کیا عفت و عصمت کے لیے نکاح کیے جا رہے ہیں؟ کیا دین داری اور امانت داری، خلوص و تقویٰ، ایمان و اسلام کی بنیاد پر عورت و مرد کا انتخاب کیا جاتا ہے؟

---

(۱) بلوغ المرام:۸۷

(۲) جمع الفوائد:۱/ ۲۱۹

(۳) سنن سعید:۳/ ۱۵۲

نکاح کو سادگی و بے تکلفی سے اور آسان و سہل طریقے پر کیا جاتا ہے؟ مہر ہلکا اور ایسا کہ قابل ادا ہو، باندھا جاتا ہے؟

اکثر و بیشتر نکاحوں کے بارے میں ان سوالوں کا جواب نفی میں ہی دینا ہوگا، پھر اس پر بس نہیں؛ بل کہ ان کے ساتھ مزید ہزاروں خرافات و رسومات کو ٹھونس رکھا ہے؛ بل کہ صریح حرام و ناجائز باتوں کو بھی اس سے جوڑا گیا ہے۔ بتایئے اس قسم کے نکاح کو رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کی سنت اسلامی عبادت قرار دینا صریح تحریف نہیں ہے تو اور کیا ہے؟ میں پوچھتا ہوں کہ اگر کوئی شخص نماز کے نام پر کچھ خلاف شرع کام انجام دے اور کہنے لگے کہ میں نے رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کی سنت اور اسلامی عبادت انجام دی ہے، تو کیا محض اس کے اس کام کو عبادت اور نماز کہہ دینے سے وہ کام عبادت و سنت کہلانے اور نماز کے لقب پانے کا مستحق ہو جائے گا؟ ہرگز نہیں؛ بل کہ اس کی اس بات کو ہر آدمی نماز کی توہین اور سنت رسول کی گستاخی قرار دے گا؛ مگر عجیب بات ہے کہ آج پورا معاشرہ اسی قسم کی غلطی و گستاخی کا مرتکب ہو رہا ہے؛ مگر کسی کو اس کا احساس نہیں۔ خطبۂ نکاح کے ساتھ من مانی رسومات و خرافات اور حرام و ناجائز کاموں کو سرانجام دے کر لوگ سمجھتے ہیں کہ ہم نے سنت رسول اللہ کو پورا کیا ہے اور ایک عبادت انجام دی ہے۔ بتایئے یہ گستاخی نہیں تو اور کیا ہے؟ یہ نکاح کی توہین نہیں تو اور کیا ہے۔

جوڑا جہیز کے طالب پر رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کی پھٹکار

میں یہاں نکاح میں ہونے والے تمام خرافات پر بحث کرنا نہیں چاہتا۔ صرف چند باتوں پر توجہ مبذول کرانا چاہتا ہوں، ان میں سے ایک جوڑے جہیز کے مطالبہ کا مسئلہ ہے اور آپ نے وہ حدیث پڑھی ہے جس میں اللہ کے نبی عَلَیْہِ السَّلَام نے

بتایا کہ نکاح کا مقصد عفت وعصمت اور پاک دامنی ہونا چاہئے اور اس مقصد سے کیا جانے والا نکاح بابرکت ہوتا ہے۔ مگراب ہوکیا رہا ہے؟ ہو یہ رہا ہے کہ لوگ مال دولت سے اپنی حرص ولالچ کے پیٹ کو بھرنے کے لیے نکاح کرتے ہیں؛ مگراس سے بھی ان کا یہ پیٹ بھرتا نہیں؛ بل کہ حرص ولالچ کی آگ اور بھڑک جاتی ہے اور کبھی کبھی کیا؛ بل کہ بہت دفعہ یہ آگ بہت سی معصوم لڑکیوں کو جلا کر خاکستر کردیتی ہے؛ مگراس پر بھی اس حریص ولالچی کو قرار نہیں آتا؛ بل کہ وہ دوسرے شکار کے لیے بے چین ہوکر تلاش شروع کردیتا ہے۔

اللہ کے نبی صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم نے سچ فرمایا:

"اگر آدمی کے پاس مال سے بھرے ہوئے دو جنگل ہوں تب بھی وہ تیسرے کی تلاش کرے گا اور آدمی کے پیٹ کو سوائے (قبر کی) مٹی کے کوئی چیز نہیں بھرتی" (۱)

مگران لوگوں کو جو نکاح سے مال دولت یا عزت وناموس یا کسی اور چیز کے طالب ہوتے ہیں، معلوم ہونا چاہئے کہ ان کے دین ودنیا بربادی وہلاکت میں پڑے ہوتے ہیں، یہ جوڑے اور جہیز کے لیے شادی کرنے والے ذرا ہوش سے اور گوشِ ہوش سے اللہ کے نبی صادق ومصدوق صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم کا ارشاد سن لیں، آپ فرماتے ہیں:

« من تزوج امرأة لعزهالم يزده الله الاذلاومن تزوجها لمالهالم يزده الله الافقرا ،ومن تزوجها لحسبهالم يزده الله الادناءة، ومن تزوج امرأة لم يرد بها الاان يغض بصره

(۱) مشکوۃ :۴۵۰

ویحصن فرجه اویصل رحمه بارک اللّٰہ له فیها وبارک لها فیه.» (۱)

(جوکسی عورت سے اس کی (دنیوی) عزت وحیثیت کی وجہ سے شادی کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کی ذلت ہی میں اضافہ کرے گا، اور جو اس کے مال کے سبب سے شادی کرتا ہے، اللہ تعالیٰ اس کے فقر وافلاس ہی میں اضافہ کرے گا، اور جو اس کے حسب ونسب کے سبب سے نکاح کرے گا، تو اللہ تعالیٰ اس کو اور پست کرے گا، اور جو کسی عورت سے صرف اس لیے نکاح کرتا ہے کہ اس کی آنکھ نیچی رہے اور شرم گاہ محفوظ رہے اور صلہ رحمی کرے، تو اللہ تعالیٰ ان دونوں (مرد وعورت کو) ایک دوسرے کے لیے مبارک بنائے گا۔)

اس حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان لوگوں کے حق میں بددعا کی ہے یا اطلاع وخبر دی ہے، جو نکاح مال ودولت یا جاہ وعزت کے لیے رچاتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ان کو اور زیادہ فقر وافلاس میں مبتلا کرے گا اور ذلت وپستی سے ہم کنار کرے گا۔ فقر وافلاس میں مبتلا کرنے کا مطلب یہ ہے کہ ان کے لیے اس مال میں برکت نہ دی جائے گی؛ بل کہ مال ودولت ہوتے ہوئے بھی یہ فقیر ہی رہیں گے۔

اس حدیث میں جوڑے اور جہیز کے مطالبہ کرنے والوں کو عبرت حاصل کرنی چاہئے اور غور وفکر کرنا چاہئے کہ وہ دنیا کی فانی و بے حقیقت مال ودولت کے لیے اپنے آپ کو کس قدر ذلیل ورسوا کر رہے ہیں۔ لوگوں کی نظر میں بھی اور اس سے بڑھ کر اللہ ورسول کی نظر میں بھی۔

---

(۱) تخریج العراقی للاحیاء :۲/ ۳۸

حضرت خواجہ عزیز الحسن مجذوبؒ کا یہ قطعہ اس جگہ ضرور یاد رکھئے۔

لطف دنیا کے ہیں کئی دن کے لیے
کھو نہ جنت کے مزے ان کے لیے
یہ کیا اے دل تو بس پھر یوں سمجھ
تو نے ناداں گل دیئے تنکے کے لیے

الغرض! اسلامی نکاح کا سب سے بڑا جو امتیاز ہے وہ اس نیک مقصد کے تحت ہونا ہے اور جب یہ نہیں تو وہ اسلامی نکاح کہاں سے ہوا اور کیوں کر ہوا؟ اور مال و دولت کی تحصیل جیسے ذلیل مقصد کے لیے کئے جانے والے نکاح میں وہ برکات وثمرات کہاں اور کیسے جو اسلامی نکاح کے بیان کیے گئے ہیں؟ اور ایسے نکاح کو سنت رسول اور اسلامی عبادت کے پر شکوہ و پر وقار الفاظ سے یاد کرنا کس طرح روا اور جائز ہوسکتا ہے؟

لڑکی والوں کا ناجائز مطالبہ

یہاں ایک اور بات پر متنبہ کرنا بھی ضروری ہے وہ یہ ہے کہ آج کل جس طرح لڑکے کی طرف سے لڑکی والوں سے جوڑے اور جہیز کا مطالبہ کیا جاتا ہے۔ اسی طرح لڑکی والوں کی جانب سے بھی زیورات اور کپڑوں وغیرہ کا مطالبہ لڑکے سے کیا جاتا ہے، یہ بھی ناجائز اور حرام ہے اور فقہی مستندات میں اس کو صاف طور پر رشوت قرار دیا گیا ہے۔

علامہ شامی رحمۃ اللہ فرماتے ہیں:

’’ لو ابیٰ ان یزوجها فللزوج الاسترداد قائما او هالكا

لانہ رشوۃ"(۱)

یعنی لڑکی کے ذمے دار نے بغیر کچھ لیے نکاح کرنے سے انکار کردیا تو مرد کو وہ چیز (خواہ باقی رہے یا نہ رہے) لوٹا لینے کا حق ہے، کیوں کہ وہ رشوت ہے۔

علامہ ابن نجیم مصری رحمۃ اللہ نے بھی اس کو صاف طور پر رشوت قرار دیا ہے۔(۲)

عام طور پر لڑکی والے بہت معصوم بن جاتے ہیں اور سارا الزام لڑکے والوں پر ڈالتے ہیں، حالاں کہ خود بھی لڑکے سے بہت سی چیزوں کا مطالبہ کرتے ہیں، یہ بھی ناجائز ہے۔

ممکن ہے کوئی صاحب ارشاد فرمائیں کہ لڑکے والوں سے لے کر لڑکی ہی کو تو دیا جاتا ہے ہم تو نہیں لیتے۔ مگر ظاہر ہے کہ اس سے مسئلہ میں کچھ فرق نہیں پڑتا، رشوت لے کر آپ خود کھا جائیں یا کسی کو دے دیں، اپنوں کو دیں یا غیروں کو دیں، رشوت تو بہ ہر حال رشوت ہے۔

الغرض! یہ مطالبہ خواہ لڑکے والوں کی طرف سے ہو یا لڑکی والوں کی جانب سے بہ ہر صورت ناجائز ہے اور اس حدیث کی وعید کا مستحق بنا دیتا ہے جس کا اوپر تذکرہ کیا گیا ہے۔

لڑکے اور لڑکی کے انتخاب کا ذلیل معیار

اوپر نکاح کے مقصد پر کلام تھا۔ اب لیجیے دوسری بات کہ اسلام نے لڑکے یا لڑکی کے انتخاب کے لیے دین کو معیار قرار دیا ہے اور حسب ونسب، مال و دولت اور

(۱) شامی:۳/۱۵۶

(۲) البحر الرائق:۳/۱۸۷

حسن و جمال کو معیارِ انتخاب بنانے سے سختی سے منع فرمایا ہے، جیسا کہ اوپر احادیث سے ثابت ہو چکا ہے۔

مگر ہماری شامت دیکھیے کہ آج ہم کسی چیز کو معیارِ انتخاب بنانے کے لیے تیار نہیں ہیں تو وہ صرف اور صرف دین ہے۔ ایسے واقعات سننے میں آئے ہیں؛ بل کہ بعض دفعہ دیکھنے کا بھی موقع ہوا ہے کہ جس کے بارے میں یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ دین دار ہے، لوگ اس کو لڑکی دینے تیار نہیں ہوتے۔ خود بعض حضرات نے مجھ سے بیان کیا کہ ہمارے پاس مال و دولت سب کچھ ہے اور ساتھ میں ہم لوگ دین دار بھی کہلاتے ہیں کہ داڑھی رکھی ہے، نماز پڑھتے ہیں اور معاملات میں حرام و حلال کا خیال کرتے ہیں، اس کی وجہ سے کوئی ہمیں لڑکی دینے پر تیار نہیں ہوتا۔

تقریباً دو سال پہلے میں اپنے گھر میں تھا کہ مجھے اطلاع دی گئی کہ بعض حضرات ملنا چاہتے ہیں، میں نے مدرسہ میں بیٹھنے کے لیے کہا اور پہنچا، دیکھا کہ کچھ لوگ ہیں ان میں ایک نوجوان داڑھی رکھے ہوئے ہے، ان حضرات نے بتایا کہ اس نوجوان کی شادی کا مرحلہ ہے، یہ کافی مال دار ہے؛ مگر بُرا یہ ہوا کہ ساتھ ساتھ دین دار بھی ہے، اب ایک جگہ رشتہ طے ہونے والا ہے، صرف ایک بات سے معاملہ اٹکا ہوا ہے، وہ یہ کہ لڑکی اور لڑکے والوں کا مطالبہ ہے کہ لڑکا داڑھی نکال دے، ورنہ وہ لڑکی دینے تیار نہیں ہیں۔ ان حضرات نے سوال کیا کہ کیا نکاح کے لیے داڑھی نکال دی جائے؟ شریعت اس کی اجازت دیتی ہے؟ میں نے عرض کیا کہ آپ کو یہ لڑکی نہ ملی تو دوسری مل جائے گی؛ مگر اس خدا کو جس کو ہم مانتے ہیں ٹھکرا کر کسی اور خدا کو ہم پا نہیں سکتے ہیں آپ ایسی جگہ کو خود ٹھکرا دیں جو اللہ کے رسول کی سنت اور دینی واجب کو نظرِ تحقیر سے دیکھتے ہیں۔

یہاں اس بحث میں نہیں جانا ہے کہ داڑھی واجب ہے یا سنت؟ یا کیا؟ بتانا صرف یہ ہے کہ لوگوں کو دین سے کس قدر بے زاری ہے کہ وہ انتخاب کا معیار دین کو بنانا قطعاً پسند نہیں کرتے۔ اس کے برخلاف مال دولت اور حسن و جمال کو معیار خیال کرتے ہیں اور اسی پر معاملات طے کرتے ہیں؛ بل کہ اس میں بھی سب سے ذلیل مقصد مال دولت کو مقدم رکھتے ہیں اور پھر بھی اپنے نکاحوں کو سنت رسول اور اسلامی عبادت کا درجہ دیتے ہیں۔ کس قدر تعجب اور افسوس کی بات ہے؟

دین دار رشتہ آنے پر نکاح نہ کرنا فساد کا باعث ہے

معلوم ہونا چاہیے کہ دین دار رشتہ آنے کے بعد نکاح نہ کرنا اور مال و دولت یا حسن و جمال کا انتظار کرنا، اسلام کی نظر میں سخت ناپسندیدہ بات ہے؛ بل کہ حدیث میں اس کو فساد کا سبب و باعث بتایا گیا ہے۔

چناں چہ حدیث میں ہے:

« اذاخطب الیکم من ترضون دینہ و خلقہ فزوجوہ ان لا تفعلوہ تکن فتنۃ فی الارض و فساد عریض »[1]

(جب تمہارے پاس ایسے لوگ (نکاح کا) پیغام بھیجیں جن کا دین واخلاق پسندیدہ ہو تو ان سے نکاح کر دو اگر تم نے ایسا نہ کیا تو زمین میں فتنہ اور بڑا فساد ہوگا)

اس حدیث کے مطابق نکاح نہ کرنے پر اور مال و دولت کے انتظار میں تاخیر کرنے پر جو فساد اور فتنہ مچا ہوا ہے وہ سب کو معلوم ہے۔ کہیں ناجائز تعلقات پل رہے ہیں اور کہیں ناجائز اولاد پل رہی ہیں اور کہیں ناجائز اولاد کو خود حرام کا ارتکاب

(۱) مشکوۃ:۲۶۷

کرنے والے گلا دبا کر مار رہے ہیں اور کہیں اس کو پھینک رہے ہیں، کہیں یہ ناجائز حمل گرائے جاتے ہیں۔ ان سب سے بڑھ کر یہ کہ کبھی ان تعلقات سے لڑکا و لڑکی بھاگ جاتے ہیں، یہ سارا فساد اور فتنہ اسی وجہ سے ہے کہ لوگوں کو دین دار پسند نہیں اور دنیادار بغیر دنیا کے راضی نہیں اور دنیا کے جمع کرنے میں نکاح مؤخر ہوتا جاتا ہے اور یہ سب فساد ظاہر ہوتا ہے۔

اس کے علاوہ ایک فساد وہ بھی ہے جو دنیا کی دولت اور عزت کی خاطر رونما ہوتا ہے کہ بے دین سے نکاح ہوا اور وہ دنیا کا حریص دنیا مانگ رہا ہے، ورنہ جلانے، پھنسانے، مارنے، پیٹنے کے لیے تیار رہے۔ یہ بھی تو فساد و فتنہ ہے۔ غرض یہ کہ دین داری کو مدنظر نہ رکھنے اور دنیا کو پیش نظر رکھنے میں ہر طرح آفت و فساد ہے۔

نکاحوں میں اسراف وفضول خرچی اور ناجائز امور

اب تیسری بات کو دیکھئے کہ اسلام نے اس نکاح کو بابرکت قرار دیا جس میں کم خرچ ہو اور اس سے معلوم ہوا کہ جس قدر خرچ زیادہ ہوگا، اسی قدر برکت کم ہوتی جائے گی۔ یہ تو مباح وحلال خرچ کے متعلق ارشاد ہے اور اگر خدانہ خواستہ اس میں حرام وناجائز خرچ بھی داخل ہو جائے تو اس کے بابرکت ہونے کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا؛ بل کہ اب یہ نہایت مذموم اور قبیح نکاح ہوگا۔

اور غور فرمالیجئے کہ آج کل کے نکاحوں کا کیا حال ہے؟ تفصیل سے ایک ایک جز پر کلام کیا جائے تو مستقل دفتر تیار ہو جائے جس کی نہ گنجائش، نہ فرصت، نہ ضرورت۔ اشارہ عقل مندوں کے لیے کافی ہوتا ہے۔

رقعہ جات اور وہ بھی حسین وخوبصورت، نہایت قیمتی، دعوت میں مختلف کھانوں اور مشروبات کی بھرمار، دعوت بھی ایک دفعہ نہیں چار چار پانچ پانچ دفعہ۔ ہلدی، شکرانہ،

نکاح،جلوہ ولیمہ۔پھراس کے بعد جمعگی وغیرہ۔نکاح کی دعوت میں پان بیڑا،بادام ،اخروٹ،مصری وغیرہ نکاح کے بعد موز،مٹھائی،نکاح خانہ(شادی محل) کی آرائش وزیبائش اورخود شادی محل کا بڑااوروسیع ہونا اورخوبصورت حسین ہونا اورمحل نکاح میں اوراس کے پہلے اور بعد کی متعدد نشستوں میں تصویرکشی اورویڈیو کا انتظام،عورتوں اورمردوں کا اختلاط اور بے پردگی وغیرہ وغیرہ۔کیاان تمام امور کے ہوتے ہوئے موجودہ دور کے نکاحوں کوسنت اور عبادت کہا سکتا ہے؟ یا یہ کہنے والوں کو گستاخ و توہین کرنے والاقرار دینا چاہئے؟

موجودہ دور کے نکاحوں میں شرکت کاحکم

یہیں یہ مسئلہ بھی عرض کردینا مناسب خیال کرتا ہوں کہ ایسے نکاحوں میں اوپر جن کا ابھی ذکر ہوا شرکت کرنے کا کیا حکم ہے؟

علمانے تصریح کی ہے کہ ایسے نکاحوں میں،دعوتوں میں شرکت کرنا جائزنہیں ہے جہاں منکراورناجائز بات ہوتی ہو۔

حضرت سفینہ مولیٰ ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ ایک شخص حضرت علی رضی اللہ عنہ کا مہمان ہوا،آپ نے اس کے لیے کھانا بنوایا،حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے کہا کہ کاش!اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کوبھی ہم بلاتے کہ آپ بھی ہمارے ساتھ کھاتے۔ چناں چہ آپ کودعوت دی گئی آپ تشریف لائے اورآپ نے دروازے کی چوکھٹ پر ہاتھ رکھا تو آپ نے ایک پردہ پرنظر کی (جوکہ منقش تھا) اورواپس لوٹ گئے۔ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا آپ کے پیچھے گئیں اورعرض کیایارسول اللہ!کس چیز نے آپ کو لوٹادیا؟ فرمایا مجھے یاکسی نبی کوایسے گھر جانے کی گنجائش نہیں جومزین ہو۔(۱)

(۱) مشکوۃ:۲۷۸

دیکھئے اللہ کے رسول اس کے گھر جانا پسند نہیں کرتے جو گھر کو مزین بنا رکھے۔ اب کیا خیال ہے آج کل کے شادی محلوں کا جہاں ہزار قسم کی زیب و زینت کی جاتی ہے؟

بیہقی نے بہ سند صحیح روایت کی ہے کہ حضرت ابو مسعود کو ایک شخص نے دعوت دی آپ نے پوچھا کہ کیا گھر میں تصویر ہے؟ عرض کیا، جی ہاں، فرمایا: میں گھر میں داخل نہ ہوں گا جب تک کہ وہ تصویر توڑ نہ دی جائے۔ (۱)

حضرت امام بخاری رحمۃ اللہ نے تعلیقاً روایت کیا ہے کہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے ایک گھر میں تصویر دیکھی تو واپس چلے آئے۔ (۲)

ان دو صحابہ کے عمل سے معلوم ہوا کہ جہاں تصویر ہو وہاں جانے کی اجازت نہیں؛ بل کہ جانے کے بعد بھی واپس آجانا ضروری ہے۔ کیا آج کل نکاحوں میں ویڈیو اور تصویر نہیں لی جاتی؟ پھر کیا وہاں جانے کی اجازت ہوگی؟

امام بخاری رحمۃ اللہ نے نقل کیا ہے کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ کو دعوت دی، انہوں نے وہاں دیکھا کہ دیوار پر پردہ لٹکا ہوا ہے، یہ دیکھ کر آپ واپس آ گئے اور فرمایا کہ میں کھانا نہیں کھاؤں گا۔ (۳)

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ ایک بار شادی کی دعوت میں گئے، دیکھا کہ گھر پردہ سے ڈھانپا ہوا ہے، آپ نے فرمایا کہ کب سے تیرے گھر میں کعبہ آ گیا ہے؟ پھر جو صحابہ آپ کے ساتھ تھے ان سے فرمایا کہ ہر ایک اس حصہ کو پھاڑ دے جو اس کے قریب ہے۔ (۴)

---

(۱) فتح الباری:۹/۲۳۹

(۲) بخاری:۲/۷۷۸

(۳) بخاری:۲/۷۷۸

(۴) فتح الباری:۹/۲۵۰

ان روایات سے معلوم ہوا کہ آج کل جو بعض جگہ رواج ہے کہ دیواروں پر پردے لگاتے ہیں، یہ جائز نہیں ہے اور جہاں ایسا ہوتا ہے وہاں جانا بھی جائز نہیں ہے، اگر جائے تو اس کو روکنا چاہئے۔

فقط

محمد شعیب اللہ خان

اسلام میں
حسن معاشرت کی تعلیم

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اسلام میں حسنِ معاشرت کی تعلیم

اسلام ایک کامل و مکمل دین ہے جس میں انسانی ضرورت کا پورا پورا سامان موجود ہے اور انسانی زندگی کے تمام ابواب اور شعبوں میں رہنمائی کے مکمل اسباب پائے جاتے ہیں۔ اسلام صرف پوجا پاٹ کا مذہب نہیں، وہ صرف عبادت خانوں میں محصور نہیں، وہ خانقاہوں میں مقیّد نہیں، وہ صرف انسان کا نجی مسئلہ نہیں اور وہ صرف راہبوں کا دین نہیں؛ بل کہ اسلام ایک عالم گیر مذہب ہے، اس کے مخاطب بادشاہ بھی ہیں، وزراء بھی ہیں مال دار بھی ہیں، غریب بھی ہیں، وہ دینِ اسلام جس طرح انسان کی نجی و ذاتی زندگی میں اس کا رہنما ہے، اسی طرح وہ اس کو بازار و کاروبار کی دنیا میں بھی، ملازمت کے میدان میں بھی، صنعت و حرفت کے میدان میں بھی، سیاست کے میدان میں بھی، ہر جگہ رہنمائی کرتا ہے۔

ایک انسان کو اسلام معاشرتی زندگی گزارنے کے لیے کیا تعلیم دیتا ہے؟ یہی اس مضمون کا موضوع ہے جس کو جاننا اور سمجھنا آج کے دور میں نہایت ضروری ہے۔

آج کی ضرورت

کیوں کہ آج لوگوں کی معاشرتی زندگی نہایت خراب و خستہ ہے، حتیٰ کہ دین دار لوگوں میں بھی یہ کمی پائی جاتی ہے۔ نماز، روزہ کی پابندی، زکوۃ کا اہتمام اور حج پر حج کا سلسلہ جاری ہے؛ مگر معاشرت دیکھو تو اس کی حالت نہایت ابتر ہے، جس کی وجہ

سے آئے دن فسادات اور جھگڑے رونما ہوتے رہتے ہیں، خاندانوں میں، دوستوں میں، پڑوسیوں میں، دیگر متعلقین میں نااتفاقی کی فضا قائم رہتی ہے۔ غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ اس کی وجہ اور واحد وجہ یہ ہے کہ اسلام نے معاشرتی زندگی کے لیے جو اصول وضوابط اور جو طریقہ کار دیا تھا ہم نے اس کو چھوڑ دیا ہے۔ اگر سکون وراحت اور چین کی زندگی مطلوب ہے تو ضروری ہے کہ اس نظامِ کار کو اختیار کیا جائے جو اسلام نے معاشرتی زندگی گزارنے کے لیے عطا فرمایا ہے۔

حسنِ معاشرت کے دو اصول

اسلام چاہتا ہے کہ انسان حسنِ معاشرت کے ساتھ زندگی گزارے۔

چناں چہ بیویوں کے ساتھ حسن معاشرت کی تعلیم دیتے ہوئے فرمایا گیا:

﴿ وَعَاشِرُوْهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ﴾ (النساء:۱۹)

(بیویوں کے ساتھ معروف اور عمدہ طریقہ پر گزران کرو)

اور والدین کے ساتھ عمدہ طریقہ پر رہنے اور زندگی گزارنے کی تعلیم حضرت لقمان علیہ السلام کی زبانی دی گئی اور فرمایا:

﴿ وَصَاحِبْهُمَا فِي الدُّنْيَا مَعْرُوْفاً ﴾ (لقمان:۱۰)

(والدین کے ساتھ دنیا میں عمدہ طریقہ پر رہو)

اسی طرح تمام مسلمانوں اور تمام انسانوں کو بھائی بھائی بن کر محبت واخوت کے ساتھ زندگی گزارنے کی تعلیم دی گئی ہے۔

ایک حدیث میں فرمایا گیا ہے:

« كُوْنُوْا عِبَادَ اللّٰهِ اِخْوَاناً »

(اے اللہ کے بندو: تم بھائی بھائی بن کر رہو)۔(۱)

(۱) بخاری:۲/۸۹۶، مسلم:۲/۳۱۵

یہ حسن معاشرت کی تعلیم جو قرآن وحدیث میں دی گئی ہے، دو اصولوں پر مبنی ہے: (۱) ایک یہ کہ جس انسان کا جو حق شریعت نے دیا ہے اس کو وہ حق پورا پورا دیا جائے والدین کا حق، بیوی کا حق، شوہر کا حق، اولاد کا حق، استاد کا حق، پڑوسیوں کا حق، رشتے داروں کا حق اور دوستوں کا حق وغیرہ۔ (۲) دوسرا اصول یہ ہے کہ اپنا حق معاف کر دے اور اس سلسلہ میں حسنِ اخلاق سے پیش آئے۔

عام طور پر دنیا میں جو فساد و جھگڑا ہوتا ہے وہ ان اصولوں کی خلاف ورزی کا نتیجہ ہوتا ہے کیوں کہ لوگ اپنا حق وصول کرنے پر تو زور لگاتے ہیں؛ مگر دوسروں کا حق دینے پر آمادہ نہیں ہوتے جب کہ معاملہ اس کے برعکس ہونا چاہئے تھا۔

حقوق وفرائض کی اہمیت

ہمارے ذمے دوسرے لوگوں کے جو حقوق وفرائض ہیں، ان کی ادائیگی ایک تو اس لحاظ سے ضروری ہے کہ دنیا میں حسن معاشرت اس کے بغیر ممکن نہیں۔ دوسرے اس لیے کہ ان حقوق کے ادا نہ کرنے پر قیامت میں سخت بازپرس بھی ہوگی، لہٰذا حقوق وفرائض کی اہمیت دنیوی اعتبار سے بھی ہے اور اُخروی اعتبار سے بھی ہے۔

حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس بھائی نے دوسرے بھائی پر کوئی ظلم کیا، یعنی اس کی حق تلفی کی، اس کو چاہئے کہ وہ دنیا ہی میں اس سے معافی مانگ لے ورنہ قیامت کے دن تاوان ادا کرنے کے لیے کسی کے پاس کوئی درہم و دینار نہ ہوگا، صرف اعمال ہوں گے۔ ظالم کی نیکیاں مظلوم کو مل جائیں گی اور نیکیاں نہ ہوئیں تو مظلوم کے گناہ ظالم کے نامہ اعمال میں لکھ دیئے جائیں گے۔ (۱)

---

(۱) بخاری: ۲/ ۹۶۷

معلوم ہوا کہ حقوق کے تلف کرنے پر قیامت کے دن پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑے گا، اس لیے اس سے قبل دنیا میں معافی مانگ لینا چاہیے۔ غرض اسلام میں حقوق کی بڑی اہمیت ہے، اخروی لحاظ سے بھی اور دنیوی لحاظ سے بھی۔ اسلام نے بہت سارے لوگوں کے حقوق بتائے ہیں؛ مگر یہاں صرف چند لوگوں کے حقوق کا ذکر کیا جاتا ہے جن سے معاشرتی زندگی میں زیادہ سے زیادہ سابقہ پڑتا ہے۔

والدین کے ساتھ حسن معاشرت

والدین سے انسان کا تعلق پیدائش سے پہلے سے قائم ہو جاتا ہے، جب کہ وہ ابھی باپ کی صلب میں منی کے قطرات کی شکل میں تھا اور پھر وہاں سے منتقل ہو کر رحم مادر میں قرار پکڑا۔ اسی لیے اللہ و رسول کے بعد پوری کائنات میں سب سے بڑا کسی کا حق انسان پر ہے تو والدین کا حق ہے۔ اسلام نے ان کے حقوق پر تفصیلی روشنی ڈالی ہے۔ ان کے حقوق کا خلاصہ چار چیزیں ہیں: عظمت، محبت، خدمت اور اطاعت۔

ان کی عظمت کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"ماں کے قدموں تلے جنت ہے اور باپ جنت کا دروازہ ہے"۔ (۱)

ان سے محبت کے بارے میں آپ نے فرمایا:

"جو شخص اپنے والدین کو نظر رحمت سے دیکھے گا اس کو ہر نظر پر ایک حج مبرور کا ثواب دیا جائے گا"۔ (۲)

ان کی خدمت کے بارے میں فرمایا گیا کہ ایک صحابی اللہ کے رسول علیہ السلام کی خدمت میں آئے اور عرض کیا کہ میں جہاد کا ارادہ کر رہا ہوں، آپ نے فرمایا کہ

(۱) نسائی: ۲/۵۳، مشکوٰۃ: ۴۲۰

(۲) مشکوٰۃ: ۴۲۱

کیا تیرے والدین زندہ ہیں؟ اس نے کہا کہ ہاں، فرمایا:

« فَفِيهِمَا فَجَاهِدْ »

کہ تو ان کی خدمت کر کے جہاد کا ثواب حاصل کر۔ (۱)

اور ان کی اطاعت کے بارے میں فرمایا گیا:

''ان کی نافرمانی کبیرہ گناہوں میں سے ہے''۔ (۲)

یہ چند اشارے ہیں، میں تفصیل سے بچتے ہوئے یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ والدین کے یہ حقوق ہیں، ان کو ادا کرنے سے ظاہر ہے کہ والدین کو خوشی ہوگی اور وہ سکون سے رہیں گے تو خود کو بھی سکون معلوم ہوگا اور معاشرتی زندگی میں لطف و مزہ آئے گا، یہ ایک اصول ہوا۔ دوسرا اصول یہ ہے کہ والدین کی طرف سے اگر خلاف طبیعت بات پیش آئے تو وہاں اپنا حق معاف کرتے ہوئے، اسی طرح ان کے ساتھ حسن سلوک کا معاملہ کرے جیسے پہلے سے کرتا آیا ہے۔ یہ نہیں کہ اب اپنے حق کو حاصل کرنے پر زور دے، کیوں کہ اس سے حسن معاشرت قائم نہیں رہ سکتی۔ اسی لیے حدیث میں آتا ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اگر والدین کو کوئی غصہ دلاتا ہے تو اللہ اس سے غصہ وغضب میں آتا ہے، لوگوں نے پوچھا کہ والدین نے اگر ظلم کیا ہو تب؟ فرمایا کہ اگر چہ والدین نے ہی ظلم کیوں نہ کیا ہو تب بھی ان کو غصہ دلانا خدا کے غضب کا باعث ہے۔ (۳)

غرض یہ کہ حسن معاشرت کو قائم رکھنے کے لیے ایک طرف والدین کے حقوق

---

(۱) الادب المفرد:۱۱

(۲) بخاری:۲/۸۸۴

(۳) الادب المفرد:۱۱

جو ہمارے ذمے ہیں ان کو ادا کرنا ضروری ہے۔ دوسرے اگر ہمارے حقوق میں ان سے کوتاہی ہو جائے تو درگذر سے کام لینا چاہیے، اس کا اثر یہ ہوگا کہ دین و آخرت کے ساتھ انسان کی دنیا بھی بن جاتی ہے اور دنیا ہی میں اس کو جنت کا مزہ آنے لگتا ہے۔

میاں اور بیوی کی معاشرت

اب لیجئے از دواجی زندگی کو۔ میاں بیوی کا تعلقِ زوجیت ایک اہم اور قابل قدر تعلق ہے۔ اس لیے اسلام نے اس تعلق کو ہر ممکنہ تدبیر سے قائم و باقی رکھنے کی تعلیم دی ہے اور اس تعلق کو خوش گوار و پر لطف بنانے کی تعلیم دی ہے؛ بل کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں اس تعلق کو مؤدت و محبت اور رحمت کا تعلق قرار دیا ہے۔

اس تعلق کو خوش گوار بنانے کے لیے ایک طرف بیوی کو یہ تعلیم دی گئی کہ وہ اپنے شوہر کو اپنا سردار و حاکم خیال کرے ''**الرجال قوامون علی النساء**'' اور عزت اور مرتبہ کا پاس رکھے۔

حدیث میں فرمایا کہ میں اللہ کے علاوہ کسی اور کو سجدہ کا حکم دیتا تو عورت کو حکم دیتا کہ وہ اپنے مرد کو سجدہ کرے۔(۱)

نیز اس کو تعلیم دی گئی کہ مرد کے ساتھ اس طرح پیش آئے کہ اس کا دل خوش ہو جائے۔ حدیث میں فرمایا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا کہ سب سے بہتر عورت کون ہے؟ فرمایا کہ ''وہ عورت جو اپنے شوہر کو خوش کردے جب وہ اس کو دیکھے، اور اس کی اطاعت کرے جب وہ حکم دے، اور اس کی مرضی کے خلاف

---

(۱) ابوداود:۲۹۱

اپنے مال ونفس کو استعمال کر کے اس کی مخالفت نہ کرے''۔(۱)

دوسری طرف مردوں کو تعلیم دی گئی کہ ''عورتوں کے ساتھ بھلائی وخیریت کے ساتھ پیش آؤ''۔

اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ:

''مجھ سے عورتوں کے بارے میں خیر کی وصیت قبول کرو۔''(۲)

اور فرمایا کہ:

''عورت میں کچھ کمی وعیب ہو تو درگزر کرتے ہوئے اس کے ساتھ زندگی گزارو اگر تم اس کو بالکل سیدھا کرنے جاؤ گے تو پسلی کی طرح وہ ٹوٹ جائے گی۔''(۳)

نیز مردوں کو حکم دیا گیا:

''عورتوں کی کوئی عادت ناپسند بھی ہے تو ان سے بغض نہ رکھو''۔(۴)

پھر مردوں کو بتایا:

''عورت دنیا میں سب سے بہترین چیز ہے''۔(۵)

اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''مجھے تین چیزوں سے محبت ہے ایک عطر، دوسرے عورت، تیسرے نماز۔''(۶)

---

(۱) نسائی:۲/۷۱

(۲) بخاری:۲/۷۷۹، مسلم:۱/۴۷۵

(۳) ایضاً

(۴) مسلم:۱/۴۷۵

(۵) نسائی:۲/۷۱

(۶) مشکوٰۃ:۲۶۷

نیز عورتوں کے نان ونفقہ کے حقوق مرد کے ذمے رکھے گئے اور بتایا گیا:

''جتنے حقوق مردوں کے عورتوں پر ہیں، اتنے ہی عورتوں کے حقوق مردوں پر بھی ہیں''۔ (البقرۃ :۲۲۸)

تو اسلام نے میاں بیوی دونوں کے حقوق بتائے ہیں اور ایک کو دوسرے کے سامنے باعزت طریقہ پر پیش کیا ہے اور ایک دوسرے کو سمجھ کر حسنِ معاشرت کے ساتھ زندگی گزارنے کی تعلیم دی ہے۔

رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی معاشرت

اور خود اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمارے لیے بہترین نمونہ چھوڑا ہے۔ حدیث کی کتابوں میں اس سلسلے میں بہت سارے واقعات موجود ہیں ؛ مگر سب کا احاطہ نہ ممکن ہے اور نہ ضروری، لہٰذا چند واقعات پیش کرتا ہوں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم گھر میں ازواج مطہرات کے ساتھ نہایت بے تکلفی اور دل بستگی سے رہتے تھے۔ اپنے گھر میں اپنا کام خود کر لیتے تھے اور اس طرح رہتے تھے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ جیسے عام آدمی رہتے ہیں۔ (۱)

نیز ازواج مطہرات کے ساتھ مزاح بھی فرماتے تھے۔ ایک دفعہ کا واقعہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ ایک سفر کے موقع پر دوڑ لگائی۔ حضرت عائشہ کم سن اور خفیف بدن کی تھیں، لہٰذا وہ آگے بڑھ گئیں، پھر کسی موقع پر اسی طرح آپ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ دوڑ لگائی؛ مگر اب حضرت عائشہ کا بدن بھاری ہو گیا تھا، لہٰذا اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم ان پر سبقت لے گئے

(۱) شمائل ترمذی :۲۳

اور فرمایا کہ یہ پہلی دفعہ کا بدلا ہے۔(۱)

یہ ہے حسن معاشرت کہ اتنے بڑے رسول ہوکر آپ ازواج مطہرات کی اتنی رعایت فرما رہے ہیں، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا چوں کہ چھ برس میں آپ سے بیاہی گئیں اور نو سال کی عمر میں آپ کی رخصتی ہوئی تھی تو طبیعت میں ابھی بچپن تھا، اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم ان کی رعایت کرتے اور ان کو کھلونوں میں اپنی ساتھنوں کے ساتھ کھیلنے کا موقع دیتے تھے۔(۲)

ایک مرتبہ آپ کی ازواج نے آپ سے نفقہ کا مطالبہ کیا اور آپ کے پاس جمع ہوگئیں اور زور زور سے آپ سے باتیں کرنے لگیں۔ اتنے میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ آئے اور اندر آنے کی اجازت چاہی، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی آواز سننا تھا کہ سب اٹھ کر پردہ میں ہوگئیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اندر آئے، جب کہ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم اپنی عورتوں کی اس حرکت پر ہنس رہے تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے پوچھا کہ یا رسول اللہ آپ کو اللہ ہنستا رکھے، کیا بات ہے؟ فرمایا کہ مجھے ان عورتوں پر تعجب ہوا کہ یہ میرے پاس تھیں، جب تمہاری آواز معلوم ہوئی تو سب پردہ میں چلی گئیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ یا رسول اللہ! آپ زیادہ حق دار تھے کہ یہ آپ سے خوف کھاتیں، پھر آپ رضی اللہ عنہ ازواج کی طرف متوجہ ہوکر کہنے لگے کہ تم اے اپنے نفس کی دشمنو! مجھ سے تو ڈرتی ہو اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے نہیں ڈرتیں؟ ازواج نے فرمایا کہ اے عمر! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مقابلے میں آپ بہت سخت ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ عمر رضی اللہ عنہ ان کو چھوڑ دو۔ پھر فرمایا کہ تم سے شیطان

(۱) ابو داود، حمیدی: ۱/ ۱۲۸

(۲) بخاری: ۹۰۵، مشکوۃ: ۱۲۸، حمیدی: ۱/ ۱۲۸

بھی ڈرتا ہے اور تم جس راستے پر جاتے ہو شیطان وہاں سے دوسرے راستہ کو چلا جاتا ہے۔(۱)

اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی معاشرت اپنی ازواج کے ساتھ کیسی تھی؟ آپ ان کی کس قدر رعایت فرماتے تھے آپ نے خود ہی فرمایا کہ میں تم میں اپنی ازواج کے ساتھ سب سے زیادہ با اخلاق ہوں (حدیث) کبھی آپ ازواج مطہرات سے کہانیاں بھی سنتے ان کی باتیں سن کر ہنستے۔(۲)

ایک عجیب واقعہ حدیث کی کتابوں میں آیا کہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے حریرہ بنا کر لائیں۔ حضرت سودہ رضی اللہ عنہا بھی حاضر تھیں، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے حضرت سودہ رضی اللہ عنہا سے کہا کہ تم بھی کھاؤ؛ مگر انہوں نے انکار کر دیا، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا کہ اگر تم نہیں کھاتیں تو میں یہ حریرہ تمہارے منہ پر مل دوں گی۔ پھر بھی حضرت سودہ رضی اللہ عنہا نے انکار کیا تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے حریرہ میں ہاتھ ڈال کر ان کے چہرہ پر اس کو مل دیا اور یہ دیکھ کر اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہنسے اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا ہاتھ پکڑ لیا۔ اور حضرت سودہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا کہ اب تم ان کے چہرے پر مل دو اور حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم برابر ہنستے رہے۔(۳)

ہماری معاشرت پر ایک نظر

ظاہر ہے کہ ایسی معاشرت کے ساتھ جھگڑے اور فساد کا کوئی مطلب نہیں، گھر جنت کا ایک نمونہ ہوگا؛ مگر افسوس کہ آج ہماری معاشرت ایسی ہے کہ کسی کو کسی سے

---

(۱) بخاری:۲/۸۹۹

(۲) شمائل:۱۷، بخاری:۲/۷۷۹

(۳) حیاۃ الصحابہ:۲/۷۹۹

اطمینان وسکون میسر نہیں، اگر میاں، بیوی کے حقوق ادا کرتا ہے تو بیوی اس کے حقوق ادا نہیں کرتی اور اگر بیوی ادا کرتی ہے تو شوہر ادا نہیں کرتا، پھر ہر ایک صرف اپنا حق مانگتا ہے، دوسرے کے حقوق کی کمی کی کوئی پرواہ نہیں کی جاتی۔ ایسی صورت حال میں آپسی نزاعات کی فضا قائم نہ ہوگی تو اور کیا ہوگا؟ اسی لیے آج طلاقوں کی بھرمار ہے، خلع کی بھرمار ہے، اگر زوجین میں سے ہر ایک دوسرے کے حقوق ادا کرنے کی فکر کرے تو سرے سے جھگڑے ختم ہو جائیں گے۔

بڑوں کا ادب چھوٹوں پر شفقت

اسلام نے حسن معاشرت کی جو تعلیم دی ہے، اس میں ایک چیز بڑوں کا ادب اور چھوٹوں پر شفقت بھی ہے۔ ایک حدیث میں ارشاد فرمایا گیا ہے کہ جو ہمارے چھوٹوں پر رحم نہ کرے اور ہمارے بڑوں کی تعظیم وتوقیر نہ کرے، وہ ہم میں سے نہیں۔(۱)

اس میں حسن معاشرت کے قیام کا بڑا اہم اصول بیان فرمایا گیا ہے۔ وہ یہ ہے کہ بڑوں کو چاہئے کہ چھوٹوں سے رحمت ومحبت وشفقت کا معاملہ کریں اور چھوٹوں کو چاہئے کہ وہ بڑوں سے عظمت وتوقیر کا برتاؤ کریں بڑوں میں والدین اور ان کے ہم رتبہ رشتہ دار جیسے چچا، تایا، ماموں، پھوپھی، خالہ، دادا، دادی، نانا، نانی وغیرہ سب آجاتے ہیں۔ اسی طرح غیروں میں سے جو عمر میں، تجربہ میں، علم میں، بزرگی وتقویٰ میں، بڑے ہوں، وہ بھی اس میں داخل ہیں۔ جیسے استاذ، پیر، عالم، بوڑھے لوگ وغیرہ۔ اس طرح چھوٹوں سے جہاں اپنی اولاد مراد ہوگی، وہیں اولاد کی حیثیت رکھنے والے رشتہ دار بھی مراد ہوں گے۔ جیسے بھائی وبہن کی اولاد وغیرہ۔ نیز شاگرد، مرید، اور عمر میں چھوٹے سب ہی لوگ مراد ہوں گے۔ اب خیال تو کیجئے کہ اگر ان بڑوں

(۱) ادب المفرد:۷۵

کی طرف سے چھوٹوں پر شفقت ورحمت کا معاملہ ہوگا اور چھوٹوں کی جانب سے بڑوں کے ساتھ عظمت واجلال کا برتاؤ ہوگا، تو معاشرت میں حسن نہ پیدا ہوگا تو اور کیا ہوگا۔

سیرت محمدی صلی اللہ علیہ وسلم سے سبق

اب ذرا سیرت محمدی صلی اللہ علیہ وسلم میں حسن معاشرت کا باب کھول کر دیکھئے کہ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بڑوں اور چھوٹوں کے ساتھ کس طرح معاملہ فرمایا ہے۔

حضرت ابوطفیل رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے مقام ''جوانہ'' میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو گوشت تقسیم کرتے ہوئے دیکھا، ناگہاں ایک عورت آئی اور آپ علیہ السلام کے قریب ہوگئی، آپ نے اپنی چادر اس عورت کے لیے بچھائی اور وہ اس پر بیٹھ گئی، حضرت ابوطفیل رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے لوگوں سے پوچھا کہ یہ کون عورت ہے، لوگوں نے بتایا کہ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وہ ماں ہیں، جنہوں نے آپ کو دودھ پلایا تھا۔ (۱)

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے والد حضرت ابوقحافہ رضی اللہ عنہ فتح مکہ کے موقع پر ایمان لائے تھے، اور کافی بڑی عمر کے آدمی تھے، ان کے ایمان لانے کا واقعہ کتب سیرت میں تفصیل سے آیا ہے، اس میں ہے کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اپنے والد کو لے کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت اقدس میں حاضر ہوئے اور بتایا کہ یہ میرے والد ہیں اور ایمان قبول کرنے کے لیے آپ کی خدمت اقدس میں حاضر ہوئے ہیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس موقع پر فرمایا کہ ابوبکر! آپ نے ان کو کیوں

---

(۱) مشکوۃ:۴۲۰

تکلیف دی، میں خود ان کے پاس چلا جاتا۔ (۱)

ان واقعات سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا بڑوں کی تعظیم وتوقیر کرنا معلوم ہوا، اسی کے ساتھ احادیث سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ آپ دوسروں کو بھی برابر اس کی تعلیم دیا کرتے تھے، چناں چہ حدیث میں ہے کہ ایک موقعہ پر حضرت محیصہ بن مسعود، حضرت حویصہ بن مسعود اور حضرت عبدالرحمان بن سہل رضی اللہ عنہم تینوں صحابہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ ان میں عبدالرحمٰن بن سہل رضی اللہ عنہ کی عمر باقی دو صحابہ کے مقابلے میں کم تھی؛ مگر اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے انہی نے گفتگو شروع کی، تو اللہ کے نبی علیہ السلام نے ان سے فرمایا ''کَبِّرْ کَبِّرْ'' یعنی بڑوں کو بات کرنے دو، بڑوں کو بات کرنے دو، یہ سن کر حضرت عبدالرحمان خاموش ہو گئے۔ (۲)

اسی طرح علما وعقلا کی تعظیم کا سبق بھی آپ نے دیا ہے۔ ایک حدیث میں ہے کہ آپ نے ارشاد فرمایا کہ (نماز میں) مجھ سے وہ لوگ قریب رہیں جو علم وعقل والے ہیں۔ (۳)

غرض یہ کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ تعلیم قولاً وعملاً دی ہے کہ بڑوں کی عظمت وتوقیر کی جائے اور ان کے اکرام واجلال کو مدنظر رکھا جائے۔

بچوں پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی شفقت

یہ تو بڑوں کے ادب وتعظیم کی تعلیم دی اور دوسری طرف آپ صلی اللہ علیہ وسلم

(۱) سیرت ابن هشام:۲/۴۰۶

(۲) ریاض الصالحین:۱۴۲، الادب المفرد:۷۵

(۳) مسلم:۱/۱۸۱

نے بچوں اور چھوٹوں سے شفقت و رحمت کا معاملہ و برتاؤ کر کے اس کی تعلیم بھی دی ہے۔

حدیث میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ایک صحابی حضرت اقرع بن حابس رضی اللہ عنہ آئے، اس وقت آپ نے حضرت حسن بن علی رضی اللہ عنہ کو جو بچے تھے پیار کیا۔ حضرت اقرع نے تعجب سے کہا کہ کیا آپ بچوں کا بوسہ لیتے ہیں؟ میرے دس لڑکے ہیں، لیکن میں نے آج تک کسی کا بوسہ نہیں لیا۔ آپ علیہ السلام نے فرمایا کہ جو رحم نہیں کرتا اس پر رحم نہیں کیا جاتا۔ اور ایک حدیث میں ہے کہ ان ہی سے آپ نے فرمایا کہ میں کیا کر سکتا ہوں، اگر خدا نے تمہارے دل سے رحمت وشفقت کو نکال لیا ہے۔ (۱)

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے بڑھ کر کسی کو بچوں پر شفقت کرنے والا نہیں دیکھا۔ (۲)

آپ کا بچوں پر شفقت کا یہ حال تھا کہ آپ فرماتے ہیں کہ میں نماز شروع کرتا ہوں اور ارادہ کرتا ہوں کہ لمبی نماز پڑھوں؛ مگر جب کسی بچے کے رونے کی آواز سنتا ہوں تو نماز کو مختصر کر دیتا ہوں، اس خیال سے کہ اس کی ماں کہیں پریشان نہ ہو جائے اور وہ غم میں نہ پڑ جائے۔ (۳)

بچوں سے آپ کے پیار کے عجیب واقعات کتابوں میں آئے ہیں۔ ایک دفعہ کا واقعہ ہے کہ آپ ممبر پر خطبہ جمعہ ارشاد فرما رہے تھے، اسی دوران آپ کے نواسے حضرت حسن وحضرت حسین رضی اللہ عنہما لال قمیصوں میں ملبوس مسجد میں آئے،

---

(۱) الادب المفرد:۲۶، مسلم:۲/۲۵۴، بخاری:۲/۸۸۷

(۲) مسلم:۲/۲۵۴

(۳) بخاری:۱/۹۸، مسلم:۱/۱۸۸، ابو داود:۱/۱۱۵، نسائی:۱/۱۳۲، ترمذی:۱/۸۶

ان کو دیکھ کر آپ نے خطبہ قطع فرما دیا اور ممبر سے اتر کر ان دونوں کو اٹھالیا اور ممبر پر تشریف لائے اور فرمایا کہ اللہ نے سچ کہا ہے کہ "تمہارے اموال واولاد فتنہ ہیں"۔ میں نے ان دونوں کو قمیصوں میں دیکھا تو صبر نہ آیا، لہٰذا میں نے ان کو اٹھالیا۔ (۱)

کبھی آپ بچوں کو اپنے کندھوں پر اٹھا لیتے تھے اور کبھی اسی حالت میں نماز بھی پڑھتے تھے۔ حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک دفعہ آپ ہماری طرف تشریف لائے اور آپ کے کندھے پر آپ کی نواسی امامہ رضی اللہ عنہا بیٹھی ہوئی تھیں، آپ نے اسی حالت میں نماز ادا فرمائی جب رکوع یا سجدہ کرنا چاہتے تھے تو بچی کو اتار دیتے اور جب کھڑے ہوتے تو پھر اٹھا لیتے اور بعض روایات میں ہے کہ اسی حالت میں آپ نے امامت فرمائی تھی۔ (۲)

کبھی آپ بچوں سے مزاح وتفریح بھی فرمایا کرتے تھے۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ان کو اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ کہہ پکارا، اے دو کان والے! اس حدیث کے راوی اسامہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ یہ آپ نے ان سے مزاح فرمایا تھا۔ (۳)

یہ چند مثالیں ہیں، جن سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا بچوں کے ساتھ شفقت کا برتاؤ کرنا ثابت ہوتا ہے۔ یہ ہیں بڑوں اور چھوٹوں کے ساتھ برتاؤ کے آداب جن سے حسن معاشرت قائم ہوتی ہے۔

پڑوسیوں سے حسنِ معاشرت

حسنِ معاشرت کی تعلیم کا ایک اہم جزو حصہ وہ ہے جو پڑوسیوں کے ساتھ سلوک

(۱) مسند احمد: ۳۵۴/۵، ابو داود: ۱/۱۵۸، نسائی: ۱/۲۰۹، ترمذی: ۲/۲۲۸
(۲) بخاری: ۲/۸۸۷، مسند حمیدی: ۱/۲۰۳، مسلم: ۱/۲۰۵
(۳) شمائل ترمذی: ۱۵

وبرتاؤ کے متعلق ہے، کیوں کہ پڑوس سے رابطہ وتعلق ہر آن ولمحہ برقرار رہتا ہے۔ اٹھتے بیٹھتے ان سے سابقہ پڑتا ہے۔ لہٰذا معاشرت میں لطف وحسن پیدا کرنے کے لیے ضروری ہے کہ پڑوسیوں کے ساتھ تعلقات کو بہتر سے بہتر بنایا جائے۔

چناں چہ قرآن مجید میں متعدد مقامات پر پڑوسیوں کے ساتھ حسن سلوک کی تعلیم دی گئی ہے۔ ان مقامات پر حکم دیا گیا ہے کہ پڑوسیوں کے ساتھ احسان کرو اور لفظ احسان میں ہر بھلائی وخوبی نظر آجاتی ہے۔

اور احادیث میں تو اس سلسلہ میں نہایت سخت تاکیدی احکامات آئے ہیں۔ ایک حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ حضرت جبرئیل علیہ السلام مجھے پڑوسیوں کے بارے میں برابر وصیت ونصیحت فرماتے رہے حتیٰ کہ میں نے یہ خیال کیا کہ شاید پڑوسی کو پڑوسی کا وارث قرار دیا جائے گا۔ (۱)

ایک اور حدیث میں فرمایا کہ جو شخص اللہ پر اور قیامت کے دن پر ایمان رکھتا ہے اس کو چاہئے کہ وہ اپنے پڑوسی کے ساتھ اچھا سلوک کرے۔ اور دوسری روایت میں یہ الفاظ ہیں کہ جو اللہ پر اور قیامت کے دن پر ایمان رکھتا ہے وہ اپنے پڑوسی کو تکلیف نہ پہنچائے۔ (۲)

ایک حدیث میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ خدا کی قسم وہ مومن نہیں، خدا کی قسم وہ مومن نہیں۔ آپ سے پوچھا گیا کہ کون یا رسول اللہ؟ فرمایا کہ وہ جس کی ایذاؤں اور تکلیفوں سے اس کا پڑوسی محفوظ نہیں ہے۔ (۳)

---

(۱) الادب المفرد:۲۸، مسلم:۱/۳۲۹، بخاری:۲/۸۸۹

(۲) بخاری:۲/۸۸۹، مسلم:۱/۵۰

(۳) بخاری:۲/۸۸۹

پڑوسی کی خبر گیری ومدد کا حکم

اسی طرح آپ نے پڑوسی کی خبر گیری کرنے اوراس کا تعاون کرنے کا حکم دیا ہے۔حدیث میں آتا ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ وہ مومن (کامل)نہیں ہوسکتا جوخود پیٹ بھر کر کھائے اوراس کا پڑوسی بھوکا ہو۔ (۱)

مطلب یہ ہے کہ پڑوسی کی خبر گیری کرنا چاہئے اوراگر وہ بھوکا ہوتو اپنے کھانے میں سے اس کو بھی دینا چاہئے ،اگرکوئی ایسانہیں کرتا اور خود سیراب ہوتا ہے تو فرمایا کہ وہ کامل ایمان والانہیں ہوسکتا۔اسی لیے آپ نے صحابہ کوتعلیم دی ہے کہ اپنے سالن میں ذراپانی زیادہ کرواوراپنے پڑوسیوں کواس میں سے حصہ دو۔ (۲)

حضرت نافع راوی ہیں کہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ ہم پر ایک ایسا زمانہ گذرا ہے کہ اس میں درہم ودینار کا اپنے مسلمان بھائی سے زیادہ کوئی مستحق وحق دارنہیں سمجھا جاتا تھا۔پھراب یہ حال ہے کہ ہم کودرہم ودینار اپنے مسلمان بھائی سے زیادہ محبوب ہوگئے ہیں۔میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ بہت سے پڑوسی قیامت کے دن لوگوں کے دامن پکڑے ہوئے اللہ سے شکایت کریں گے کہ اے اللہ! یہ وہ ہے جس نے اپنا دروازہ مجھ پر بند کردیا تھا،اور بھلائی سے مجھ کوروک دیا تھا۔ (۳)

ان تمام احادیث سے واضح ہوا کہ پڑوسیوں کے ساتھ حسن معاشرت کا تاکیدی حکم شریعت نے دیا ہے کہ ان سے سلوک اچھا ہو،ایذ اوتکلیف نہ پہنچائی جائے ان کی

---

(۱) الادب المفرد:۲۹

(۲) بخاری،ریاض الصالحین:۱۴۵

(۳) الادب المفرد:۲۹

خبر گیری کی جائے، اپنے کھانے میں سے ان کا بھی حصہ نکالا جائے، ضرورت پر اپنا دروازہ ان کے لیے بند نہ کرے۔

اپنی طرف بھی دیکھئے

غور کیجئے کہ یہ حسنِ معاشرت کے قیام کے لیے کس قدر اہم وضروری اصول و احکام ہیں؟ مگر کیا آج مسلمان ان کے دسویں حصہ پر بھی عامل ہے؟ اس کا جواب نفی ہی میں دینا ہوگا۔ اسی لیے آج کوئی پڑوسی کسی پڑوسی سے خوش نہیں ہے؛ بل کہ شا کی ونالاں ہے، اس کو راحت وخوشی دینا تو دور کی بات ہے، آج ہم پڑوسی کو ہر طرح دکھ پہنچانے پر تلے ہوئے ہیں اور جب سے ریڈیو، ٹی وی، ویڈیو کا زور چلا ہے، اس وقت سے تو پڑوسیوں کو راحت ملنا دشوار ہو گیا ہے کہ زور زور سے گانے بجانے کی آوازیں ان کی نیند وچین، راحت وآرام کو ختم کر چکی ہیں؛ مگر کوئی احساس نہیں ہے۔ اسی طرح ایک پڑوسی دوسرے کے گھر کے پاس گندگی اور کوڑا کرکٹ ڈال جاتا ہے، جس سے پڑوسی کو تکلیف ہوتی ہے؛ مگر اس کا احساس تک نہیں ہے؛ بل کہ مزید حیرت کی بات یہ ہے کہ بعض لوگ دوسروں کو تکلیف بھی دیتے ہیں اور اگر وہ آدمی اس سے کہہ دے کہ اس بات سے ہم کو تکلیف ہوتی ہے تو اس پر شرمندہ ہونے اور معافی مانگنے کے بہ جائے جھگڑنے لگتے ہیں۔

دورِ رسالت کا ایک واقعہ

ایسے لوگوں کا ایک عجیب علاج حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے تجویز فرمایا ہے۔ وہ یہ کہ ایک شخص آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ میرے پڑوسی سے مجھے بڑی تکلیف ہوتی ہے، پہلے آپ نے صبر کی

تلقین کی؛ مگر جب وہ پھر شکایت لے کر آئے، تو فرمایا کہ اپنے گھر کا سامان باہر روڈ پر ڈال کر وہاں بیٹھ جاؤ۔ چناں چہ انھوں نے ایسا ہی کیا تو آنے جانے والے پوچھنے لگے کہ کیا بات ہے؟ تو انھوں نے لوگوں سے بتایا کہ میرا پڑوسی مجھے تکلیف دیتا ہے، میں نے اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے شکایت کی تو آپ نے مجھے اس طرح کرنے کا حکم دیا، یہ بات سن کر لوگ اس پڑوسی پر لعنت کرنے لگے اور یہ بات اس کو پہنچی کہ میری اس طرح رسوائی ہوگئی تو آ کر اس سے اس نے معافی مانگی اور مکان پر لے گیا اور وعدہ کیا کہ پھر ایسا نہ کروں گا۔ (۱)

میں کہتا ہوں کہ یہ شرافت بھی اس دور کا خاصہ ہے الا ماشاء اللہ، ورنہ آج لوگ اس طرح کرنے سے بھی باز تو کیا آتے، ہوسکتا ہے کہ الٹا اس کو رسوا کرنے کی کوشش کریں۔ غرض پڑوسی سے حسن معاشرت کے لیے یہ ضروری ہے کہ اس کے حقوق ادا کیے جائیں اور اس سے اچھا سلوک کریں۔

پڑوسی کی ایذا پر صبر اور ایک عجیب واقعہ

یہ تصویر کا ایک رخ ہے، دوسرا رخ یہ ہے کہ اگر ہمارے کسی پڑوسی سے ہم کو تکلیف ہو تو صبر سے کام لیں۔ اس پر ایک واقعہ عرض کرتا ہوں جس کو علامہ ذہبی رحمہ اللہ نے اپنی کتاب ''الکبائر'' میں درج کیا ہے، وہ یہ ہے کہ حضرت سہل بن عبد اللہ تستری رحمہ اللہ کا ایک غیر مسلم پڑوسی تھا، اور اس کے گھر کے بیت الخلا سے ایک سوراخ ہو کر حضرت تستری رحمہ اللہ کے گھر میں نجاست آ کر گرتی۔ حضرت نے اس جگہ ایک برتن رکھ دیا، دن بھر اس میں نجاست جمع ہوتی اور رات کو آپ لے جا کر کسی دور جگہ ڈال آتے۔ یہ سلسلہ برس ہا برس جاری رہا، جب آپ کے انتقال کا وقت قریب

(۱) الادب المفرد:۳۲، ابو داود:۲/۷۰۱

آنے لگا تو آپ نے اس پڑوسی کو بلایا اور فرمایا کہ اس کمرہ میں جا کر دیکھو کیا ہے؟ اس نے دیکھا کہ برتن ہے۔ اور اس میں نجاست گر رہی ہے۔ آپ نے اس سے فرمایا کہ ایک طویل عرصہ سے تیرے گھر سے اس طرح نجاست گرتی ہے اور میں دن میں جمع کر کے رات کو دور جگہ ڈال آتا تھا۔ مگر اب اس لیے بتانا پڑا کہ میری موت قریب ہے اور شاید اس جگہ آنے والا دوسرا پڑوسی ایسے اخلاق نہ برت سکے۔ یہ سن کر اس نے کہا کہ اے شیخ آپ تو ہمارے ساتھ ایسا معاملہ فرمائیں اور میں کفر پر رہوں۔ آپ اپنا ہاتھ دیجئے کہ میں مسلمان ہوتا ہوں یہ کہہ کر وہ مسلمان ہو گیا۔ (۱)

حسنِ معاشرت کے چند عام اصول

حسن معاشرت کے قائم کرنے کے لیے جہاں حقوق وفرائض کی تعلیم دی گئی ہے، وہیں آداب واصول کی تلقین بھی فرمائی گئی ہے۔ عام طور پر ان میں بھی ہم سے بڑی کوتاہی ہوتی ہے اور ان میں کوتاہی سے معاشرتی زندگی کا لطف ولذت ختم ہو جاتی ہے اور ایک دوسرے کو شکایت پیدا ہو جاتی ہے اور کبھی اختلافات اور نزاعات چل پڑتے ہیں، اسلام مسلمانوں کو جس انداز کی معاشرتی زندگی سکھاتا ہے اس میں کسی کو کسی سے کوئی بے لطفی پیدا ہو ہی نہیں سکتی۔

مسلمان کی تعریف

یہی بات ہے جس کی بنیاد پر اللہ کے رسول صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے مسلمان کی تعریف میں فرمایا کہ مسلمان وہ ہے جس کے ہاتھ اور زبان سے دوسرے مسلمان محفوظ رہیں۔ (۲)

---

(۱) الکبائر: ۲۰۹-۲۰۸
(۲) بخاری: ۶/۱

مگر یاد رکھئے کہ اس حدیث میں جو یہ فرمایا کہ مسلمان وہ ہے جس کی زبان اور ہاتھ سے دوسرے مسلمان محفوظ رہیں تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ مسلمان سے کفار کو تکلیف پہنچ سکتی ہے، یہ مطلب ہرگز نہیں۔ میرے شیخ حضرت اقدس مولانا شاہ ابرارالحق صاحب دامت برکاتہم نے فرمایا کہ مسلمان کے محفوظ رہنے کا ذکر اس لیے فرمایا گیا کہ مسلمان کا میل جول اور اس کے تعلقات زیادہ تر مسلمان ہی سے ہوتے ہیں۔ جب مسلمان قریب رہتے ہوئے اور قریبی تعلقات کے ہوتے ہوئے بھی اس کی ایذا و تکلیف سے محفوظ رہتے ہیں، تو کفار جو دور رہتے ہیں اور جن سے تعلقات زیادہ نہیں ہوتے وہ تو بہ درجہ اولیٰ محفوظ رہیں گے۔ اسی طرح ہاتھ اور زبان کی قید اس لیے لگائی گئی کہ عام طور پر زبان سے اور ہاتھ سے ہی تکلیف پہنچتی ہے۔ لات کا نمبر تو اس کے بعد ہی آتا ہے، جب زبان اور ہاتھ ہی سے وہ تکلیف نہیں دیتا تو لات کیا مارے گا؟ تو خلاصہ یہ کہ مسلمان نہ مسلمان کو ایذا دیتا ہے اور نہ کافر کو، اور نہ زبان و ہاتھ سے دیتا ہے اور نہ کسی اور چیز سے۔ یہ ہے مسلمان کی تعریف کہ وہ ایسی معاشرت قائم کرتا ہے کہ کسی کو کوئی ایذا و تکلیف نہیں پہنچ سکتی؛ مگر یہ اسی وقت ممکن ہے جب کہ ان آداب معاشرت واصول معاشرت کو اپنایا جائے، جن کی تعلیم دی گئی ہے۔ میں یہاں چند امور کی طرف اشارہ کروں گا۔

کسی کے گھر بے موقعہ بیٹھے رہنا

حدیث میں ہے کہ جب اللہ کے رسول صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کا حضرت زینب بنت جحش رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہَا سے نکاح ہوا اور آپ نے ولیمہ کیا تو لوگ آتے رہے اور کھا کر جاتے رہے آخر میں تین آدمی کھانا کھا کر بھی بیٹھے رہے اور باتوں میں مشغول و منہمک ہو گئے۔ رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کو یہ بات ناگوار اور شاق گذری؛ مگر آپ نہایت حیادار

انسان تھے آپ نے ان سے کچھ نہیں فرمایا؛ بل کہ خود ایک دم سے کھڑے ہوئے اور باہر تشریف لے گئے تاکہ یہ لوگ بھی اٹھ کر چلے جائیں؛ مگر وہ لوگ پھر بھی وہیں بیٹھے رہے۔ آپ وہاں سے اٹھ کر حضرت عائشہ اور دیگر ازواج مطہرات رضی اللہ تعالیٰ عنہن کے حجروں کو ایک نظر دیکھ آئے تو وہ لوگ اب بھی وہیں تھے، آپ پھر باہر آ گئے اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے حجرے کی طرف گئے، تو کسی نے خبر دی کہ وہ لوگ چلے گئے۔ چناں چہ آپ حضرت زینب رضی اللہ عنہا کے حجرے میں تشریف لے گئے، اسی وقت آپ پر وحی نازل ہوئی، اس میں اور باتوں کے ساتھ یہ بھی فرمایا گیا کہ جب تم کو دعوت دی جائے تو گھر میں داخل ہو اور جب کھانا کھا چکو تو منتشر ہو جاؤ۔ یعنی باہر نکل آؤ، اور وہاں جی لگا کر باتوں میں نہ بیٹھ جاؤ۔ یہ بات اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی تکلیف کا باعث ہے۔ (۱)

اس میں معاشرت کا ایک اہم اصول اور ادب بیان کیا گیا ہے کہ جب کسی جگہ کسی وجہ سے جائیں تو وہ کام ہوتے ہی وہاں سے چلا آنا چاہیے، یہ نہیں کہ وہیں باتوں میں بیٹھے رہیں، اس سے گھر کے لوگوں کو یا جہاں گئے ہیں ان لوگوں کو تکلیف ہوگی، ہر آدمی کو اپنی ضرورت و حاجت ہوتی ہے، اب یا تو وہ بے حیا بن کر روک ٹوک کرے یا نہیں تو کلفت میں مبتلا رہے، اس لیے اسلام نے تعلیم دی کہ کسی جگہ بے وجہ بیٹھا نہیں رہنا چاہیے۔

راستوں اور دروازوں پر بیٹھنا

معاشرتی آداب میں سے ایک یہ بھی ہے کہ راستوں پر اور عام جگہوں پر بیٹھنا نہیں چاہیے، کیوں کہ اس سے لوگوں کو تکلیف ہوتی ہے۔ بعض لوگ راستوں میں یا گھروں کے

(۱) تفسیر ابن کثیر: ۳/۵۲۰

دروازوں پر بیٹھ کر یا کھڑے ہوکر باتیں کرتے ہیں یہ طریقہ صحیح نہیں ہے۔ حدیث میں ہے کہ اللہ رسول صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے راستوں پر بلا وجہ بیٹھنے سے منع کیا ہے۔ (۱)

ہاں! کوئی خاص ضرورت پیش آجائے تو راستہ پر بیٹھ سکتے ہیں؛ مگر اسلام نے اس صورت میں بھی چند آداب کی تعلیم دی ہے۔ ایسے موقعہ پر ان آداب کے ساتھ راستہ پر بیٹھنے کی اجازت ہے۔ چناں چہ حدیث میں ہے کہ جب اللہ کے رسول صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے راستہ پر بیٹھنے سے منع کیا تو صحابہ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! ہم تو راستہ پر بیٹھنے کے لیے مجبور ہیں، کیوں کہ ہم وہاں بیٹھ کر تمام ضروری امور پر بحث و تکرار کرتے ہیں تو آپ عَلَیْہِ السَّلَام نے فرمایا کہ اگر تم مجبور ہو تو راستہ کا حق ادا کرو۔ (۲)

راستہ پر بیٹھنے کا حق وادب

اس پر حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم نے پوچھا کہ راستہ کا کیا حق ہے؟ حضرت نبی کریم صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے چند چیزوں کا ذکر فرمایا کہ یہ چیزیں راستہ کا حق وادب ہیں۔

(۱) پہلی چیز آپ نے یہ بیان فرمائی کہ آنکھوں کا بند رکھنا یعنی حرام وغیر محرم پر نظر نہ ڈالنا اور نظروں کو نیچی رکھنا۔ اسی طرح اس میں یہ بھی داخل ہے کہ بلا وجہ کسی کو نہ دیکھے، کیوں کہ بسا اوقات ایک مرد بھی بلا وجہ دوسرے مرد کو دیکھتا ہے تو اس کو تکلیف ہوتی ہے، اسی طرح گھروں میں نظر نہ پڑے اس طرح راستہ پر بیٹھے۔

(۲) دوسری چیز یہ فرمائی کہ کسی کو اذیت و تکلیف نہ پہنچانا۔ مثلاً راستہ میں ایسی جگہ بیٹھنا جس سے لوگوں کو چلنے پھرنے میں تکلیف ہوتی ہو، یہ راستہ کے ادب وحق

---

(۱) مشکوٰۃ:۳۹۸

(۲) بخاری:۲۲۸۵، مسلم:۳۹۶، ابو داود:۴۱۸۱

کے خلاف ہے، اسی طرح راستہ میں یا لوگوں کے گھر کے پاس بیٹھ کر باتیں کرنا، جس سے دوسروں کے آرام میں خلل پڑتا ہو، تو یہ بھی ادب کے خلاف ہے، بعض لوگوں کی عادت ہے کہ کسی کے گھر کی سیڑھیوں پر یا چبوترے پر بیٹھے زور زور سے مذاق وتفریح کرتے یا باتیں کرتے رہتے ہیں، جس سے گھر والوں کو تکلیف ہوتی ہے، اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے منع فرمایا ہے۔

(۳) تیسرا ادب یہ بتایا کہ آنے جانے والوں کے سلام کا جواب دیا جائے، یہ راستہ کا حق ہے۔ اب تو لوگوں میں سلام کا رواج ہی ختم ہو رہا ہے، راستہ میں بیٹھنے والوں کو سلام کا جواب دینے کی تعلیم دی جا رہی ہے۔ یہاں ایک بات یاد آ گئی کہ اب لوگ سلام سے مراد ہاتھ اٹھانا لیتے ہیں، حالاں کہ سلام تو زبان سے " **السلام علیکم**" کہہ کر ہوتا ہے اور اس کے بہ جائے ہاتھ سے یا انگلی سے اشارہ کر کے سلام کرنے سے بھی منع فرمایا گیا ہے۔ چناں چہ ترمذی میں حدیث ہے کہ اللہ کے رسول علیہ السلام نے فرمایا کہ تم نہ تو یہود کے جیسے بنو اور نہ عیسائی جیسے بنو۔ یہودی انگلیوں کے اشارے سے سلام کرتے ہیں اور عیسائی ہتھیلی کے اشارے سے سلام کرتے ہیں۔ (۱)

مگر افسوس کہ اب اسی کو مسلمانوں نے اختیار کر لیا ہے۔ اور جب تک دوسرا آدمی ہاتھ نہ اٹھائے تب تک لوگ اس کو سلام ہی نہیں سمجھتے اور اس سے یہ بدگمانی بھی قائم کر لی جاتی ہے کہ فلاں شخص سلام نہیں کرتا، حالاں کہ وہ زبان سے کہتا ہے؛ مگر یہ اس کو سلام سمجھتے ہی نہیں، کیوں کہ اس نے ہاتھ نہیں اٹھایا۔ غرض زبان سے السلام علیکم کہنا چاہئے نہ کہ ہاتھ کے اشارہ سے سلام پیش کرے۔ غرض راستہ میں بیٹھنا ہو کسی ضرورت و مجبوری سے تو سلام کرنے والوں کے سلام کا جواب دینا چاہئے۔

---

(۱) ترمذی: ۹۹/۲

(۴) چوتھی بات یہ فرمائی کہ بھلائی کی باتوں کا لوگوں کو حکم دیا جائے اور برائی سے روکا جائے، جو لوگ کسی ضرورت سے راستہ میں بیٹھیں ان کی اہم ترین ذمے داری یہ بھی ہے کہ امر بالمعروف ونہی عن المنکر کریں۔(۱)

اب غور کریں کہ آج راستہ پر بیٹھ کر لوگوں کو کتنی تکلیف پہنچائی جاتی ہے، پھر خود منکر میں مبتلا لوگ سڑکوں پر واہی تباہی میں مشغول ہوں تو وہ دوسروں کو کیا اچھی تعلیم دیں گے اور کیوں برائی سے روکیں گے؟ غرض راستوں پر فضول مجلس آرائی سخت ناپسندیدہ ہے۔

گھر میں داخل ہونے کی اجازت

ان ہی آداب میں سے ایک اہم ادب اسلام نے یہ تعلیم دیا ہے کہ کسی کے گھر جانا ہو تو پہلے داخلہ کی اجازت لو۔ جب اجازت مل جائے تب اندر آؤ۔ یہ حکم قرآن پاک میں بھی موجود ہے اور حدیث میں بھی موجود ہے۔ کسی کے گھر میں؛ بل کہ خود اپنے گھر میں بلا اجازت، بے دھڑک داخل ہو جانا، ادب کے خلاف ہے۔

ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کے پاس ایک شخص آئے اور سوال کیا کہ کیا جب میں اپنی والدہ کے پاس جاؤں تو اجازت طلب کروں؟ آپ نے فرمایا کہ ہاں۔ اس نے کہا کہ میں ماں کے ساتھ اسی گھر میں رہتا ہوں۔ آپ عَلَیْہِ السَّلَام نے فرمایا کہ ہاں تب بھی اجازت لو۔ اس آدمی نے کہا کہ میں تو ان کا خدمت گذار ہوں (اس لیے بار بار آنا جانا پڑتا ہے تو کیا پھر بھی اجازت لینا ضروری ہے؟) آپ نے فرمایا کہ ہاں اجازت لو۔ بتاؤ کیا تم پسند کرتے ہو کہ تم ماں کو عریاں دیکھو (یعنی اگر کبھی وہ کسی ضرورت سے برہنہ ہوئیں اور تم بلا اجازت چلے گئے تو کیا

(۱) مشکوۃ:۳۹۸

ہوگا) لہٰذا اجازت لینا چاہیے۔(۱)

اور ایک صاحب نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے جب بہن کے پاس (جو انہی کے گھر میں رہتی تھیں) داخلہ کے لیے اجازت کے بارے میں سوال کیا تو یہی جواب دیا۔(۲)

جب اپنے گھر میں اپنے لوگوں کے پاس جانے کے لیے ضرورت ہے کہ اجازت لی جائے تو دوسرے کے گھر میں جانے کے لیے تو اور زیادہ ضرورت ہے۔ حدیث سے پتہ چلتا ہے کہ بغیر اجازت اگر کوئی آجائے، داخل ہو جائے تو اللہ کے رسول علیہ السلام اس کو واپس جا کر اجازت لے کر آنے کے لیے فرماتے تھے۔ چناں چہ کلدہ بن حنبل فرماتے ہیں کہ ایک دفعہ اللہ کے نبی کی خدمت میں صفوان بن امیہ کے دیئے ہوئے تحائف لے کر گیا اور بغیر سلام و اجازت کے داخل ہو گیا تو آپ نے فرمایا کہ واپس جا اور سلام کر اور اجازت لے۔(۳)

غرض یہ کہ کسی کے گھر میں بلا اجازت نہ جانا چاہیے، یہ اصول معاشرت کے خلاف ہے، اس لیے اجازت لے کر جانا چاہیے۔

دو آدمیوں کے درمیان نہ گھسو

اسی سلسلہ کی ایک بات یہ بھی ہے کہ اگر دو آدمیوں کے درمیان بات چیت ہو رہی ہے تو حکم ہے کہ ان کے درمیان نہ جاؤ، ہاں وہ اجازت دے دیں تو درست ہے۔ چناں چہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ اور عمرو بن شعیب کے دادا سے روایت ہے کہ نبی

(۱) مؤطا امام مالک:۳۸۰
(۲) الادب المفرد:۲۱۲
(۳) ترمذی:۲/۱۰۰، ابو داود:۲/۷۰۳

کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ دو بیٹھے ہوئے آدمیوں کے درمیان جا کر نہ بیٹھو، جب تک کہ ان سے اجازت نہ لے لو۔ (۱)

اس کی وجہ یہ ہے کہ ہوسکتا ہے کہ ان دونوں کے درمیان کوئی ایسی گفتگو ہو رہی ہو جو وہ دوسروں سے پوشیدہ رکھنا چاہتے ہوں، اب یہ بلا اجازت جائے گا تو ان کو ناگوار ہوگا، یا یہ اس بات پر مطلع ہو جائے گا، اس سے نتیجہ یہ نکلا کہ کسی کی باتوں پر مطلع ہونا جو وہ بتانا نہ چاہتے ہوں، یا ایسی جگہ جانا جہاں کے لوگ اس وقت اس کو ناگوار سمجھیں، درست نہیں۔

حضرت تھانوی رحمہ اللہ کا ایک واقعہ

لہٰذا چوری سے کسی کی بات سننا کسی طرح جائز نہیں۔ بعض لوگ دوسروں کی باتیں چھپ کر سن لیتے ہیں، بعض لوگ دوسروں کا خط بلا اجازت پڑھ لیتے ہیں، یہ جائز نہیں۔ یاد آیا کہ حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی رحمہ اللہ جب آخری زمانہ میں آنکھوں سے معذور ہو گئے تو ان دنوں جب حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ آپ کی خدمت میں حاضر ہوتے تو وہاں پہونچ کر بلا اطلاع کبھی نہیں بیٹھتے تھے: بل کہ جاتے ہی کہہ دیتے کہ ''اشرف علی حاضر ہوا ہے'' اور جب واپس ہونا چاہتے تو فرماتے کہ ''اشرف علی جا رہا ہے'' اور اس کی وجہ خود بیان فرماتے ہیں کہ یہ اس لیے کرتا تھا کہ حضرت گنگوہی رحمہ اللہ کو کوئی ایسی بات کرنی ہو جو وہ مجھ سے چھپانا چاہتے ہیں تو وہ اس وقت بیان نہ کریں، کیوں کہ حضرت کی آنکھیں نہیں تھیں، نظر نہیں آتا تھا، جا کر اگر کوئی بیٹھ جائے تو پتہ نہ چلتا، اس لیے کہہ دیتا کہ اشرف علی حاضر ہے؛ مگر افسوس کہ آج بعض لوگ دوسروں کی ٹوہ میں لگے رہتے ہیں اور ان کی باتیں سنتے ہیں، یہ

---

(۱) ترمذی: ۲/۱۰۴، ابوداود: ۲/۶۶۵

جائز نہیں ہے۔

غرض یہ کہ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے دو آدمیوں کے درمیان گھسنے سے منع فرمایا جب کہ ان کی اجازت نہ ہو۔

کسی کے گھر میں جھانک تاک کرنا

حسن معاشرت کی ان جزئیات میں سے ایک یہ بھی ہے کہ کسی کے گھر میں بلا اجازت و بلا اطلاع تاک جھانک کرنا بھی جائز نہیں ہے۔

چناں چہ حدیث میں ہے کہ ایک شخص نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے حجرہ میں سوراخ سے یا دروازہ سے جھانک رہا تھا، آپ نے اس کو دیکھا تو فرمایا کہ اگر مجھے معلوم ہوتا کہ تو مجھے جھانک رہا ہے تو میں اس کنگھی سے (اس وقت آپ کے ہاتھ میں کنگھی تھی) تیری آنکھ میں مارتا۔(۱)

الغرض! اسلام چاہتا ہے کہ زندگی حسن ولطف سے گذاریں۔ یہ چند اصول و احکام پیش کیے گئے ہیں۔ (واللہ ھو الموفق)

(۱) الادب المفرد:۲/۵۹۹

ضمیمہ

رشتہ داروں سے حسن سلوک

یہ بات ہر اس شخص پر آشکارا ہے جو اسلامی تعلیمات سے تھوڑی بہت بھی واقفیت رکھتا ہے کہ اسلام ایک طرف اللہ کی عبادت و اطاعت، اس کی طرف رجوع و انابت، اس پر اعتماد و توکل، اور ہر کام میں اخلاص و للّٰہیت کی دعوت دیتا ہے، تو دوسری طرف مخلوق کی خدمت، اس پر شفقت، اس سے ہم دردی و غم خواری، اور اس کے ساتھ حسن سلوک کی بھی تعلیم دیتا ہے، اسی مخلوق کے ساتھ حسن سلوک میں اپنے رشتہ داروں کے ساتھ حسن سلوک ان سے محبت و پیار، ان کی خدمت بھی داخل ہے اور اسی کو صلہ رحمی کہا جاتا ہے۔

اس موضوع کی آج کل سخت ترین ضرورت ہے، کیوں کہ آج لوگوں میں رشتے داری کا کوئی مقام و اہمیت ہی باقی نہیں رہی، معمولی معمولی باتوں پر رشتہ توڑ لیتے ہیں، حتیٰ کہ ایک دوسرے رشتے دار کا جانی دشمن بن جاتا ہے۔ بعض لوگ ایک دوسرے کے گھر نہیں جاتے، ایک دوسرے سے بات نہیں کرتے، ایک دوسرے کا چہرہ دیکھنا نہیں چاہتے، یہ باتیں آج بہت عام ہوگئی ہیں۔ حتیٰ کہ ان چیزوں کو لوگ کوئی گناہ کا کام نہیں سمجھتے؛ بل کہ بعض لوگ فخر سے کہتے ہیں کہ میں نے اس کو یوں کر دیا اور یوں کہہ دیا، اس لیے ضرورت معلوم ہوئی کہ اس موضوع پر گفتگو کی جائے۔

صلہ رحمی کی اہمیت

اسلام میں صلہ رحمی یعنی رشتے داری کو جوڑے رکھنے کی بڑی اہمیت اور تاکید

ہے۔اور اس میں کوتاہی کرنے پر سخت وعید بھی آئی ہے،اور اس کی اہمیت کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ قرآن مجید میں اپنے ساتھ رشتہ داری کے حقوق کا بھی ذکر کیا ہے۔

چناں چہ فرمایا:

﴿ وَاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِیْ تَسَآءَ لُوْنَ بِه وَالْاَرْحَامَ ﴾ (سُوْرَۃُ النِّسَآءِ)

(یعنی اللہ سے ڈرو جس کے نام سے تم سوال کرتے ہو اور رشتہ داریوں سے ڈرو)

اس میں اللہ سے ڈرنے کا حکم دینے کے ساتھ، رشتے داری سے ڈرنے کا بھی حکم دیا گیا ہے۔ رشتے داری سے ڈرنا کیا ہے؟ یہ نہیں کہ رشتے داروں سے ڈر کر ان کے پاس ہی نہ جائے، بعض لوگ اس قسم کے جملوں سے ایسے غلط مطلب نکال لیتے ہیں، یہ لفظوں کے چکّر میں پڑنے کا نتیجہ ہے، جو لوگ لفظوں کے چکر میں پڑ جاتے ہیں اور محاورہ سے واقف نہیں ہوتے، وہ بڑی گڑ بڑ کرتے ہیں۔ جیسے ایک شخص کا واقعہ ہے:

ایک مزاحیہ حکایت

ایک مرتبہ ایک شخص جا رہا تھا، راستہ میں ایک جگہ اس کے دوست کو اس کا دشمن پیٹ رہا تھا، یہ شخص دوڑ کر دوست کے پاس گیا، دوست بہت خوش ہوا کہ اس پریشانی و درماندگی میں دوست مل گیا، کچھ ساتھ دے گا اور میرے دشمن کو مار بھگائے گا؛ مگر یہ شخص دوست کے پاس جا کر دوست کے دونوں ہاتھ مضبوطی سے پکڑ لیا کہ وہ حرکت بھی نہ کر سکے، اب دشمن کو اور اچھا موقع ہاتھ آیا کہ مزاحمت کے بغیر مار سکتا ہے، چناں چہ خوب مار کر چلا گیا، دشمن کے جانے کے بعد اس نے دوست کا ہاتھ چھوڑا، تو دوست نے غصہ ہو کر کہا کہ تم بھی عجیب دوست ہو کہ میرے ہاتھ پکڑ کر تم نے دشمن کو موقع فراہم کیا کہ مجھے اچھی طرح مارے، کیا یہی دوستی کا حق ہے جو تم نے ادا کیا ہے؟ اس پر وہ

شخص کہنے لگا کہ شیخ سعدی رحمۃ اللہ نے ایسا ہی کرنے کو لکھا ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ

دوست آن باشد کہ گیرد دست دوست ☆☆ در پریشان حالی و درماندگی

(کہ دوست وہ ہے جو پریشان حالی میں دوست کا ہاتھ پکڑ لیتا ہے)

اس لیے میں نے بھی آپ کے ہاتھ پکڑ لیے۔ اگر اس کو پتہ ہوتا کہ محاورہ میں ہاتھ پکڑنے کا کیا مطلب ہوتا ہے تو وہ ایسی غلطی نہ کرتا۔

غرض اس آیت میں بھی کوئی یہ مطلب نہ لے لے کہ رشتے داری سے ڈرو، یعنی اس کے قریب بھی نہ جاؤ؛ بل کہ مطلب یہ ہے کہ جس طرح اللہ سے ڈر کر اس کے حق ادا کرتے ہیں، اسی طرح رشتے داری کے حقوق بھی ادا کرو، اور رشتے داری کے حقوق کو ادا کرنے کا نام ہی صلہ رحمی ہے، اس لیے حضرت ابن عباس، مجاہد، عکرمہ وغیرہ حضرات نے اس کی تفسیر میں یہی فرمایا کہ مراد یہ کہ صلہ رحمی کرو۔(۱)

چناں چہ ایک دوسری آیت میں صاف آیا ہے:

﴿ وَآتِ ذَالْقُرْبىٰ حَقَّهٗ ﴾

(رشتہ دار کو اس کا حق ادا کرو)

اس سے اسلام میں صلہ رحمی کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے۔

صلہ رحمی کی فضیلت

پھر اسلام نے اس عمل کی فضیلت بھی بیان فرمائی تاکہ لوگ اس اہم کام کی طرف رغبت کریں، اس سلسلہ میں بہت سی احادیث وارد ہوئی ہیں، اور اس عمل کے متعدد فضائل ان میں بیان فرمائے گئے ہیں۔ بعض فضائل آخرت سے متعلق ہیں اور بعض فضائل دنیا کے بارے میں ہیں۔

---

(۱) ابن کثیر:۱/۴۴۸

اخروی فوائد وفضائل

ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے فرمایا کہ رشتہ داری، رحمان کی ایک شاخ ہے (یعنی اللہ کی رحمت کی ایک شاخ ہے) جو اس کو جوڑے گا اللہ تعالیٰ اس کو جوڑیں گے اور جو اس کو توڑے گا اللہ تعالیٰ اس کو توڑیں گے۔ (۱)

غور فرمایئے کہ اس حدیث میں رشتے داری کو جوڑنے کی کتنی بڑی فضیلت بیان فرمائی ہے کہ اللہ اس کو جوڑے گا۔ اور اللہ کے جوڑنے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اس سے اپنے تعلق کو قائم فرمائے گا۔ جس کا تعلق اللہ سے ہو جائے۔ اس کی عظمت کا کیا ٹھکانہ ہے؟ لوگ بڑے لوگوں سے تعلق ہو جائے تو پھولے نہیں سماتے اور اس کے لیے ان کو بڑے پاپڑ بیلنے پڑتے ہیں، اور یہاں دیکھئے کتنا آسانی سے اللہ سے تعلق قائم ہو سکتا ہے؛ مگر پھر بھی ہم غافل ہیں۔

ایک اور حدیث میں ہے کہ ایک شخص رسول صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ اے اللہ کے رسول! مجھے ایسا عمل بتا دیجئے جو مجھے جنت میں پہنچا دے، آپ نے فرمایا کہ اللہ کی عبادت کر اس کے ساتھ شرک نہ کر، نماز قائم کر، زکوۃ ادا کر، اور صلہ رحمی کر۔ (۲)

اس حدیث میں جنت میں لے جانے والے اعمال میں اللہ کے نبی عَلَیْہِ السَّلَام نے صلہ رحمی کا بھی ذکر فرمایا ہے، معلوم ہوا کہ رشتہ داری قائم رکھنا جنت کا عمل ہے۔

حضرات! ذرا سوچئے کہ کیا ہم کو جنت میں نہیں جانا ہے؟ پھر اس عمل سے غفلت کیوں؟

---

(۱) الادب المفرد:۱۸۰

(۲) بخاری:۲/۴۴۸

دنیوی فوائد وفضائل

یہ تو اُخروی فوائد وفضائل تھے۔ اب لیجئے اس عمل کے دنیوی فضائل اگر ہم کو آخرت محبوب نہیں تو کم از کم دنیوی فوائد ہی کے لیے اس عمل کو کر کے دیکھ لیجئے، ویسے مومن کے نزدیک اصل چیز آخرت ہی ہے، دنیا میں کوئی فائدہ ملے یا نہ ملے، وہ تو آخرت کا فائدہ دیکھتا ہے، مگر اسلام کی تعلیمات ایسی ہیں، جن میں آخرت کا فائدہ تو ہے ہی دنیا کا بھی فائدہ ہے۔ سنئے، اللہ کے نبی علیہ السلام فرماتے ہیں کہ جس کو اس بات سے خوشی ہوتی ہے کہ اس کا رزق زیادہ کر دیا جائے اور اس کی عمر لمبی کر دی جائے تو اس کو چاہئے کہ وہ صلہ رحمی کرے۔ (۱)

اس حدیث پاک میں صلہ رحمی کے دو فائدے اور بڑے بڑے فائدے ذکر فرمائے ہیں، ایک یہ رزق بڑھتا ہے، دوسرے یہ کہ عمر بڑھتی ہے دنیا میں آدمی یہی دو چیزیں چاہتا ہے کہ عمر لمبی ہو اور اس عمر میں آرام سے گذارہ ہو جائے، یہ دونوں باتیں صلہ رحمی سے حاصل ہو جاتی ہیں۔

ایک شبہ کا جواب

اس حدیث پر بظاہر یہ شبہ ہوتا ہے کہ انسان کی عمر مقرر ہے۔ پھر اس کو بڑھانے کا کیا مطلب ہے کہ مثلاً ساٹھ سال کی عمر والا ستر سال تک زندہ رہے گا۔ یا کم از کم ایک دو سال کی عمر بڑھ جائے گی؟ اس کا جواب یہ ہے کہ بعض علما کے نزدیک عمر بڑھنے سے مراد یہ ہے کہ عمر میں برکت ہوگی۔ جس سے بہت سی نیکیاں وہ کر سکے گا۔ تو عمر ساٹھ ہی رہے گی مگر کام اتنا ہوگا کہ سو سال والے بھی نہ کر سکیں۔ چناں چہ بہت سے

---

(۱) بخاری: ۲/۸۸۵، الادب المفرد: ۱۸

بزرگوں کو دیکھا گیا کہ انہوں نے اپنی عمر میں اتنا کام کیا کہ دوسرے لوگ اس سے دس گنا زیادہ عمر بھی پائیں تو نہ کر سکیں۔ اور بعض علما نے کہا کہ اللہ تعالیٰ فرشتوں کو بتاتے ہیں کہ اس کی اتنی عمر ہے۔ پھر جب وہ صلہ رحمی کرتا ہے تو فرشتوں کو بتاتے ہیں کہ اس کے عمل کی وجہ سے اتنی عمر زیادہ کر دی گئی تو عمر کی زیادتی فرشتے کے علم کے اعتبار سے ہے۔ (۱)

غرض صلہ رحمی کا فائدہ یہ ہے کہ رزق میں اور عمر میں اضافہ و برکت دی جاتی ہے۔ ایک اور حدیث میں آیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ صلہ رحمی اور عمدہ اخلاق شہروں کی آبادی، عمروں میں زیادتی کا سبب ہیں۔ (۲)

اس حدیث میں عمر کی زیادتی کے ساتھ، صلہ رحمی کا ایک اور فائدہ ذکر کیا گیا ہے وہ کیا؟ شہروں کی آبادی یعنی جب آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ صلہ رحمی اور حسن اخلاق سے پیش آئیں گے تو محبت والفت پیدا ہوگی، فساد و شر ختم ہوگا۔ آبادی بڑھے گی، ورنہ خود ہی مر کر ختم ہوتے رہیں گے۔

قطع رحمی کا وبال

اب ذرا اس پر بھی نظر ڈالیے کہ صلہ رحمی نہ کرنے اور رشتہ داری کو توڑنے پر کیا وبال آتا ہے؟ ایک حدیث اوپر گذری ہے جس میں فرمایا کہ رشتہ داری کو جو توڑتا ہے، اس کو اللہ توڑتا ہے، یعنی اپنا تعلق توڑ دیتا ہے، اس کے علاوہ یہ احادیث بھی عبرت ناک ہیں۔

---

(۱) فتح الباری: ۴۷۶/۱۰

(۲) فتح الباری: ۴۱۵/۱۰

(۱) ایک حدیث میں ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اس قوم پر اللہ کی رحمت نازل نہیں ہوتی جس میں رشتہ کو توڑنے والا ہو۔(۱)

(۲) ایک حدیث میں ہمارے نبی حضرت محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قطع رحمی اور ظلم سے بڑھ کر کوئی گناہ ایسا نہیں کہ آخرت کے عذاب کے ساتھ اللہ تعالیٰ دنیا میں بھی اس کے مرتکب کو جلدی عذاب دے دیں۔(۲)

یعنی دو گناہ ایسے ہیں کہ دنیا میں بھی ان پر جلدی عذاب میں گرفتار کر دیا جاتا ہے اور جو آخرت کے عذاب ہیں وہ الگ۔

(۳) ایک حدیث میں ہے کہ بنی آدم کے اعمال ہر جمعہ کی رات اللہ کے سامنے پیش ہوتے ہیں؛ مگر قطع رحمی کرنے والے کے اعمال قبول نہیں کیے جاتے۔(۳)

(۴) بخاری وغیرہ میں حضرت جبیر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ رشتہ توڑنے والا جنت میں داخل نہ ہوگا۔(۴)

ان احادیث پر غور کیجیے کہ دنیا و آخرت دونوں جگہ اس پر وبال بتایا گیا ہے جو رشتہ کو توڑتا ہے۔ اس جگہ ایک قصہ یاد آ گیا جو علامہ ذہبی رحمہ اللہ نے لکھا ہے:

ایک عجیب واقعہ

وہ یہ کہ ایک مال دار آدمی حج کو گیا اور اپنا مال مکہ کے ایک امانت دار شخص کے پاس امانت رکھ دیا، اور عرفہ کے وقوف وحج سے فراغت کے بعد جب اپنا مال لینے

---

(۱) الادب المفرد:۱۹

(۲) الادب المفرد:۲۰، ابو داود:۲/۶۷۲

(۳) الادب المفرد:۱۸

(۴) بخاری:۲/۸۸۵

گیا تو پتہ چلا کہ اس شخص کا انتقال ہوگیا ہے اور یہ بھی علم ہوا کہ اس کی امانت کے بارے میں اس کے رشتے داروں کو کچھ بھی علم نہیں ہے۔ بعض علما نے اس کا مسئلہ سن کر کہا کہ آدھی رات میں زمزم کے کنویں میں اس کو پکارو کہ اے فلانے ! اگر وہ جنتی ہے تو جواب دے گا، وہ گیا پکارا؛ مگر کوئی جواب نہیں ملا، علما نے مشورہ دیا کہ بیرِ برھوت (جو یمن کا ایک کنواں ہے) اس میں اس کو پکارو، اگر وہ دوزخی ہے تو وہاں سے جواب دے گا۔ اس نے جا کر پکارا تو جواب ملا اور اس کی امانت کے بارے میں اس نے بتا دیا کہ فلاں جگہ رکھی ہے۔ اس آدمی نے اس سے پوچھا کہ تم دوزخ میں کس طرح چلے گئے، جب کہ ہم تمہارے بارے میں نیک گمان رکھتے تھے؟ اس نے جواب دیا کہ میری ایک بہن تھی جس سے میں نے قطع تعلق کر رکھا تھا، اس کی سزا میں مجھے یہاں دوزخ میں ڈالا گیا ہے۔ علامہ ذہبی رَحِمَہُ اللّٰہُ فرماتے ہیں کہ اس کی تصدیق حدیث میں ہے کہ قطع رحمی کرنے والا جنت میں نہیں جائے گا۔ (۱)

یہ واقعہ بتا رہا ہے کہ رشتہ توڑنا دوزخ میں لے جانے والا عمل ہے، اس لیے رشتے داری کا حق ادا کرنا چاہیے۔

رشتے داری کا حق کیا ہے؟

اب رہی یہ بات کہ رشتہ کو کس طرح جوڑا جائے اور اس کے حق کو کس طرح ادا کرنا چاہیے اور اس کے حقوق کیا ہیں؟ ابن حجر رَحِمَہُ اللّٰہُ نے لکھا ہے کہ صلہ رحمی مال سے ہوتی ہے، حاجت وضرورت میں مدد کرنے سے ہوتی ہے، ضرر کو دفع کرنے سے ہوتی ہے خوشی سے ملاقات کرنے سے ہوتی ہے، دعا خیر کرنے سے ہوتی ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ ہر وہ اچھائی جو ممکن ہو وہ پہنچانا اور طاقت کے بعد شر سے بچانا

(۱) الکبائر:۴۹

یہ صلہ رحمی کا حاصل ہے۔(۱)

کیوں کہ رشتہ داری کو جوڑنے سے یہی مراد ہے کہ رشتہ داری کے حقوق ادا کیے جائیں، جیسا کہ قرآن میں فرمایا گیا ہے۔﴿ فَآتِ ذَا الْقُرْبیٰ حَقَّهُ﴾(الروم: ۲۷) (کہ رشتہ داروں کو ان کا حق دو) تو گویا یہ آیت تفسیر ہے، ان آیات کی جن میں رشتے داری کو جوڑنے کا حکم دیا گیا ہے۔ اس لیے کہ ایک آیت دوسری آیت کی تفسیر ہوا کرتی ہے۔ غرض یہ کہ صلہ رحمی یہ ہے کہ رشتہ داروں کے حقوق کو ادا کیا جائے۔ اب سوال یہ ہے کہ رشتہ داروں کے حقوق کیا ہیں؟ ہم یہاں چند اہم حقوق کو بیان کرتے ہیں:

حسنِ سلوک

رشتے داروں کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آنا اوران کے ساتھ حسن اخلاق کا مظاہرہ کرنا ضروری ہے اوران کا حق ہے، قرآن مجید نے صاف طور پر اس کی تعلیم دی ہے۔

چناں چہ فرمایا:

﴿ وبالوالدین احسانا و ذی القربی ﴾ (البقرۃ: ۸۳)

(اور والدین کے ساتھ رشتہ داروں کے ساتھ احسان کا برتاؤ کرو)

اس میں جس طرح والدین کے ساتھ حسنِ سلوک کا حکم دیا گیا ہے، اسی طرح اہل قرابت کے ساتھ بھی حسنِ سلوک کی تعلیم دی گئی ہے۔

مالی تعاون

رشتے داروں کا ایک حق یہ ہے کہ ان کا مالی تعاون بھی کیا جائے، اگر وہ ضرورت مند ومحتاج ہوں۔ قرآن میں متعدد مواقع پر اہل قرابت کو اپنے مال میں سے دینے کا

(۱) فتح الباری: ۱۰/ ۴۱۸

حکم دیا گیا ہے، ایک جگہ فرمایا: ﴿قُلْ مَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ خَيْرٍ﴾ (البقرة: ۲۱۵) (یعنی اللہ کے راستہ میں جو تم خرچ کرتے ہو یہ والدین اور رشتہ داروں اور یتیموں اور مسکینوں اور مسافروں کو دینا ہے)۔

معلوم ہوا کہ رشتے داری کا ایک حق یہ ہے کہ ان کو مال میں سے بھی حسب ضرورت ہدیہ کرے، یا اپنے رشتہ داروں میں سے کسی کا نفقہ وخرچہ اپنے ذمہ لے لے۔

رسول اللہ صَلَّی اللہُ عَلَیہِ وَسَلَّم کا ایک واقعہ

جیسے حدیث میں ہے کہ جب قریش قحط سالی میں مبتلا ہوئے اور یہاں تک نوبت پہنچی کہ سڑی ہوئی ہڈی کھانا پڑا تو اس وقت اللہ کے نبی صَلَّی اللہُ عَلَیہِ وَسَلَّم اور حضرت عباس رضی اللہ عنہ کے سوا کوئی شخص قریش میں خوش حال نہ تھا۔ اللہ کے نبی عَلَیہِ السَّلَام نے اپنے چچا حضرت عباس سے فرمایا کہ چچا جان آپ کے بھائی ابو طالب کے یہاں اولاد زیادہ ہے اور قریش کو جو پریشانی ومصیبت آئی ہے، وہ تو آپ کو معلوم ہے، آپ اور میں جا کر ان کے بعض بچوں کو لے آئیں اور ان کی پرورش کریں۔ چناں چہ اللہ نبی عَلَیہِ السَّلَام اور حضرت عباس رضی اللہ عنہ دونوں ابو طالب کے پاس گئے اور اللہ کے نبی عَلَیہِ السَّلَام نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اپنی پرورش میں لے لیا اور حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے حضرت جعفر رضی اللہ عنہ کو اپنی تربیت میں لے لیا۔ اور ان کی تربیت و پرورش کرتے رہے۔ (۱)

حضرات! آج ہم لوگوں کا کیا حال ہے؟ خاندان میں کئی محتاج لوگ اپنی بچیوں اور لڑکیوں کی پرورش و تعلیم کے لیے پریشان ہیں، اگر خاندان کے مال دار لوگ ایک ایک بچہ کی ذمے داری بھی لے لیں تو کس قدر ان کو سہارا ملے؛ مگر افسوس کہ آج یہ حکم ہم نے بھلا دیا ہے۔

---

(۱) حیاۃ الصحابہ: ۲/۶۲۲

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا ذکرِ جمیل

حالاں کہ اس حق کا اتنا تاکیدی حکم ہے کہ اگر کسی رشتے دار کی طرف سے تکلیف پہونچ جائے تو بھی اس حق کو ساقط کرنے کی اجازت نہیں ہے۔

حدیث میں ہے کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے ایک خالہ زاد بھائی تھے حضرت مسطح بن اثاثہ یہ بہت ہی محتاج وضرورت مند تھے۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ ہمیشہ ان کی مدد فرماتے رہے؛ بل کہ یوں کہنا صحیح ہوگا کہ ان کی پرورش حضرت صدیق رضی اللہ عنہ ہی کے پاس ہوئی۔ ایک دفعہ بڑا سنگین حادثہ پیش آیا وہ یہ کہ حضرت صدیق رضی اللہ عنہ کی صاحب زادی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زوجہ محترمہ ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا پر منافقین نے تہمت لگادی اور اس کا پروپیگنڈہ کیا، بعض لوگ بغیر تحقیق سنی سنائی باتوں پر یقین کر لیتے اور پھر اس کو پھیلا بھی دیتے ہیں۔ یہ مسطح بن اثاثہ جو صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے خالہ زاد بھائی تھے، وہ بھی اسی طرح منافقوں کے پروپیگنڈہ سے متأثر ہوکر نعوذ باللہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے بارے میں غلط بات کا پروپیگنڈہ کرنے لگے، جس سے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو نہایت درجہ ناگواری اور تکلیف ہوئی، اور یہ فطری بات بھی تھی، لہٰذا آپ نے قسم کھالی کہ میں مسطح کو اب کوئی نفع نہ پہنچاؤں گا۔

حضرات! غور کیجیے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا جیسی مقدس ہستی پر الزام تراشی کرنے والوں کے ساتھ ہو جانے والے رشتے دار پر اگر حضرت ابوبکر ناراض ہوں اور قسم کھالیں تو غلط تو نہیں؟ مگر خدائے مہربان کی مہربانیوں پر نظر فرمایئے کہ اس نے آیت کریمہ نازل فرمادی۔ سورہ نور میں ہے ﴿وَلَا يَأْتَلِ أُولُوا الْفَضْلِ مِنكُمْ﴾ (النور: ۲۲) جس کا حاصل یہ ہے کہ اہل فضل واہل وسعت لوگوں کو اس طرح قسم نہیں کھانا چاہیے کہ رشتے داروں اور مسکینوں وغیرہ کو ہم نہیں دیں گے وغیرہ۔ چناں چہ جب یہ آیت

نازل ہوئی تو آپ پھران کو دینے لگے اور فرمایا کہ میں کبھی ان کا خرچہ نہ روکوں گا۔ (۱)

غرض رشتے داری کا اتنا بڑا حق ہے کہ اس قدر نا گوار امر پیش آنے کے بعد بھی مالی تعاون سے ہاتھ روکنا، اچھا نہیں قرار دیا گیا، تو یہ بڑا حق ہے کہ رشتے دار اگر محتاج ہوں تو ان کا تعاون کیا جائے۔

دوہرا اجر ملے گا

اور اس میں دوہرا اجر ملے گا جیسا کہ بعض احادیث میں وارد ہوا ہے۔ ایک تو محتاج وضرورت مند کی مدد کرنے کا اجر، دوسرا صلہ رحمی ورشتہ داری کا حق ادا کرنے کا اجر، چناں چہ امام ترمذی نے حضرت سلمان بن عامر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ محتاج ومسکین پر صدقہ کرنا ایک صدقہ ہے اور رشتہ دار پر صدقہ کرنا صدقہ بھی ہے اور صلہ رحمی بھی ہے۔ (۲)

غرض رشتے داری کی بنیاد پر خرچ کرنا، یہ خود بھی بہت بڑا ثواب کا کام ہے۔ صدقہ کا صدقہ اور رشتے داری کا حق بھی، اس لیے اس پر دوہرا ثواب واجر ہے۔

حاجت وضرورت پر کام آنا

رشتے داری کا ایک حق یہ ہے کہ رشتہ داروں کی حاجت وضرورت پر ان کے کام آئے، مال کے سوا اور بھی بہت سی ضروریات ہوتی ہیں، مثلاً کسی کام کی سفارش کسی سے کر کے رشتے دار کا کام بنا دینا، یا کوئی کام اٹکا ہوا ہے اور اپنے اندر طاقت و صلاحیت ہے کہ اس کام کو انجام دے تو وہ کام کر دینا چاہئے۔ حدیث میں عام لوگوں

(۱) بخاری:۲/۶۹۸

(۲) ریاض الصالحین:۱۳۴

کے کام کر دینے اور ان کی ضرورت میں کام آنے پر بہت بڑا ثواب بتایا گیا ہے۔

ایک حدیث میں ہے کہ ایسا شخص اللہ کے راستہ میں جہاد کرنے والے کی طرح ہے یا اس کے مانند ہے جو دن بھر روزہ رکھتا ہے اور رات بھر نماز پڑھتا ہے۔ یہ روایت بخاری میں ہے۔ (۱)

ایک اور حدیث میں آیا ہے کہ رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے فرمایا کہ جو شخص اپنے مسلمان بھائی کی حاجت میں اس کے کام آتا ہے، اللہ اس کی حاجت میں اس کے کام آتا ہے اور جو مسلمان اپنے مسلمان بھائی کی کوئی پریشانی دور کرتا ہے، تو اللہ تعالیٰ قیامت کی پریشانیوں میں سے اس کی پریشانی دور کرتا ہے۔ (۲)

غور فرمایئے کہ جب ایک مسلمان بھائی کی ضرورت میں اس کے کام آنے اور اس کی پریشانی کو دور کرنے پر یہ اجر وثواب ہے تو پھر اپنے رشتے دار کی ضرورت پر اس کے کام آنے پر کتنا ثواب ملے گا؟ مگر آج کے دور میں رشتہ داری کا یہ حق بھی ختم کر دیا گیا ہے۔ ضرورت پر کام آنے کو لوگ معیوب سمجھنے لگے ہیں، افسوس تو یہ ہے کہ دوسروں کی مصیبت پر غم نہیں ہوتا، رنج نہیں ہوتا۔

ایک انسانیت سوز واقعہ

اس پر ایک واقعہ یاد آیا کہ ایک صاحب کو ایک اہم معاشی ضرورت میں پندرہ ہزار روپیوں کی ضرورت تھی، اس کے لیے وہ اپنے ایک رشتہ دار کے پاس گئے اور بہ طور قرض پندرہ ہزار روپئے کا سوال کیا، پہلے تو اس رشتے دار نے کہا کہ سوچ کر کل جواب دوں گا۔ جب دوسرے دن یہ پہنچے تو انکار کر دیا کہ اس وقت دینے کی گنجائش نہیں ہے

(۱) بخاری:۸/۸۸۸

(۲) ریاض الصالحین:۱۰۴

اس واقعہ کے چند دنوں بعد غالباً ایک ماہ بعد ان رشتہ دار کے گھران کی لڑکی کی شادی ہوئی، جس میں نہایت درجہ اسراف وفضول خرچی سے کام لیا گیا اور کئی لاکھ روپئے خرچ کیئے گئے۔

اس واقعہ سے اندازہ لگایئے کہ آج انسانیت وہم دردی کا نام بھی باقی نہیں ہے، جولوگ کئی لاکھ روپئے فضول اڑا سکتے ہیں، وہ کیا انسان اور وہ بھی رشتے دار کوصرف قرض نہیں دے سکتے؟ آج اپنی فضولیات پر انسان لاکھوں خرچ کرنے تیار ہے؛ مگر بھائی کی ضروریات پر بھی اس کے کام آنا نہیں چاہتا۔

اس سے زیادہ تعجب یہ کہ زبانی تعاون بھی کرنا گوارا نہیں کرتے کہ کسی سے کوئی سفارش کردیں اوراپنے رشتے دار کا کام بنادیں، حالاں یہ بھی ایک نیکی ہے۔قرآن میں فرمایا گیا کہ کسی کی نیکی میں سفارش کرنے سے اس نیکی میں سے اس کوبھی حصہ ملے گا۔ غرض یہ کہ اپنے رشتے دار کا حق ہے کہ اس کی ضروریات میں اس کے کام آئے۔

دفع مضرت

رشتہ داری کا ایک حق یہ ہے کہ اس پرکوئی مصیبت وپریشانی آئی ہےتو اس کودفع کرنے میں اس کا تعاون کرے۔ مثلاً کسی کو بلاوجہ گرفتار کرلیا گیا، تو اس پر یہ ایک مصیبت ہے، اس کودفع کرنے کی تدبیر کرنا اورکوشش کرنا بھی ضروری ہے اوراس کا ثواب حدیث میں بتا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ قیامت میں اس کی پریشانی دور کردے گا جو کسی کی پریشانی دورکرتا ہے جیسا کہ ابھی وہ حدیث عرض کرچکا ہوں۔

لغزشوں سے درگزر کرنا

ایک حق رشتے داری کا یہ ہے کہ رشتے دار سے اگرکوئی لغزش ہوجائے، تو درگذر

کردے، معاف کرے۔ علامہ ابن حجر رحمہ اللہ نے رشتے کے حقوق بتاتے ہوئے فرمایا ہے (والتغافل عن زلاتھم) کہ ان کی لغزشوں سے چشم پوشی کرنا بھی ان کا حق ہے۔

مگر یہ صفت بھی آج عنقا ہوگئی ہے، ذرا ذرا سی بات پر قطع تعلق کر لیتے ہیں حتیٰ کہ جنازہ میں شرکت نہیں کرتے یہ انتہائی درجہ کی قساوتِ قلبی ہے۔

حدیث میں ہے کہ مسلمان بھائی کا ایک حق یہ ہے کہ اس کے عذر کو قبول کرو، اور دوسری حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ کسی مسلمان کو جائز نہیں کہ اپنے مسلمان بھائی سے تین دن تک بات نہ کرے، یہ عام مسلمان کے بارے میں آیا ہے تو رشتے دار کا کیا حکم ہوگا: مگر دیکھئے کہ آج اس میں کتنی غفلت برتی جارہی ہے۔ اس لیے یاد رکھنا چاہئے کہ لغزش تو ہر ایک سے ہوتی ہے؛ مگر اس کو مسئلہ نہ بنایا جائے، معاف کردیں، درگذر سے کام لیں، جیسا کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو حکم دیا گیا کہ مسطح رضی اللہ عنہ کی لغزش کو معاف کرکے ان کو نفقہ دو۔

ان حقوق کے علاوہ اور بھی حقوق ہیں، مثلاً کبھی کبھی رشتہ داروں کی زیارت کو جانا اور بیمار ہوجائیں تو عیادت کرنا، کبھی کبھی تحفہ بھیجنا یا لے جانا، ان کے حق میں دعا کرتے رہنا وغیرہ۔

اب سوچئے کہ جب اس طرح رشتے داروں کے حقوق ادا کرتے ہوئے زندگی بسر کی جائے گی تو معاشرت میں حسن ولذت کیوں کر نہ پیدا ہوگی؟ ضرور بالضرور اس زندگی میں لذت ولطف، راحت ورحمت کے آثار دکھائی دیں گے۔

فقط

محمد شعیب اللہ خان

نمازِ تہجد کا شرعی حکم

التقریظ

حضرت اقدس مولانا شاہ ابرار الحق صاحب رحمہ اللہ
خلیفہ حضرت تھانوی رحمہ اللہ

نحمده ونصلی علی رسوله الکریم

امابعد:

رسالہ ''جماعت تہجد کا شرعی حکم'' مرتبہ جناب مولانا محمد شعیب اللہ خان صاحب مفتاحی، مدرسہ مسیح العلوم، بیدواڑی، بنگلور دیکھا گیا۔ ان کی تحقیق سے ہم خدام مدرسہ اشرف المدارس ہردوئی متفق ہیں۔ یعنی ''تہجد کی نماز جماعت سے پڑھنا مکروہ ہے''۔

ابرار الحق

یکم شعبان ۱۴۱۱ھ

تمہید وتقدیم

گذشتہ چند سالوں سے بنگلور اور اس کے اطراف میں جماعت تہجد کا رواج جڑ پکڑتا دکھائی دیا تو احقر نے گذشتہ رمضان مبارک میں اس رواج سے متعلق حضرات علماء وفقہاء کے فتاوی کو اور ساتھ ہی ان کے دلائل کو وضاحت سے لکھ کر شائع کیا اور اس سلسلے میں کچھ پمفلٹ بھی شائع کیے گئے، مگر جن لوگوں کے دلوں میں نبوی طریقہ کے بجائے من مانی طریقہ کی محبت جا گزیں تھی اور جو حقیقی دینداری کے بجائے ظاہری دینداری کو کافی خیال کرتے تھے، وہ ان فتاوی کو ماننے اور ان پر عمل کرنے تیار نہ ہوئے ، بلکہ ان فتاویٰ کی مخالفت پر کمر بستہ ہوگئے ، اور عجیب بات یہ کہ جن سے زیادہ توقع تھی کہ وہ حق کے سامنے آجانے کے بعد اپنی غلطی سے رجوع کرلیں گے، انھی کی طرف سے سب سے زیادہ مخالفت ہوئی، حالانکہ وہ فتاوی جو رسالے میں نقل کیے گئے تھے، ان اکابر کے تھے جن کو یہ مخالفین بھی اپنے اکابر تسلیم کرتے ہیں۔ اس مخالفت کے چند نمونے بھی ملاحظہ فرماتے جائیں۔

(۱) ادارہ تبلیغ وتجدید سنت کے چند افراد جب میرا رسالہ لے کر تقسیم کے لیے ایک جگہ گئے تو وہاں چند لوگوں نے اس کو چھین کر پھاڑ ڈالا، اور پیروں میں ڈال کر روندا۔

(۲) ایک صاحب نے (جو ایک بڑی مرکزی مسجد میں اس جماعت تہجد کے علم

بردار بلکہ بانی ہیں) جب سنا کہ احقر نے یہ رسالہ شائع کیا ہے تو انہوں نے مسجد میں مصلیوں سے خطاب کر کے کہا کہ آپ حضرات اس پر توجہ نہ دیں، شیطان اسی طرح نماز سے روکتا ہے، گویا ان تمام اکابر پر شیطان ہونے کا فتوی لگا دیا۔ اللہ رے جہالت !!

(۳) ایک مسجد میں جہاں اس بدعت کی ہمت افزائی خوب ہو رہی ہے، ایک صاحبِ علم کا بیان مقرر ہوا۔ چند نوجوان ان سے زیر بحث مسئلہ معلوم کرنا چاہتے تھے کہ حقیقت کیا ہے۔ چنانچہ ایک صاحب نے کھڑے ہو کر مسئلہ پوچھا کہ جماعتِ تہجد کا کیا حکم ہے؟ بس اس پر ان صاحب کو زجر و توبیخ کی گئی، اور ان کو مسجد سے نکل جانے کو کہا گیا۔ کیا کسی عالم سے مسئلہ پوچھنے سے محض اپنے نفس کے لیے روکنا اور پھر مسجد سے نکل جانے کا حکم دینا جائز ہو سکتا ہے۔ یہ بھی سنا کہ اس موقع پر بعض ناخدا ترس لوگوں نے اس کو شرارت قرار دیا ہے۔ تعجب ہے کہ بدعت کا کام تو شرافت ہو جائے اور مسئلہ معلوم کرنا اور حق کی وضاحت چاہنا شرارت ہو؟ فیاللعجب !!

مزید تعجب یہ ہے کہ یہ لوگ اپنے آپ کو دین کے علمبردار سمجھتے ہیں، مگر یاد رکھیں کہ دین حق ہمیشہ غالب ہو کر رہتا ہے اور باطل ہمیشہ نیست و نابود ہوتا ہے۔

یہاں یہ بھی عرض کر دینا ضروری ہے کہ ایک مسجد (لال مسجد) میں ''جماعت تہجد'' کے طریقہ کو جاری کرنے والے اس کے جواز کی یہ تاویل کرتے ہیں کہ بعض حنفی لوگ رمضان کی آخری راتوں میں اہل حدیث کی مساجد میں جا کر ''تہجد با جماعت'' ادا کرتے ہیں اور ان کا بیان سنکر حنفیت سے بدظن ہو جاتے ہیں۔ لہٰذا ان کی حفاظت کے لیے یہ ناجائز طریقہ مصلحتاً اپنایا گیا ہے۔

راقم عرض کرتا ہے کہ یہ وجہ خاص ایک مسجد میں جماعتِ تہجد جاری کرنے کی ہو سکتی ہے بلکہ ہے۔ اب جو بہت ساری مساجد میں اس مسجد کی دیکھا دیکھی یہ رسم

جاری ہورہی ہے، اس کا ذمہ دار کون ہوگا؟ دوسرے غور کرنا چاہئے کہ کیا اس جماعت میں شریک ہونے والے وہی حضرات ہیں جو اہل حدیث مسجد میں جایا کرتے تھے؟ اور اس طریقہ سے ہر قسم کی گمراہی ختم ہوگئی؟ ظاہر ہے کہ محض ایک بے وجہ کا خیال باندھ لیا گیا ہے کہ حنفی جو اہل حدیث کی مساجد کو جاتے تھے وہ سب یہاں آجاتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ جن کو وہاں جانا ہے، وہ وہیں جاتے ہیں۔ ہاں ممکن ہے کہ کچھ لوگ ادھر بھی آگئے ہوں۔ تیسرے یہ کہ جب ایک اور طرح بھی ان کو اپنی مساجد میں آنے کی طرف متوجہ کرسکتے ہیں مثلاً وعظ وتقریر کا انتظام کرسکتے ہیں تو ایک ناجائز کام کو اختیار کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ چوتھے یہ سمجھنا چاہئے کہ اگر مذکورہ بالا وجہ ہی اس طریقہ کے ایجاد کرنے کی وجہ ہے تو صاف طریقہ پر لوگوں کو بتا دینا چاہئے کہ یہ طریقہ ناجائز ہے، ہم صرف ایک مصلحت سے کررہے ہیں۔ یہ کونسی دیانت داری ہے کہ اس کو ناجائز بتانے والے کو شیطان تک کہہ دیا جائے، فتنہ پرور کا خطاب دیا جائے اور پوچھنے والوں کو یہ بتایا جائے کہ جماعت تہجد جائز ہے۔

فرض کیجئے کہ ایک شخص بھوک سے بے تاب ہوگیا مگر کھانے کو کوئی چیز حلال نہ تھی، لہٰذا اس نے اور اس کے ساتھ کچھ اور لوگوں نے جو بھوک سے بے تاب نہیں تھے، کسی حرام چیز کو کھانے کا ارادہ کیا تو ایک جاننے والے نے بتایا کہ یہ حرام چیز ہے۔ اس کا کھانا جائز نہیں ہے۔ اب میں پوچھتا ہوں کہ یہاں دیانت کا تقاضا کیا ہے۔ خوف خدا کا کیا حق ہے؟ آیا یہ کہ اس عالم کی بات مان لی جائے اور جو بے تاب نہیں ہے، ان کو روک دیا جائے یا یہ کہ ایک کے حق میں جائز ہونے سے یہ مسئلہ پیدا کرلیا جائے کہ جائز ہے اور اس عالم کو شیطان کہا جائے؟

لہٰذا جو حضرات اس بدعت کو جاری کرنے کی وجہ وہ بتارہے ہیں جو اوپر مذکور

ہوئی، ان کو یوں کہنا چاہئے کہ ہاں یہ مسئلہ جو علماء کی طرف سے پیش ہوا ہے وہ بالکل صحیح ہے اور ہم مجبوراً مصلحتاً اس ناجائز کو کر رہے ہیں۔ لہٰذا اے پوچھنے والو! تم اس بدعت سے بچ کر رہو۔

یہ ہے حق وصداقت کے حاملین کا کردار و عمل، مگر اب کیا ہو رہا ہے، یہ کہ ایک مسجد میں ایک وجہ سے یہ بدعت جاری ہوئی، پھر دوسری مساجد میں شروع ہوئی، اب لوگ پہلی مسجد والوں سے پوچھتے ہیں تو یہ ''توحید وسنت ودعوت وتبلیغ'' کے دعویدار یہ نہیں کہتے ہیں کہ بھائی ہم نے تو ایک خاص وجہ سے ایک ناجائز کام کو اختیار کیا ہے تم اس کو نہ کرو۔ مجھے کوئی بتائے کہ یہ کونسی دیانت داری ہے؟

الغرض اس رسالہ کو ہم نے متعدد اہل علم اور بزرگوں کی خدمات میں پیش کیا اور سب ہی نے اس کی تصدیق فرمائی۔ حضرت مرشدی مسیح الامت رحمۃ اللہ مولانا شاہ مسیح اللہ خان صاحب رحمۃ اللہ نے ایک ہی مجلس میں از اول تا آخر ملاحظہ فرما کر تحسین فرمائی اور حضرت اقدس مولانا ابرارالحق صاحب رحمۃ اللہ نے اور آپ کے مدرسہ ''اشرف المدارس ہردوئی'' کے علماء نے ملاحظہ فرما کر ایک تقریظ بھی روانہ فرمائی ہے جو رسالہ کے شروع میں درج ہے۔ اب اسی کو مزید اضافوں کے ساتھ شائع کیا جا رہا ہے۔

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس رسالہ کو شرف قبولیت بخشے اور لوگوں کی ہدایت کا ذریعہ بنائے۔ آمین

محمد شعیب اللہ خان

۱۷/شعبان ۱۴۱۱ھ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

جماعت تہجد کا شرعی حکم

حامداً و مصلیا:

شریعت اسلامیہ کی سب سے بڑی خوبی اور کمال اور اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس نے ہر عمل کا ایک درجہ واضح طور پر مقرر کردیا ہے اور ہر اس شخص کو جو اسلام سے وابستہ ہو اس بات کا پابند بنایا ہے کہ وہ اعمال کے مقرر کردہ درجات وحدود کی رعایت رکھے، ان سے تجاوز نہ کرے اور تجاوز کرنے والوں کو ظالم قرار دیا ہے۔

﴿ تِلْکَ حُدُوْدُ اللّٰہِ فَلاَ تَعْتَدُوْھَا وَمَنْ یَّتَعَدَّ حُدُوْدَ اللّٰہِ فَاُوْلٰٓئِکَ ھُمُ الظّٰلِمُوْنَ ﴾ (البقرۃ : ۲۲۹)

اس کے ضمن میں ہر عمل کا طریقہ بھی آجاتا ہے کہ یہ عمل کیونکر اور کس ڈھنگ اور طریقہ سے انجام دیا جائے اور مسلمانوں کو اس کا بھی مکلّف قرار دیا گیا ہے کہ وہ ہر عمل کو اس نہج اور طریقہ پر ادا کریں جو خدا اور رسول کی طرف سے مقرر کیا گیا ہے، اس سے تجاوز کرنا اور اس کے خلاف کسی اور طریقہ پر عمل کو انجام دینا گمراہی وضلالت ہے۔ مثلاً شریعت اسلام نے نماز کا ایک طریقہ مقرر کیا ہے، اگر کوئی شخص اس سے ہٹ کر کسی اور طریقہ پر خدا کی عبادت وپرستش کرے گا تو اس کو گمراہ وضال قرار دیا جائے گا۔ اسی طرح نماز کی مختلف اوقات میں مختلف رکعتیں مقرر کی گئی ہیں۔ مغرب

میں تین، فجر میں دو اور ظہر میں چار، اگر کوئی شخص خدا کی محبت میں آکر فجر میں تین اور مغرب میں چار اور ظہر میں پانچ رکعت پڑھنے لگے تو اس کی نماز مقبول تو کیا ہوگی، مردود ہوگی۔ نماز میں الحمدللہ سے پہلے بسم اللہ پڑھنا سب کو معلوم ہے کہ سنت ہے۔ اور اس کو آہستہ آواز سے پڑھنا سنت ہے، اور زور سے پڑھنا مکروہ اور بدعت ہوگا۔ چنانچہ حضرت عبداللہ بن مغفل رضی اللہ عنہ کے بیٹے کہتے ہیں کہ میں نے نماز میں زور سے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم پڑھی تو میرے والد حضرت عبداللہ بن مغفل رضی اللہ عنہ نے سن کر فرمایا کہ اے بیٹے! یہ بدعت ہے اور اس سے بچو۔ (۱)

غور کیجئے کہ حضرت عبداللہ بن مغفل صحابی رضی اللہ عنہ بسم اللہ زور سے پڑھنے کو بدعت قرار دے رہے ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ عبادت کو اسی طریقہ پر ادا کرنا ضروری ہے جو منقول چلا آرہا ہے، اس میں کسی معمولی چیز کا اضافہ بھی غلط اور بدعت ہے۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے صحیح روایت سے ثابت ہے کہ انہوں نے بعض لوگوں کو دیکھا کہ مسجد میں حلقہ بنا کر زور زور سے لا الہ الا اللہ وغیرہ کا ذکر کر رہے ہیں۔ آپ نے ان لوگوں سے فرمایا کہ میں سمجھتا ہوں کہ تم نے بدعت جاری کرلی ہے جب کہ ابھی اللہ کے رسول کے اصحاب موجود ہیں، اسکے بعد ان لوگوں کو مسجد سے باہر کردیا۔ (۲)

حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی ان چیزوں میں یہ سختی وتشدد اس لیے ہے کہ یہ باتیں جو آج معمولی نظر آرہی ہیں، تحریف وتبدیل دین کا سبب بن جاتی ہیں۔ چنانچہ یہود ونصاریٰ نے اپنے اپنے دینوں میں تحریف اسی طرح کی ہے، انہوں نے اٹھتے

---

(۱) ترمذی: ۱/۵۳

(۲) دارمی: ۱/۴۹

ہی خرافات کو دین میں داخل نہیں کر دیا، بلکہ خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے قائم کردہ حدود کو آہستہ آہستہ پھلانگنا شروع کیا، غلو اور تعمق اور تشدد پسندی نے آخر یہ رنگ دکھایا کہ ان کا دین مسخ ہو کر رہ گیا۔ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمہ اللہ اپنی کتاب ''حجۃ اللہ البالغہ'' میں یہود و نصاری کے دین میں تحریف کے اسباب بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اس کی ایک وجہ اور سبب تشدد پسندی ہے کہ سنتوں اور آداب کا ایسا التزام کرنا جیسے واجبات کا ہوتا ہے اور یہ یہود و نصاریٰ کے راہبوں کی عادت تھی۔(۱)

دینِ یہود و نصاریٰ ان رہبانیت پسند عباد و زہاد کی ان تحریفوں کا تختۂ مشق بن کر مسخ ہو گیا، لیکن محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کا لایا ہوا دینِ اسلام چوں کہ خداوند تعالیٰ کی حفاظت میں ہے اس لیے ایسا تو نہیں ہوسکتا کہ وہ سابقہ دینوں کی طرح مسخ ہو جائے۔ البتہ خود ایسا کرنے والے خدا کے یہاں دھتکار دیے جائیں گے اور اللہ تعالیٰ ایک ایسی جماعت کھڑی کر دے گا جو دین میں تحریف کرنے اور بدعت ایجاد کرنے والوں کے خلاف کارروائی کر کے دین کے اصلی چہرے کو لوگوں کے سامنے پیش کرے گی۔

اوپر جن حقائق کو پیش کیا گیا ہے ان کی روشنی میں یہ بات واضح ہے کہ عبادات کو ان کے شرعی طریقہ کے مطابق ادا کرنا ضروری ہے، اس کے ذرہ برابر خلاف کرنے سے بھی اللہ تعالیٰ کے یہاں اس عبادت کا کوئی مقام و مرتبہ نہیں رہتا۔

مگر افسوس کہ آج بعض دین پسند لوگوں نے بھی اس راز کو نہیں سمجھا ہے جس کی وجہ سے دین کے نام پر بدعات رائج ہوتی جا رہی ہیں۔ انہیں میں سے ایک یہ ہے کہ

(۱) حجة الله البالغه: ۱/۱۲۱

بعض مساجد میں رمضان المبارک کی آخری راتوں میں جن میں لیلۃ القدر ہونے کی توقع ہوتی ہے، نماز تہجد کو با جماعت پڑھنے کا اہتمام کیا جاتا ہے حالانکہ شریعت میں اس کی کوئی دلیل نہیں ہے۔

زیرِ نظر مضمون میں ہم نے حنفی فقہاء کرام کے فتاوی اوران کا استدلال اوراس کے ساتھ بعض دیگر ائمہ کے اقوال کو جمع کر دیا ہے، جن سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض مساجد میں جو نماز تہجد میں جماعت کا اہتمام کیا جاتا ہے یہ غیر شرعی عمل ہے۔

تہجد کی جماعت اور حنفی نقطۂ نظر

سب سے پہلے ہم تہجد کی نماز کو با جماعت ادا کرنے کے سلسلہ میں حنفی نقطۂ نظر کی وضاحت کرتے ہیں تا کہ فقہاء احناف کا موقف واضح ہو جائے۔

ان حضرات کا موقف یہ ہے کہ جماعت فرض نمازوں کے لیے مشروع ہے۔اور کسی خاص وجہ سے بعض اور نمازوں میں بھی مشروع ہے جیسے تراویح، عیدین، نماز کسوف وغیرہ، ان کے علاوہ اور کسی نفل یا سنت نماز کے لیے جماعت مشروع نہیں ہے بلکہ ان کو تنہا پڑھنا چاہئے جس طرح فرض نماز جماعت سے پڑھنا مشروع طریقہ ہے۔ اسی طرح نفل اور سنت نمازوں کو تنہا تنہا پڑھنا اوران میں جماعت نہ کرنا ہی مشروع طریقہ ہے اور جیسے فرض نماز کو بغیر جماعت ادا کرنا بھی غلط و نا مشروع ہے۔

چنانچہ علامہ ظفر احمد عثمانی رحمہ اللہ ''اعلاء السنن'' میں فرماتے ہیں:

''علامہ ابن قیم رحمہ اللہ نے زاد المعاد میں فرمایا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقہ سنت اور نفل میں گھر میں پڑھنے کا تھا۔ مگر کوئی عذر ہو تو مسجد میں پڑھتے جیسے آپ فرائض مسجد میں پڑھتے الا یہ کہ کوئی عذر ہو، لہٰذا سنت و نفل میں تنہا پڑھنا سنت موکدہ ہوگا جیسے

فرائض میں جماعت کرنا سنت موکدہ ہے۔لہٰذا نوافل کی جماعت، سنت مؤکدہ کے خلاف ہونے کی وجہ سے مکروہ ہوگی۔ (۱)

البتہ فقہاء احناف نے بعض قیود وشرائط کے ساتھ نفل کی جماعت کی اجازت دی ہے۔اس کی تفصیل وتوضیح یہ ہے کہ:

(۱) اگر نفل نماز با جماعت بغیر تداعی کے ہوتو جائز ہے،اور تداعی کے ساتھ ہوتو مکروہ ہے،اور تداعی کے معنی یہ ہیں کہ امام کے علاوہ چار آدمی مقتدی ہوں۔ (۲)

معلوم ہوا کہ امام کے علاوہ اگر چار آدمی مقتدی ہوں تو نفل نماز خواہ وہ تہجد ہو یا کوئی اور رمضان میں ہو یا رمضان سے باہر مکروہ ہے اور تین مقتدی ہوں تو بعض علماء جائز اور بعض نا جائز فرماتے ہیں اور دو مقتدی ہوں تو جائز ہے۔ (۳)

(۲) دوسری شرط یہ ہے کہ نفل کی جماعت اتفاقاً کبھی کرلی جائے تو چار آدمیوں کے ساتھ جائز ہے،اور اگر اس کا اہتمام کیا جائے اور ہمیشہ کی عادت بنالی جائے تو باتفاق یہ نا جائز اور مکروہ اور بدعت ہے۔جیسا کہ علماء کے فتاوی آگے آرہے ہیں ان سے معلوم ہوگا۔

حاصل یہ نکلا کہ نفل کی جماعت اگر اتفاقا کسی دن کرلی تو دو تین آدمیوں کے ساتھ جائز ہے۔اور اگر اس کا اہتمام کر کے جماعت بنائی یا چار مقتدی ہو گئے تو مکروہ ہے۔اسی طرح اعلان کے ساتھ جماعت نفل مکروہ ہے اور اعلان میں یہ بھی داخل ہے کہ کسی مسجد میں جماعت نفل ہونے کی شہرت ہو جائے۔جیسا کہ آگے حضرت مفتی عزیز الرحمان رحمہ اللہ کا فتویٰ آرہا ہے۔

---

(۱) اعلاء السنن: ۷/۸۷

(۲) درمختار مع شامی: ۲/۴۹

(۳) شامی: ۲/۴۹

خلاصہ کلام یہ نکلا کہ نفل نماز کو باجماعت ان شرطوں کے ساتھ پڑھ سکتے ہیں کہ:

(۱) اس کا کسی طرح بھی اعلان وشہرت نہ ہو۔

(۲) اس کا اہتمام نہ کیا جائے جیسے فرائض کا اہتمام ہوتا ہے۔

(۳) اس کا کوئی معمول نہ بنایا جائے بلکہ کبھی اتفاق سے کرلیا جائے۔

(۴) اور امام کے ساتھ چار مقتدی نہ ہوں بلکہ زیادہ سے زیادہ دو تین ہوں۔

اگر ان شرطوں میں سے کوئی ایک بھی شرط فوت ہوگئی تو نفل نماز جماعت سے پڑھنا مکروہ ہوگا۔ یہ تمام شرائط حضرات فقہائے کرام کے کلام سے لی گئی ہیں اور ان فقہاء کا کلام آگے پیش کیا جارہا ہے۔

نوافل کی جماعت کے مکروہ ہونے کی دلیل

حضرات فقہاء کرام کے اس سلسلے میں فتاوی پیش کرنے سے قبل جماعت نفل کے مکروہ ہونے کی دلیل بیان کرنا مناسب ہے۔ حضرات علماء وفقہاء نے اس پر متعدد احادیث سے استدلال کیا ہے، ان میں سے بعض یہ ہیں:

(۱) حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اے لوگو! اپنے گھروں میں نماز پڑھو؛ کیوں کہ سب سے افضل نماز آدمی کی وہ نماز ہے جو گھر میں ہو سوائے فرض نماز کے۔ (۱)

(۲) عبداللہ بن سعد رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے گھر میں نماز پڑھنے اور مسجد میں نماز پڑھنے کے بارے میں سوال کیا، آپ نے فرمایا کہ تم دیکھتے ہو کہ میرا گھر مسجد سے کتنا قریب ہے، پھر بھی میں گھر میں نماز پڑھنے

(۱) نسائی: ۱/۱۸۱، ابن خزیمہ: ۲/۲۱۱، اعلاء السنن: ۷/۷۷

کو مسجد میں نماز پڑھنے سے زیادہ محبوب رکھتا ہوں، مگر یہ کہ فرض نماز ہو۔(۱)

(۳) حضرت صہیب بن نعمان رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ آدمی کی اپنے گھر کی نماز کی فضیلت اس نماز پر جو ایسی جگہ پڑھے، جہاں لوگ اس کو دیکھیں، ایسی ہے جیسے فرض نماز کی فضیلت نفل نماز پر۔(۲)

محدثِ شہیر وفقیہ جلیل حضرت علامہ ظفر احمد عثمانی رحمۃ اللہ پہلی دو حدیثوں کو پیش کر کے فرماتے ہیں کہ:

> ''ان دو حدیثوں میں جیسے اس بات پر دلالت ہے کہ مسجد سے زیادہ گھر میں نفل نماز پڑھنا بہتر وافضل ہے، اسی طرح ان میں اس بات پر بھی دلالت ہے کہ جماعت فرض نماز کے ساتھ خاص ہے، اور نوافل میں اصل اخفاء اور تنہا پڑھنا ہے۔ ورنہ ان کا گھر میں پڑھنا افضل نہ ہوتا؛ کیوں کہ جس نماز کا مبنی اظہار واجتماع پر ہو اس کا مسجد میں گذارنا افضل ہے، پس ثابت ہوا کہ نوافل میں جماعت خلاف اصل ہے اور خلافِ اصل طریقہ پر ادا کرنا کراہیت سے خالی نہیں ہوتا، لہٰذا نوافل میں جماعت مکروہ ہے۔''(۳)

دوسری دلیل

نفل کی جماعت کے مکروہ ہونے پر فقہاء نے اس طرح بھی استدلال کیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرات صحابہ کرام سے یہ ثابت نہیں کہ انہوں نے کبھی

(۱) طحاوی: ۱/۱۶۷، شمائل ترمذی: ۲۱، مسند احمد: ۴/۳۴۲، ابن ماجہ: ۱۳۷۸، ابن خزیمہ: ۲/۲۱۰

(۲) معجم کبیر: ۸/۴۶، اعلاء السنن: ۷/۸۱

(۳) اعلاء السنن: ۷/۷۸

نوافل میں جماعت کا اہتمام کیا ہو، بلکہ سنت نمازیں بھی وہ حضرات گھر جا کر تنہا تنہا پڑھتے تھے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ نوافل میں جماعت مشروع نہیں ہے، یہ استدلال ایسا ہی ہے جیسے علماء نے عید کی نماز کے لیے اذان و اقامت نہ ہونے پر استدلال کیا ہے کہ آپ نے عید کی نماز کے لیے اذان و اقامت نہیں کہی، لہٰذا وہ غیر مشروع ہے، اس لیے نوافل میں جماعت غیر مشروع ہے۔

علامہ ظفر احمد عثمانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

> ''مؤکدہ سنتیں فرائض کے تابع ہونے کی وجہ سے اس بات کے زیادہ مستحق تھے کہ ان میں جماعت مشروع ہوتی، پس جب سنت موکدہ میں جماعت مشروع نہیں ہوئی اور کسی بھی حدیث میں یہ وارد نہیں ہوا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سنت نماز میں ایک مرتبہ بھی جماعت کی ہو، تو اس کے علاوہ دوسری نمازوں میں اس کا مشروع نہ ہونا زیادہ مناسب ہے۔''(۱)

ایک شبہ کا جواب

اگر کسی کو یہ شبہ ہو کہ حدیث میں ایک دو موقعوں پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا نفل کو جماعت سے پڑھنا ثابت ہے، جیسا کہ بخاری وغیرہ میں ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ بلاشبہ یہ ثابت ہے اور اسی سے ہمارے علماء نے کبھی کبھی جماعت نفل کی اجازت دی ہے؛ کیوں کہ آپ نے بھی اتفاقاً ایسا کیا تھا، نیز اس جماعت میں آپ کے پیچھے دو لڑکے حضرت انس رضی اللہ عنہ اور یتیم تھے اور ایک حضرت انس رضی اللہ عنہ کی والدہ ام سلیم تھیں۔(۲)

(۱) اعلاء: ۸/۷۸

(۲) بخاری: ۱/۵۵

اس سے ہمارے علماء میں سے بعض نے فرمایا کہ جماعت نفل میں تین مقتدیوں تک کی گنجائش ہے؛ کیوں کہ آپ کے پیچھے بھی تین ہی افراد تھے اور بعض نے کہا کہ جماعت میں عورت کا وجود و عدم برابر ہے، اس کا کوئی اعتبار نہیں، لہٰذا آپ کے پیچھے صرف دو افراد تھے اس لیے دو مقتدیوں کے ساتھ جماعت نفل جائز ہے اس سے زیادہ نہ ہوں۔ یہیں سے احناف میں یہ اختلاف ہے کہ تین مقتدیوں کے ساتھ جماعت نفل جائز ہے یا نہیں؟

الغرض یہ احادیث جن سے جماعت نفل کا ثبوت ہوتا ہے انہی سے یہ اخذ کیا گیا ہے کہ بغیر اہتمام کے کبھی کبھی اور دو تین افراد کے ساتھ جماعت نفل کی جائے تو جائز ہے ورنہ خلاف اصل ہونے کی وجہ سے مکروہ ہے۔

دوسرا شبہ اور جواب

اور اگر یہ شبہ ہو کہ حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم گھوڑے سے گر جانے کی وجہ سے گھر میں تھے اور بعض صحابہ آپ کی عیادت کو گئے اور آپ نماز میں مشغول تھے ان صحابہ نے بھی آپ کے پیچھے نماز پڑھی۔ (۱)

اور ابن حجر رَحِمَهُ اللّٰهُ نے اسی سلسلہ میں نقل کیا ہے کہ آپ کے پیچھے جن حضرات نے نماز پڑھی، ان میں سے حضرت ابو بکر، حضرت عمر، حضرت جابر اور انس رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُم کے نام بیان کیے گئے ہیں۔ (۲)

اس سے معلوم ہوا کہ آپ کے پیچھے چار افراد نے کم از کم نماز پڑھی ہے اور جن کا نام نہیں لیا گیا، ان کی تعداد معلوم نہیں تو پھر احناف نے چار افراد کے ساتھ تہجد کو

---

(۱) ابو داود: ۱/ ۸۹

(۲) فتح الباری: ۲/ ۱۷۸

کیوں مکروہ قرار دیا ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ آپ کے گر جانے اور گھر میں رہنے کے زمانے میں ایسا واقعہ صرف ایک دفعہ نہیں بلکہ دو دفعہ پیش آیا ہے، ان میں سے ایک دفعہ فرض نماز پڑھنے کا واقعہ پیش آیا ہے۔(۱)

اب یہ معلوم نہیں کہ یہ چار صحابہ آپ کے پیچھے فرض نماز میں تھے یا نفل میں اس لیے اس سے استدلال نہیں کیا جا سکتا؛ کیوں کہ ممکن ہے کہ فرض نماز میں آپ کے پیچھے ان چار اصحاب نے نماز پڑھی ہو۔ (واللہ اعلم)

الغرض نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے جتنی بات ثابت تھی، احناف نے اسی قدر لے لیا اور جو ثابت نہ تھی اس کو اختیار نہیں کیا، بلکہ احناف ہی نے نہیں جمہور ائمہ وعلماء نے بھی ایسا ہی کیا ہے، جیسا کہ آگے چل کر معلوم ہوگا۔

اس کے بعد ہم فقہاء وعلماء کے فتاویٰ واقوال بحوالہ کتب درج کرتے ہیں۔

علامہ ابراہیم حلبی کا فتوی

علامہ ابراہیم حلبی رحمہ اللہ شرح منیۃ المصلّی میں ارشاد فرماتے ہیں:

”جاننا چاہئے کہ سوائے تراویح، نماز کسوف (سورج گرہن کی نماز) اور نماز استسقاء کے جماعت سے نفل پڑھنا تداعی کے ساتھ مکروہ ہے۔ پس معلوم ہوا کہ رجب کی پہلی جمعہ میں صلوٰۃ رغائب اور شعبان کی پندرھویں رات کو صلوٰۃ البرأۃ اور رمضان کی ستائیسویں کو صلوۃ القدر جماعت سے پڑھنا مکروہ ہے۔“(۲)

(۱) دیکھو: ابو دائود: ۱/۸۹

(۲) غنیۃ السمتملی: ۴۳۲

ملک العلماء علامہ کاسانی کا فتوی

ملک العلماء علامہ کاسانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''بلاشبہ نفل میں جماعت کرنا سنت نہیں ہے، سوائے تراویح کے اس لیے کہ جماعت شعائر اسلام میں سے ہے اور وہ خاص ہے فرائض وواجبات کے ساتھ نہ کہ نفل کے ساتھ۔''(۱)

علامہ ولوالجی کا فتوی

علامہ شبلی رحمہ اللہ نے ''تبیین الحقائق'' کے حاشیہ میں درایہ کے حوالہ سے نقل کیا ہے کہ:

''علامہ والوالجی رحمہ اللہ نے کہا کہ سوائے رمضان کی تراویح اور نماز کسوف کے نفل نماز کی جماعت مکروہ ہے کیوں کہ صحابہ کرام نے یہ نہیں کیا۔''(۲)

علامہ ابن البز ازالکردری کا فتوی

علامہ ابن البز ازالکردری رحمہ اللہ ''فتاویٰ بزازیہ'' میں مسائل تراویح کے ضمن میں فرماتے ہیں۔

''تراویح جماعت سے پڑھنے کے بعد اگر تراویح کو دوبارہ پڑھنے کا ارادہ کیا تو جماعت سے پڑھنا مکروہ ہے بلکہ تنہا تنہا پڑھنا چاہیے اس لیے کہ تداعی کے ساتھ نفل کی جماعت مکروہ ہے نص (قرآن مجید اور

(۱) البدائع: ۲۹۸/۱

(۲) حاشیہ تبیین الحقائق: ۱۸۱/۱

حدیث کی دلیل) ہو اور ان زائد رکعتوں کو جماعت سے پڑھنے کے بارے میں نص نہیں ہے۔''(۱)

علامہ احمد بن محمد الحموی کا فتویٰ

علامہ احمد الحموی رَحِمَہُ اللّٰہُ حنفی علماء میں سے ایک خصوصی وانفرادی مقام کے حامل ہیں، آپ نے شرح اشباہ میں لکھا ہے:

''صلوۃ الرغائب جو رجب کے پہلے جمعہ کی رات میں پڑھی جاتی ہے اور صلوۃ البرأۃ جو شعبان کی پندرہویں رات میں ہوتی ہے ان میں اور اس کے بعد مذکور نمازوں میں (جس کا ذکر اشباہ کی عبارت میں ہے) امام کی اقتداء کرنا مکروہ ہے، اس لیے کہ نفل نماز کو جماعت سے ادا کرنا تداعی کے ساتھ مکروہ ہے۔''(۲)

علامہ ابن نجیم مصری کا فتوی

علامہ زین الدین ابن نجیم مصری رَحِمَہُ اللّٰہُ علماءِ احناف میں ایک بلند پایہ فقیہ وامام گزرے ہیں، علماء میں ابوحنفیہ رَحِمَہُ اللّٰہُ ثانی کے لقب سے مشہور ہیں، وہ فرماتے ہیں:

''سوائے تراویح کے کوئی نفل نماز جماعت سے نہ پڑھی جائے، اور مبارک اوقات میں مثلاً لیلۃ القدر، لیلۃ البرأت، عیدین، عرفہ، جمعہ کی راتوں میں جو نمازیں مروی ہیں یہ تنہا تنہا پڑھی جائیں گی۔''(۳)

---

(۱) بزازیه علی هامش هندیه: ۲۹/۴

(۲) غمزعیون البصائر: ۲۸/۲

(۳) البحر الرائق: ۵۲/۲

غور کیجیے کہ اس میں علامہ ابن نجیم رحمۃ اللہ نے رمضان کی آخری راتوں میں سے لیلۃ القدر کا ذکر بھی کیا ہے اور فتویٰ دیا ہے کہ ان راتوں کی نمازیں بھی تنہا تنہا پڑھی جائیں، جماعت سے نہ پڑھی جائیں، اگر لیلۃ القدر میں تہجد کو جماعت سے ادا کرنے کی کوئی گنجائش ہوتی تو علامہ موصوف اتنی صراحت و وضاحت سے یہ کیوں فرماتے کہ جماعت سے نہیں تنہا تنہا پڑھیں۔ معلوم ہوا کہ اس کی گنجائش نہیں ہے، بلکہ علامہ ابن نجیم رحمۃ اللہ نے تو ان راتوں میں مساجد میں جاگنے کے لیے جمع ہونے کو بھی مکروہ قرار دیا ہے۔

چنانچہ وہ فرماتے ہیں:

> مستحبات میں سے یہ بھی ہے کہ رمضان کے آخری عشرہ کی راتوں، عیدین کی راتوں اور ذی الحجہ کی دس راتوں، شعبان کی پندرھویں رات کو جاگے اور جاگنے سے مراد اس میں نماز پڑھنا ہے اور ان راتوں میں سے کسی رات کو جاگنے کے لیے، مساجد میں جمع ہونا مکروہ ہے۔"(۱)

نوافل کی جماعت تو دور رہی، علامہ ابن نجیم رحمۃ اللہ سرے سے مساجد میں آ کر جاگنے کے اہتمام کو بھی مکروہ قرار دیتے ہیں۔

علامہ شرنبلالی کا فتویٰ

گیارہویں صدی ہجری کے مشہور حنفی فقیہ و عالم علامہ حسن بن عمارہ شرنبلالی رحمۃ اللہ اپنی معروف کتاب نور الایضاح میں فرماتے ہیں:

> "مستحب ہے کہ رمضان کے آخری عشرہ کی راتوں کو شب بیداری کرے، لیکن ان راتوں میں سے کسی رات میں شب بیداری کے لیے

(۱) البحر الرائق: ۹۲/۲

مساجد میں جمع ہونا مکروہ ہے۔"(۱)

علامہ شرنبلالی رحمۃ اللہ خود نورالایضاح کی شرح مراقی الفلاح میں اس کے بعد فرماتے ہیں کہ یہ مکروہ اس لیے ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحاب رضی اللہ عنہم نے ایسا نہیں کیا۔لہٰذا اکثر علماء نے اس کو منکر قرار دیا ہے۔(۲)

معلوم ہوا کہ رمضان کی آخری راتوں کے لیے بھی مسئلہ یہی ہے کہ مساجد میں جمع ہو کر عبادت نہ کی جائے ،ورنہ یہ مکروہ و منکر ہوگا، جب جمع ہونا ہی مکروہ ہوا تو ظاہر ہے کہ جماعت بنانا کیسے جائز ہو سکتا ہے؟

علامہ ابن عابدین شامی کا فتویٰ

علماء احناف میں علامہ ابن عابدین شامی رحمۃ اللہ کا جو مقام و مرتبہ ہے اس سے فقہ و فتاویٰ سے دلچسپی رکھنے والے ناواقف نہیں،آپ اپنی مایۂ ناز کتاب "ردالمحتار" میں فرماتے ہیں:

"ظاہر یہی ہے کہ نفل نماز میں جماعت غیر مستحب ہے پھر اگر کبھی کبھی اتفاقاً کرلی جائے تو مباح ہوگا۔(مستحب نہ ہوگا) اور اگر اس پر مواظبت (یعنی عادت) کرلی تو یہ بدعت و مکروہ ہوگا؛ کیوں کہ یہ متوارث طریقہ کے خلاف ہے۔"(۳)

اس سے یہ دو باتیں ثابت ہوئیں، ایک یہ کہ نفل نماز میں جماعت مستحب و پسندیدہ کسی حال میں نہیں خواہ اتفاقاً کرلی جائے یا اہتمام سے کی جائے۔دوسرے

(۱) نورالایضاح :۹۵

(۲) مراقی الفلاح علی ھامش الطحاوی:۲۱۹

(۳) رد المختار شامی: ۴۸/۲

یہ کہ اگر اتفاقاً کرلیا تو زیادہ سے زیادہ مباح ہے اور اگر اس پر مواظبت کی جائے تو یہ بدعت ومکروہ ہے۔

آج کل جن مساجد میں تہجد کی جماعت ہوتی ہے، ان میں یہ اتفاقی بات نہیں ہے، بلکہ اس کا اہتمام کیا جاتا ہے اور ایک دوسرے کو بلایا جاتا ہے، بلکہ بعض جگہ اعلان بھی کیا جاتا ہے، پھر بہت سے لوگ اس میں شرکت کرتے ہیں، اب بتایئے کہ اس کے بدعت ہونے میں کیا شبہ ہوسکتا ہے؟

قاضی ثناء اللہ پانی پتی کا فتوی

حضرت علامہ قاضی ثناء اللہ صاحب رحمۃ اللہ پانی پتی ''مالا بدمنہ'' میں فرماتے ہیں:

> ''نفل میں جماعت مکروہ ہے، مگر رمضان میں سنت یہ ہے کہ بیس رکعت دس سلام سے اور جماعت سے ادا کی جائے۔''(۱)

اس میں قاضی صاحب رحمۃ اللہ نے رمضان میں صرف تراویح کو جماعت سے ادا کرنے کی اجازت وسنیت بتائی ہے، اس کے علاوہ نوافل کے بارے میں فرمایا کہ کہ نفل میں جماعت مکروہ ہے، اس سے معلوم ہوا کہ رمضان میں بھی تہجد میں جماعت مکروہ ہے۔

حضرت مولانا اشرف علی تھانوی کا فتوی

حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ سے کسی نے سوال کیا کہ بلا اہتمام نوافل کی جماعت علاوہ تراویح کے جائز ہے یا نہیں اور اس میں آدمیوں کی تعداد شرط ہے یا نہیں؟ حضرت نے اس کا جواب یہ دیا ہے کہ:

---

(۱) مالا بدمنہ: ۷۰

''صورت مسئلہ میں اگر مقتدی ایک یا دو ہوں تو کراہیت نہیں اور اگر چار ہوں تو مکروہ ہے اور اگر تین ہوں تو اختلاف ہے''۔(۱)

جیسا کہ سوال سے ظاہر ہے کہ یہ بلا اہتمام کبھی اتفاق سے نفل میں جماعت کر لینے کا مسئلہ تھا، جس کا یہ جواب دیا گیا اور اگر اہتمام سے جماعت نفل کی جائے تو مسئلہ یہ ہے کہ ہر صورت میں یہ مکروہ ہے، چنانچہ آپ ہی نے شبینہ کا حکم بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

''تراویح پڑھ کر جماعت نوافل میں (شبینہ) پڑھیں یہ بے شک مکروہ ہے، کیونکہ فقہاء نے کہا ہے کہ جماعت نفل مکروہ ہے''۔(۲)

یہ چوں کہ متعارف شبینہ کا حکم پوچھا گیا تھا جو اہتمام سے ہوتا ہے، اس لیے آپ نے بلا کسی شرط کے اس کو مکروہ قرار دیا ہے۔(واللہ اعلم)

حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی کا فتویٰ

قطب عالم حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''جماعت نوافل کی سوائے ان مواقع کے کہ حدیث سے ثابت ہیں، مکروہ تحریمی ہے، فقہ میں لکھا ہے کہ اگر تداعی ہو اور تداعی سے چار آدمی مقتدی کا ہونا ہے پس جماعت صلوۃ کسوف، تراویح، استسقاء کی درست اور باقی سب مکروہ ہیں''۔(۳)

ایک دوسرے فتویٰ میں تحریر فرماتے ہیں:

---

(۱) امداد الفتاوی: ۱/۴۷۷

(۲) امداد الفتاوی: ۱/۴۸۸

(۳) فتاوی رشیدیه: ۳۵۴

’’نوافل کی جماعت تہجد ہو یا غیر تہجد سوائے تراویح وکسوف واستسقاء کے اگر چار مقتدی ہوں تو حنفیہ کے نزدیک مکروہ تحریمہ ہے، خواہ خود جمع ہوں خواہ بطلب آویں اور تین میں اختلاف ہے اور دو میں کراہت نہیں۔‘‘(۱)

حضرت اقدس رحمہ اللہ تقریر بخاری میں ایک موقع پر فرماتے ہیں:

’’ہمارے علماء حنفیہ نے جماعت کو صرف ان موقعوں پر جائز قرار دیا ہے جو ثابت ہیں، جیسے کسوف اور عیدین، اور جن نوافل میں جماعت ثابت نہیں، ان میں تداعی اور اجتماع جائز نہیں ہے، ہاں دو تین آدمیوں کی اجازت دی جاسکتی ہے؛ کیونکہ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس نماز میں ثابت ہے جو آپ نے حضرت انس رضی اللہ عنہ اور ان کی والدہ اور یتیم کے ساتھ پڑھی تھی اور یہ (نوافل کی جماعت کا ناجائز ہونا) اس لیے ہے کہ اس کی اجازت دینے میں بہت سے مفاسد لازم آتے ہیں۔ لہٰذا بغیر دلیل اس پر اقدام نہیں کیا جاسکتا، حالاں کہ بعض (دلیل) اس کے خلاف کی طرف اشارہ کرتی ہے اور اس کی وہ دلیل اللہ کے رسول علیہ السلام کا یہ قول ہے کہ آدمی کی افضل نماز وہ ہے جو گھر میں ہو (سوائے فرض کے) اور یہ بات تداعی اور اجتماع کے وقت فوت ہو جاتی ہے، اگرچہ یہ جمع ہونا کسی کے گھر ہی میں کیوں نہ ہو۔‘‘(۲)

---

(۱) فتاوی رشیدیہ :۳۵۵

(۲) لامع الدراری: ۱/۹۵

حضرت شیخ الحدیث زکریا صاحب کا ارشاد

حضرت شیخ الحدیث مولانا زکریا صاحب رحمۃ اللہ لامع الدراری کے حاشیہ میں فرماتے ہیں:

''میں کہتا ہوں کہ اس مسئلہ (جماعت نفل) پر علامہ ابن عابدین شامی رحمۃ اللہ نے تفصیل سے کلام کیا ہے اور خلاصۃ الفتاوی سے نقل کیا ہے کہ یہ (نفل کی جماعت) اگر کبھی اتفاقاً ہو تو مباح ہے مکروہ نہیں اور اگر عادت کے طور پر ہو تو بدعت مکروہہ ہے؛ کیوں کہ یہ متوارث طریقہ کے خلاف ہے۔''(۱)

حضرت جی مولانا یوسف صاحب کاندھلوی کا ارشاد

رئیس التبلیغ حضرت جی مولانا یوسف صاحب کاندھلوی رحمۃ اللہ اپنی مایۂ ناز کتاب ''امانی الاحبار شرح معانی الآثار'' میں لکھتے ہیں:

''درمختار میں لکھا ہے کہ رمضان کی وتر میں (جماعت) مستحب ہے اور رمضان کے علاوہ دوسرے دنوں کی وتر میں اور نفل نماز میں تداعی کے ساتھ جماعت مکروہ ہے۔''(۲)

حضرت مولانا انور شاہ کشمیری کا ارشاد

محدث عصر حضرت مولانا انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ شرح بخاری میں فرماتے ہیں:

''ہمارے نزدیک (نفل نماز) میں جماعت نہیں ہے اور اس کے

---

(۱) حاشیہ لامع الدراری: ۱/۹۵

(۲) امانی الاحبار: ۴/۱۷۷

لیے بلانا مکروہ ہے۔ فقہاء نے کہا ہے کہ نوافل میں جماعت مکروہ ہے سوائے رمضان کے اور بعض غبی لوگوں نے ان کی مراد کو نہیں سمجھا اور اس کو مطلق نفل میں، رمضان میں جماعت کے جواز پر محمول کیا، حالانکہ فقہاء کی مراد اس سے صرف تراویح ہے نہ کہ دوسری نمازیں، اس کو اچھی طرح سمجھ لو؛ کیوں کہ علم بڑی تحقیق کے بعد حاصل ہوتا ہے۔"(۱)

بریلوی مسلک کے مشہور و مستند عالم مولانا امجد علی صاحب کا فتویٰ

بریلوی مسلک کے مشہور و مستند عالم مولانا حکیم ابوالعلاء محمد امجد علی اعظمی رضوی اپنی مشہور کتاب "بہار شریعت" میں رقمطراز ہیں:

"نوافل اور علاوہ رمضان کے وتر میں اگر تداعی کے طور پر ہو تو جماعت مکروہ ہے، تداعی کے یہ معنی ہیں کہ تین سے زیادہ مقتدی ہوں۔"(۲)

حضرت مجدد الف ثانی کا ارشاد

حضرت مجدد الف ثانی سرہندی رحمہ اللہ کے زمانے میں بعض نقشبندی حضرات نے نماز تہجد کو با جماعت پڑھنے کا رواج دیا تو اس پر حضرت مجدد الف ثانی رحمہ اللہ نے اپنے مکتوب (۱:۱۳۱) میں لکھا ہے:

"افسوس ہزار ہا افسوس کہ بعض وہ بدعتیں جو دوسرے سلاسل میں قطعاً نہیں ہیں، ہمارے طریقہ عالیہ میں پیدا ہو گئیں ہیں، نماز تہجد کو جماعت سے ادا کرتے ہیں، اطراف و اکناف سے لوگ جمع ہوتے ہیں اور بڑی جمعیت خاطر کے ساتھ نماز تہجد ادا کرتے ہیں، حالانکہ یہ

---

(۱) فیض الباری: ۲/۴۳۲-۲/۴۳۳

(۲) بہار شریعت حصہ سوم: ۹۷

عمل مکروہِ تحریمی ہے۔''

بعض فقہاء نے جن کے نزدیک تداعی (ایک دوسرے کو بلانا) کراہت کی شرط ہے، انہوں نے نفل کی جماعت کو مسجد کے ایک کونے میں جائز قرار دیا ہے اور تین آدمیوں سے زیادہ کی جماعت کو بالاتفاق مکروہ کہا ہے۔ [1]

اس مکتوب میں حضرت مجدد صاحب رحمۃ اللہ نے بھی جماعت تہجد کو صاف طور پر بدعت لکھا ہے اور اس کے رواج پر افسوس کا اظہار کیا ہے، معلوم نہیں آج کے رواجی لوگ مجدد صاحب پر کیا فتوی لگائیں گے؟

حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب کا فتوی

حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب دیوبندی مفتیٔ اعظم پاکستان رحمۃ اللہ نے اپنے ایک مطبوعہ فتوے ''جماعت تہجد در رمضان'' میں فرمایا ہے کہ:

''میرے نزدیک مسئلہ زیر بحث میں فتوی یہی ہے کہ علاوہ تراویح کے رمضان میں کسی دوسری نفل کی جماعت [2] درست نہیں۔ جمہور فقہاء ومحدثین اسی پر ہیں اور اسی پر اکابر علماء دیوبند کا عمل رہا ہے، سیدی وسندی حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ جن کا معمول پورے رمضان کی شب بیداری اور نفلوں میں سماعت قرآن کا تھا، جب لوگوں نے اس کی جماعت میں شرکت کی خواہش ظاہر کی تو اس کی اجازت نہیں دی، گھر کا دروازہ بند کر کے اندر حافظ کفایت اللہ صاحب رحمۃ اللہ کی اقتداء میں

---

(۱) مکتوبات مترجم: ۲۴۱ دفتر اول

(۲) انوار الباری جس سے یہ عبارت نقل کی گئی ہے اس میں یہاں غلطی سے نماز لکھا گیا ہے۔ سیاق سباق کو دیکھ کر ہم نے اس کی تصحیح کر دی ہے۔ ۱۲۔ محمد شعیب اللہ

قرآن مجید سنتے تھے، پھر جب لوگوں کا اصرار بڑھا تو معمول یہ بنالیا کہ فرض نماز مسجد میں با جماعت پڑھ کر کچھ دیر آرام کرنے کے بعد تراویح میں پوری رات قرآن مجید سنتے تھے، جماعت مکان پر ہوتی تھی، جس میں چالیس پچاس آدمی شریک ہوتے تھے۔ یہ احقر بھی حضرت کی اسارت مالٹا سے پہلے دو سال اس جماعت میں شریک رہا ہے، جو تراویح کی جماعت تھی، نفل تہجد کی جماعت کو حضرت نے کبھی گوارا نہیں فرمایا۔"(۱)

ایک وضاحت

اوپر کی پیش کردہ حضرت مفتی صاحب کی عبارت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ نے جماعت سے نفل نہیں پڑھی ہے، بلکہ جو پڑھی ہے وہ تراویح کی نماز ہے اور باوجود اصرار کے بھی حضرت نے اس کو گوارا نہیں فرمایا، اس سے ان لوگوں کی غلطی معلوم ہوگئی، جو حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ کے بارے میں کہتے ہیں کہ وہ جماعت سے تہجد پڑھتے تھے، حضرت مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ جو حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ کے پاس رہے ہیں وہ خود فرماتے ہیں کہ یہ تراویح کی جماعت تھی، نفل تہجد کی جماعت کو گوارا نہیں فرمایا۔ ظاہر ہے کہ اس سے بڑی کیا شہادت ہوسکتی ہے؟

حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن کا فتوی

حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن صاحب رحمۃ اللہ نے اس سلسلے میں کئی فتوے تحریر فرمائے ہیں، ان میں سے یہاں صرف ایک نقل کرتا ہوں۔ ایک جگہ آپ تحریر کرتے ہیں:

(۱) بحوالہ انوار الباری شرح بخاری: ۲/۸۷

''ماہ رمضان میں تداعی کے ساتھ جماعت وتر اور تراویح جائز ہے اور مشروع ومسنون ہے اور باقی نوافل سوائے تراویح کے رمضان شریف میں بھی تداعی کے ساتھ مکروہ ہیں، اور معنی تداعی کے صاحب درمختار نے یہاں بیان فرمائے ہیں کہ چار مقتدی ہوں۔(جماعت نفل) اتفاقاً کبھی ہو تو کراہت تنزیہی ہے۔اور اگر مواظبت (پابندی) اس پر کی جائے تو کراہت تحریمی ہے، تداعی کے ساتھ ہو یا بلا تداعی ......آگے چل کر فرماتے ہیں ......اگر شہرت ہو جانے پر جماعت زیادہ ہونے لگے تو تداعی ثابت ہوگئی اور لازم آگئی، امام کو چاہئے کہ منع کردے۔''(۱)

اس فتوی سے چند باتیں معلوم ہوئیں، ایک یہ کہ جماعت نفل کا مکروہ ہونا جس طرح اور دنوں میں ہے اسی طرح رمضان میں بھی ہے، دوسرے یہ کہ جماعت نفل میں اگر چار مقتدی ہو جائیں تو یہ مکروہ ہے، تیسرے یہ کہ جماعتِ نفل اتفاقاً اگر کبھی کرلی گئی تو تب بھی مکروہ تنزیہی ہے، اگر چار مقتدی ہو جائیں یا اس کی عادت بنالی یا پابندی سے جماعت کی جانے لگی تو مقتدی کم ہوں یا زیادہ ہر حال میں مکروہ تحریمی ہے، چوتھے یہ کہ لوگوں میں شہرت کا ہو جانا کہ فلاں جگہ تہجد کی جماعت ہوتی ہے، یہ بھی تداعی کے حکم میں ہے، لہٰذا اس سے بھی جماعت نفل مکروہ ہو جاتی ہے، امام کو منع کردینا چاہئے۔

علامہ ظفر احمد عثمانی کا فتوی

حضرت شیخ الاسلام علامہ ظفر احمد عثمانی رحمۃ اللہ فرماتے ہیں:

(۱) فتاوی دار العلوم دیوبند: ۴/۲۲۲-۴/۲۲۴

''نوافل میں تنہا تنہا پڑھنا ہی سنت مؤکدہ ہے، جیسے فرائض میں جماعت سنت مؤکدہ ہے، پس نوافل میں جماعت کرنا سنت مؤکدہ اور صحابہ وخلفاء راشدین کے عمل کے خلاف ہونے کی وجہ سے مکروہ ہوگا۔''(۱)

حضرت مفتی محمود حسن گنگوہی کا فتوی

مفتی اعظم ہند حضرت مولانا مفتی محمود حسن گنگوہی رحمہ اللہ سے سوال کیا گیا کہ رمضان المبارک میں بعد تراویح صلوۃ نافلہ پڑھنا درست ہے یا نہیں۔ ہمارے محلّہ کی مسجد میں بڑے اہتمام سے پڑھی جاتی ہے۔ آپ نے اس کا جواب تحریر فرمایا ہے:

''یہ جماعت علی سبیل التداعی ہے جو کہ مکروہ ہے۔''(۲)

پھر ایک سوال اور کیا گیا ہے کہ تہجد کی نماز با جماعت ادا کرنا کیسا ہے؟ اس کا جواب آپ نے دیا کہ یہ بھی علی سبیل التداعی مکروہ ہے۔(۳)

علامہ عبد الشکور لکھنوی کا فتوی

حضرت امام ربانی علامہ عبد الشکور لکھنوی رحمہ اللہ ''**علم الفقہ**'' میں تحریر فرماتے ہیں:

''مکروہ تحریمی ہے نماز کسوف میں اور تمام نوافل میں بشرطیکہ اس اہتمام سے ادا کی جائیں جس اہتمام سے فرائض کی جماعت ہوتی ہے، یعنی اذان واقامت کے ساتھ یا اور کسی طریقہ سے لوگوں کو جمع کر کے،

(۱) اعلاء السنن: ۷/۱۸

(۲) فتاوی محمودیہ: ۲/۱۶۰

(۳) فتاوی محمودیہ: ۲/۱۶۰

ہاں اگر بے اذان واقامت اور بے بلائے ہوئے دوتین آدمی جمع ہوکر کسی نفل میں جماعت کرلیں تو دوشرطوں سے جائز ہے ایک یہ کہ اذان واقامت نہ ہواور کسی بھی طریقے پر لوگوں کو جمع نہ کیا جائے۔ دوسرے یہ کہ صرف دو یا تین آدمی ہوں ورنہ مکروہ تحریمی ہے۔''(۱)

امام مالک وامام شافعی ودیگر ائمہ کرام کے فتاوے

اوپر علماء احناف کا نقطۂ نظر اوران کے فتاوی نقل کیے گئے تھے۔اب ہم دیگر علماء وائمہ کا مسلک وفتویٰ بھی مختصر طور پر پیش کرتے ہیں۔امام مالک رَحِمَہُ اللّٰہُ کا مسلک ان کے شاگرد امام ابن وہب رَحِمَہُ اللّٰہُ نے یہ نقل کیا ہے کہ''اگر چندافراد نفل کی جماعت کرلیں تو کوئی حرج نہیں،لیکن اگراس کی شہرت ہوگئی یااس کے لیے لوگ جمع ہونے لگے تو اجازت نہیں۔(۲)

ملاعلی القاری رَحِمَہُ اللّٰہُ کی شرح الشمائل سے اعلاء السنن میں نقل کیا گیا ہے کہ انہوں نے فرمایا کہ:

''ابن حجر ہیثمی شافعی رحمہا اللّٰہ اورشافعی مذہب کے دیگر علماء نے تصریح کی ہے کہ نفل میں جماعت کرنا مشروع نہیں ہے۔''(۳)

نیز ملاعلی قاری رَحِمَہُ اللّٰہُ فرماتے ہیں کہ:

''فروع میں تصریح کردی گئی ہے کہ جب چار مقتدی ہوں تو نفل کی جماعت تمام فقہاء کے نزدیک مکروہ ہے۔''(۴)

---

(۱) علم الفقه: ۹۷/۲

(۲) فتح الباری: ۶۲/۳

(۳) اعلاء السنن: ۸۳/۷

(۴) اعلاء السنن: ۸۳/۷

اس سے ثابت ہوا کہ تداعی واہتمام کے ساتھ جماعتِ نفل کا کوئی بھی قائل نہیں ہے، تمام علماء وائمہ اس کو مکروہ قرار دیتے ہیں، اس سے پتہ چلا کہ بعض جاہل لوگوں میں جو یہ مشہور ہے کہ امام شافعی رَحِمَہُ اللّٰہُ کے نزدیک نفل کی جماعت جائز ہے، یہ غلط ہے، بلکہ تمام فقہاء کے نزدیک جماعتِ نفل کا اہتمام ناجائز ہے اور مکروہ ہے۔

خاتمہ اور دعا

فقہاء کرام کی ان تصریحات سے مسئلہ بالکل صاف ہوگیا نفل نماز خواہ تہجد ہو یا کوئی اور با جماعت ادا کرنا جب کہ چار یا اس سے زیادہ مقتدی ہوں یا اس کا اہتمام کیا جائے یا اس کی شہرت ہوجائے بدعت اور مکروہ ہے۔ اور یہ ظاہر ہے کہ جن مساجد میں جماعت نفل ہوتی ہے وہاں اس کا اہتمام ہوتا ہے، حفاظ کو تیار کر کے بلایا جاتا ہے، پھر مقتدی بھی ایک دوسرے کو بلاتے ہیں، اس کی شہرت ہوتی ہے لوگ اس کے لئے خاص طور پر جمع ہوتے ہیں، غور کیجئے کہ ان فقہاء کے کلام سے کیا اس کا بدعت ومکروہ ہونا ثابت نہیں ہوتا، اگر ثابت ہوتا ہے تو اس سے بچنا کیا ضروری نہیں ہے، اللہ سے دعا ہے کہ وہ دین کا صحیح فہم اور اس کی صحیح اتباع عطا فرمائے اور مسلمانوں کو ہر بدعت وگمراہی سے بچائے۔ آمین

فقط

حررہ العبد محمد شعیب اللہ خان عفی عنہ

کوئی بتا سکتا ہے کہ رحمِ مادر میں کیا ہے؟
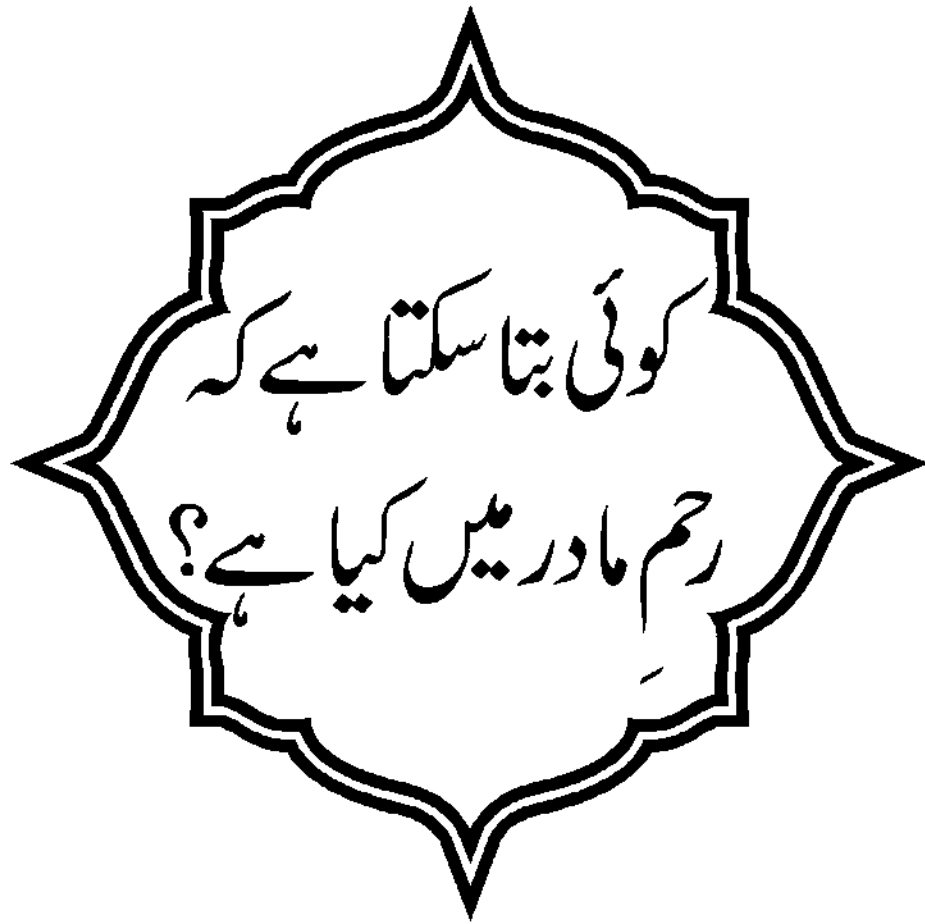
بسم اللہ الرحمن الرحیم

حرفِ آغاز

حامداً و مصلیًا. امابعد، زیرِ نظر رسالہ دراصل ایک مضمون کی شکل میں لکھا گیا تھا، جو ہفتہ وار اخبار ''عروجِ ہند بنگلور'' میں ''کیا ڈاکٹر بتا سکتے ہیں کہ رحم مادر میں کیا ہے'' کے عنوان سے قسط وار شائع ہوا۔ مضمون کی اہمیت کے پیشِ نظر خیال تھا کہ اس کو مستقل رسالہ کی شکل میں شائع ہونا چاہیے، پھر بعض حضرات نے خطوط لکھ کر اس پر متوجہ کیا تو اس خیال کو اور تقویت ہوئی اور اس کا مصمم ارادہ ہو گیا، پھر کچھ اضافے کے ساتھ اس کو مرتب کیا گیا، اور رسالہ کی شکل دی گئی۔

اس رسالہ میں ان عربی عبارتوں کو بھی بعینہ شامل کر لیا گیا ہے، جو اصلی مضمون میں بہ قصد اختصار حذف کر دی گئی تھیں اور صرف ان کے ترجمہ پر اکتفا کیا گیا تھا، اور بعض علما کا کلام جو اصل مضمون میں نہیں لیا گیا تھا، اس کو بھی اس میں شامل کر لیا گیا ہے۔

مصنف کو اس رسالہ کو پیش کرتے ہوئے نہایت ہی خوشی محسوس ہو رہی ہے، اس لیے کہ یہ قرآن کی تفسیر و توضیح کے سلسلے کی ایک کڑی ہے، جس سے قرآن کی صداقت کو آشکارا کیا گیا ہے، دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کو مقبولیت سے نوازے۔

فقط

محمد شعیب اللہ

۸/ جمادی الاخری ۱۴۰۸ھ

تمہید

سائنس جوں جوں ترقی کی راہیں طے کرتی جارہی ہے،لوگوں کی ذہنیت ہزار ہاقسم کے شکوک وشبہات کے زہر سے آلودہ ومسموم ہوتی جارہی ہے۔اس نے جہاں بہت سے لاینحل مسائل کا حل پیش کیا۔وہیں قرآن واسلام کے متعلق بہت سے مسائل پیدا کردیئے ہیں جس سے بہت سے لوگوں کے عقیدے متزلزل ہوتے جارہے ہیں۔

واقعی اس میں شک نہیں کہ موجودہ دورلوگوں کے لیے نہایت ہی ابتلاوآزمائش کا دور ہے۔غالبًا حضرت محمد صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے اسی دور کے متعلق یہ فرمایا تھا:

''ایک زمانہ لوگوں پرایسا آئے گا جس میں دین پر قائم رہنے والا اس آدمی کے مانند ہوگا جس نے اپنی مٹھی میں انگارا لے لیا ہو''۔(۱)

اورایک موقع پرآپ نے ارشادفرمایا کہ:

''اعمال میں جلدی کروان فتنوں کے پیش آنے سے پہلے جوتاریک رات کے ٹکڑوں کی طرح ہوں گے۔آدمی صبح ایمان کی حالت میں اٹھے گا اورشام کو کافر ہوجائے گا اورشام کومومن ہوگا اورصبح کو کافر ہوجائے گا۔(۲)

اورغالبًا اسی زمانہ کے بارے میں یہ بھی فرمایا ہے کہ:

''عن قریب فتنوں کا ظہور ہوگا ان میں بیٹھنے والا، کھڑے ہونے

(۱) ترمذی:۲۱۸٦

(۲) مسلم:۲/۳۸۹

والے سے، اور کھڑا ہونے والا، چلنے والے سے، اور چلنے والا، دوڑنے والے سے بہتر ہوگا"۔(۱)

چناں چہ من جملہ ان امور کے جن میں ترقی سے بہت سے لوگ شبہات کے دَل دَل میں پھنسے ہوئے ہیں، ایک یہ بھی ہے کہ حاملہ کہ رحم میں لڑکا یا لڑکی ہونے کی، بعض آلات واسباب کے ذریعہ تشخیص وتعیین کی جارہی ہے۔ چناں چہ کئی لوگوں کو اس کا تجربہ ہوا ہے کہ اطبا اور ڈاکٹروں نے جس بات کی خبر دی ہے، وہ سچی ثابت ہوئی، اس سے بعض لوگوں کو یہ شبہ دامن گیر ہوا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس بات کے علم کو کہ رحمِ مادر میں کیا ہے، اپنی ذات کے ساتھ خاص قرار دیا ہے، جیسا کہ سورۂ لقمان کی آخری آیت کریمہ میں ہے، تو پھر بتانے والے کیسے بتادیتے ہیں کہ رحم مادر میں لڑکا ہے یا لڑکی؟ اور یہ بھی نہیں کہ محض اٹکل واندازہ سے بتادیتے ہوں؛ بل کہ بعض آلات واسباب جدیدہ نے اس قدر آسانیاں اور سہولتیں بہم پہنچادی ہیں کہ حقیقت واقعہ کا صاف انکشاف ہوجاتا ہے اور بلاتردد وتذبذب وہ اس بات کو جان لیتے اور اوراس کی خبر دیتے ہیں کہ رحم مادر میں کیا ہے اور وہ خبر بالکل صحیح نکلتی ہے۔

اس موقعہ پر اس سے متاثر ہونے والوں کی دو متضاد قسمیں سامنے آتی ہیں، ایک وہ جسے قرآن وصاحب قرآن کی عظمت وبڑائی کا احساس ہے، جس کا ایمان بڑا مضبوط اور راسخ ہے۔ جس کا قلب اللہ ورسول کی صداقت کا معترف ہے، ایسے لوگوں کو اس وقت نہ اللہ تعالیٰ کے کلام کی صداقت میں شبہ ہوتا ہے، نہ ان کے ایمان میں تزلزل واقع ہوتا ہے، یہ حضرات جن کے نفوس ایمان کی دولت سے مالا مال ہیں، جس طرح پہلے اللہ ورسول کی صداقت اور ان کی باتوں کی حقانیت کے معترف ومقرّ

(۱) مسلم:۲/۳۸۹

تھے، اب بھی ایمان واطمینان رکھتے ہیں۔

ہاں البتہ ان لوگوں کو کچھ اشکال ہوتا ہے تو یہ کہ ہمارے معلومات اور اللہ کے کلام میں جو ٹکراؤ معلوم ہو رہا ہے وہ کیوں؟ قرآن کی آیت تو اپنی جگہ اٹل ہے، اس کا حرف حرف صداقت کا حامل ہے، اس کی کوئی بات جھوٹی اور خلاف واقعہ نہیں ہوسکتی، تو پھر ہمارے علم کا اس سے ٹکراؤ کیوں ہوا؟ کیا ہمیں غلط خبر ملی ہے یا ہم نے غلط سنا ہے؟ یا آیت کا مطلب ہم نے غلط سمجھا ہے، بہ الفاظ دیگر وہ ہر غلطی کو اپنی طرف منسوب کرتے ہیں، یاد رہے کہ یہ وہی شبہ ہے جو ہزار ہا یقین سے بہتر ہے اور جس کو حدیث میں ''**ذاک صریح الایمان**'' کہا گیا ہے، یہ وسوسہ نہیں یقین کیجیے کہ دفع وسوسہ ہے، یہ کفر نہیں صریح ایمان ہے، یہ شک وریب نہیں، ایمان وایقان کا اعلیٰ مقام ہے۔

دوسری قسم ان لوگوں کی ہے جو اللہ ورسول کی صداقت میں شک کرتے ہیں، قرآن جنھیں چودہ سو سال قدیم نظریات کی حامل کتاب نظر آتا ہے، جو کلام اللہ میں ترمیم واصلاح کی ضرورت کے مدعی ہیں، ایسے لوگوں کو یہ بات محض شک میں نہیں؛ بل کہ صریح کفر کے ہاویہ میں گرا دیتی ہے، جو اسی کو قرآن کی صداقت کے خلاف ایک زبردست دلیل خیال کرتے ہیں، یہ وہ لوگ ہیں جن کا مقصد قرآن کا ابطال ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ عقل ودانش سے کورے اور حماقت میں سب سے آگے ہوتے ہیں۔

اس صورت میں علمائے دین کی ذمہ داری اور ان کا اولین فریضہ ہے کہ قرآن کی حقانیت کو ثابت کر دکھائیں، اور جہاں پہلی قسم کے لوگوں کے لیے ایمان میں جلا اور قلب کی طمانینت کا سامان بہم پہنچائیں، وہیں دوسری قسم کے لوگوں کی زبان بند کردیں اور اسلام وقرآن کے خلاف ان کی سازشوں کو ناکام بنادیں اور ان کی

ناپاک امیدوں اور ناجائز آرزؤں کو پوری ہونے نہ دیں۔

مگر کس قدر تعجب اور تعجب سے زیادہ حیرت اور حیرت سے بڑھ کر افسوس کی بات یہ ہے کہ بعض علما نتائج سے بے پرواہو کر اس بات کی جرأت کرتے ہیں کہ صاف اس سے انکار کردیں کہ ڈاکٹر آلات واسباب کی بنیاد پر رحم مادر کی اندرونی چیز کو جان لیتے یا جان سکتے ہیں، بلاشبہ قرآن کے خلاف کوئی بات سامنے آئے تو اس کا انکار کرنا ہی چاہئے ؛لیکن بلا غور وفکر محض سطحی مطالعہ وعلم کی بنا پر ایک واقعہ کا انکار کردینا (بغیر اس کے کہ کم از کم اس واقعہ کی کوئی تاویل کریں) میرے نزدیک وہی نتیجہ پیدا کرسکتا ہے، جو یورپ میں سائنس اور کلیسا کی جنگ کا ہوا جس نے یوروپ سے کلیسا کا اقتدار ہی ختم کردیا۔

جب بعض لوگوں نے مجھ سے اس شبہ کا اظہار کیا اور یہ بھی معلوم ہوا کہ بعض علما نے ڈاکٹروں کی اس کارروائی کو محض ایک فریب اور دھوکہ قرار دیتے ہوئے، اس واقعہ کا انکار کیا تو میں نے ضروری سمجھا کہ اس سلسلہ میں قلم اٹھاؤں، چناں چہ اسی خیال سے چند سطور حوالۂ قرطاس کرنے کی سعادت حاصل کررہا ہوں۔

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس مقصد کی تکمیل میں مدد فرمائے اور اس کو میرے لیے ذخیرۂ آخرت اور لوگوں کے لیے نافع ومفید بنائے۔ آمین

محمد شعیب اللہ خان

بسم اللہ الرحمن الرحیم

آیت کریمہ کی تفسیر وتوضیح

مقصد پر بحث سے قبل ضروری ہے کہ ہم آیت کی تفسیر وتوضیح کر دیں، جس میں رحمِ مادر کی اندرونی چیز کے علم کو اللہ تعالیٰ کے ساتھ خاص قرار دیا گیا ہے، تاکہ وہ بات جو ہم یہاں بیان کرنا چاہتے ہیں، آسانی کے ساتھ بہ خوبی سمجھ میں آجائے، سورہ لقمان کی آخری آیت میں فرمایا گیا ہے:

﴿ إِنَّ اللّٰهَ عِنْدَهٗ عِلْمُ السَّاعَةِ وَيُنَزِّلُ الْغَيْثَ وَيَعْلَمُ مَافِي الْاَرْحَامِ وَمَاتَدْرِي نَفْسٌ مَاذَاتَكْسِبُ غَدًا وَّمَاتَدْرِيْ نَفْسٌ بِأَيِّ اَرْضٍ تَمُوْتُ إِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ خَبِيْرٌ. ﴾ (لقمان:۳۴)

(**ترجمہ وتفسیر**: بے شک اللہ ہی کو قیامت کی خبر ہے اور وہی (اپنے علم کے موافق) مینہ برساتا ہے (بس اللہ کا علم اور قدرت بھی اسی کے ساتھ خاص ہے) اور وہی جانتا ہے جو کچھ (لڑکا یا لڑکی حاملہ کے) رحم میں ہے اور کوئی شخص نہیں جانتا کہ کل وہ کیا عمل کرے گا۔ (اس کی بھی اسی کو خبر ہے) اور کوئی شخص نہیں جانتا کہ وہ کس زمین میں مرے گا (اس کی بھی اسی کو خبر ہے اور انہیں چیزوں کی کیا تخصیص ہے جتنے غیوب ہیں) بے شک اللہ (ہی ان) سب باتوں کا جاننے والا (اور ان سے) باخبر ہے (کوئی دوسرا اس میں شریک نہیں۔ (۱)

آیت کریمہ کا شان نزول

ابن المنذر نے حضرت عکرمہ سے روایت نقل کی ہے کہ ایک شخص جس کو وارث

(۱) تفسیر بیان القرآن-سورۂ لقمان

ابن عمر کہا جاتا تھا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا کہ اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم ! قیامت کب آئے گی؟ اور ہمارے شہر قحط زدہ ہیں وہ کب سرسبز و شاداب ہوں گے، (یعنی بارش کب ہوگی؟) اور میں اپنی عورت کو حاملہ چھوڑ کر آیا ہوں، وہ کب جنے گی؟ اور میں جانتا ہوں کہ آج میں نے کیا کیا، پس میں کل کیا کروں گا اور میں جانتا ہوں کہ میں کہاں پیدا ہوا پس میں کہاں مروں گا؟ اس کے جواب میں یہ آیت کریمہ نازل ہوئی۔ (۱)

اور امام قرطبی نے امام تفسیر حضرت مقاتل سے نقل کیا ہے کہ یہ آیت اہل صحرا میں سے ایک شخص کے بارے میں نازل ہوئی ،جس کو وارث بن عمرو بن حارثہ کہا جاتا تھا، اس نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر سوال کیا کہ میری عورت حاملہ ہے، وہ کیا جنے گی؟ اور ہمارے شہر قحط زدہ ہیں، بارش کب ہوگی؟ اور میں جانتا ہوں کہ میں نے آج کیا کیا، بتائیے کل میں کیا کروں گا؟ اور میں جانتا ہوں کہ میں کب پیدا ہوا، بتائیے کہ میں کب مروں گا؟ اور بتائیے قیامت کب آئے گی؟ اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ (۲)

عکرمہ کی روایت میں ''کب جنے گی'' سوال نقل کیا گیا ہے اور مقاتل کی روایت میں ''کیا جنے گی'' کے الفاظ ہیں، آیت سے انطباق میں پہلی روایت کے بہ نسبت دوسری روایت کے الفاظ زیادہ قریب ہیں، اسی طرح دوسری روایت میں سوال ''کب مروں گا'' نقل کیا گیا ہے جب کہ پہلی روایت میں ''کہاں مروں گا'' منقول ہے، یہاں آیت سے پہلی روایت کے الفاظ زیادہ قریب ہیں' قرین قیاس یہ ہے کہ یہ نقل روایت میں راویوں کے سہو کا نتیجہ ہے، کیوں کہ واقعہ ایک ہے یا یہ بھی ممکن ہے

(۱) روح المعانی:۱۱/۱۰۹

(۲) تفسیر قرطبی:۱۴/۸۳

کہ سائل نے دونوں ہی قسم کے سوال کیے ہوں، اور آیت میں ایک کا جواب صراحت سے دوسرے کا دلالۃً دیا گیا ہو جیسا کہ اہل نظر سے مخفی نہیں۔

آیت میں حصر کا مفہوم

اس آیت میں مذکورہ پانچ باتوں کے علم کو اللہ تعالیٰ نے کئی طرح اپنی ذات کے ساتھ مخصوص قرار دیا ہے، کیوں کہ اس کا پہلا جملہ ''اِنّ اللّٰہَ عِندَہٗ عِلْمُ السَّاعَۃِ'' کئی طرح حصر کا مفہوم دیتا ہے۔

(۱) اس جملہ میں '' **عندہ** '' کو '' **علم الساعۃ** '' پر مقدم کیا گیا ہے، حالاں کہ ''عندہ'' خبر اور ''علم الساعۃ'' مبتدا ہے اور نحو کا ادنیٰ طالب علم بھی جانتا ہے کہ مبتدا مقدم اور خبر مؤخر ہوتی ہے، لہٰذا بہ قاعدہ ''**تَقْدِیْمُ مَاحَقَّہٗ التاّخِیْرُ یُفِیْدُ الْحَصْرَ**'' یہاں حصر پیدا ہو گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی کے پاس قیامت کا علم ہے۔

(۲) اللہ تعالیٰ کے نام کو مقدم کر کے اس پر خبر ''**عندہ**'' کی بنا کی گئی ہے جو حصر کا فائدہ دیتا ہے، چناں چہ کہا گیا ''بلاشبہ اسی کے پاس قیامت کا علم ہے''۔ جب کہ ''**اللّٰہ یعلم الساعۃ** '' بھی کہا جا سکتا تھا۔

(۳) خود لفظ ''**عند**'' حصر و اختصاص کا فائدہ دیتا ہے، کیوں کہ '' **عند** '' سے جس چیز کے بارے میں خبر دی جاتی ہے، اس کے محفوظ و محصور ہونے پر یہ دلالت کرتا ہے کہ کوئی اس تک نہیں پہنچ سکتا۔ (۱)

جب اس جملہ میں کئی طرح اختصاص و حصر مفہوم ہوا تو جو جملے اسی سباق میں وارد ہوئے ہیں، ان میں بھی حصر کا مفہوم ملحوظ ہوگا، کیوں کہ آیت اسی مقصد سے نازل کی گئی ہے کہ ان چیزوں کے علم کا اللہ تعالیٰ کے ساتھ مخصوص ہونا بتایا جائے۔

---

(۱) روح المعانی: ۱۰۹/۱۲

چناں چہ حضرت حکیم الامت تھانوی رحمہ اللہ بیان القرآن میں فرماتے ہیں:

"غیث" (بارش) یا مافی الارحام (جو کچھ رحم میں ہے) کہ علم سے اختصاصِ علم پر کیسے دلالت ہوئی؟ جواب یہ ہے کہ قرینۂ مقام سے ہوئی"۔ (۱)

خلاصہ اس سوال و جواب کا یہ ہے کہ آیت میں اللہ تعالیٰ نے صرف یہ فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ بارش نازل کرتا ہے (لہٰذا اس کے وقت کو بھی وہ جانتا ہے) اور رحم میں کیا ہے، اس کو بھی اللہ جانتا ہے، یہ تو نہیں فرمایا کہ دوسرے اس کو نہیں جانتے پھر اس سے اختصاصِ علم پر کیسے دلالت ہوئی؟ اس کا جواب حضرت تھانوی رحمہ اللہ نے یہ دیا ہے کہ قرینہ قیاس سے معلوم ہوا کہ یہاں مراد یہی ہے کہ یہ علم اللہ تعالیٰ کے ساتھ خاص ہے پھر معلوم ہوا کہ ان چیزوں کا علم صرف اللہ کو ہے، کسی اور کو نہیں۔

احادیثِ تفسیریہ

نیز بہت سی احادیث سے بھی یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہاں ان علوم کا اللہ تعالیٰ کی ذات کے ساتھ اختصاص بتانا مقصود ہے، یہاں چند حدیثیں درج کرتا ہوں۔

(۱) حضرت بریدہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ پانچ چیزیں ہیں جن کو سوائے خدا تعالیٰ کے کوئی نہیں جانتا، پھر آپ نے یہی آیت "اِنَّ اللّٰهَ عنده علم الساعة" الخ پڑھی۔ (۲)

(۲) حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مجھے ہر چیز کے علم کی کنجیاں عطا کی گئیں ہیں، سوائے پانچ چیزوں کے پھر آپ

(۱) تفسیر بیان القرآن-سورۂ لقمان
(۲) مسند احمد: ۸/۲۱۹

نے یہی آیت تلاوت فرمائی۔ (۱)

(۳) بنی عامر میں سے ایک آدمی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ اے اللہ کے رسول! کیا علم میں سے کچھ باقی ہے جو آپ نہ جانتے ہوں، آپ نے فرمایا کہ بلاشبہ اللہ نے مجھے بھلائی سکھائی اور بلاشبہ علم میں سے ایسی بھی چیزیں ہیں جو خدا تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں جانتا، یعنی پانچ چیزیں، پھر آپ نے یہی آیت پڑھی۔ (۲)

(۴) حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا تمہارے نبی کو ہر چیز کے علم کی کنجیاں دی گئیں سوائے پانچ کے، پھر آپ نے یہی آیت پڑھی۔ (۳)

یہ اور ان جیسی روایات جو آیت کریمہ کی تفسیر کے طور پر علمائے تفسیر نے نقل کی ہیں، ان سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ مذکورہ پانچ باتوں کا علم ذات باری کے ساتھ خاص ہے جس میں نہ کوئی ولی اس کا ساجھی ہے نہ کوئی نبی اس کا شریک ہے۔

رجوع بہ مقصد

مذکورۂ صدر امور کی وضاحت کے بعد، ہم اصل مقصد کی طرف متوجہ ہوتے ہیں جس کے لیے ہم یہ رسالہ لکھ رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اس کی توفیق بخشے۔

علم سے کون سا علم مراد ہے؟

ہمیں درپیش اشکال کو حل کرنے اور اصل حقیقت کو پانے کے لیے سب سے اہم تحقیق یہ ہے کہ آیت کریمہ میں علم سے کون سا علم مراد ہے؟

---

(۱) احمد:۵۳۲۲

(۲) احمد:۲۳۴۶

(۳) روح المعاني:۲۱/۱۱۱، قرطبی:۱۴/۸۲

یہ تو ظاہر ہے کہ یہاں علم سے مطلق علم مراد نہیں ہوسکتا، کیوں کہ مطلق علم جو اندازوں اور تخمینوں کو بھی شامل ہے اور مختلف ذرائع، آلات واسباب سے بھی حاصل ہوجاتا ہے اور وحی، الہام اور کشف کے واسطوں سے بھی عطا ہوجاتا ہے، یہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ خاص نہیں؛ بل کہ یہ اللہ کی شان کے لائق بھی نہیں، کیوں کہ ایسا علم تو مخلوقات کو بھی حاصل ہے پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ جس علم کو اپنے ساتھ خاص فرما رہے ہیں، اس سے ہم وہ علم مراد لیں جو اللہ تعالیٰ کے ساتھ خاص نہیں، بلکہ مخلوقات کو بھی حاصل ہے، اس لیے یہاں ایسا علم مراد لینا ضروری ولازم ہے جو اللہ تعالیٰ کی شان کے لائق ہو اور اس کے ساتھ خاص قرار دیا جاسکتا ہو اور اللہ تبارک وتعالیٰ کے ساتھ وہی علم خاص اور اس کے شایانِ شان ہے جو اس کا خانہ زاد اور ذاتی علم ہو اور بلا کسی واسطہ اور ذریعہ کے اس کو حاصل ہو۔ وجہ یہ ہے کہ وہ علم جو کسی واسطہ یا ذریعہ سے حاصل ہوا ہو، وہ اس کے شایانِ شان نہیں ہوسکتا، کیوں کہ یہ احتیاج کی علامت ہے اور اللہ تعالیٰ ہر قسم کی احتیاج سے پاک ومنزہ ہیں، نیز وہ علم اللہ تعالیٰ کے ساتھ خاص ہوگا جو ہر شی کو محیط ہو کر اس کے دائرہ علم سے کوئی شی باہر نہ ہو۔

خلاصہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ دو قسم کے علم خاص ہیں یا یوں کہیے کہ اللہ تعالیٰ کے علم کی دو قسمیں ہیں۔

(۱) ایک وہ علم جو بلا کسی واسطہ کے اس کو حاصل ہو، یعنی وہ اس کا ذاتی علم ہو، اسی علم کو علمِ غیب کہتے ہیں۔

(۲) دوسرا وہ علم جو ذرّہ ذرّہ کو محیط ہو اور اس کے دائرہ سے کوئی چیز باہر نہ ہو۔

مراد علم غیب اور علم محیط ہے

پس مراد علم غیب وعلم محیط ہے، اس کی صریح دلیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں دو

قسم کے علم کو اپنی ذات کے ساتھ خاص قرار دیا ہے۔ چناں چہ سورۂ انعام میں ارشاد فرمایا گیا ہے: ﴿وَعِنْدَهٗ مَفَاتِيْحُ الْغَيْبِ لَا يَعْلَمُهَآ اِلَّا هُوَ وَيَعْلَمُ مَا فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ﴾ (اوراسی کے پاس کنجیاں ہیں غیب کی کہ ان کو سوائے اس کے کوئی نہیں جانتا اور وہی جانتا ہے جو کچھ بر و بحر میں ہے) (آیت:۵۹) اس میں دو باتوں کو اللہ تعالیٰ کے ساتھ مخصوص قرار دیا گیا ہے، علم غیب کا علم اور موجودات کا محیط علم، کیوں کہ ''مافی البحر و البحر'' میں لفظ ''ما'' عام ہونے کی وجہ سے اس بات کا فائدہ دیتا ہے کہ اللہ تعالیٰ بر و بحر کی تمام چیزوں کو جانتے ہیں اور یہ پہلی بات کی طرح اللہ تعالیٰ کے ساتھ خاص ہے۔

اسی آیت کی تفسیر میں حضرت مفتی محمد شفیع صاحب علیہ الرحمہ فرماتے ہیں کہ:

> '' خلاصہ یہ ہے کہ علم کے متعلق دو چیزیں حق تعالیٰ کی خصوصیات میں سے ہیں جن میں کوئی فرشتہ یا رسول یا کوئی دوسری مخلوق شریک نہیں، ایک علم غیب دوسرے موجودات کا علم محیط، جس سے کوئی ذرّہ مخفی نہیں''۔(۱)

لہٰذا زیر بحث آیت میں بھی علم سے یا تو علم غیب مراد لینا چاہئے یا علم محیط، اس لیے کہ یہی وہ علم ہے جو اللہ تعالیٰ کے ساتھ خاص اور اس کے شان کے لائق ہے۔

آمدم بر سر مطلب

جب یہ بات واضح ہوگئی تو اب اس پر غور کیجیے کہ ہم نے مانا کہ ڈاکٹر اور اطبا رحم مادر میں کیا ہے؟ اس کو بعض آلات واسباب کے ذریعہ اس طرح جانتے ہیں کہ انہیں اس میں نہ کچھ شک وریب رہتا ہے نہ اس کے خلاف کوئی امکان؛ بل کہ وہ اس طرح

---

(۱) معارف القرآن:۳/ ۳۴۸

اس کو جانتے ہیں، جیسے جسم کی سطح ظاہر کی کسی چیز کو جان لیا جاتا ہے اور یہ کہ ان کا علم نفس الامر اور حقیقت کے مطابق ہوتا ہے جس کی تصدیق ولادت کے وقت ہو جاتی ہے۔

لیکن کیا اس سے آیت کی تکذیب ہو جاتی ہے؟ اور کلام الٰہی کا بطلان لازم آتا ہے؟ کیا اس سے اللہ کے رسول کی صداقت میں شبہ کی گنجائش پیدا ہو جاتی ہے؟ اہل اسلام نے جس کو عقیدہ بنایا اور جس کی تلقین کرتے رہے اور چودہ سو سال تک جس کو ایک حقیقت خیال کرتے رہے کیا یہ سب ایک دھوکہ، فریب اور وہم تھا؟ ہرگز نہیں، حقیقت یہ ہے کہ اس واقعہ کا آیت سے کوئی تعارض اور ٹکراؤ نہیں، آیت جس چیز کی مدعی ہے واقعہ مذکور نے اس کی تکذیب نہیں کی اور واقعہ سے جو امر ثابت ہوتا ہے آیت اس کے خلاف نہیں، کیوں کہ آیت نے یہ بتایا کہ اللہ کے سوا کوئی اور مافی الارحام کا علم غیب یا علم محیط نہیں رکھتا اور ڈاکٹروں نے جو کچھ جانا وہ نہ علم غیب ہے اور نہ علم محیط، پھر بھلا آیت کی اس واقعہ سے تکذیب وتردید کیسے ہو جائے گی؟

علم غیب کی حقیقت

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ ہم نے اوپر یہ بات واضح کی ہے کہ آیت میں علم سے یا تو علم غیب مراد ہے یا علم محیط، یہ دو صورتیں ہوئیں، اگر آیت میں علم غیب مراد ہے کہ سوائے اللہ تعالیٰ کے کوئی اور ان چیزوں کا علم غیب نہیں رکھتا، تب تو ظاہر ہے کہ ماں کے پیٹ میں لڑکا ہے یا لڑکی، اس کو اس طور پر جان لینا جس کو علم غیب نہیں کہتے، آیت کے دعوے کے خلاف نہیں؛ مگر یہاں سوال یہ ہے کہ علم غیب کسے کہتے ہیں؟ واقعی جب تک اس کی حقیقت سے واقفیت نہ ہو جائے، بات صاف نہیں ہو سکتی اور یاد رہے کہ اس سلسلہ میں جس قدر اشکالات وشبہات پیدا ہوتے ہیں وہ سب اسی لیے کہ علم غیب کی حقیقت سے واقفیت نہیں ہوتی۔

غیب اصل میں مصدر ہے جس کے معنی ہیں غائب ومستور ہو جانا۔کہا جاتا ہے "غابتِ الشمسُ" کہ سورج آنکھوں سے غائب وپوشیدہ ہوگیا۔اوراصطلاح شریعت میں ان پوشیدہ چیزوں کوغیب کہتے ہیں،جن پرکوئی قرینہ ودلیل قائم نہ ہو۔(۱)

اورقرینہ سے مراد عام ہے خواہ قرینہ حسی ہو یا نقلی،قرینہ حسی کی مثال یہ ہے کہ ڈاکٹرنبض دیکھ کر،اس کی سرعت وتیزی سے یہ جان لیتا ہے کہ یہ شخص بیمار ہے،اس مثال میں ڈاکٹر کا کسی شخص کی بیماری معلوم کرلینا چوں کہ قرینہ حسّیہ کی بناپر ہے،اس

(۱) اعلم ان اطلاق الغیب علی الشئ الغائب الذی لم تنصب له قرینه باعتباره بالناس ونحوهم من المخلوقات لاباعتباره بالله عزوجل فانه سبحانه لایغیب منه شی. فان قلت فعل هذا یمکن ان یقال انه جل وعلا لایعلم الغیب قصداً الی انه لاغیب بالنسبة الیه تعالیٰ.قلت نعم ولکنه لایجوزشرعاً لان فی ذلک سوء الادب والایهام والمصادمة لظواهرالأیات وقال الألوسی فی روح المعانی (۱۰/۲۰) مانصه "ولکن لایجوزان یقال انه جل وعلا لایعلم الغیب قصداً الی انه لاغیب بالنسبة الیه لیقال یعلمه وقد شنع الشیخ احمد السرهندی المشهوربالامام الربانی فی مکتوباته علی من قال ذلک قاصدا ماذکراتم تشنیع کماهوعادته" وکذارد الألوسی علی من قال ذلک فی تفسیره فی سورة الرعد (۱۳/۱۱۰) روح المعانی:۱۰/۲۰

غیب کی اصل تعریف یہی ہے اور بعض مقامات پر علماء نے جو یہ لکھا ہے کہ غیب کی دو قسمیں ہیں ایک وہ جس پر دلیل قائم ہو۔دوسرا وہ جس پر دلیل نہ ہو۔یہ ایک خاص مقام کے اقتضا سے مجازاً کہا گیا ہے،مثلاً قرآن مجید میں ایک جگہ فرمایا"الذین یومنون بالغیب"............کہ وہ غیب کی باتوں پر ایمان لاتے ہیں"اورغیب سے مراد اللہ کی ذات وصفات،جنت،جہنم وغیرہ ہیں، جن کے وجود پر قرینہ ودلیل ہی نہیں؛بل کہ دلائل وقرائن قائم ہیں تو سوال ہوگا کہ جب ان چیزوں کے وجود پر دلائل موجود ہیں تو ان پر ایمان بالغیب کہاں ہوا؟مفسرین نے اس اعتراض کو دفع کرنے کے لیے غیب کو دو قسموں پر تقسیم کیا ہے،ان میں سے ایک غیب حقیقی ہے،دوسرا مجازی۔اور یہ چیزیں مجازاً غیب کہلاتی ہیں۔

لیے اس کو علم غیب نہیں کہتے ، اور قرینہ عقلی کی مثال یہ ہے کہ ایک شخص ایک جگہ دھواں اٹھتا ہوا دیکھ کر یہ جان لیتا ہے کہ یہاں آگ موجود ہے تو چوں کہ اس کو آگ کا علم دھویں کے قرینہ سے ہوا، اس لیے اس کو غیب کا علم نہیں کہیں گے اور قرینہ نقلی کی مثال یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے وحی والہام کے ذریعہ نبی یا ولی کو کسی بات کی خبر دیں تو ان چیزوں کے علم کو بھی غیب کا علم نہیں کہہ سکتے ، اسی وجہ سے حضرات انبیاء علیہم السلام واولیاء کرام کو عالم الغیب نہیں کہا جا سکتا۔

غیب کی تعریف اس سے بھی واضح ؛ مگر مختصر لفظوں میں حضرت قاضی ثناء اللہ پتی رحمہ اللہ نے تفسیر مظہری میں بیان فرمائی ہے:

”لفظ غیب سے وہ چیزیں مراد ہیں جو ابھی وجود میں نہیں آئیں یا وجود میں تو آ چکی ہیں، مگر اللہ تعالیٰ نے ان پر کسی کو مطلع ہونے نہیں دیا۔ (۱)

الغرض علم غیب ان چیزوں کے جاننے کو کہتے ہیں جن پر مطلع ہونے کی کوئی راہ و سبیل نہ ہو اور جن پر مطلع ہونے کے لیے ذرائع واسباب موجود ہوں، ان کا جان لینا علم غیب نہیں۔

ڈاکٹروں کا علم، علم غیب نہیں

اب علم کی حقیقت کو مد نظر رکھتے ہوئے ، اس بات پر غور کیجیے کہ ڈاکٹر کو جو رحم مادر کی اندرونی چیز کو جان لیتے ہیں، وہ کیا بر بنائے علم غیب ہے؟ ہر گز نہیں ، کیوں کہ وہ اس کو بعض آلات واسباب کے ذریعہ جان لیتے ہیں جو کہ قرینہ حسیہ یا عقلیہ ہے اور اوپر معلوم ہو گیا کہ کسی قرینہ کی بناء پر کسی پوشیدہ بات کا معلوم کر لینا علم غیب نہیں ہے؛ بل کہ علم غیب تو یہ ہے کہ بلا کسی قرینہ وواسطہ کے محض ذاتی علم کی بنیاد پر کسی پوشیدہ

(۱) معارف القرآن: ۳/ ۳۳۵

حقیقت کو معلوم کرلیا جائے اور انسان کے یا کسی بھی مخلوق کے حق میں یہ بات ممکن نہیں ، کیوں کہ کسی بھی مخلوق کو ذاتی طور پر علم حاصل ہی نہیں ؛ بل کہ ذات کے لحاظ سے انسان اور دیگر مخلوقات جاہل ہیں ، اللہ تعالیٰ کے علم عطا کرنے پر وہ کچھ جاننے لگے ہیں ، انسان کے بارے میں قرآن نے کہا ہے: ﴿وَاللّٰهُ اَخْرَجَكُمْ مِنْ بُطُوْنِ اُمَّهَاتِكُمْ لَاتَعْلَمُوْنَ شَيْئاً﴾ (کہ اللہ تعالیٰ نے تمہیں تمہاری ماؤں کے پیٹ سے اس حال میں پیدا کیا تم کچھ نہیں جانتے تھے)۔ (النحل : ۷۸) جب انسان کا یہ حال ہے تو دیگر مخلوق کا کیا حال ہوگا جن کا مرتبہ و مقام انسان سے بمراتب کم ہے۔

حضرات انبیاء عالم الغیب نہیں

یہی وجہ ہے کہ حضرات انبیاء علیہم السلام کو بھی مطلع علی الغیب تو کہہ سکتے ہیں ؛ لیکن عالم غیب نہیں کہہ سکتے ، کیوں کہ انہیں اللہ تعالیٰ نے غیب پر مطلع کیا ہے ، نہ یہ کہ وہ ذاتی طور پر ان چیزوں سے واقف ہوتے ہیں۔

علامہ آلوسی بغدادی رحمہ اللہ اپنی تفسیر روح المعانی میں اسی سلسلہ میں بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

”ان علم الغيب المنفى عن غيره جل وعلاهوماكان للشخص لذاته اى بلاواسطه فى ثبوته لهٗ وهذاانمالايعقل لاحد من أهل السموات والارض لمكان الامكان فيهم ذاتاوصفةًوهويأبى ثبوت شئ لهم بلاواسطة وماوقع للخواص ليس من هذاالعلم المنفى فى شئ ضرورة انه من الواجب عزوجل اضافه عليهم بوجهٍ من وجوه الافاضة فلايقل انهم علموا الغيب وانمايقال انهم اظهروا واطلعوا

علی الغیب اونحوذالک ممایفهم الواسطه فی ثبوت العلم لهم اه". (۱)

(علم غیب جس کی غیر اللہ سے نفی کی گئی ہے وہ ہے جو کسی کو ذاتی طور پر حاصل ہو یعنی اس کے ثابت ہونے میں کسی کا واسطہ نہ ہو اور یہ بات (کہ بلاواسطہ علم حاصل ہو جائے) زمین و آسمان والوں میں سے کسی کے لیے بھی عقل باور نہیں کرتی کیوں کہ یہ (مخلوقات) ذات وصفت کے لحاظ سے ممکنات میں سے ہیں اور امکان (ممکن ہونا) بلاواسطہ ان کے لیے کسی شی کے ثبوت سے اباء وانکار کرتا ہے اور جو خواص کو حاصل ہوتا ہے وہ اس (علم غیب) میں سے نہیں ہے جس کی غیر اللہ سے نفی کی گئی ہے کیوں کہ یہ ان حضرات پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے وجوہ اضافہ میں سے کسی طریقہ سے افاضہ ہوتا ہے اس لیے ان کے حق میں یوں نہیں کہہ سکتے کہ یہ غیب جانتے ہیں اس معنی کے لحاظ سے اور جو ایسا کہے وہ قطعی طور پر کافر ہے ہاں یوں کہا جائے گا کہ جو حضرات غیب پر مطلع کیے گئے ہیں وغیرہ جس سے ان کے علم کے حاصل ہونے میں واسطہ مفہوم ہو)۔

علامہ آلوسی بغدادی رحمۃ اللہ کی اس وضاحت سے دو باتیں مستفاد ہوئیں، ایک تو یہ کہ علم الغیب اسی علم کو کہتے ہیں جو ذاتی طور پر بلا کسی واسطہ کے حاصل ہو اور اسی علم کی غیر اللہ سے نفی کی گئی ہے، دوسرے یہ کہ حضرات انبیاء علیہم السلام اور اولیاء اللہ کو جو غیب کی باتیں معلوم ہوتی ہیں، یہ اللہ تعالیٰ کے واسطے سے ان کو حاصل ہوتی

---

(۱) روح المعانی:۲۱/۱۱۲

ہیں اس لیے ان کو عالم الغیب نہیں کہتے؛ بل کہ مطلع علی الغیب کہتے ہیں۔

پس ڈاکٹروں کا علم جو بعض آلات واسباب کے ذریعہ حاصل ہوتا ہے، اس کو کیسے علم غیب کہہ سکتے ہیں؟ جب کہ انبیاء علیہم السلام کے علم کو بھی علم الغیب نہیں کہا جاسکتا، پس ڈاکٹروں کے مافی الارحام کو جاننے سے آیت پر کوئی اعتراض نہیں ہوسکتا کیوں کہ آیت میں علم غیب ہی کو اللہ تعالیٰ کے ساتھ خاص کیا گیا ہے جو ڈاکٹروں کو حاصل نہیں اور نہ ہوسکتا ہے۔

غیر اللہ کو مافی الارحام کا علم عطا ہوسکتا ہے

یہی وجہ ہے کہ علماء نے آج سے کئی برس پہلے جب کہ سائنس کو اتنی ترقی نہیں ہوئی تھی، اس کی تصریح فرمادی ہے کہ اس آیت میں مذکورہ باتوں کی اطلاع اللہ تعالیٰ غیر اللہ کو کرسکتا ہے اور دوسرا اس کو جان سکتا ہے۔ چنانچہ علامہ آلوسی علیہ الرحمہ اپنی تفسیر میں علامہ قسطلانیؒ کے حوالہ سے رقم طراز ہیں:

> ”اللہ جل شانہ جب بارش کے برسانے اور اس کو جہاں وہ چاہتا ہے چلانے کا حکم دیتا ہے تو وہ فرشتے جو اس کام پر مسلّط وموکل ہیں، اس کو جان لیتے ہیں (کہ بارش کب اور کہاں ہوگی) اسی طرح وہ بھی اس کو جان لیتے ہیں جن کو اللہ تعالیٰ اپنی مخلوقات میں سے بتانا چاہتے ہیں۔ اور اسی طرح جب اللہ تعالیٰ ارادہ فرماتے ہیں رحم میں کسی شخص کو پیدا کرنے کا تو اللہ تعالیٰ اس فرشتہ کو جو اس کام پر مامور ہے اپنے ارادے سے مطلع فرمادیتے ہیں۔ چناں چہ بخاری میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے رحم پر ایک فرشتہ مقرر فرمایا ہے جو کہتا رہتا ہے کہ اے رب! اب یہ نطفہ بنا ہے، اے رب!

اب یہ علقہ بنا ہے، اب رب! اب یہ مضغہ بنا ہے، پس جب اللہ تعالیٰ اس کی تخلیق مکمل کرنا چاہتے ہیں تو وہ پوچھتا ہے کہ یہ لڑکا ہے یا لڑکی، نیک بخت ہے یا بد بخت اور اس کا کتنا رزق ہے اور کتنی عمر؟ اللہ تعالیٰ ان تمام باتوں کو لکھ دیتے ہیں جب کہ وہ ابھی ماں کے پیٹ میں ہے، اس کو وہ فرشتہ اور اللہ کی مخلوق میں سے جن کو اللہ تعالیٰ بتانا چاہیں، جان لیتے ہیں۔(۱)

علامہ ابن کثیر رحمہ اللہ نے بھی اپنی تفسیر میں اسی آیت کے تحت لکھا ہے کہ جس کو اللہ تعالیٰ چاہیں، بارش کے نزول کا وقت بتا دیتے ہیں، فرشتہ بھی جو اس کام پر مامور ہے اللہ کے بتانے سے اس کو جان لیتا ہے اور حضرت مولانا شیخ احمد جیون رحمہ اللہ نے "تفسیرات احمدیہ" میں لکھا ہے کہ اللہ تعالیٰ چاہے تو ان پانچ باتوں میں سے کسی بات پر دوسروں کو اطلاع دے سکتا ہے۔(۲)

علامہ قسطلانی اور ابن کثیر اور ملا جیون رحمہم اللہ کے بیانات اور علامہ آلوسی رحمہ اللہ کی تائید سے یہ بات صاف طور پر معلوم ہوئی کہ ان چیزوں کا علم غیر اللہ کو ہو سکتا ہے جب کہ خود اللہ تعالیٰ اس کے اسباب پیدا فرما دیں، خواہ وہ اسباب وحی والہام یا آلات جدیدہ ہوں؛ لیکن اس علم کو جو ان واسطوں سے حاصل ہوتا ہے، علم غیب نہیں کہا جاتا، جس کی نفی غیر اللہ سے کی گئی ہے۔

ایک شبہ کا جواب

یہاں ممکن ہے کسی ذہن میں یہ شبہ پیدا ہو کہ جب آیت کا منشا و مقصد یہ بتانا ہے

(۱) روح المعانی:۲۱/۱۱۲

(۲) تفسیر ابن کثیر:۴۰۵و۴۰۶

کہ علم غیب اللہ تعالیٰ کے ساتھ خاص ومخصوص ہے تو پھر پانچ چیزوں کی تخصیص کیوں ہے؟ جب کہ اللہ تعالیٰ تو صرف انہی پانچ چیزوں کو نہیں، تمام غیوب کو جانتے ہیں؟ تمام چیزوں کا علم غیب صرف اور صرف اللہ کے پاس ہے، کوئی دوسرا اس میں شریک نہیں۔

اس کا جواب یہ ہے کہ بلاشبہ اللہ تعالیٰ تمام چیزوں کا علم غیب رکھتے ہیں اور آیت کا منشا بھی یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے عالم الغیب ہونے اور غیر اللہ کے عالم الغیب نہ ہونے کی صراحت کی جائے؛ لیکن صرف پانچ باتوں کا آیت میں ذکر کرنا اس وجہ سے ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال انہیں پانچ باتوں کے بارے میں ہوا تھا، جیسا کہ پہلے آیت کے شان نزول میں ذکر کیا جا چکا ہے، لہٰذا جواب میں انہیں باتوں کا ذکر کیا گیا ہے، اس کو اتفاقی امر کہتے ہیں، ورنہ ان پانچ چیزوں کی خصوصیت نہیں، دوسری وجہ یہ ہے کہ عام طور پر لوگ انہیں پانچ چیزوں کی جستجو وتلاش میں رہتے ہیں اور نفوس انہیں پانچ چیزوں کے جاننے کے مشتاق ہوتے ہیں، اس لیے ان کا ذکر کیا گیا، ورنہ مراد یہی ہے کہ مطلق علم غیب اللہ تعالیٰ کے ساتھ خاص ہے۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ آیت کے آخر میں بہ طور تذییل یہ فرمایا گیا ہے: ''**اِنَّ اللّٰہَ عَلِیۡمٌ خَبِیۡرٌ**''۔ حضرت تھانوی رحمہ اللہ نے اس کی تفسیر یہ کی ہے:

''ان چیزوں کی کیا تخصیص ہے جتنے غیوب ہیں بے شک اللہ ہی ان سب باتوں کا جاننے والا اور ان سے باخبر ہے''۔(۱)

علامہ آلوسی رحمہ اللہ ''روح المعانی'' میں رقم طراز ہیں:

''والذی ینبغی ان یعلم ان کل غیب لایعلمہٗ الااللّٰہ

(۱) بیان القرآن، تفسیر سورۂ لقمان

عزوجل وليست المغيبات محصورة بهذه الخمس وانماخصت بالذ كر لوقوع السوال عنهااولانهاكثيراً ماتشتاق النفوس الى العلم بها". (۱)

(یہ بات جان لینا ضروری ہے کہ بلاشبہ ہرغیب سوائے خدا کے کوئی اس کونہیں جانتا اورغیب کی چیزیں ان پانچ میں منحصرنہیں ہیں اور خاص طور پران پانچ کا ذکر اس لیے کیا گیا کہ سوال انہیں کے جاننے کی طرف اکثر لوگ مشتاق ہوتے ہیں)

اورحضرت حکیم الامت تھانوی قدس سرہ بیان القرآن میں فرماتے ہیں کہ:

''جب علم غیب یعنی علم بلاواسطہ ہرشی کا اورعلم محیط مجموعہ اشیاء کا حق تعالیٰ کے ساتھ مختص ہے، پھران اشیاء خمسہ کے تخصیص ذکری کی کیا وجہ؟ سو اس کی دووجہ ہوسکتی ہیں، اول سوال ان ہی اشیاء سے کیا گیا تھا (کمافی الدرعن مجاہدوعکرمۃ) دوسری وجہ یہ ہے کہ اکثر نفوس ان اشیاء کے علم کے مشتاق زیادہ ہوتے ہیں۔ (۲)

علامہ شبیراحمد عثانی رحمۃ اللہ ترجمۂ شیخ الہند رحمۃ اللہ پرفوائد میں لکھتے ہیں:

''بہ ہرحال ان پانچ چیزوں کے ذکر سے تمام اکوان غیبیہ کے علم کلی کی طرف اشارہ کرنا ہے، حصر مقصودنہیں اور غالباً ذکر میں ان پانچ چیزوں کی تخصیص اس لیے ہوئی کہ ایک سائل نے سوال ان ہی پانچ باتوں کی نسبت کیا تھا، جس کے جواب میں یہ آیت نازل ہوئی،

(۱) روح المعانی:۲۱/۱۱۲

(۲) بیان القرآن،تفسیر سورۂ لقمان

کمافی الحدیث۔(۱)

مولانا ابوالاعلیٰ مودودی مرحوم تفہیم القرآن میں فرماتے ہیں:

''یہاں ایک بات اور بھی اچھی طرح سمجھ لینی ضروری ہے اور وہ یہ ہے کہ اس آیت میں امورِ غیب کی کوئی فہرست نہیں دی گئی ہے، جن کا علم اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کو نہیں ہے، یہاں تو صرف سامنے کی چند چیزیں مثالاً پیش کی گئی ہیں، جن سے انسان کی نہایت گہری اور قریبی دلچسپیاں وابستہ ہیں اور انسان ان سے بے خبر ہے، اس سے یہ نتیجہ نکالنا درست نہ ہوگا کہ صرف پانچ امورِ غیب ہیں، جن کو اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا، حالاں کہ غیب نام ہی ان چیزوں کا ہے جو مخلوقات سے پوشیدہ اور صرف اللہ پر روشن ہو۔''(۲)

یہیں سے ایک اور شبہ کا جواب بھی نکل آیا وہ یہ ہے کہ بعض احادیث میں مذکور ہے کہ غیب کی کنجیاں پانچ ہیں جن کو سوائے خدا کے کوئی نہیں جانتا اور وہ یہی پانچ چیزیں ہیں، اس سے بہ ظاہر یہی سمجھا جاتا ہے کہ صرف یہ پانچ اشیا ہیں جن کا علم اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کو نہیں، سوال یہ ہے کہ ان احادیث میں غیب کی کنجیاں صرف پانچ کیوں بتائی گئی ہیں، جن کا علم صرف اللہ کو ہے جب کہ تمام چیزوں کا علم غیب صرف اللہ کو ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ ان احادیث میں بھی حصر مقصود نہیں؛ بل کہ بعض اہم چیزوں کا بہ طور مثال ذکر مقصود ہے۔

جیسا کہ علامہ آلوسی رحمۃ اللہ فرماتے ہیں:

---

(۱) ترجمہ شیخ الہند: ۵۳۸

(۲) تفہیم القرآن ۴/۲۹

''اور جو احادیث میں (پانچ کا ذکر ہے) اس کو بعض اہم غیوب کے بیان پر محمول کریں گے نہ کہ حصر کے دعوے پر، کیوں کہ ان پانچ چیزوں کے علاوہ دوسرے غیوب کو بھی بلا شبہ اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا''۔(۱)

ملا جیون رحمہ اللہ نے بھی تفسیر احمدیہ میں پانچ چیزوں کے ذکر کو اہم غیوب کے ذکر پر محمول کیا ہے۔(۲)

الغرض پانچ چیزوں کی تخصیص سے یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ دوسری اشیاء کا علم غیب اللہ کے سوا دوسروں کو ہے، نہیں؛ بل کہ ہر غیب اللہ ہی کے قبضۂ قدرت میں ہے، یہ تخصیص ان وجوہات کی بناء پر ہے جو اوپر ذکر کی گئیں ہیں۔

ڈاکٹروں کا علم محیط نہیں

یہ تو اس صورت پر کلام تھا جب کہ آیت میں علم سے علم غیب مراد لیا جائے اور اگر علم سے علم محیط مراد ہو کہ بر و بحر کا کوئی ذرہ اس کے احاطہ علم سے باہر نہیں، تو بھی ظاہر ہے کہ ڈاکٹروں کا کسی کسی کے رحم کا حال جان لینا، آیت کے خلاف نہیں، کیوں کہ یہاں جس علم کی غیر اللہ سے نفی کی گئی ہے، وہ علم محیط ہے اور ظاہر ہے کہ ڈاکٹروں کو علم محیط حاصل نہیں، کہ دنیا کی تمام عورتوں کے رحموں کا حال وہ جانتے ہوں؛ بل کہ بعض بعض جزئیات کا ان کو علم ہے، جیسے مثلاً بنگلور کے یا کسی اور جگہ کے بارے میں کسی کا جان لینا کہ یہاں بارش کب ہوگی، آیت کے خلاف نہیں، جب کہ وہ کائناتِ دنیا کے ہر خطہ و علاقہ کے بارے میں نہیں جانتا کہ وہاں بارش کب ہوگی۔

جیسے بارش برسانے والے فرشتہ کو بعض علاقوں کے بارے میں خبر دی جاتی ہے

---

(۱) روح المعانی: ۷/۱۷۱

(۲) تفسیرات احمدیہ: ۴۰۵

کہ وہاں کب بارش ہوگی؛ مگر دنیا کے ہر علاقے کے بارے میں وہ نہیں جانتا کہ بارش کب ہوگی؟ اسی طرح ڈاکٹر اگر دس، پچاس ان عورتوں کے رحموں کا حال جان لے، جو اس کے زیر علاج وزیر تشخیص آئی ہیں، تو یہ علم محیط نہیں کہ اس سے آیت کا بطلان لازم آئے، کیوں کہ یہ دنیا کی تمام عورتوں کے ارحام کا حال نہیں جانتا۔

علامہ محمود آلوسی بغدادی رَحِمَہُ اللہُ لکھتے ہیں:

وانہٗ یجوزان یطلع اللہ تعالیٰ بعض اصفیائہ علی احدی ھذہ الخمس ویرزقہ عزوجل العلم بذلک فی الجملۃ وعلمھاالخاص بہٖ جل وعلاماکان علی وجہ الاحاطۃ والشمول لاحوال کل منھا و تفصیلہ علی الوجہ الاتم وفی شرح المناوی الکبیر للجامع الصغیر فی الکلام علی حدیث بریدۃ السابق خمس لایعلمھن الااللّٰہ علی وجہ الاحاطہ والشمول کلیاً وجزئیاً فلاینافیہ اطلاع اللّٰہ تعالیٰ بعض خواصہٖ علی بعض المغیبات حتی من ھذہ الخمس لانھاجزئیات معدودۃ.(۱)

(اور یہ ہوسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ، اپنے بعض برگزیدہ لوگوں کو ان پانچ باتوں میں سے کسی بات پر مطلع کر دیں اور ان کو اس کا کچھ علم دے دیں اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ خاص وہ علم ہے جو ان میں سے ہر ایک کے احوال پر بوجہ اتم احاطہ وشمول و تفصیل کے طور پر ہو، علامہ مناوی کی جامع صغیر کی بڑی شرح میں حدیث بریدہ رضی اللہ عنہ کے تحت میں ہے کہ پانچ چیزیں

(۱) روح المعانی:۱۱۲/۲۱

ہیں، جنہیں اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا یعنی بطور احاطہ وشمول کہ تمام کلیات وجزئیات کو جان لے، لہٰذا اللہ تعالیٰ کا اپنے بعض خاص بندوں کو بعض غیب کی باتوں پر اطلاع دے دینا حتی کہ ان پانچ میں سے بھی، اس حدیث کے خلاف نہیں کیوں کہ یہ چند جزئیات ہیں۔)

حضرت علامہ شبیر احمد عثمانی رحمہ اللہ نے ترجمہ شیخ الہند پر ''فوائد تفسیریہ'' میں جو لکھا ہے، اس سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ ان اشیا کا محیط وکلی علم اللہ کے ساتھ خاص ہے۔

چناں چہ فرماتے ہیں:

''اکوان غیبیہ کے کلیات واصول کا علم حق تعالیٰ نے اپنے ساتھ مختص رکھا ہے، ہاں جزئیات منتشرہ پر بہت سے لوگوں کو حسب استعداد اطلاع دی اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اس سے بھی اتنا وافر اور عظیم حصہ ملا جس کا کوئی اندازہ نہیں ہوسکتا، تاہم اکوان غیبیہ کا علم کلی رب العزت ہی کے ساتھ مختص رہا۔ آیت ہذا میں جو پانچ چیزیں مذکور ہیں، احادیث میں ان کو مفاتیح الغیب فرمایا ہے، جن کا علم یعنی علم کلی بجز اللہ کے کسی کو نہیں''۔(۱)

علامہ آلوسی رحمہ اللہ ایک اور موقع پر فرماتے ہیں کہ:

''وهذالاينافي الاختصاص والاستشاربعلم المذكورات بناءً على ماسمعت منّا من ان المراد بالعلم الذى استأثر سبحانه به العلم الكامل باحوال كل على التفصيل فما يعلم به الملك ويطلع عليه بعض الخواص يجوزان

(۱) ترجمۂ قرآن مولانا شیخ الہند: ۵۳۸

یکون دون ذلک العلم بل ھو کذالک فی الواقع بلاشبھة" (۱)

(اور یہ (غیر اللہ کا ان چیزوں پر مطلع ہو جانا) مذکورہ چیزوں کے علم کے اللہ تعالیٰ کے ساتھ مخصوص ہونے کے خلاف نہیں اس بنا پر کہ اس علم سے مراد جو اللہ تعالیٰ کے ساتھ خاص ہے وہ علم ہے جو بالتفصیل تمام احوال پر حاوی ہو، پس جو فرشتے جانتے ہیں یا خواص جس پر مطلع ہوتے ہیں، ممکن ہے کہ وہ اس (کامل ومحیط) علم سے کم درجہ کا ہو؛ بل کہ وہ بلاشبہ حقیقت میں ایسا ہی ہے)

ان تمام عبارات میں اس بات کی صراحت موجود ہے کہ غیر اللہ سے جس علم کی نفی کی گئی ہے وہ علم محیط ہے، اور بعض جزئیات پر کسی کا مطلع ہو جانا آیت کے خلاف نہیں ؛ بل کہ ایسا ہو سکتا اور ہوتا ہے، اور ڈاکٹروں کا علم "علم محیط" نہ ہونا محتاج دلیل و بیان نہیں، کیوں کہ ہر شخص جانتا ہے کہ مثلاً اگر کسی ڈاکٹر کو اس حاملہ عورت کے بارے میں پوچھا جائے جو ڈاکٹر کے سامنے نہ ہو کہ اس عورت کے رحم میں لڑکا ہے یا لڑکی؟ تو وہ قطعاً نہیں بتا سکتا، یہ اس بات کی صاف دلیل ہے کہ ڈاکٹر ہر کسی کے بارے میں نہیں جانتا کہ اس کے رحم میں کیا ہے، اور آیت کا منشا یہی ہے کہ علم محیط و کامل کی غیر اللہ سے نفی کی جائے۔

ایک سوال کا جواب

یہاں قدرتاً یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ رسول اللہ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نے ارشاد فرمایا ہے کہ مجھے ہر چیز کے علم کی کنجیاں دی گئیں، سوائے پانچ کے، اور وہ پانچ چیزیں جن کا آپ کو علم نہیں دیا گیا، وہ یہی ہیں جو زیر بحث آیت میں مذکور ہیں، اس سے صاف

(۱) روح المعانی:۲۱/۱۱۲

معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ان پانچ چیزوں کا علم عطا نہیں ہوا تو پھر دوسروں کو ان میں سے کسی چیز کا علم عطا کیا جانا، اگر چہ آلات واسباب وغیرہ کے ذریعہ ہی کیوں نہ ہو، کیوں کر باور کیا جا سکتا ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ یہ خیال خود ہی صحیح نہیں کہ ان پانچ چیزوں میں سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کسی چیز کا علم عطا نہیں کیا گیا؛ بل کہ حضرت علامہ شبیر احمد عثمانی رحمہ اللہ کی عبارت پہلے نقل کر چکا ہوں جس میں یہ الفاظ ہیں:

"ہاں جزئیات منتشرہ پر بہت سے لوگوں کو حسب استعداد اطلاع دی اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اس سے بھی اتنا وافر وعظیم حصہ ملا جس کا کوئی اندازہ نہیں ہو سکتا۔"

غور کیجیے اس سے کیا ثابت ہو رہا ہے؟ کیا اس سے یہ معلوم نہیں ہوتا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ان چیزوں میں سے بھی کلی ومحیط نہیں؛ بل کہ جزوی اور فی الجملہ علم عطا کیا گیا تھا، اور جو آپ نے فرمایا کہ مجھے ان پانچ چیزوں کا علم نہیں دیا گیا، تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ان چیزوں کا محیط وکلی علم نہیں دیا گیا۔

علامہ آلوسی رحمہ اللہ نے اس سلسلہ میں اس بات کی بھی نشان دہی فرمائی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس طرح کی خبریں کتب اخبار وسیر میں منقول ہیں، جن سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کو ان چیزوں میں سے بھی وافر حصۂ علم عطا ہوا۔

علامہ آلوسی رحمہ اللہ کی عبارت یہ ہے:

"ویعلم مما ذکرناوجدالجمع بین الاخباروالدلالة علی استشاراللہ تعالیٰ بعلم ذلک وبین مایدل علی خلافه کبعض اخباراته علیه السلام بالمغیبات التی هی من

هذالقبيل يعلم ذلک من راجع نحوالشفأ والمواهب اللدنية الخ. (۱)

جو ہم نے ذکر کیا (مراد علم سے علم محیط ہے) اس سے دونوں مختلف قسم کی روایات میں وجہ تطبیق معلوم ہوجائے گی، ایک تو وہ جو ان باتوں کے علم کے اللہ کے ساتھ خاص ہونے پر دلالت کرتے ہیں، دوسری وہ جو اس کے خلاف ہیں، جیسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا بعض اسی طرح کی باتوں کی خبر دینا جیسا کہ شفاء اور مواہب لدنیہ کی طرف رجوع کرنے والے جانتے ہیں۔"

حاصل یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی ان میں سے بعض باتوں کی اطلاع دی گئی تھی، ام الفضل کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت حسین کی ولادت سے پہلے ہی فرما دیا تھا کہ فاطمہ کو لڑکا ہوگا۔ (۲)

مگر چوں کہ یہ علم محیط و کامل نہ تھا، اس لیے اس سے آیت پر کوئی اشکال وارد نہیں ہوتا۔

مرزا حیرت دہلوی پر نقد

یہاں یہ بات سمجھ لینا چاہئے کہ اکثر مفسرین نے "مافی الارحام" کا مطلب یہی بتایا کہ پیٹ میں لڑکا ہے یا لڑکی، اس کا علم صرف اللہ کو ہے، اگرچہ مفسرین نے اس کے ساتھ یہ بھی کہا ہے کہ پیٹ میں موجودہ بچہ کالا ہے یا گورا، شقی ہے یا سعید وغیرہ، اس کا علم بھی اللہ ہی کو ہے۔

---

(۱) روح المعانی: ۱۱۲/۲۳

(۲) مشکوۃ: ۸۷۲:۲

حضرت شاہ عبدالقادر دہلوی رحمہ اللہ موضح القرآن میں آیت کا مطلب بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''جانتا ہے جو کچھ بیچ بچہ دانوں کے ہے، بیٹا یا بیٹی۔(۱)

اور علامہ جلال الدین محلی رحمہ اللہ تفسیر جلالین میں فرماتے ہیں:

''جانتا ہے جو کچھ رحم میں ہے یعنی لڑکا یا لڑکی۔(۲)

علامہ آلوسی رحمہ اللہ روح المعانی میں فرماتے ہیں:

''جانتا ہے جو کچھ رحم میں ہے یعنی مذکر ہے یا مونث، تام ہے یا ناقص اور اس طرح اس کے دیگر احوال کو۔''(۳)

حضرت حکیم الامت تھانوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''اور وہی جانتا ہے جو کچھ (لڑکا یا لڑکی حاملہ) کے رحم میں ہے۔(۴)

ان کے علاوہ دیگر مفسرین نے بھی اس کا یہی مطلب بیان کیا ہے اور اس آیت کے شان نزول سے بھی اسی کی تائید ہوتی ہے؛ مگر حیرت ہے کہ مرزا حیرت دہلوی مرحوم نے محض اس بنا پر کہ اس معنیٰ پر اشکال ہوتا ہے، اگلے مفسرین پر رد کرتے ہوئے کہا ہے کہ آیت کا مطلب یہ نہیں، پھر دوسرا مطلب اپنی طرف سے بیان کیا ہے چناں چہ اپنے ترجمۂ قرآن کے حاشیہ پر نوٹ فرماتے ہیں:

''رہا تیسرا دعویٰ کہ ماں کے پیٹ میں کیا ہے، ذرا غور طلب ہے، اگر اس کے یہ معنی لیے جائیں کہ لڑکا یا لڑکی جیسا کہ بعض مفسرین نے

---

(۱) موضح القرآن:۴۳۳
(۲) جلالین:۳۴۸
(۳) روح المعانی:۲۱/۱۰۹
(۴) بیان القرآن:۸۱۰

لکھا ہے تو بے شک اس میں دقت اٹھانی پڑے گی، کیوں کہ ختن کے اطبا صرف نبض پر ہاتھ رکھ کر بتا دیتے ہیں کہ پیٹ میں لڑکا ہے یا لڑکی، اور اس کا ثبوت پورا ہو چکا ہے، اور فی الواقع یہ کوئی بڑی بات نہ تھی، جس پر خدا تعالیٰ فخر کرتا کہ میرے سوائے کوئی نہیں جانتا؛ بل کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ کوئی نہیں جانتا کہ ارحام میں کیا ہے، یعنی یہ بچہ جو ایک ملکہ کے پیٹ میں آیا ہے، بھیک مانگے یا محل شوکت وعظمت کھو کے قید خانہ میں جان دے گا''۔

آگے چل کر فرماتے ہیں:

''اس آیت کے موزوں، سوا اس کے کوئی دوسرے معنی نہیں ہو سکتے۔'' (۱)

میں کہتا ہوں کہ مرزا مرحوم کو اس تاویل کی ضرورت اس لیے محسوس ہوئی کہ وہ یہاں آیت میں علم سے کیا مراد ہے؟ اس کو نہ سمجھے، ورنہ عام مفسرین کی تغلیط نہ کرتے پھر اطبا کا نبض پر ہاتھ رکھ کر پیٹ میں لڑکا ہے یا لڑکی جان لینے سے کیا آیت پر کوئی اعتراض واقع ہوتا ہے؟ ہم نے اوپر تفصیل کے ساتھ عرض کیا ہے کہ یہاں مراد علم غیب وعلم محیط ہے، اور اطبا وڈاکٹروں کا علم نہ علم غیب ہے، نہ محیط، پھر آیت پر کیا اعتراض ہو سکتا ہے؟ نیز حیرت مرحوم کا یہ کہنا کہ آیت کا مطلب یہ ہے کہ پیٹ میں بچہ کیا ہوگا یہ بھی نشانۂ اعتراض ونقد بن سکتا ہے، کیوں کہ بعض نجومی اور کاہن بعض بچوں کے بارے میں پیشین گوئی کرتے ہیں اور وہ صحیح نکل آتی ہے تو پھر تیسرا مطلب تلاش کیا جائے گا؟ اس لیے صحیح بات وہ ہے جو ہم نے اوپر لکھی ہے۔

---

(۱) ترجمہ قرآن۔ مرزا حیرت: ۵۴۲-۵۴۳

خلاصہ کلام

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ اطبا اور ڈاکٹروں کا یہ جان لینا کہ رحم مادر میں کیا ہے، آیت پر کوئی اعتراض وارد نہیں کرتا، کیوں کہ آیت اس بات کی مدعی ہے کہ سوائے اللہ کے کوئی اور ان چیزوں کا علم غیب اور علم محیط نہیں رکھتا، جیسے تمام غیب کی باتوں کا علم اور عالم شہادت کی چیزوں کا علم صرف اللہ ہی کو ہے۔

اور یہ ایسا یقینی امر اور مبرم دعویٰ ہے، جس میں کسی بھی شک وشبہ کی گنجائش نہیں نہ نبی وولی کے علوم سے اس میں شبہ کی گنجائش ہے، نہ ڈاکٹر وسائنس داں کے علم سے، پس آیت اپنی جگہ اٹل ہے۔

(والحمدللّٰہ علی ذلک)

فقط

محمد شعیب اللہ خان

ماہِ صفر کی دو بدعتیں

ابتدائیہ

حامدًا ومصلیًا: جاہل وبے دین لوگوں نے یا اسلام دشمن عناصر نے دین کے نام پر بہت ساری بدعات وخرافات کو جنم دیا اور پھیلایا ہے، انہی میں وہ بدعات بھی ہیں، جو مختلف مہینوں کے بارے میں گھڑی گئی ہیں۔ جیسے محرم کے پنجے اور شربت، تعزیہ وعلم شعبان میں حلوہ، ربیع الاول میں میلاد، ربیع الثانی میں گیارہویں وغیرہ۔

حضراتِ علما کی مسلسل جدوجہد سے اگرچہ بہت سارے خرافات بحمد اللہ ختم ہو چکے ہیں، تاہم اندازہ ہوتا ہے کہ بعض رسومات وبدعات معاشرے میں آج بھی قبولیت کا درجہ حاصل کی ہوئی ہیں۔ انہی میں سے ماہِ صفر کی دو بدعتیں ہیں۔

(۱) ایک تیرہ تیزی کی بدعت، (۲) دوسری آخری چہار شنبہ کی بدعت، حالاں کہ نبی کریم عَلَيْهِ السَّلَامُ نے بدعت کو گمراہی اور شر قرار دیا ہے۔(۱)

زیرِ نظر رسالہ میں احقر نے انہی دو بدعات کو موضوع بنایا ہے اور ان کے بارے میں قرآن وحدیث کی روشنی میں مفصل بحث کی گئی ہے، اس میں دلائل شرعیہ سے ثابت کیا گیا ہے کہ یہ رسومات محض بے بنیاد ہیں، جن کا شریعت سے دور کا بھی واسطہ نہیں؛ بل کہ ان رسومات میں شامل عقیدے اور اعمال سراسر تعلیمات اسلام کے خلاف ہیں۔

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس رسالے کو میرے لیے ''ذریعۂ نجات وذخیرۂ معاد'' اور لوگوں کے لیے سرچشمۂ ہدایت وسعادت بنائے۔ آمین

فقط

محمد شعیب اللہ عفی عنہ

---

(۱) دیکھو بخاری: ۱/ ۳۷۱، ۱/ ۲۵۱، ۲/ ۱۰۸۱، مسلم: ۲/ ۷۷، ۱/ ۲۸۴، ۱/ ۴۴۱

بسم اللہ الرحمن الرحیم

تیرہ تیزی

اسلام سے بے پروالوگوں نے جہاں اور بہت ساری بدعات وخرافات کو جنم دیا ہے، وہیں ماہِ صفر کی وہ بدعت بھی جاری کی ہے کہ جس کو عام طور پر لوگ ''تیرہ تیزی'' کہتے ہیں۔ اس کی شرعی حیثیت کو واضح کرنے سے پہلے ضروری ہے کہ عوام کی نظر میں اس تیرہ تیزی کی حقیقت کیا ہے، اس کو بیان کیا جائے۔

تیرہ تیزی عوام کی نظر میں

لوگ کہتے ہیں کہ ماہ صفر کے ابتدائی تیرہ دنوں میں نحوست ہے، کیوں کہ ان دنوں میں سرکار دو عالم محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سخت بیمار ہو گئے تھے۔ یہ بیماری اسی نحوست کا اثر ہے۔ اور غالباً ان دنوں کو تیرہ تیزی بھی اسی وجہ سے کہتے ہیں کہ یہ سخت اور برے اور منحوس دن خیال کر لیے گئے ہیں۔ اور لغت میں تیزی کے معنی سختی، اور پریشانی کے آتے ہیں۔ (۱)

اس طرح عوام کے نزدیک تیرہ تیزی کا مطلب یہ ہوا کہ ماہ صفر کے ابتدائی تیرہ دن نہایت منحوس، سخت اور برے ہیں۔ اسی لیے ان میں اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سخت بیماری میں مبتلا ہوئے۔ یہ تیرہ تیزی کے متعلق عوام الناس کا عقیدہ ہے۔ پھر اس غلط عقیدے پر جن کاموں کی بنیاد رکھی گئی ہے، وہ بھی لغو اور باطل ہیں، ان دنوں میں کسی چیز کو خریدنا منحوس و برا سمجھا جاتا ہے، شادی یا اور کوئی خوشی کی تقریب کرنا معیوب خیال

(۱) دیکھو فیروز اللغات: مادہ تیزی

کیا جاتا ہے۔ گویا یہ دن اتنے منحوس ہیں کہ ان میں کوئی خوشی و مسرت کا کام نہیں کیا جا سکتا اور کیا جائے تو بھی نحوست کے اثر سے وہ کام نہ ہوگا یا رنجیدہ ثابت ہوگا۔

غور کرنے کی دو باتیں

تیرہ تیزی کے اس عقیدے اور اس کے متعلق کاموں کی شرعی حیثیت معلوم کرنے کے لیے ہمیں دو باتوں پر غور کرنا چاہئے۔ ایک یہ کہ کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صفر کے شروع میں تیرہ دن بیمار رہے؟ ظاہر ہے کہ یہ ایک تاریخی بات ہے، جس کا جواب ہمیں تاریخ ہی دے سکتی ہے۔ دوسرے یہ کہ اگر فی الواقع آپ ان دنوں بیمار رہے تھے، تو کیا اس کی وجہ ان دنوں کی نحوست ہے؟ اور کیا ہمیں اس کی بنا پر ان دنوں کو نحوست قرار دینا اور ان میں شادی بیاہ اور خوشی کی تقریبات سے اور خرید و فروخت سے پرہیز کرنا جائز و درست ہے؟

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بیماری کے ایام

پہلے ہم پہلی بات کو لیتے ہیں کہ کیا رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم صفر کے ابتدائی تیرہ دن بیمار رہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ آپ اپنے مرض الوفات میں تیرہ دن تو بیمار رہے، مگر یہ تیرہ دن کون سے تھے؟ اس میں اکثر علما کا قول یہ ہے کہ یہ صفر کے آخری اور ربیع الاول کے ابتدائی ایام تھے، جیسا کہ علامہ ابن حجر رحمہ اللہ کی فتح الباری سے واضح ہوتا ہے۔ (۱)

اور اسی طرح ثقات ابن حبان سے بھی واضح ہوتا ہے۔ (۲)

---

(۱) فتح الباری:۸/ ۱۲۹

(۲) ثقات ابن حبان:۲/ ۱۳۰

اور سیرت ابن ہشام میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مرض الوفات صفر کے آخری دنوں میں یا ربیع الاول کے ابتدائی دنوں میں شروع ہوا۔ (۱)

اس سے معلوم ہوا کہ آپ کی بیماری کے بارے میں دو قول ہیں: (۱) ایک یہ کہ صفر کے آخری اور ربیع الاول ہی کے شروع میں بیمار ہو کر وفات پائے۔ (۲) دوسرا قول یہ ہے کہ آپ ربیع الاول ہی کے شروع میں بیمار ہو کر وفات پائے۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ تاریخی اعتبار سے یہ بات صحیح نہیں ہے کہ آپ صفر کے شروع میں تیرہ دن بیمار رہے؛ بل کہ صحیح یہ ہے آپ کی بیماری صفر کے آخری دنوں میں شروع ہوئی اور ربیع الاول میں جا کر ختم ہوئی۔

اب غور فرمائیے کہ جب تیرہ تیزی کی بدعت کی بنیاد ہی غلط ہوگئی تو اس پر جو عقیدہ وعمل قائم کیا گیا ہے وہ کیسے درست ہو سکتا ہے؟

یہ تو اس صورت میں بحث تھی جب کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بیماری سے وہ بیماری مراد لی جائے، جس میں آپ کا انتقال ہوا ہے، ہم نے ثابت کیا ہے کہ آپ کا مرض وفات صفر کے ابتدائی دنوں میں نہیں تھا؛ بل کہ صفر کے آخری دنوں میں شروع ہوا تھا۔ اور اگر اس بیماری سے کوئی اور بیماری مراد ہو تو اس کا دعویٰ کرنے والوں کو تاریخ کے معتبر حوالوں سے پہلے یہ ثابت کرنا چاہئے کہ فلاں وقت آپ صفر کے ابتدائی تیرہ دنوں میں بیمار ہوئے تھے۔ جب تک اس کو ثابت نہ کیا جائے گا۔ اس وقت تک اس عقیدے وعمل کا کوئی جواز نہیں ہے۔

طرفہ تماشا

پھر عجیب بات یہ ہے کہ ایک طرف یہ کہا جاتا ہے کہ آپ علیہ السلام صفر کے

(۱) سیرۃ ابن ھشام: ۶۴۲/۲

ابتدائی دنوں میں بیمار ہوئے اور تیرہ دن تک بیمار رہے، اور دوسری طرف صحت افاقہ کو صفر کے آخری چہار شنبہ کے ساتھ مخصوص کرتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ جب آپ تیرہ دن بیمار رہے تو تیرہ دن کے بعد ٹھیک ہو گئے ہوں گے۔ تو تیرھویں دن کو صحت یابی کا دن کیوں نہیں قرار دیا جاتا۔

اور اگر کہا جائے کہ یہ تیرہ دن کی بیماری کسی اور موقعہ کی ہے، اور آخری چہار شنبہ کی صحت یابی کسی اور بیماری کے بعد ہوئی ہے تو پھر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ لوگوں نے جس طرح چہار شنبہ کو صحت یابی کا دن قرار دے کر خوشی و تفریح کو لازم کیا ہے، اسی طرح وہ تیرہ تیزہ کی بیماری کے بعد تیرھویں دن کو خوشی و تفریح کا دن کیوں قرار نہیں دیتے؟ معلوم ہوتا ہے کہ نفس نے جو سکھایا، اس کو اختیار کر لیا گیا ہے عقل کو کام میں نہیں لایا گیا ہے۔

کیا بیماری نحوست ہے یا نحوست سے آتی ہے؟

اور اگر ہم بالفرض یہ مان لیں کہ آپ صفر کے ابتدائی دنوں میں ہی بیمار ہوئے یا یہ کہ کسی اور موقع پر ان دنوں میں آپ بیمار ہوئے تھے، تو کیا اس کی وجہ سے ان دنوں کو یا صفر کے مہینے کو منحوس سمجھنا درست ہوگا اور کیا بیماری کو منحوس خیال کرنا یا یہ سمجھنا کہ بیماری نحوست سے آتی ہے صحیح ہوگا؟ یہ دوسرا نکتہ ہے جس پر ہمیں غور کرنا ہے۔

اس سلسلے میں عرض ہے کہ اسلامی تعلیم کے مطابق نہ خود بیماری منحوس ہے اور نہ ہی یہ نحوست سے آتی ہے؛ بل کہ مومن کے لیے یہ سراسر رحمت و نعمت ہے۔ اور اللہ کی طرف سے آتی ہے۔ چناں چہ احادیث شریفہ میں اس کا ذکر موجود ہے۔

(۱) حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ جس شخص کے ساتھ بھلائی کا ارادہ فرماتے ہیں، اسے مصیبت

(بیماری) میں مبتلا کر دیتے ہیں۔(۱)

(۲) حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں حضرت رسول کریم علیہ السلام کی خدمت میں آپ کی بیماری کے زمانے میں حاضر ہوا اور عرض کیا کہ آپ کو تو سخت بخار ہے۔آپ نے فرمایا کہ ہاں! مجھے اکیلے تم میں سے دو کے برابر بخار ہے۔ میں نے عرض کیا، یہ شاید اس لیے کہ آپ کو دو اجر (ثواب) ملیں؟ فرمایا کہ ہاں یہ اسی لیے ہے اور اس لیے کہ مسلمان کو کانٹا یا اس سے بھی کم کوئی (تکلیف) چیز پہنچتی ہے، تو اللہ تعالیٰ اس کو اس کے گناہوں کا کفارہ (بدلہ) بنا دیتے ہیں، جیسے خشک درخت کے پتے گرتے ہیں (گناہ بھی ایسے ہی گرتے ہیں)(۲)

(۳) اور بعض روایات میں ہے کہ بیماری سے اجر و ثواب اور درجات کی بلندی نصیب ہوتی ہے، جیسا کہ مسلم شریف میں متعدد روایات میں مذکور ہے۔(۳)

(۴) ایک حدیث میں ہے کہ مومن کے معاملے پر تعجب ہے کہ اس کی ہر بات خیر ہی خیر ہے، اگر اسی کو خوشی حاصل ہوئی اور اس نے اس پر شکر کیا تو یہ اس کے لیے بھلائی اور خیر ہے، اور اگر اس کو تنگی و پریشانی ہوئی اور اس پر اس نے صبر کیا تو یہ بھی اس کے لیے بھلائی اور خیر ہے۔(۴)

(۵) حضرت ام السائب رضی اللہ عنہا بیمار تھیں۔ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم ان کے پاس گئے، دیکھا کہ وہ ٹھٹر رہی ہیں۔ پوچھا کہ کیا حال ہے؟ انہوں نے کہا کہ بخار ہے، اللہ اس میں برکت نہ دے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ بخار کو برا بھلا نہ

---

(۱) بخاری:۲/۸۴۳، موطا امام محمد:۳۹۹
(۲) بخاری:۲/۸۴۳ مسلم:۲/۳۱۸
(۳) مسلم:۲/۳۱۸ تا ۳۱۹
(۴) مشکوٰۃ:۴۵۲

کہو، یہ انسانوں کے گناہوں کو اس طرح ختم کر دیتی ہے، جیسے بھٹی لوہے کے میل کو صاف کر دیتی ہے(۱)

ان سب سے معلوم ہوا کہ بیماری خدا کی طرف سے آتی ہے اور یہ اُسے آتی ہے، جس کے ساتھ اللہ تعالیٰ بھلائی کرنا چاہتے ہیں، اور یہ کہ محض رحمت و برکت ہے جس سے گنہ گاروں کے گناہ دھل جاتے اور نیکوں کے درجات بلند ہو جاتے ہیں۔

نیز یہ بھی معلوم ہوا کہ بیماری کو برا بھلا کہنے اور برا سمجھنے کی اجازت نہیں، یہ صریح اسلام کی تعلیمات کے خلاف ہے۔ اب دیکھ لیجئے کہ تیرہ تیزی کا عقیدہ جس میں صفر کو بیماری کی وجہ سے منحوس و برا سمجھا جاتا ہے۔ کیا اسلام کے خلاف نہیں ہے؟ بلاشبہ یہ اسلام کے خلاف ہے۔

صفر کی نحوست کا عقیدہ جاہلیت ہے

اوپر کی توضیح و تفصیل سے صاف معلوم ہوا کہ صفر کے تیرہ دنوں کو یا صفر کے مہینہ کو منحوس سمجھنا غلط ہے؛ بل کہ احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ ماہ صفر کی نحوست کا عقیدہ زمانہ جاہلیت کے جاہل لوگوں کا عقیدہ تھا، اور اسلام نے اس کو باطل قرار دیا ہے۔

چناں چہ ایک حدیث میں اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے "لا صفر" کہ صفر (کی نحوست کا عقیدہ) کوئی چیز نہیں (بل کہ غلط و باطل ہے)۔(۲)

اس حدیث کے متعدد معانی و مطالب علما نے بیان فرمائے ہیں۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ عرب کے لوگ زمانہ جاہلیت میں صفر کے مہینہ کو منحوس سمجھ کر، اس کے آنے سے بدفالی کرتے تھے، اس باطل و غلط عقیدے کی تردید میں اللہ کے رسول

(۱) مسلم:۲/۳۱۹

(۲) بخاری کتاب الطب:۲/۸۵۱، مسلم:۲/۲۳۰

صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے فرمایا: ''**لاصفر**'' کہ صفر کچھ نہیں، یعنی اس کی نحوست اور اس سے بدفالی کا عقیدہ کچھ نہیں۔ ملا علی قاری رَحِمَہُ اللہُ نے مرقات میں اس کو بیان فرمایا ہے۔ (۱)

اس کے علاوہ متعدد احادیث سے ثابت ہے کہ کسی بھی چیز میں نحوست نہیں اور کسی چیز سے بدفالی لینا درست نہیں۔ چناں چہ ایک حدیث میں فرمایا ''**لاطیرۃ**'' کہ بدفالی لینا جائز نہیں۔ (۲)

اور ایک حدیث میں بدفالی لینے کو شرک قرار دیا ہے۔ (۳)

ان احادیث میں بدفالی لینے کا یہی مطلب ہے کہ کسی چیز کو منحوس سمجھ کر اس کو برا خیال کیا جائے اور اس سے بدفالی لی جائے۔ یہ بات اسلامی نقطۂ نظر سے غلط وباطل ہے۔

جب کسی بھی چیز کو بدفالی کا سبب خیال کرنا صحیح نہیں، تو صفر کے مہینے کو منحوس سمجھ کر، اس سے بدفالی لینا کیوں کر جائز ہوسکتا ہے؟

تین چیزوں میں نحوست کا مطلب

اور جو بعض روایات میں آیا ہے کہ رسول اللہ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے فرمایا: کہ نحوست تین چیزوں میں ہے۔ عورت، گھر اور گھوڑا، جیسا کہ کتب حدیث میں مروی ہے۔ (۴)

اس کی تشریح میں علما کا اختلاف ہے۔ حضرت عائشہ صدیقہ رَضِیَ اللہُ عَنْہَا نے فرمایا ہے

---

(۱) مرقاۃ شرح مشکوۃ:۹/۴

(۲) بخاری:۲/۸۵۳، مسلم:۲/۲۳۰، مشکوۃ:۳۹۱

(۳) طحاوی:۲/۳۱۷

(۴) بخاری:۲/۸۵۶، مسلم:۲/۲۳۲، طحاوی:۲/۳۱۷

کہ اللہ کے رسول کا مطلب یہ نہیں کہ ان چیزوں میں نحوست ہے؛ بل کہ آپ نے صرف اہل جاہلیت کا قول نقل کیا ہے کہ یہ جاہل لوگ اس طرح کہتے ہیں۔(۱)

اور امام طحاوی رحمۃ اللہ نے فرمایا کہ مطلب یہ ہے کہ اگر بالفرض کسی چیز میں نحوست ہوتی تو ان چیزوں میں ہوتی، جب ان میں بھی نحوست نہیں تو کسی میں بھی نہیں ہے۔(۲)

اس کی تائید اس حدیث سے ہوتی ہے جس میں اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے خود فرمایا:

''لاشوم وقد یکون فی الدار والمرأۃ والفرس''

(بدفالی کوئی چیز نہیں، اگر کسی چیز میں نحوست ہوتی تو عورت گھر اور گھوڑے میں ہوتی)(۳)

یہ حدیث بتارہی ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا مقصد ان چیزوں میں نحوست بتانا نہیں ہے؛ بل کہ ان سے نحوست کی نفی کرنا مقصود ہے کہ اگر کسی چیز میں نحوست ہوتی تو ان میں ہوتی، جب ان میں بھی نہیں ہے تو کسی اور چیز میں بھی نہیں ہے۔

الغرض! کسی چیز میں نحوست خیال کرنا، اور اس سے بدفالی لینا اسلامی نقطۂ نظر سے صحیح نہیں۔ اسی طرح صفر کے مہینہ کو منحوس جان کر اس سے بدفالی لینا بھی صحیح نہیں ہے۔

اصل نحوست کیا ہے؟

ہاں! اصل نحوست بدعملی، بداخلاقی، شریعت و دین سے غفلت ولاپروائی سے

---

(۱) طحاوی:۲/۳۱۸

(۲) طحاوی:۲/۳۱۸

(۳) بخاری:۱/۴۰۰، مسلم:۲/۲۳۲، طحاوی:۲/۳۱۸، ترمذی:۲۷۵۰

آتی ہے اور بد عمل و بے دین لوگوں کے حق میں ہر دن ہر ماہ اور ہر چیز منحوس ہے۔

اسی لیے قرآن میں قوم عاد کے ذکر میں کہا گیا ہے:

﴿اِنَّاۤ اَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِيْحًا صَرْصَرًا فِيْ يَوْمِ نَحْسٍ مُّسْتَمِرٍّ﴾

(ہم نے ان (قوم عاد) پر ایک سخت ہوا بھیجی ایسے دن میں جو دائمی نحوست والا ہے) (القمر: ۱۹)

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے اس دن کو منحوس بتایا ہے جس میں قومِ عاد کو ہلاک کیا گیا، کیوں؟ اس لیے کہ ان کی بے ایمانی و بد عملی نے ان کو اس نتیجہ تک پہنچایا۔ ورنہ تو وہی دن جس میں ان کو ہلاک کیا گیا۔ حضرت ہود علیہ السلام اور مومن حضرات کے لیے نہایت ہی مسعود و مبارک تھا۔ اگر فی نفسہ وہ دن ہی منحوس ہوتا تو سب کے لیے منحوس ہوتا۔ حالاں کہ ایسا نہیں ہے۔

علامہ قرطبی رحمہ اللہ اسی آیت کی تفسیر میں اس نکتہ کی وضاحت یوں کرتے ہیں:

”کما کانت الایام النحسات المذکورۃ فی القرآن نحسات علی الکفار من قوم عاد علی نبیھم والمومنین بہ منھم“

(جیسے وہ منحوس ایام جن کا ذکر قرآن میں آیا ہے وہ قوم عاد کے کفار پر منحوس تھے، نہ کہ ان کے نبی کے حق میں اور نہ ان پر ایمان رکھنے والوں کے حق میں۔)(۱)

علامہ محمود آلوسی بغدادی رحمہ اللہ ”تفسیر روح المعانی“ میں فرماتے ہیں:

”کہ ہر لمحہ و ساعت کسی کے حق میں مسعود ہوتی ہے تو کسی کے حق

(۱) القرطبی: ۱۷/۱۳۶

میں منحوس ہوتی ہے۔ اس اعتبار سے کہ اللہ تعالیٰ اس کے حق میں اس گھڑی کوئی خیر یا شر پیدا فرماتے ہیں۔ لہٰذا ہر دن، سعادت ونحوست دونوں سے متصف ہوسکتا ہے“۔(۱)

خلاصہ یہ ہے کہ کسی دن یا ماہ میں نحوست نہیں ہوتی؛ بل کہ بے ایمانی، بدعملی اور بدخُلقی کی وجہ سے بعض لوگوں کے حق میں بعض دن یا مہینے منحوس ہوجاتے ہیں، تو یہ نحوست دنوں یا مہینوں کی نہیں؛ بل کہ بدخُلقی و بے ایمانی کی ہے۔

چناں چہ ایک حدیث شریف میں اللہ کے نبی عَلَیْہِ السَّلَام کا ارشاد مبارک ہے:

اَلشُّوْمُ سُوْءُ الخُلُقِ.

یعنی نحوست بداخلاقی ہے۔(۲)

معلوم ہوا کہ نحوست کسی چیز میں نہیں؛ بل کہ نحوست ہمارے اپنے برے اعمال برے اخلاق میں ہے۔ اس لیے ہمیں نحوست سے بچنے کی خاطر، گناہوں سے، اللہ کی نافرمانیوں اور بداخلاقیوں سے باز آنے کی ضرورت ہے، نہ کہ صفر میں خرید وفروخت اور خوشی کی تقریبات منانے سے۔ بہ ہر حال ماہ صفر کی نحوست کا اعتقاد باطل ہے۔

ایک بے اصل حدیث

یہاں یہ عرض کرنا بھی ضروری ہے کہ بعض نڈر و بے خوف لوگوں نے صفر کی نحوست پر ایک حدیث بھی گھڑ رکھی ہے کہ رسول اللہ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے فرمایا:

”مَنْ بَشَّرَنِیْ بِخُرُوْجِ صَفَرَ بَشَّرْتُهٗ بِالْجَنَّةِ“

(جو مجھے صفر کے چلے جانے کی بشارت سنائے گا میں اس کو جنت کی

(۱) روح المعانی: ۲۸۲/۲۷

(۲) اخرجه احمد وفی اسناده ضعف، کذافی بلوغ المرام: ۱۱۲

خوش خبری دیتا ہوں)

یہ لوگ کہتے ہیں کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو جنت کی بشارت دی ہے۔ جو صفر کے ختم ہو جانے، چلے جانے کی خبر دے، یہ اس لیے کہ صفر منحوس مہینہ ہے، اس کے ختم ہونے پر اللہ کے رسول کو خوشی ہوئی، اس لیے آپ نے اس کے جانے کی خبر دینے والے کو جنت کی بشارت دی ہے۔

مگر یہاں دیکھنا یہ ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے سچ مچ کبھی یوں فرمایا ہے؟ اور کیا یہ واقعتاً اللہ کے رسول کی حدیث ہے؟

جواب یہ ہے کہ نہیں، یہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث نہیں ہے؛ بل کہ لوگوں نے اس کو گھڑ لیا ہے۔ چناں چہ علمائے حدیث نے اس حدیث کو موضوع یعنی من گھڑت قرار دیا ہے۔ مشہور و معروف محدث وفقیہ ملا علی قاری حنفی رحمہ اللہ نے اپنی کتاب موضوعات کبیر میں اس حدیث کو لکھ کر فرمایا "لا اصل له" یعنی اس حدیث کی کوئی اصل نہیں ہے؛ بل کہ یہ بے اصل حدیث ہے۔ (۱)

دوسری بات یہ ہے کہ اگر بالفرض اس حدیث کو تسلیم کر لیا جائے تب بھی اس حدیث سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ صفر کا مہینہ منحوس ہے، کیوں کہ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے صفر کے جانے کی خبر دینے والے کو بشارت اس لیے دی ہو کہ صفر کا جانا دراصل ربیع الاول کا آنا ہے۔ تو یہ دراصل ربیع الاول کے ورودِ مسعود پر خوش خبری ہے۔ اس سے یہ مطلب نکالنا کہ صفر کا مہینہ منحوس ہے سراسر غلط ہے۔

حاصلِ کلام یہ کہ تیرہ تیزی کا عقیدہ اور اس عقیدے کی بنا پر خرید وفروخت، شادی بیاہ اور خوشی کی تقریبات سے پرہیز کرنا، غیر اسلامی عقیدہ وعمل اور سراسر بدعت ہے۔

(۱) موضوعاتِ کبیر: ٦٩ حرفِ میم

آخری چہار شنبہ

ماہ صفر کی کی ایک اور بدعت جس کو عوام ''آخری چہار شنبہ'' کہتے ہیں وہ بھی غلط و بے بنیاد عقیدے اور باطل امور پر مشتمل ہے؛ مگر بہت سے لوگ بڑے اہتمام کے ساتھ اس رسم کو مناتے ہیں۔ ہم پہلے بتائیں گے کہ عوام کے نزدیک آخری چہار شنبہ کی حقیقت کیا ہے۔ پھر اس پر شرعی نقطۂ نظر سے بحث کریں گے۔

آخری چہار شنبہ عوام کی نظر میں

آخری چہار شنبہ کی حقیقت کیا ہے؟ عوام الناس کہتے ہیں کہ ''آخری چہار شنبہ'' صفر کے مہینے کا آخری بدھ جس میں آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم بیماری کے بعد سبزے کی سیر کو تشریف لے گئے، (عوام) مسلمان اس دن کو مبارک سمجھ کر سیر و تفریح کرنا اچھا سمجھتے ہیں۔ (۱)

گویا آخری چہار شنبہ کے دو جز ہیں، ان میں سے ایک عقیدہ ہے اور دوسرا عمل۔ عقیدہ یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم صفر کے آخری بدھ کو بیماری سے شفایاب ہو کر سیر و تفریح کے لیے گئے تھے۔ اور عمل یہ کہ لوگ اس کو مبارک سمجھ کر خود بھی سیر و تفریح کے لیے جاتے ہیں اور بعض جگہ میں نے ایک اور چیز بھی دیکھی ہے، وہ یہ کہ اس دن بعض خاص چیزیں مثلاً انڈا، تیل وغیرہ خیرات بھی کرتے ہیں، جب معلوم ہو گیا کہ آخری چہار شنبہ کی رسم میں ایک عقیدہ اور کچھ عمل شامل ہیں، تو اب ہم ان میں سے ہر ایک پر الگ الگ تبصرہ کرتے ہیں، تاکہ شرعی نقطۂ نظر سے اس عقیدے و عمل کی حیثیت واضح ہو سکے۔

(۱) فیروز اللغات: ۱۸ مادہ آخر

آخری چہار شنبہ اور صحت یابیٔ رسول صلی اللہ علیہ وسلم

جہاں تک آخری چہار شنبہ کو آپ کے صحت پانے کا تعلق ہے، اس کے بارے میں عرض ہے کہ اگر اسے مرض الوفات سے صحت پانا مراد ہے تو یہ صریح غلط و بالکل باطل ہے، کیوں کہ اس بیماری سے آپ صحت نہیں پائے تھے، جیسا کہ یہ بات بالکل ظاہر ہے اور اسی وجہ سے اس کو مرض الوفات کہتے ہیں۔

اور اگر کسی اور موقعہ کی بیماری سے صحت و شفا پانا مراد ہے تو تاریخ و سیرت سے اس کا ثبوت ہونا چاہیے کہ فلاں موقع پر آپ آخری چہار شنبۂ صفر کو بیماری سے صحت و شفا پائے تھے اور پھر آپ سیر و تفریح کے لیے تشریف لے گئے؛ مگر اس کا کوئی ثبوت نہیں ہے۔ لہٰذا بے دلیل ثبوت کسی بات کو اپنے عقیدے کی بنیاد بنانا کیسے اور کیوں کر جائز ہو سکتا ہے۔

ایک انکشاف اور اندیشہ

اس کے علاوہ یہ بھی معلوم ہونا چاہیے کہ حضرات علما حدیث و سیر نے لکھا ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا مرض الوفات صفر کے آخری چہار شنبہ سے شروع ہوا تھا۔

چناں چہ امام حدیث و تاریخ ابن حبان رحمہ اللہ نے کتاب الثقات میں لکھا ہے:

> ”سب سے پہلے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بیماری کی شکایت پیدا ہوئی وہ چہار شنبہ کا دن تھا، جب کہ صفر کے مہینے کے صرف دو دن باقی تھے۔“(۱)

---

(۱) ثقات ابن حبان:۲/۱۳۰

اسی طرح طبقات ابن سعد میں بھی یہ روایت موجود ہے۔ (۱)

ظاہر ہے کہ صفر کے ختم ہونے میں دو دن باقی ہوں تو جو چہار شنبہ ہوگا وہ صفر کا آخری چہار شنبہ ہی ہوگا۔ اس سے معلوم ہوا کہ آپ کا مرض الوفات ایک قول کے مطابق صفر کے آخری چہار شنبہ کو شروع ہوا ہے، اگر چہ اس کے متعلق اور بھی اقوال ہیں، تاہم ایک قول یہ بھی ہے اور بہت سے علما نے اس کو اختیار بھی کیا ہے، کہ اس کے پیش نظر تو صفر کا آخری چہار شنبہ خوشی کا دن نہ ہونا چاہئے؛ بل کہ غم و اندوہ کا دن ہونا چاہئے، یہ بھی امکان ہے کہ کسی دشمن رسول اور منافق نے آپ کی بیماری کے دن خوشی منائی ہو اور مسلمانوں کو بہکانے کے لیے یہ کہہ دیا ہو کہ اس دن آپ صحت پائے تھے اور سیر کو گئے تھے، اور مسلمان لوگوں میں سے جاہلوں نے اس کو صحیح سمجھ کر قبول کر لیا ہو، اگر ایسا ہی ہے تب تو معاملہ بڑا سنگین ہے۔

منافق اور دشمن لوگوں کی طرف سے ایسا ہونا کوئی بعید نہیں، اور اس طرح کی دوسری مثالیں بھی موجود ہیں، مثلاً رجب کی ۲۲ر تاریخ کو کونڈوں کی جو رسم ہے، اس کے بارے میں مشہور تو یہ ہے کہ اس دن امام جعفر صادق پیدا ہوئے تھے، حالاں کہ یہ غلط ہے، امام جعفر صادق کی ولادت ۱۷ر ربیع الاول کو ہوئی ہے۔ (۲)

ہاں ۲۲ر رجب کو حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی وفات ہوئی ہے، جیسا کہ علما نے لکھا ہے۔ (۳) بات یہ ہے کہ شیعہ نے حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے انتقال کی خوشی میں یہ تقریب کی ہے اور چوں کہ تقیہ ان کا مذہب ہے، اس لیے اس کو چھپا لیا اور یہ

---

(۱) بہ حوالہ فتح الباری: ۸/۱۳۰

(۲) دیکھو تاریخ الائمۃ: ۱۲۷

(۳) دیکھو ثقات ابن حبان: ۲/۳۰۵

ظاہر کر دیا ہے کہ اس دن حضرت امام جعفر صادق کی ولادت ہوئی۔

بالکل اسی طرح امکان ہے کہ کسی دشمن نے آپ کی بیماری کے دن کو خوشی سنائی ہو اور دھوکہ دینے کے لیے یہ ظاہر کر دیا ہو کہ آپ صحت پائے تھے۔

مولانا احمد رضا خان بریلوی کا فتویٰ

بے جا نہ ہوگا اگر ہم اس کو اس جگہ بریلویوں کے اعلیٰ حضرت مولانا احمد رضا خان بریلوی کا فتویٰ درج کر دیں۔ وہ اپنی کتاب ''احکام شریعت'' میں لکھتے ہیں:

''آخری چہار شنبہ کی کوئی اصل نہیں، نہ اس دن صحت یابی حضور سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا کوئی ثبوت؛ بل کہ مرض اقدس جس میں وفات مبارک ہوئی اس کی ابتداء اسی دن سے بتائی جاتی ہے۔[1]

صحت وافاقے کے کچھ تذکرے

پھر اگر یہ ثابت بھی ہو جائے کہ صفر کے آخری چہار شنبہ میں آپ کو صحت حاصل ہوئی تھی، تو سوال یہ ہے کہ خاص صفر کی آخری بدھ کو کیا خصوصیت ہے کہ اس کو منایا جاتا ہے جب کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو دوسرے مواقع پر بھی بیماری سے صحت وافاقہ ہوا ہے۔ چناں چہ صحت افاقے کے متعدد تذکرے احادیث میں ملتے ہیں۔

مثلاً مرض الوفات ہی میں ایک دن آپ کو افاقہ ہوا اور طبیعت کچھ ہلکی محسوس ہوئی تو آپ دو آدمیوں کے سہارے مسجد تشریف لے گیے (۲)

یہ واقعہ انتقال سے پانچ دن پہلے کا ہے، اور چوں کہ آپ کا وصال مبارک پیر

(۱) احکام شریعت:۲/ ۲۴۹

(۲) بخاری:۱/ ۹۵، مسلم:۱/ ۱۷، ثقات ابن حبان:۲/ ۱۳۲، سیرت ابن ہشام:۲/ ۶۴۹

کے دن ہوا ہے، اس لیے یہ متعین ہے کہ یہ واقعہ اتفاقاً جمعرات کے دن پیش آیا ہے۔(۱)

تو یہ ربیع الاول کی پہلی جمعرات ہے، تو کیا ربیع الاول کی پہلی جمعرات بھی منائی جائے گی اگر نہیں تو کیوں؟

(۲) بخاری وغیرہ کی صحیح ترین روایات سے ثابت ہے کہ ایک یہودی لبید بن عاصم نے اللہ کے رسول صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم پر جادو کر دیا تھا، جس کی وجہ آپ سخت بیمار ہو گیے تھے۔(۲)

یہ بیماری محرم الحرام میں شروع ہوئی اور ۶/ماہ تک جاری رہی۔(۳)

اس لحاظ سے آپ اس بیماری سے جمادی الثانی میں صحت یاب ہوئے تو کیا جمادی الثانی کو بھی منایا جائے گا؟ اگر نہیں تو کیوں؟ معلوم ہوا کہ نفس پرستوں نے بے وجہ اس آخری چہار شنبہ کی رسم کو جاری کر لیا ہے، ورنہ اس کی خصوصیت کی کوئی دلیل نہیں۔

خوشی کے موقعہ پر اسوۂ نبی

نیز یہ بھی قابل غور بات ہے کہ ان آخری چہار شنبوں نے صحت یابی کے بعد سیر وتفریح کو جس انداز سے پیش کیا ہے، اور خود جس طرح اس پر عمل کرتے ہیں، اس کا مقابلہ وموازنہ اگر سیرت طیبہ اور اسوۂ نبی سے کیا جائے، تو دونوں میں کوئی جوڑ معلوم نہیں ہوتا، کیوں کہ خوشی کے موقعہ پر آپ کا معمول سیر وتفریح اور سبزہ زاروں کو رونق

---

(۱) فتح الباری:۱۴۲/۸

(۲) بخاری:۸۵۷/۲، مسلم:۲۲۱/۲

(۳) فتح الباری:۲۲۶/۱۰

بخشا نہیں تھا؛ بل کہ ایسے موقعہ پر آپ صَلَّی اللّٰہ عَلَیْہِ وَسَلَّم کا مبارک معمول یہ تھا کہ آپ اللہ کی حمد وثنا، رجوع وانابت الی اللہ اور شکر و نماز میں مشغول ہوتے، نیز دین کے مہمات میں اپنا وقت لگاتے۔

مثلاً (۱) مرض الوفات ہی میں ۲۶/ صفر کو آپ نے افاقہ محسوس فرمایا اور کچھ راحت معلوم ہوئی تو آپ نے حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ کو جہادِ روم کے لیے تیار فرمایا اور اس سلسلے میں ہدایات جاری فرمائیں۔(۱)

نوٹ: بعض علما نے مرض الموت کی ابتدا محرم سے بتائی ہے اور ۲۶/ صفر کو افاقہ کا دن بتایا ہے اور پھر دو دن بعد یعنی ۲۸/ صفر سے شدید حملہ کا ہونا بتایا ہے۔ اس اعتبار سے ۲۶/ صفر جو منگل کا دن قرار پاتا ہے افاقہ کا دن ہے۔(واللہ اعلم)

(۲) مرض الوفات ہی میں ایک دن آپ نے محسوس فرمایا کہ بیماری میں کمی وخفت ہے تو آپ دو آدمیوں کے سہارے مسجد نبوی پہنچے اور آپ نے وعظ ونصیحت بھی فرمائی۔ اس وعظ میں آپ نے یہ بھی فرمایا:

> ''اللہ نے اپنے بندوں میں سے ایک بندے کو دنیا اور آخرت میں سے کسی ایک کو اختیار کرنے کا اختیار دیا۔ تو اس نے آخرت کو اختیار کرلیا۔''

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سمجھ گئے کہ اس بندے سے مراد خود آپ کی ذات بابرکات ہے۔ اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ رونے لگے۔ الخ (۲)

یہ ہے اسوۂ نبی، خوشی، راحت، صحت وافاقے کے موقعہ پر، نہ کہ سیر وتفریح کرنا

---

(۱) تاریخ اسلام مولانا اکبر شاہ مرحوم: ۱/ ۲۲۸

(۲) سیرت ابن ھشام: ۲/ ۶۴۹ وغیرہ

اور سبزہ زاروں کو رونق بخشنا، غور کیجیے کیا اس طریقہ نبوی سے اس عمل کا کوئی جوڑ ہے جو لوگوں نے گھڑ رکھا ہے؟

بدعت، دین کی تحریف ہے

اور اگر بالفرض آپ نے سیر وتفریح فرمائی بھی ہے، تو یہ ایک اتفاقی بات اور سیدھی سادی شکل ہے، جیسے کبھی آپ نے مزاح بھی فرمایا ہے اور بعض صحابہ سے آپ نے کھیلا ہے۔ ظاہر ہے کہ ان باتوں کو اجتماعی طریقہ پر اور مستقل حیثیت دے کر نہیں کیا جا سکتا اور نہ ان امور کو رسم بنایا جا سکتا ہے۔

اسی طرح اگر کسی سبب سے آپ نے سیر فرمائی ہو تو سب لوگوں کا سیر کو جانا اور مردوں عورتوں کا پارکوں میں جمع ہونا، بے پردگی وخلاف شرع امور کا ارتکاب کرنا کیا دین اور سنت ہے؟ یا دین میں تحریف ہے؟

اسی لیے حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمہ اللہ نے لکھا ہے:

''آداب وسنن میں تشدد اور ان کو ان کے درجے سے بڑھا دینا بھی تحریف دین کا سبب ہے اور یہود ونصاریٰ کی عادت ہے''۔(۱)

یہ بات بالکل صحیح ہے، کیوں کہ اس سے دین کا حلیہ بگڑ جاتا ہے جب آداب و سنن کو ان کے درجے سے بڑھا دینا بھی برا ہے، تو کھیل تماشوں کو دین کا نام دینا اور بدعات وخرافات کو دین سمجھ لینا، کتنا برا ہوگا؟

سیر وتفریح اور شیطانی دھوکہ

غور کیجیے کہ ان عوام کو شیطان نے کس طرح دھوکہ دے رکھا ہے کہ ان کو نماز

---

(۱) حجۃ اللہ البالغۃ:۱/۱۲۰

کا دیگر فرائض وواجبات کا، اللہ کے نبی کی سنتوں کا، کسی کا اہتمام نہیں ہے؛ مگر آخری چہار شنبہ کی سیر وتفریح کا بڑا اہتمام کرتے ہیں۔ اور ہزاروں خلافِ شریعت کاموں میں مبتلا ہوتے ہیں۔

افسوس کہ ایک من گھڑت سنت کو ادا کرنے کے لیے، کئی فرائض وسنتوں کو ترک کیا جاتا ہے اور ہزاروں قسم کے گناہوں کا وبال اپنے سر پر لیا جاتا ہے۔

آخری بات اور دعا

الغرض! یہ سب محض شیطانی دھوکہ اور فریب ہے یا نفس کی چالبازیاں ہیں کہ دین کے نام پر تیرہ تیزی اور آخری چہار شنبہ کی من گھڑت رُسومات اور بدعات میں پھنسا دیا ہے، دین سے فی الواقع ان کا کوئی جوڑ نہیں ہے۔

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اہل اسلام کو دین کا صحیح فہم عطا فرمائے قرآن وسنت کی تعلیمات کو حاصل کرنے اور ان پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ تمام خرافات وبدعات سے بچائے۔

فقط

محمد شعیب اللہ خان

تلاشِ حلال

بسم اللہ الرحمن الرحیم

تلاشِ حلال

تمہید:

حلال وحرام کی تمیز کرنا اور حلال سے نفع اٹھانا اور حرام سے پرہیز کرنا مسلمان کے لیے اتنا ہی ضروری ہے جتنا کہ نماز پڑھنا اور زکاۃ دینا؛ مگر آج بڑی حیرت ہوتی ہے یہ دیکھ کر کہ آج مسلم معاشرے میں بہت کم لوگ ایسے ہیں، جو حلال وحرام میں تمیز کرتے اور حرام سے پرہیز کرتے ہوں۔ پھر اس میں اور اضافہ ہو جاتا ہے، جب کہ ہم دیکھتے ہیں کہ بعض لوگ حرام چیزوں کے بارے میں یہ سوال کرتے ہیں کہ حرام کیوں ہے؟ اس کے استعمال میں کیا حرج ہے؟ حالاں کہ یہ بات ایک مسلمان کی شان سے بعید ہے کہ وہ اللہ کے نازل کردہ قانون کو ماننے کے بعد یہ سوال کرے۔

بہ ہر حال یہ ایک حیرت ناک بات ہے کہ آج بہت سے مسلمان حلال وحرام میں تمیز نہیں کرتے اور حرام تجارتیں، حرام ملازمتیں، حرام پیشے بلا جھجک اختیار کیے ہوئے ہیں۔

اس لیے جی چاہا کہ مسلمانوں کو اس سلسلہ میں آگاہ کیا جائے اور حلال کے فضائل و برکات اور حرام کی نحوست اور اس پر وعیدات ان کے سامنے پیش کی جائیں، تا کہ جو لوگ اس میں کوتاہی کا شکار ہیں وہ اللہ و رسول سے ڈر کر حرام سے بچ سکیں، اور حلال کی برکات سے استفادہ کریں اور دین و دنیا کی بھلائیوں سے مالا مال ہوں، لہٰذا اس سلسلہ میں چند سطور پیش خدمت ہیں۔

حلال کی تلاش کا حکم

سب سے پہلے یہ بات سمجھ لینا چاہئے کہ اسلام مسلمان پر یہ حکم و پابندی لگاتا ہے کہ حلال کمائی کی فکر اور تلاش کرے۔ اس سلسلہ میں چند حدیثیں ملاحظہ کیجیے:

(۱) حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«طَلَبُ الْحَلَالِ وَاجِبٌ عَلٰی كُلِّ مُسْلِمٍ.»

(حلال کی تلاش ہر مسلمان پر واجب ہے۔)

علامہ ہیثمی و علامہ منذری رحمہما اللہ نے کہا کہ اس کی سند حسن ہے۔(۱)

(۲) حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«طَلَبُ كَسْبِ الْحَلَالِ فَرِيْضَةٌ بَعْدَ الْفَرِيْضَةِ.»

(حلال کمائی کی تلاش وطلب، فرضوں (جیسے نماز وغیرہ) کے ادا کرنے کے بعد، فرض ہے۔)(۲)

ان احادیث سے معلوم ہوا کہ مسلمان کی ذمہ داری ہے کہ وہ حلال کمائی کی فکر کرے، اس کے لیے تلاش و جستجو میں لگا رہے، یہ ہر مسلمان پر فرض و واجب ہے۔ لہٰذا مسلمان جب کوئی تجارت کرنا چاہے، یا کسی ملازمت میں لگنا چاہے، یا کسی پیشہ کو اختیار کرنا چاہے تو پہلے یہ غور کرلے کہ یہ حلال ہے یا نہیں، مثلاً ایک شخص کو بینک کی ملازمت ملے تو اس کو یہ ہرگز اختیار نہ کرنا چاہئے؛ بل کہ دوسری حلال ملازمت

(۱) مجمع الزوائد:۱۰/۲۹۱، الترغیب:۲/۳۴۵

(۲) سنن بیہقی:۶/۱۲۶، مسند الشہاب:۱/۱۰۴

تلاش کرنا چاہیے۔

کسب حلال کی فضیلت

پھر اسلام نے حلال روزی وکمائی کی تلاش وجستجو کرنے والے کی بڑی فضیلت و منقبت بیان کی ہے۔

(۱) ایک حدیث میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ہم اللہ کے نبی علیہ السلام کی خدمت میں بیٹھے ہوئے تھے کہ ایک جوان شخص پہاڑی راستے سے حاضر ہوا، ہم نے اسے دیکھ کر آپس میں کہا کہ کاش! یہ جوان اپنی جوانی، اپنی قوت اور اپنی جد وجہد سب اللہ کے راستے میں لگا دیتا! یہ بات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سن لی اور فرمایا:

« وَمَا سَبِيْلُ اللّٰهِ إِلَّا مَنْ قُتِلَ ، مَنْ سَعٰى عَلٰى وَالِدَيْهِ فَفِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ، وَمَنْ سَعٰى عَلٰى عِيَالِهٖ فَفِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ، وَمَنْ سَعٰى عَلٰى نَفْسِهٖ لِيُعَفَّهَا فَفِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ، وَمَنْ سَعٰى عَلٰى التَّكَاثُرِ فَفِيْ سَبِيْلِ الشَّيْطَانِ. »

(کیا اللہ کے راستے میں صرف وہی ہے جو قتل کیا جائے؟ جو اپنے والدین کے لیے کوشش کرتا ہے وہ بھی اللہ کے راستے میں جہاد کرنے والا ہے اور جو شخص اپنے اہل وعیال کے لیے حلال کی تلاش وکوشش کرتا ہے وہ بھی اللہ کے راستہ میں جہاد کرنے والا ہے اور جو اپنی جان کے لیے حرام سے اس کو بچانے کی خاطر حلال کی کوشش کرتا ہے، وہ بھی اللہ کے راستے میں جہاد کرنے والا ہے اور جو محض مال بڑھانے کے لیے

کوشش کرتا ہے وہ شیطان کے راستے میں ہے۔)(۱)

(۲) حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ:

«مَنْ طَلَبَ مَكْسَبَةً مِّنْ بَابِ الْحَلَالِ يَكُفُّ بِهَا وَجْهَهُ عَنْ مَسْأَلَةِ النَّاسِ وَوَلَدَهُ وَ عِيَالَهُ جَاءَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ مَعَ النَّبِيِّيْنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ.»

(جو شخص حلال کمائی تلاش کرتا ہے تاکہ لوگوں سے مانگنے سے اپنے کو اور اپنے اہل وعیال کو بچائے، تو وہ قیامت کے دن نبیوں اور صدیقوں کے ساتھ ہوگا۔)(۲)

(۳) حضرت علی رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد نقل کیا ہے کہ آپ نے فرمایا:

«إِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ أَنْ يَرٰى عَبْدَهُ تَعِباً فِيْ طَلَبِ الْحَلَالِ.»

(اللہ تعالے اس بات کو پسند فرماتے ہیں کہ اپنے بندے کو حلال کمائی کی تلاش میں محنت کرتا ہوا دیکھیں۔)(۳)

یہ حدیث متعدد طرق سے واقع ہونے کی وجہ سے قابل قبول ہو جاتی ہے، اگر چہ انفراداً ہر سند اس کی ضعیف ہے؛ مگر ان کا مجموعہ حسن ہو جاتا ہے۔(۴)

اسی طرح اوپر کی دو حدیثیں بھی اگر چہ ضعیف ہیں؛ مگر فضائل کے باب میں معتبر ہیں۔ ان سے معلوم ہوا کہ حلال کمائی کی فکر و تلاش مومن انسان کا مرتبہ و مقام بلند

---

(۱) طبرانی فی الاوسط:۴/۲۸۵، بیهقی:۹/۲۵

(۲) تاریخ بغداد للخطیب:۸/۱۶۸

(۳) الجامع الصغیر:۱۸۸۲

(۴) کشف الخفاء:۱/۲۹۱، المقاصد الحسنة:۱۵۵

سے بلند ترین کر دیتی ہے۔

حلال کی برکت

پھر اس حلال کمائی سے حاصل ہونے والی حلال چیزیں، بڑی بابرکت ہوتی ہیں، ان میں ایک نورانیت ہوتی ہے اور اس کی وجہ سے آدمی کی دعائیں قبول ہوتی ہیں، اعمال صالحہ کی توفیق ملتی ہے۔

چناں چہ دعا کی قبولیت کا ذکر حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کی حدیث میں آیا ہے کہ ایک دفعہ حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ یارسول اللہ! آپ میرے لیے اللہ سے دعا کیجیے کہ اللہ مجھے مستجاب الدعوات (یعنی ایسا بنادے کہ جو دعا کروں قبول ہو جائے)، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«يَا سَعْدُ ! أَطِبْ مَطْعَمَكَ تَكُنْ مُسْتَجَابَ الدَّعْوَةِ .»

(اے سعد! حلال کھانا کھاؤ تم مستجاب الدعوۃ ہو جاؤ گے۔)(۱)

اس سے معلوم ہوا کہ حلال غذا میں ایسی برکت ہوتی ہے کہ اس کے کھانے والے کی دعائیں اللہ تعالے قبول کر لیتا ہے۔ روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت سعد بن ابی وقاص کی دعائیں قبول ہوتی تھیں، علامہ ابن رجب رحمہ اللہ نے نقل کیا ہے کہ ایک دفعہ کسی نے آپ سے پوچھا کہ صحابہ کے مابین آپ کی دعائیں قبول کی جاتی ہیں کیا وجہ ہے؟ تو فرمایا کہ میں کوئی لقمہ اپنے منہ کے پاس ایسا نہیں لے گیا جس کے بارے میں میں یہ نہ جانتا ہوں کہ وہ کہاں سے آیا اور کہاں گیا؟۔(۲)

اور اعمال صالحہ کی توفیق کا ذکر قرآن مجید کے اشارہ سے معلوم ہوتا ہے، چناں چہ

(۱) معجم اوسط: ۶/۳۱۱، مجمع الزوائد: ۱۰/۲۹۱

(۲) جامع العلوم والحکم لابن رجب: ۱/۱۰۷

قرآن کہتا ہے:

﴿ يَا اَيُّهَا الرُّسُلُ كُلُوا مِنَ الطَّيِّبَاتِ وَاعْمَلُوا صَالِحاً . ﴾

(المؤمنون : ۵۱)

(اے رسولو! کھاؤ حلال چیزیں اور نیک عمل کرو۔)

اس میں حلال غذا کھانے کا حکم دینے کے بعد نیک عمل کرنے کی ہدایت کی گئی ہے، کیوں کہ حلال غذا کھانے سے نیک عمل کرنا آسان ہو جاتا ہے اور خود بہ خود نیکی کی طرف طبیعت چلتی ہے۔

ایک حدیث میں ہے کہ حضرت شداد بن اوس کی بہن حضرت ام عبد اللہ رضی اللہ عنہا نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں افطاری کے وقت دودھ کا ایک پیالہ بھیجا اور اس دن آپ صلی اللہ علیہ وسلم روزے سے تھے اور وہ دن بڑا لمبا بھی تھا اور سخت گرمی کا بھی تھا، آپ نے وہ دودھ قاصد کو دے کر واپس بھیج دیا کہ یہ پوچھ کر آؤ کہ تجھے یہ دودھ کہاں سے آیا؟ ام عبد اللہ رضی اللہ عنہا نے بتایا کہ یہ میری بکری سے حاصل ہوا ہے۔ جب آپ کو قاصد نے بتایا تو آپ نے اسے پھر واپس بھیجا کہ یہ معلوم کرو کہ وہ بکری تجھے کہاں سے ملی تھی؟ انہوں نے بتایا کہ یہ میں نے خریدی تھی تب آپ نے یہ دودھ لے لیا۔ دوسرے دن ام عبد اللہ رضی اللہ عنہا آپ کی خدمت میں آئیں اور عرض کیا کہ یا رسول اللہ! میں نے سخت گرمی اور لمبے دن کی وجہ سے آپ کی خدمت میں کل دودھ بھیجا تھا؛ مگر آپ نے واپس کر دیا؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

« بِذٰلِكَ أُمِرَتِ الرُّسُلُ أَلَّا تَأْكُلَ إِلَّا طَيِّباً وَّ لَا تَعْمَلَ إِلَّا صَالِحاً . »

(رسولوں کو یہی حکم ہے کہ سوائے پاکیزہ چیز کے کچھ نہ کھاؤ اور سوائے نیک عمل کے کچھ نہ کرو۔)(۱)

امام حاکم نے کہا کہ اس کی سند صحیح ہے، اس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ حلال کھانے میں یہ فائدہ ہے کہ اس سے نیکیوں اور عمل صالح کی توفیق ملتی اور وہ اس کے حق میں آسان ہو جاتے ہیں۔

نیز حلال کھانا وہ عظیم دولت ہے کہ جس کو یہ حاصل ہو جائے اسے اور کچھ نہ ملے تو کوئی پرواہ نہیں، کیوں کہ یہ اس کو نقصان نہ دے گا، حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد نقل کیا ہے:

« أَرْبَعٌ إِذَا كُنَّ فِيكَ فَلاَ عَلَيْكَ مَا فَاتَكَ مِنَ الدُّنْيَا: حِفْظُ أَمَانَةٍ، وَصِدْقُ حَدِيثٍ، وَحُسْنُ خَلِيقَةٍ، وَ عِفَّةٌ فِي طُعْمَةٍ. »

(یعنی اگر تیرے اندر یہ چار باتیں ہوں تو دنیا تجھ سے فوت بھی ہو جائے تو تجھے کوئی نقصان نہیں: ایک امانت کی حفاظت، دوسرے بات میں سچائی، تیسرے اچھے اخلاق اور چوتھے کھانے میں پاکیزگی۔)(۲)

نیز ایک حدیث میں حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

« أَيُّمَا رَجُلٍ اكْتَسَبَ مَالًا مِّنْ حَلَالٍ، فَأَطْعَمَ نَفْسَهُ أَوْ كَسَاهَا، فَمَنْ دُونَهُ مِنْ خَلْقِ اللّٰهِ كَانَ لَهُ بِهِ زَكٰوةٌ. »

---

(۱) مستدرک:۴/۱۴۰، معجم کبیر طبرانی:۲۵/۱۷۴،

(۲) مسند احمد:۶۶۵۲، مستدرک:۴/۳۴۹، شعب الایمان:۴/۲۰۵، قلتُ: حسّن اسناده المنذری فی الترغیب: ۲/۳۴۵

(جس آدمی نے حلال مال سے کمایا، پھر اس کو اپنی ذات کو یا دوسری اللہ کی مخلوق کو کھلایا، یا کپڑا پہنایا تو اس کے لیے یہ چیز پاکیزگی و طہارت کا ذریعہ بنے گی۔)(۱)

ان تمام احادیث سے یہ بات واضح ہوگئی کہ حلال مال اور جائز کمائی کا اہتمام اللہ و رسول کی نگاہ میں کس قدر لائق و فائق کام ہے اور اس پر کیسی کیسی بشارتیں و فضیلتیں بیان کی گئی ہیں۔

حرام کمائی کی حرمت ونحوست

اس کے برعکس حرام کمائی اسلام میں سخت ناجائز اور اس سے حاصل ہونے والی چیزیں نہایت منحوس ہیں۔

قرآن میں فرمایا گیا ہے کہ:

﴿ يَا أَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَاتَأْكُلُوْا أَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ إِلَّا أَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً عَنْ تَرَاضٍ مِّنْكُمْ . ﴾

(اے ایمان والو! آپس میں ایک دوسرے کے مالوں کو باطل طریقہ سے نہ کھاؤ؛ مگر یہ کہ آپسی رضا سے تجارت ہو۔) (النساء :۲۹)

ایک اور موقعہ پر ارشاد ربانی ہے:

﴿ وَ لَاتَأْكُلُوْا أَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ وَتُدْلُوْا بِهَا إِلَى الْحُكَّامِ لِتَأْكُلُوْا فَرِيْقًا مِّنْ أَمْوَالِ النَّاسِ بِالْإِثْمِ وَ أَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ . ﴾ (البقرة :۱۸۸)

(۱) صحیح ابن حبان:۱۰/۴۸،مستدرک:۴/۱۴۴،شعب الایمان:۲/۸۶،قلتُ: صحح اسناده الحاکم

(آپس میں ایک دوسرے کے مالوں کو باطل طریقہ سے نہ کھاؤ اور نہ حاکموں کے پاس اس غرض سے رجوع کرو کہ گناہ کے طور پر لوگوں کے مال کا ایک حصہ کھا جاؤ، جب کہ تم کو معلوم بھی ہے۔)

ان آیات میں کسی کا مال باطل طریقے سے کھا جانے اور حرام طریقے سے لے لینے کی ممانعت وارد ہوئی ہے۔

ایک لمبی حدیث میں حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے وارد ہوا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:

« وَلَا يَكْسِبُ عَبْدٌ مَالاً مِّنْ حَرَامٍ فَيُنْفِقُ مِنْهُ فَيُبَارَكُ لَهُ فِيْهِ،وَلَا يَتَصَدَّقُ بِهِ فَيُقْبَلَ مِنْهُ،وَلَا يَتْرُكُ خَلْفَ ظَهْرِهِ إِلَّا كَانَ زَادَهُ إِلَى النَّارِ. »

(جو شخص حرام مال حاصل کرے گا اور اس سے (اپنی ضرورت) میں خرچ کرے گا تو اس میں برکت نہ ہوگی اور اس سے صدقہ دے گا تو وہ صدقہ قبول نہیں کیا جائے گا اور ترکہ میں اس کو چھوڑ کر مرے گا تو وہ اس کے لیے جہنم کا توشہ ہوگا)۔(۱)

یہ حدیث حرام مال کی دنیوی واخروی نحوست کو صاف وصریح انداز میں بتا رہی ہے، اخروی نحوست تو یہ ہے کہ صدقہ قبول نہ ہوگا اور یہ حرام مال اس کا توشہ جہنم بنے گا اور دنیوی نحوست یہ ہے کہ اس مال کو خرچ کرے گا تو اللہ تعالیٰ اس میں برکت نہ دے گا۔

---

(۱) مسند احمد:۱/۳۸۷، مسند البزار:۵/۳۹۲، امام منذری نے کہا کہ بعض نے اس کو حسن قرار دیا ہے، دیکھیے الترغیب:۲/۳۴۸

ایک حدیث میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد مروی ہے کہ آپ نے قسم کھا کر فرمایا:

« وَلَأَنْ يَأْخُذَ تُرَاباً فَيَجْعَلَهُ فِيْ فِيْهِ خَيْرٌ لَّهُ مِنْ أَنْ يَجْعَلَ فِيْ فِيْهِ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ عَلَيْهِ. »

(تم میں سے کوئی مٹی لے اور اپنے منہ میں ڈال لے یہ اس سے بہتر ہے کہ وہ ایسی چیز اپنے منہ میں ڈالے جو اس پر اللہ نے حرام کی ہے۔)(۱)

اللہ اکبر! نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم مٹی سے پیٹ بھر لینے کو حرام سے پیٹ بھرنے پر ترجیح دے رہے ہیں، معلوم ہوا کہ حرام سے بچنا مسلمان کے لیے انتہائی ضروری امر ہے۔

حرام مال کی بے برکتی و نقصان

یہ بات معلوم و مسلم ہے کہ حرام مال میں برکت نہیں ہوتی، مقدار میں زیادہ ہونے کے باوجود اس سے وہ نفع نہیں ہوتا جو حلال مال سے ہوتا ہے۔ اور اس بے برکتی کی مختلف صورتیں ہیں:

ایک صورت یہ ہوتی ہے کہ اللہ تعالے اس پر مصائب بھیج دیتے ہیں اور وہ مال بربادی کا شکار ہو جاتا ہے۔

قرآن پاک میں ایک جگہ ارشاد ربانی ہے:

﴿ يَمْحَقُ اللّٰهُ الرِّبَا وَ يُرْبِي الصَّدَقَاتِ، وَاللّٰهُ لاَ يُحِبُّ

(۱) مسند احمد:۷۴۸۲،قال المنذری : باسناد جید،الترغیب:۳۴۶/۲

كُلَّ كَفَّارٍ أَثِيمٍ ﴾ (البقرة : ٢٧٥)

(اللہ تعالے سود کو گھٹاتے ہیں اور صدقات کو بڑھاتے ہیں اور اللہ تعالے کسی بھی گناہ گار کافر سے محبت نہیں کرتے۔)

اس آیت سے معلوم ہوا کہ سود جو کہ حرام ہے اللہ اس کو گھٹاتے ہیں، اس گھٹانے سے مراد بہت سے علمانے یہی لیا ہے کہ اللہ تعالے اس کو ہلاک و برباد کر دیتے ہیں؛ بل کہ ایک حدیث میں بہ سند صحیح حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل کیا ہے کہ سود اگر چہ بڑھ جائے؛ لیکن اس کا انجام قلت و کمی ہی ہوگا۔(۱)

معلوم ہوا کہ سود جو کہ من جملہ حرام چیزوں کے ہے، اس کا انجام ہلاکت و تباہی و بربادی کی صورت میں ہوتا ہے۔

حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ اپنی تفسیر ''معارف القرآن'' میں تحریر فرماتے ہیں:

''سود جس مال میں شامل ہو جاتا ہے، بعض اوقات تو وہ مال خود ہلاک و برباد ہو جاتا ہے اور پچھلے مال کو بھی ساتھ لے جاتا ہے، جیسے کہ ربا اور سٹے کے بازاروں میں اس کا ہمیشہ مشاہدہ ہوتا رہتا ہے کہ بڑے بڑے کروڑ پتی اور سرمایہ دار دیکھتے دیکھتے دیوالیہ اور فقیر بن جاتے ہیں، بے سود کی تجارتوں میں بھی نفع و نقصان کے احتمالات رہتے ہیں اور بہت سے تاجروں کو نقصان بھی کسی تجارت میں ہو جاتا ہے؛ لیکن ایسا نقصان

(۱) ابن ماجہ:۲۲۷۰،مسند احمد:۴۰۲۶،مستدرک:۲/۴۳،معجم کبیر :۱۰/۲۲۳، شعب الایمان:۴/۳۹۲

کہ کل کروڑ پتی تھا اور آج ایک ایک پیسہ کی بھیک کا محتاج ہے، یہ صرف سود اور سٹے کے بازاروں میں ہی ہوتا ہے اور اہل تجربہ کے بے شمار بیانات اس بارے میں مشہور و معروف ہیں کہ سود کا مال فوری طور پر کتنا ہی بڑھ جائے؛ لیکن وہ عموماً پائے دار و باقی نہیں رہتا، جس کا فائدہ اولاد اور نسلوں میں چلے۔ اکثر کوئی نہ کوئی آفت پیش آ کر اس کو برباد کر دیتی ہے۔ حضرت معمر رحمۃ اللہ نے فرمایا کہ ہم نے بزرگوں سے سنا ہے کہ سود خوری پر چالیس سال گزرنے نہیں پاتے کہ اس کے مال پر محاق آ جاتا ہے۔(۱)

ایک صورت بے برکتی کی یہ ہے کہ مال تو ہوگا؛ مگر مال سے جو مقصود ہے یعنی سکون کی زندگی وہ میسر نہ ہوگی، چناں چہ پہلے لوگوں اور ہمارے اسلاف کی بہ نسبت آج کے لوگوں کے پاس مال تو بے حد ہے اور ہر قسم کا مال موجود ہے؛ مگر اس مال کی فراوانی کے باوجود راحت و سکون حاصل نہیں؛ بل کہ مال میں اضافہ کے ساتھ ساتھ بے چینی میں بھی اضافہ ہوتا جاتا ہے، یہی سب سے بڑی بے برکتی ہے۔

ایک صورت یہ ہے کہ حرام مال سے جو کام کرنا چاہتے ہیں وہ ہوتے ہوتے رک جاتا ہے اور کام ادھورا رہ جاتا ہے۔ اور یہ ظاہر ہے کہ مال محض رکھنے کے لیے نہیں ہوتا، کیوں کہ اس سے نہ کسی کا پیٹ بھر سکتا ہے اور نہ پیاس بجھ سکتی ہے، نہ گرمی سے حفاظت ہو سکتی ہے اور نہ سردی سے بچاؤ ہو سکتا ہے، لہذا ہر عقل مند کے نزدیک مال بہ ذات خود کوئی مقصود شی نہیں ہے؛ بل کہ یہ دنیا میں اپنی ضرورت و حاجت کو پورا کرنے کا اور راحت و عزت کے حصول کا ذریعہ ہے، اور اس سے اپنے یہی کام بنانا

(۱) معارف القرآن: ۱/ ۵۹۰-۵۹۱

مقصود ہوتا ہے؛ مگر مال حرام کو اللہ تعالےٰ اس قدر بے برکت بنا دیتے ہیں کہ اس سے کام بنتے نہیں؛ بل کہ اور زیادہ بگڑتے ہیں۔

اوپر جو حدیث حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے گزری، اس میں مال حرام میں بے برکتی کا ذکر ہے اور اس بے برکتی سے یہ ساری صورتیں مراد ہیں۔

حرام کھانے والے کے اعمال مقبول نہیں

مال حرام سے ایک نحوست یہ آتی ہے کہ اس کے استعمال کرنے والے کا نہ کوئی عمل قبول ہوتا ہے اور نہ اس کی دعائیں قبول ہوتی ہیں۔

عمل قبول نہ ہونے کی وعید متعدد احادیث میں آئی ہے:

(۱) حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے ایک لمبی حدیث میں آیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کی مستجاب الدعوۃ ہونے کے لیے دعا کی درخواست پر ان کو حلال کھانے کا اہتمام کرنے کی تاکید کی، پھر فرمایا:

« وَالَّذِيْ نَفْسُ مُحَمَّدٍ بِيَدِهِ إِنَّ الْعَبْدَ لَيَقْذِفُ اللُّقْمَةَ الْحَرَامَ فِيْ جَوْفِهِ مَا يُتَقَبَّلُ مِنْهُ عَمَلٌ أَرْبَعِيْنَ يَوْماً،وَأَيُّمَا عَبْدٍ نَبَتَ لَحْمُهُ مِنَ السُّحْتِ وَالرِّبَا فَالنَّارُ أَوْلٰى بِهِ. »

(یعنی اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی جان ہے، بلا شبہ بندہ جب اپنے پیٹ میں حرام لقمہ ڈالتا ہے تو اس کی چالیس دن کا عمل قبول نہیں کیا جاتا اور جس بندہ کا جسم حرام وسود سے بنا ہوا اس کے لیے دوزخ ہی لائق ہے۔)(۱)

---

(۱) معجم اوسط: ۶/ ۳۱۱

ایک حدیث میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ نقل کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس نے کوئی کپڑا دس درھم میں خریدا اور ان میں ایک درہم حرام کا تھا تو جب تک وہ کپڑا اس کے جسم پر ہے اللہ اس کی نماز قبول نہیں کرتا، یہ کہہ کر حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے کانوں میں اپنی انگلیاں ڈالیں اور فرمایا کہ اگر میں نے اس حدیث کو اللہ کے رسول سے نہ سنا ہو تو یہ بہرے ہو جائیں۔(۱)

ایک حدیث میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

« إِذَا أَدَّيْتَ زَكَاةَ مَالِكَ فَقَدْ قَضَيْتَ مَا عَلَيْكَ ، وَمَنْ جَمَعَ مَالًا حَرَاماً ، ثُمَّ تَصَدَّقَ بِهِ لَمْ يَكُنْ لَهُ فِيهِ أَجْرٌ وَكَانَ إِصْرُهُ عَلَيْهِ. »

(اگر تو نے اپنے مال کی زکاۃ دے دی تو تو نے اپنے ذمہ داری پوری کر دی اور جس نے مال حرام جمع کیا پھر اس سے صدقہ دیا تو اس کو اس میں کوئی اجر نہیں ہے اور الٹا اس کا گناہ اس پر آئے گا۔)(۲)

ان احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ حرام لقمہ، وحرام کپڑا وغیرہ کا استعمال انسان کے عمل کو قبولیت سے محروم کر دیتا ہے اور اس کے سارے اعمال ضائع جاتے ہیں، یہ تو نماز و روزہ، صدقہ و زکاۃ ادا کر کے یہ سمجھتا ہے کہ میں نے تو یہ اور وہ عمل کیا ہے؛ مگر جب اللہ کے دربار میں جائے گا تو وہاں اس کا نامۂ عمل ان عبادات سے خالی ہوگا، اور ان پر اسے کوئی اجر و ثواب نہیں ملے گا؛ بل کہ الٹا عذاب و گناہ ہوگا، سوچیں

(۱) مسند احمد: ۵۷۳۲، مسند عبد بن حمید: ۱/۲۶۷، شعب الایمان: ۵/۱۴۲

(۲) صحیح ابن حبان: ۸/۱۱، صحیح ابن خزیمہ: ۴/۱۱۰، مستدرک: ۱/۵۴۸، منتقی ابن جارود: ۱/۹۲

کہ کیا یہ انتہائی حسرت وافسوس کا مقام نہ ہوگا؟

اور دعاؤں کا قبول نہ ہونا بھی احادیث میں آیا ہے۔ چناں چہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''اے لوگو! اللہ تعالے پاک ہے، وہ پاک چیز ہی قبول کرتا ہے اور اللہ تعالے نے مومنین کو اسی بات کا حکم دیا ہے جس کا حکم اس نے اپنے رسولوں کو دیا ہے، پھر آپ نے یہ آیات پڑھیں: ﴿ یَاأَیُّهَا الرُّسُلُ کُلُوْا مِنَ الطَّیِّبَاتِ وَ اعْمَلُوْا صَالِحاً ﴾ (المؤمنون: ۵۱)(اے رسولو! کھاؤ حلال چیزیں اور نیک عمل کرو) اور ﴿ یَا أَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کُلُوْا مِنْ طَیِّبَاتِ مَارَزَقْنَاکُمْ ﴾ (البقرۃ: ۱۷۲)(اے ایمان والو! جو پاکیزہ چیزیں ہم نے تمھیں دی ہیں ان میں سے کھاؤ)، پھر آپ نے ایک ایسے شخص کا ذکر کیا جو دور دراز سے سفر کر کے (کسی متبرک جگہ) آیا اس طرح کہ اس کے بال بکھرے ہوئے تھے اور سر سے پاؤں تک وہ غبار میں اٹا ہوا تھا اور وہ خوب گڑگڑا کر دعا کر رہا تھا اور کہا: اے میرے رب! اے میرے رب! لیکن اس کا کھانا پینا حرام مال سے ہے اس کا لباس حرام ہے، اور اس کی پرورش حرام سے ہوئی ہے، تو اس حالت میں اس کی یہ دعا کیوں کر قبول ہوگی؟۔ (۱)

یہاں سے اس سوال کا جواب بھی نکل آیا جو بعض ؛ بل کہ اکثر لوگ کیا کرتے ہیں کہ ہم بڑی دعائیں کرتے ہیں، اور اس پر ہفتے اور مہینے ہی نہیں ؛ بل کہ سال ہا

(۱) مسلم: ۱۶۸۶، ترمذی: ۲۹۱۵، مسند احمد: ۸۳۳۰، عبد الرزاق: ۲۰/۵، سنن بیھقی: ۳۴۶/۳

سال گزر جاتے ہیں؛ مگر ہماری دعائیں قبول نہیں ہوتیں، آخر ہماری دعا قبول کیوں نہیں ہوتی؟

حدیث نے اس کا جواب دے دیا کہ حرام غذا اور حرام لباس اختیار کرنے والوں کی دعا قبول نہیں کی جاتی، آج بہت سے مسلمان؛ بل کہ نمازی، حاجی اور بڑی بڑی دینی خدمات میں لگے ہوئے لوگ، حرام سے بچنے کا اہتمام نہیں کرتے، پھر ان کی دعائیں کیوں کر قبول ہوں گی؟

حرام کھانے کی اُخروی سزا

یہ تو دنیا میں حرام چیزوں کے استعمال کی نحوست ہے اور آخرت میں اس کی سزا اور عذاب یہ ہے کہ جہنم میں داخل کیا جائے گا۔

(۱) حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت کعب بن عجرہ رضی اللہ عنہ سے فرمایا:

« لَا يَدْخُلُ الْجَنَّةَ لَحْمٌ نَبَتَ مِنَ السُّحْتِ ، اَلنَّارُ أَوْلٰى بِهٖ . »

(جو جسم حرام سے پرورش پایا ہو وہ جنت میں نہ جا سکے گا اور اس جسم کے لیے دوزخ زیادہ لائق ہے۔)(۱)

(۲) حضرت کعب بن عجرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے فرمایا:

« لَا يَدْخُلُ الْجَنَّةَ لَحْمٌ نَبَتَ مِنَ السُّحْتِ ، اَلنَّارُ أَوْلٰى بِهٖ . »

(جو جسم حرام سے پرورش پایا ہو وہ جنت میں نہ جا سکے گا اور اس جسم

(۱) مسند احمد: ۱۴۴۸۱، ابن حبان: ۹/۵، مستدرک: ۱۴۱/۴، مسند عبد بن حمید: ۳۴۵/۱

کے لیے دوزخ زیادہ لائق ہے"۔ (۱)

(۳) اور بعینہ یہی بات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے متعدد صحابہ حضرت عبداللہ بن عباس اور حضرت حذیفہ بن الیمان، حضرت عبدالرحمٰن بن سمرہ رضی اللہ عنہم نے بھی روایت فرمائی ہے۔ (۲)

(۴) حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے:

« لَا يَدْخُلُ الْجَنَّةَ جَسَدٌ غُذِّيَ بِالْحَرَامِ . »

(جو جسم حرام غذا سے پرورش پایا ہو وہ جنت میں نہ جا سکے گا۔) (۳)

(۵) ایک اور حدیث میں آیا ہے:

« مَنْ لَمْ يُبَالِ مِنْ أَيْنَ اكْتَسَبَ الْمَالَ لَمْ يُبَالِ اللّٰهُ مِنْ أَيِّ بَابٍ أَدْخَلَهُ النَّارَ . »

(جو شخص اس بات کی پرواہ نہیں کرتا کہ مال کہاں سے اور کیسے کمائے (یعنی حلال کمائی کی فکر نہیں کرتا) تو اللہ کو بھی اس کی کوئی پرواہ نہیں کہ وہ دوزخ کے جس دروازے سے چاہے داخل ہو جائے۔) (۴)

(۶) ایک اور عبرت ناک حدیث قابل ملاحظہ و لائق توجہ ہے، اللہ کے نبی علیہ السلام نے فرمایا:

---

(۱) معجم کبیر: ۱۹/۱۴۱، معجم اوسط: ۴/۳۷۸، ترمذی: ۶۱۴

(۲) معجم کبیر: ۱۱/۲۱۷، معجم اوسط: ۴/۲۲۲، ومعجم اوسط: ۶/۳۸۰، حلیۃ الاولیاء: ۱/۲۸۱

(۳) معجم اوسط: ۶/۱۱۳، مسند ابو یعلی: ۱/۸۴، مسند البزار: ۱/۱۰۵

(۴) الکبائر للذھبی: ۱۱۹

''قیامت کے دن کچھ لوگوں کو لایا جائے گا جن کے پاس تہامہ کے پہاڑ کے برابر نیکیاں ہوں گی، یہاں تک کہ جب ان کو اللہ کے پاس لایا جائے گا تو اللہ تعالی ان کے اعمال کو اڑتی ہوئی دھول کی طرح کر دیں گے اور ان کو جہنم میں پھینک دیا جائے گا۔ صحابہ رضی اللہ عنہم نے پوچھا، یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم یہ کیوں ہوگا؟ فرمایا کہ « كَانُوْا يُصَلُّوْنَ وَ يَصُوْمُوْنَ وَ يُزَكُّوْنَ وَ يَحُجُّوْنَ ، غَيْرَ أَنَّهُمْ كَانُوْا إِذَا عَرَضَ لَهُمْ شَيْءٌ مِّنَ الْحَرَامِ أَخَذُوْهُ ، فَأَحْبَطَ اللّٰهُ أَعْمَالَهُمْ »

(یہ لوگ نماز پڑھتے تھے، روزہ رکھتے تھے، زکوٰۃ دیتے تھے، حج کرتے تھے؛ لیکن حرام مال سامنے آتا تو اس کو لے لیتے تھے، لہٰذا اللہ نے ان کے اعمال کو حبط کر دیا۔)(۱)

یہ چند احادیث ہیں، ان میں غور کیجیے کہ حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ حرام سے پلا ہوا جسم جنت میں نہیں جائے گا اور دوزخ اس کے لیے زیادہ موزوں اور لائق ہے۔ ہم میں سے کوئی کیا جہنم میں جانا چاہتا ہے؟ کیا وہاں کے عذابات برداشت کرنے کی کسی میں سکت ہے؟ نہیں اور ہرگز نہیں تو پھر کیا ہمیں حرام مال و حرام غذاؤں اور حرام لباس و پوشاک؛ بل کہ ہر حرام چیز سے بچنا لازمی نہیں کہ ہم جہنم سے بچ سکیں؟

حضراتِ صحابہ رضی اللہ عنہم کی حرام سے احتیاط

اب ہم ذرا اس پر بھی نظر کر لیں کہ ہمارے اسلاف کی زندگیوں میں حرام و حلال کی تمیز، اور حرام سے اجتناب کا کیا حال تھا؟ تاریخ و سیرت کی کتابیں دیکھنے

(۱) الکبائر:۱۲۱

سے اس کا بہ خوبی اندازہ ہوتا ہے کہ حضراتِ صحابہ اور سلف صالحین حرام چیزوں سے نہایت درجہ احتیاط کرتے تھے۔

(۱) حضرت سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا واقعہ سیرت نگاروں نے لکھا ہے کہ حضرت کا ایک غلام تھا، وہ ایک دن کچھ کھانا لایا، حضرت نے اس میں سے ایک لقمہ کھالیا، پھر آپ کو معلوم ہوا کہ یہ کھانا حرام ہے، کیوں کہ غلام نے بتایا کہ وہ جاہلیت میں لوگوں کو غیب کی باتیں بتاتا تھا، یہ کھانا اسی کے عوض میں ملا ہے۔ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ تجھ پر تف ہے! تو نے مجھے ہلاک کر دیا۔ پھر آپ نے منہ میں ہاتھ ڈال کر قے کرنا چاہا؛ مگر قے نہ ہوئی۔ لوگوں نے کہا پانی پینے سے قے ہوگی۔ آپ نے پانی منگوایا اور آپ پانی پیتے جاتے اور قے کرتے جاتے، یہاں تک کہ پورا کھانا نکل آیا۔

لوگوں نے کہا کہ اس ایک لقمہ کے لیے آپ نے اتنی مشکل اٹھائی؟ فرمایا کہ اگر اس کے لیے میری جان بھی چلی جاتی تو بھی میں ضرور اس کو نکالتا، کیوں کہ میں نے اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے سنا ہے کہ جو جسم حرام سے پلا ہو وہ دوزخ کے زیادہ لائق ہے۔ (۱)

(۲) اسی طرح کا واقعہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے بھی کتب حدیث میں آیا ہے کہ آپ نے ایک مرتبہ دودھ پیا اور اس کا مزہ کچھ عجیب معلوم ہوا، آپ نے دودھ لانے والے سے پوچھا کہ یہ دودھ کیسا اور کہاں سے آیا ہے؟ اس نے کہا کہ میں جنگل میں گیا تھا، وہاں زکوۃ کے اونٹ چر رہے تھے، یہ دودھ انہی اونٹوں کا ہے، آپ نے یہ سن کر فوراً قے کر دیا، کیوں یہ دودھ زکاۃ کے اونٹوں کا آپ کے لیے

(۱) صفوۃ الصفوۃ:۲۵۲/۱، حلیۃ الاولیاء:۳۱/۱، ریاض النضرۃ:۱۴۱/۲

حلال نہ تھا۔ (۱)

(۳) اسماعیل بن محمد رحمۃ اللہ کہتے ہیں کہ ایک دفعہ حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ کی خدمت میں بحرین سے مشک وعنبر آیا، آپ نے کہا کہ واللہ میں چاہتا ہوں کہ کوئی اچھی طرح تولنے والی عورت ہو جو اس مشک وعنبر کو تولے؛ تاکہ میں اس کو مسلمانوں کے درمیان تقسیم کروں، یہ سن کر آپ کی زوجہ حضرت عاتکہ بنت زید رضی اللہ عنہا نے عرض کیا کہ مجھے اچھی طرح تولنا آتا ہے، دیجئے میں تول دوں، آپ نے فرمایا کہ نہیں، انہوں نے پوچھا کہ کیوں؟ فرمایا کہ مجھے اندیشہ ہے کہ کہیں اس سے تم کچھ لے لو، اس طرح کہ تم اپنی گردن پوچھو اور اس کو یہ لگ جائے۔ (۲)

(۴) حضرت عطارہ کہتی ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اپنی بیوی کو بیت المال کا عطر (مشک وعنبر) دیتے، وہ اس کو فروخت کرتی تھیں، ضرورت پر اس کو اپنے دانتوں سے توڑتی تھیں اور اس میں سے کچھ ہاتوں پر لگ جاتا، ایک دفعہ ایسا ہی ہوا تو انہوں نے اپنے دوپٹہ سے پوچھ لیا، حضرت عمر رضی اللہ عنہ گھر آئے تو فرمایا کہ یہ کیا خوشبو ہے؟ ان کی زوجہ نے واقعہ بتایا، تو فرمایا کہ مسلمانوں کا عطر اور تم نے اس کو استعمال کر لیا؟ پھر ان کا دوپٹہ اتارا اور پانی سے دھوتے جاتے اور سونگتے جاتے تھے، جب تک وہ خوشبو رہی، برابر اس کو دھوتے رہے۔ (۳)

(۵) بنو ثقیف کے ایک شخص کو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کوفہ کے ایک گاؤں ''عکبری'' کا گورنر بنایا، وہ کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ آپ نے مجھے حکم دیا کہ ظہر کی نماز میرے پاس

---

(۱) مؤطا مالک:۱/۲۶۹، سنن بیهقی :۷/۱۴، شعب الایمان:۵/۶۰
(۲) کتاب الورع للامام احمد :۳۷، کتاب الزهد لابن ابی عاصم:۱/۱۱۹
(۳) الورع:۳۷-۳۸

پڑھو، میں حاضر ہوا اور کسی نے مجھے آپ تک جانے سے نہیں روکا، آپ کے پاس پانی کا ایک کوزہ اور ایک پیالہ رکھا تھا، آپ نے شیشہ کے برتن سے ستو نکال کر پیا، وہ شخص کہتے ہیں کہ میں نے عرض کیا کہ یا امیر المؤمنین! کیا عراق میں اس طرح کیا جاتا ہے؟ جب کہ عراق میں کھانے کی بڑی فراوانی ہے۔ آپ نے فرمایا کہ میں نے کنجوسی کی وجہ سے ایسا نہیں کیا ہے؛ بل کہ میں پیٹ میں حلال چیز کے علاوہ کسی چیز کو داخل کرنا مکروہ سمجھتا ہوں۔ (۱)

یہ واقعات بتاتے ہیں کہ حضراتِ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نہ صرف حرام سے؛ بل کہ مشتبہ چیزوں سے بھی کس قدر احتیاط برتتے تھے اور اس کا ان حضرات کو کتنا اہتمام تھا۔

بزرگانِ دین کی حرام سے احتیاط

اس کے بعد تابعین و بزرگانِ دین کی اس سلسلہ میں احتیاط بھی ملاحظہ کیجیے تاکہ ہمارے اندر بھی کچھ احتیاط کا مادہ پیدا ہو جائے۔

(۱) حضرت عمر بن عبد العزیز رحمۃ اللہ کی جانب سے بیت المال کے عطر پر مقرر کردہ نگراں عبد اللہ بن راشد کہتے ہیں کہ میں ایک دفعہ حضرت عمر بن عبد العزیز کی خدمت میں بیت المال کا وہ عطر لایا جو ان سے قبل خلفا کے لیے تیار کیا جاتا تھا، تو آپ نے اپنی ناک پر ہاتھ رکھ لیا، اور فرمایا کہ عطر سے خوشبو ہی تو لی جاتی ہے۔ عبد اللہ بن راشد کہتے ہیں کہ میں نے عرض کیا کہ کیا یہ بات میں آپ کی طرف سے روایت کرسکتا ہوں؟ تو آپ نے اجازت دی۔ (۲)

(۲) بشر بن حارث کہتے ہیں کہ معافی بن عمران فرماتے تھے کہ گزشتہ زمانے میں

---

(۱) الورع:۷۵

(۲) الورع:۳۷

اہل علم میں سے دس آدمی ایسے تھے جو حلال کے سلسلہ میں بہت سخت نظر رکھتے تھے، ان کے پیٹ میں کوئی ایسی چیز داخل نہ ہوتی تھی جس کے بارے میں وہ یہ نہ جانتے ہوں کہ یہ حلال ہے؛ اگر یہ بات معلوم نہ ہوتی تو پانی پر کفایت کر لیتے تھے، پھر حضرت بشر نے ان حضرات کے نام شمار کیے، وہ یہ تھے: ابراہیم بن ادہم، سلیمان الخواص، علی بن الفضیل، ابو معاویہ الاسود، یوسف بن اسباط، وھیب بن الورد، حذیفہ اہل حران میں سے، اور داؤد طائی وغیرہ رحمہم اللہ علیہم اجمعین۔ (۱)

(۳) امام غزالی رحمۃ اللہ نے نقل کیا ہے کہ ایک بزرگ ایک صاحب کے پاس حالت نزع میں بیٹھے ہوئے تھے، اسی اثناء میں ان صاحب کا انتقال ہوگیا اور وہاں ایک چراغ جل رہا تھا، ان بزرگ نے کہا کہ یہ چراغ بجھا دو، کیوں کہ اس چراغ کے تیل میں اب اس میت کے وارثین کا حق ہوگیا ہے۔ یعنی اب ان کی اجازت کے بغیر اس کا جلانا اور اس سے استفادہ کرنا جائز نہیں۔ (۲)

(۴) علامہ ذہبی رحمۃ اللہ نے ''کتاب الکبائر'' میں لکھا ہے کہ بعض بزرگوں سے مروی ہے کہ ان کے انتقال کے بعد وہ کسی کے خواب میں آئے، ان سے پوچھا گیا کہ آپ کے ساتھ کیا سلوک کیا گیا؟ انہوں نے کہا کہ اچھا ہوا؛ مگر مجھے جنت سے روک دیا گیا ہے، کیوں کہ میں نے ایک سوئی کسی سے عاریۃً لیا تھا؛ مگر اس کو واپس نہیں کیا تھا۔ (۳)

(۵) حضرت مولانا مظفر حسین صاحب کاندھلوی رحمۃ اللہ اکابر اولیاء میں سے ہیں۔ وہ دہلی سے اپنے وطن کاندھلہ آنا چاہتے تھے۔ چناں چہ ایک بہلی (گاڑی)

---

(۱) الورع: ۱/۱۰

(۲) احیاء العلوم: ۲/۹۶

(۳) الکبائر: ۱۲۱

کرایہ پر لی اور چل پڑے، راستہ میں بہلی والے سے گفتگو فرمانے لگے، گفتگو کے درمیان گاڑی بان نے بتایا کہ یہ گاڑی ایک رنڈی کی ہے، میں کرایہ پر اس کو چلاتا ہوں۔ یہ سن کر حضرت پیشاب کے بہانہ گاڑی سے اُتر گئے، پیشاب کیا اور بہلی والے سے کہا کہ بیٹھ کر ٹانگیں شل ہوگئی ہیں، ذرا چلنا چاہتا ہوں، تم گاڑی لے کر چلو، میں پیدل چلتا ہوں۔ کافی دور جانے کے بعد گاڑی بان نے عرض کیا کہ حضرت اب بیٹھ جائیے۔ حضرت نے پھر ٹال دیا۔ آخر کار وہ گاڑی بان سمجھ گیا اور کہا کہ آپ رنڈی کی گاڑی پر بیٹھنا نہیں چاہتے ہیں۔ حضرت نے اس کو کاندھلہ لا کر اس کی مزدوری دے دی؛ مگر پورا راستہ پیدل ہی تشریف لائے۔ (۱)

یہ تمام واقعات نہایت عبرت انگیز اور ہماری آنکھیں کھولنے والے ہیں، جن میں اکابرین کا حلال و حرام کے سلسلہ میں غایت تقویٰ اور انتہائی احتیاط ظاہر ہوتا ہے۔

حلال وحرام کے بارے میں اقوال اکابر

اب آئیے، واقعات کے بعد حلال وحرام کے بارے میں ہمارے سلف صالحین و بزرگان امت کے اقوال بھی ملاحظہ کرتے چلیں اور ان سے عبرت ونصیحت حاصل کریں۔

(۱) حضرت یوسف بن اسباط رحمۃ اللہ کہتے ہیں کہ جب کوئی جوان عبادت میں لگتا ہے تو ابلیس (اپنی ذریت سے) کہتا ہے کہ دیکھو اس کا کھانا کیا ہے؟ اگر اس کا کھانا حرام ہوتا ہے تو شیطان کہتا ہے کہ اس کو اس کے حال پر چھوڑ دو، اس کو نہ چھیڑو ؛ تا کہ وہ مجاہدہ کرتا رہے اور تکلیف اُٹھاتا رہے، کیوں کہ وہ حرام کھانے کی وجہ سے خود ہی اپنی ہلاکت کے لیے کافی ہے۔ (۲)

---

(۱) ارواح ثلاثہ: ۲۱۴

(۲) شعب الایمان: ۶۰/۵

(۲) حضرت سری سقطی رحمۃ اللہ کہتے ہیں کہ نجات تین باتوں میں ہے: حلال غذا، کمال تقویٰ اور راہ ہدایت۔ (۱)

(۳) اسحاق الانصاری رحمۃ اللہ کہتے ہیں کہ حضرت حذیفہ مرعشی رحمۃ اللہ نے لوگوں کو صف اول کے لیے دوڑتے ہوئے دیکھا تو فرمایا کہ مناسب ہوتا کہ یہ لوگ حلال کے حاصل کرنے کی طرف ایسا ہی دوڑتے۔ (۲)

(۴) حضرت فضیل بن عیاض رحمۃ اللہ کہتے ہیں کہ حضرت سفیان ثوری رحمۃ اللہ سے پوچھا گیا کہ صف اول کی فضیلت کیا ہے؟ فرمایا کہ تیری روٹی کا وہ ٹکڑا جو تو کھاتا ہے اس کو دیکھ کہ یہ کہاں سے آیا ہے؟ پھر آخری صف ہی میں کھڑا ہو جانا۔ (۳)

(۵) سھل بن عبداللہ تستری رحمۃ اللہ کہتے ہیں کہ ہمارے (صوفیا کے) پانچ اصول ہیں: کتاب اللہ کو تھامنا، رسول اللہ کی اقتدا، حلال کھانا، گناہوں سے بچنا، حقوق کی ادائیگی۔ (۴)

(۶) شعیب بن حرب رحمۃ اللہ نے فرمایا کہ نیکی کے دس اجزاء ہیں اور ان میں سے نو اجزاء تو حلال کمائی کی طلب میں ہیں۔ (۵)

(۷) حضرت یحییٰ بن معاذ رحمۃ اللہ نے کہا کہ طاعت وعبادت اللہ کے خزائن میں سے ایک خزانہ ہے؛ مگر اس کی کنجی دعا ہے اور اس کنجی کے دندانے حلال لقمے ہیں۔ (۶)

---

(۱) شعب الایمان: ۶۰/۵

(۲) شعب الایمان: ۶۰/۵

(۳) شعب الایمان: ۶۱/۵

(۴) شعب الایمان: ۶۰/۵

(۵) کتاب الورع: ۹/۱

(۶) احیاء العلوم: ۹۱/۲

(۸) حضرت سہل بن عبد اللہ تستری رحمۃ اللہ نے فرمایا کہ جو حرام کھانا کھاتا ہے اس کے اعضاء نافرمانی کرتے ہیں، خواہ وہ چاہے یا نہ چاہے اور خواہ اس کا اسے علم ہو یا نہ ہو اور جو حلال کھاتا ہے اس کے اعضاء اطاعت کرتے ہیں اور خیر کے کاموں کے لیے وقف ہوتے ہیں۔(۱)

خلاصہ یہ کہ قرآن وحدیث میں ایک طرف حلال کمائی کی تلاش وفکر اور حلال چیزوں کو کھانے اور استعمال کرنے کی ترغیب اور اس کی برکات کا ذکر ہے، تو دوسری طرف حرام کمائی کی برائی، اکل حرام پر دوزخ اور سخت عذاب کی دھمکی اور اس کی نحوست و بے برکتی کو وضاحت سے بیان کیا گیا ہے اور سلف صالحین وحضرات صحابہ نے اپنی زندگی میں اسی کے مطابق چل کر ہمارے لیے نمونہ چھوڑا ہے۔ اگر ہم بھی اسی طرح حلال کی تلاش وفکر کریں گے اور حرام سے بچیں گے تو ہمیں بھی ہمارے مالوں میں وہی برکتیں نظر آئیں گی جو ان حضرات کو نظر آتی تھیں، پھر آخرت میں بھی ہم کامیابی ونجات کے حق دار ہوں گے۔

ہمارا معاشرہ غلط روش پر

اب ذرا ہمارے ماحول ومعاشرہ پر نظر ڈالیے اور جائزہ لیجئے کہ وہ کہاں تک اس کے مطابق ہے؟ ہر شخص کو بہ خوبی اندازہ ہو جائے گا کہ ہمارا معاشرہ قرآن وحدیث اور اسوۂ اسلاف سے بہت کچھ ہٹا ہوا اور غلط روش پر قائم ہو گیا ہے۔

ایسا لگتا ہے کہ اب حرام وحلال کی تمیز بہت کم لوگوں میں رہ گئی ہے اور حرام چیزوں کو نئی نئی شکلوں اور صورتوں میں لا کر حرام کو بھی حلال قرار دینے کی کوشش کی جارہی ہے، تجارت وکاروبار میں بھی حرام وناجائز صورتوں کو داخل کیا جارہا ہے، خاص طور پر

(۱) احیاء العلوم: ۹۱/۲

سُود کی عجیب عجیب پیچ دار شکلیں تراشی اور رواج دی جا رہی ہیں اور مسلمان اسلامی تعلیمات سے غافل ہو کر انہیں اختیار کرتے چلے جا رہے ہیں، نیز حرام پیشوں، حرام ملازمتوں کے علاوہ چوری، غصب، حقوق کی پامالی، رشوت وغیرہ کی مختلف شکلوں سے لوگ حرام میں مبتلا وملوث ہیں۔

اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی زمانے کے بارے میں جو پیشین گوئی فرمائی تھی وہ شاید یہی زمانہ ہے۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

« يَأْتِي عَلَى النَّاسِ زَمَانٌ لَا يُبَالِي الْمَرْءُ مَا أَخَذَ مِنْهُ ، أَمِنَ الْحَلَالِ أَمْ مِنَ الْحَرَامِ. »

(لوگوں پر ایک زمانہ ایسا آئے گا کہ اس میں آدمی اس کی کوئی پرواہ نہیں کرے گا کہ کہاں سے مال لے رہا ہے، حلال طریقے سے یا حرام طریقے سے)(۱)

لہذا یہاں پر میں عرض کروں گا کہ ایک دفعہ گذشتہ صفحات پر نظر ڈالئے اور دیکھئے کہ حرام پر کیسی سخت دھمکیاں اور وعیدیں آئی ہیں۔ اللہ حفاظت کرے۔

حصول حلال کے چند اہم اصول

اب ہم یہاں حصول رزق حلال کے لیے چند اہم اصول کی طرف نشان دہی کرتے ہیں، جن کا جاننا اس سلسلے میں انتہائی ضروری ہے۔

(۱) اسلام میں جن ذرائع آمدنی کو حرام قرار دیا گیا ہے، ان کے ذریعہ کمائی کرنا یا آمدنی بڑھانا سراسر حرام و ناجائز ہوگا، مثلاً سود لینا، رشوت لینا، جوابازی، چوری کرنا

(۱) بخاری:۱۹۵۴، احمد:۹۶۱۸، دارمی:۲/۳۲۱، ابن حبان:۱۵/۱۲۰، سنن بیہقی:۵/۲۶۴

یا ڈکیتی ڈالنا، یا غصب کرنا یا ظلم وزور سے کسی کا مال لینا وغیرہ، ہر مسلمان جانتا ہے کہ اسلام میں یہ سب ناجائز کام ہیں اوران کوذریعۂ آمدنی بنانا قطعاً حرام ہے۔

سود کی حرمت

سود کی حرمت کس سے پوشیدہ ہے؟ مسلمان ہی نہیں کافر بھی جانتے ہیں کہ اسلام میں سود حرام ہے۔ نیز اس پر سخت ترین وعیدیں آئی ہیں۔اس سلسلہ کی چند آیات ملاحظہ فرمایئے۔قرآن میں فرمایا گیا کہ:

(۱) ﴿يَـٰٓأَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَأْكُلُوا الرِّبٰوٓا أَضْعَافًا مُّضَاعَفَةً ، وَاتَّقُوْا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ﴾ (آل عمران : ۱۳۰)

(اے ایمان والو! تم سود کو بڑھا چڑھا کرنہ کھاؤ، اور اللہ سے ڈرو تا کہ تم کام یاب ہو۔)

دوسری جگہ ارشاد ہے:

(۲)﴿ يَـٰٓأَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اتَّقُوا اللّٰهَ وَ ذَرُوْا مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبٰوٓا إِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ، فَإِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا فَأْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ، وَإِنْ تُبْتُمْ فَلَكُمْ رُءُ وْسُ أَمْوَالِكُمْ ،لَا تَظْلِمُوْنَ وَلَا تُظْلَمُوْنَ ﴾ (البقرۃ :۲۷۸-۲۷۹)

(اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو اور جو سود کی رقم باقی ہے اس کو چھوڑ دو، اگر تم ایمان والے ہو، پس اگر تم نے ایسا نہیں کیا تو اللہ ورسول سے جنگ کا اعلان کردو اور اگر تم نے توبہ کرلی تو تم کو تمہاری اصل رقم ملے گی نہ تو تم ظلم کروگے اور نہ تم پر ظلم کیا جائے گا)

(۳)﴿ اَلَّذِیْنَ یَاْکُلُوْنَ الرِّبٰوا لَا یَقُوْمُوْنَ اِلَّا کَمَا یَقُوْمُ الَّذِیْ یَتَخَبَّطُهُ الشَّیْطٰنُ مِنَ الْمَسِّ﴾ (البقرۃ: ۲۷۵)

(جو لوگ سود کھاتے ہیں وہ قیامت میں اس شخص کی طرح اُٹھیں گے جیسے وہ شخص جس کو شیطان نے چھو کر خبطی بنادیا ہو)

اس آیت کی تفسیر میں مشہور مفسر قرآن حضرت علامہ مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ لکھتے ہیں:

''قرآن نے یہ نہیں فرمایا کہ سود خوار محشر میں پاگل یا مجنون ہو کر اٹھیں گے؛ بل کہ دیوانہ پن یا بے ہوشی کی ایک خاص صورت کا ذکر کیا ہے، کہ جیسے کسی کو شیطان نے لپٹ کر خبطی بنادیا ہو، اس میں شاید یہ اشارہ ہے کہ بے ہوش و مجنون تو بعض اوقات چپ چاپ پڑا بھی رہتا ہے، ان کا یہ حال نہ ہوگا؛ بل کہ شیطان کے خبطی بنائے ہوؤں کی طرح بکواس اور ہذیان اور دوسری مجنونانہ حرکتوں کی وجہ سے پہچانے جائیں گے۔ اور شاید اس طرف بھی اشارہ ہو کہ بیماری سے بے ہوش یا مجنون ہو جانے کے بعد چوں کہ احساس بالکل باطل ہو جاتا ہے، اس کو تکلیف یا عذاب کا بھی احساس نہیں رہتا، ان کا یہ حال نہ ہوگا؛ بل کہ آسیب زدہ کی طرح تکلیف و عذاب کو پوری طرح محسوس کرے گا۔ اب یہاں یہ دیکھنا ہے کہ جرم و سزا میں کوئی مناسبت ہونی چاہیے، اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو سزا کسی شخص یا جماعت کے کسی جرم کے مقابلہ میں کی جاتی ہے، وہ یقیناً اس جرم کے مناسب ہوتی ہے، اس لیے سود خوروں کو خبطی بنا کر محشر میں اُٹھانا شاید اس کا اظہار ہے کہ سود خور روپے پیسہ کی حرص میں اس قدر

مدہوش ہوتا ہے کہ اس کو نہ کسی غریب پر رحم آتا ہے نہ کسی کی شرم مانع ہوتی ہے، وہ چوں کہ اپنی زندگی میں درحقیقت بے ہوش تھا، اس لیے محشر میں بھی اسی حالت میں اُٹھایا گیا، یا یہ سزا اس لیے دی گئی کہ دنیا میں اس نے عقلی رنگ میں اپنی بے عقلی کو ظاہر کیا کہ بیع کو مثل سود قرار دیا اس لیے اس کو بے عقل کرکے اُٹھایا گیا۔(۱)

آیات کے بعد احادیث بھی لیجیے

(۱) حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

«لَعَنَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صلی اللہ علیہ وسلم آکِلَ الرِّبَا وَ مُوْکِلَہٗ وَ کَاتِبَہٗ وَ شَاهِدَہٗ وَقَالَ :هُمْ سَوَاءٌ »

(رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سود لینے والے، دینے والے، اس کو لکھنے والے، اس پر گواہ بننے والے پر لعنت فرمائی اور فرمایا کہ یہ سب (گناہ میں) برابر ہیں)(۲)

(۲) حضرت سمرہ بن جندب رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ رات میرے پاس دو شخص آئے اور مجھے ایک مقدس زمین کو لے گئے، پس ہم سب چلتے رہے یہاں تک کہ خون کی ایک نہر کے پاس آئے جس میں ایک شخص کھڑا ہوا تھا اور دوسرا آدمی اس کے کنارے پر تھا، جس کے سامنے پتھر پڑے ہوئے تھے، جب وہ نہر والا آدمی سامنے آتا اور نکلنے کا ارادہ کرتا، تو یہ کنارے والا آدمی اس کے منہ پر پتھر سے مارتا اور وہیں پہنچا دیتا جہاں وہ پہلے تھا، پس جب بھی وہ نکلنے کا

(۱) معارف القرآن:۱/ ۵۸۸

(۲) مسلم:۲۹۹۵،مسند احمد:۱۳۷۴۴

ارادہ کرتا تو وہ اس کو اسی طرح مار کر لوٹا دیتا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں نے ان دو شخصوں سے (جو درحقیقت اللہ کے فرشتے تھے) پوچھا کہ یہ کون ہے؟ تو کہا کہ یہ سود خور ہے۔(۱)

(۳) حضرت عبداللہ بن حنظلہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

« دِرْهَمُ رِبًا يَأْكُلُهُ الرَّجُلُ وَهُوَ يَعْلَمُ أَشَدُّ مِنْ سِتَّةٍ وَ ثَلاثِينَ زَنْيَةً. »

(سود کے طور پر ایک درہم جو آدمی کھالے، جب کہ وہ جانتا بھی ہو یہ چھتیس مرتبہ زنا سے زیادہ سخت ہے۔)(۲)

(۴) حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«الربا اثنان و سبعون بابا،أدناها مثل إتيان الرجل أمه.»

(سود کے بہتر باب ہیں، ان میں سے ادنی درجہ یہ ایسا ہے جیسے کوئی اپنی ماں سے منہ کالا کرے۔)(۳)

(۵) حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے کہ آپ نے فرمایا کہ معراج کی رات میں ایک قوم پر گزرا، جن کے پیٹ گھروں کے مانند تھے جن میں سانپ تھے جو باہر سے دکھائی دے رہے تھے، میں نے پوچھا

(۱) بخاری:۲۹۴۳، احمد:۱۹۲۳۶
(۲) مسند احمد:۲۰۹۵۱، کنز العمال: حدیث:۹۷۵۷
(۳) معجم الاوسط:۷/۱۵۸

کہ جبرئیل! یہ کون ہیں؟ تو انہوں نے کہا کہ یہ سود خور لوگ ہیں۔(۱)

یہ چند احادیث اس بات کو جاننے کے لیے کافی ہیں کہ اسلام میں سود و ربا نہایت درجہ مذموم اور حرام اور ایک بدترین چیز ہے اور اسلامی معاشرہ میں اس کے پلنے بڑھنے یا پنپنے کی کوئی گنجائش نہیں ہو سکتی۔

بینک انٹرسٹ کا رواج

مگر ہائے افسوس! کہ آج مسلمانوں کا ایک اچھا خاصا طبقہ سود کی اس لعنت میں گرفتار ہے اور بعض تو حیلوں بہانوں سے اس میں مبتلا ہیں اور فرضی ضروریات و حاجات کی بنیاد پر اس کو جائز کر لینے کی فکر کرتے ہیں۔ جب سے سرمایہ دارانہ نظام جس کی بنیاد ہی سود و قمار پر ہے، کا رواج ہوا ہے اور بینکنگ سسٹم قائم ہوا ہے اس وقت سے سود خوری کی شرح مسلمانوں کے اندر خطرناک حد تک بڑھ گئی ہے اور سب سے بڑے خطرے کی بات یہ ہے کہ سود خوری کے ساتھ اس سود خوری کی حرمت کا تصور بھی تقریباً ختم ہوتا جا رہا ہے، عام طور پر اپنا روپیہ بینکوں میں رکھتے اور اس پر سود وصول کرتے ہیں، پھر اس میں بعض لوگ تو وہ سود خود کھا جاتے ہیں اور بعض صدقہ دے دیتے ہیں؛ مگر ہر صورت میں سود لینے کے گناہ میں ملوث ہوتے ہیں۔ جس طرح سود کھانا حرام ہے، اسی طرح سودی معاملہ میں شرکت اور اس کا وصول کرنا بھی حرام ہے۔

اس سے زیادہ افسوس یہ کہ بعض لوگ اپنے چھوٹے بچوں کے نام مختصر سی رقم بینک میں داخل کر دیتے ہیں اور یہ سود در سود ہو کر بڑھتی رہتی ہے، یہاں تک کہ جب وہ بچہ بڑا ہو جاتا ہے اور شادی کے لائق ہو جاتا ہے تو وہ رقم نکال کر شادی کا نظم کیا جاتا

---

(۱) مصنف ابن أبي شيبه:۷/۳۳۵،مسند حارث:۱/۱۶۹، كنز العمال:۹۷۶۲

ہے، لڑکی ہوتو اس کا جہیز اور اس کے نوشہ کے لیے جوڑا مہیا کیا جاتا ہے۔

اور دوسری طرف اپنے آپ کو ماڈرن اور پڑھے لکھے، حالات زمانہ سے واقف کار اور امراض امت کے نبض شناس کہلانے والے لوگ ہیں جو نہایت بے شرمی کے ساتھ صاف وعلی الاعلان اس جرم میں مبتلا ہیں اور سود کی اس لعنت کو مسلمانوں کی زبوں حالی کا واحد علاج سمجھتے ہیں۔ اور ان میں ایک دوسرا طبقہ وہ ہے، جو یہ دعویٰ کرتا ہے کہ اسلام میں جس سود سے منع کیا گیا ہے وہ مہاجنی سود ہے، جو آدمی کی اپنی ذاتی ضروریات پر دئے گئے قرضہ پر وصول کیا جاتا تھا، اس میں وہ سود داخل نہیں جو آج کمرشیل بیس (COMMERCIAL-BASE) پر بینکنگ سسٹم میں دیا اور لیا جاتا ہے، ان لوگوں کا دعویٰ ہے کہ یہ سود نعوذ باللہ اسلام میں جائز ہے؛ کیوں کہ اس سود کا اُس زمانے میں رواج ہی نہیں تھا جب قرآن نازل ہو رہا تھا، اس وقت تو صرف مہاجنی سود کا دنیا میں رواج تھا، اس لیے اسلام میں اُس وقت رائج سود کو ناجائز قرار دیا گیا؛ مگر اس دلیل کا بودہ پن اور کمزوری؛ بل کہ بطلان اہل نظر سے مخفی نہیں، ہم اس وقت ان کے بارے میں کچھ کہنا نہیں چاہتے، کیوں کہ اس کے لیے دوسرا موقعہ ہے، اور ہم نے اس طبقہ کے دلائل کا جائزہ اور ان کا مدلل جواب ہمارے ''فقہی مقالات'' میں دے دیا ہے، یہ موقعہ اس کا نہیں، جو ذوق رکھتے ہوں وہ ہمارے ''فقہی مقالات'' کی طرف رجوع کریں۔

اس وقت صرف اسلام سے عقیدت ومحبت رکھنے والے ان حضرات سے گفتگو مقصود ہے جو نفس وشیطان کی چالوں میں آ کر اس لعنت میں مبتلا ہو گئے ہیں اور اسلام کی ان تعلیمات کے سامنے آ جانے سے ان کے دل میں نور ہدایت جگمگانے لگتا ہے، ہم ان سے یہ کہنا چاہتے ہیں کہ خدارا غور کرو کہ قرآن وحدیث نے سود کو کس قدر

براقرار دیا ہے اور اس پر کیسی کیسی اور کس قدر سخت وعیدیں بیان کی گئی ہیں۔

مارٹ گیج کا حکم

سود کی ایک خاص شکل جو اس زمانے میں ہمارے ان علاقوں میں رواج پا رہی ہے وہ مارٹ گیج کی صورت ہے۔ عوام الناس اس کے بارے میں کہتے ہیں کہ اس میں پیسہ پر سود نہیں اور مکان کا کرایہ نہیں؛ مگر غور کیجئے کہ مکان میں جو شخص سکونت پذیر ہوتا ہے اور مکان سے فائدہ اٹھاتا ہے، یہ مکان سے فائدہ حاصل کرنا روپے پیسہ کا سُود نہیں تو اور کیا ہے؟

اگر مالک مکان کو روپے پیسے نہ دئے جاتے تو وہ بغیر کرایہ کے اپنا مکان کسی کو دیتا؟ بس یہ پیسوں کی وجہ سے بلا کرایہ مکان دیا گیا ہے، یہی اس پیسہ کا سُود ہے۔

حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ:

« كُلُّ قَرضٍ جَرَّ نَفعاً فَهُوَ رِبَا »

(یعنی ہر وہ قرض جس سے نفع حاصل ہو وہ (نفع) سود ہے)(۱)

حضرت یزید بن ابی یحیی سے روایت ہے، وہ کہتے ہیں کہ میں نے حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے سوال کیا کہ اے ابو حمزہ! ہم میں سے کوئی اپنے بھائی کو مال بہ طور قرض دیتا ہے، اور وہ اس کو ہدیہ دیتا ہے، (کیا یہ درست ہے؟) تو آپ نے فرمایا کہ رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے فرمایا ہے کہ تم میں سے کوئی کسی کو قرض دے اور وہ اس کو ہدیہ میں کوئی برتن یا اس کا بند دے، تو قبول نہ کرے، اور اگر اپنی سواری پر بٹھائے تو سوار نہ ہو؛ مگر یہ کہ قرض دینے سے پہلے سے دونوں میں اس طرح کا معاملہ

---

(۱) التلخيص الحبير: "حديث حسن" ، إعلاء السنن: ۱۴/۴۹۹

ہو۔(۱)

امام بیہقی نے روایت کیا ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے کسی نے پوچھا کہ حضرت! ایک شخص نے کسی سے کچھ درہم قرض لیے اور یہ قرض لینے والا قرض دینے والے کو اپنی سواری (جانور) کی پیٹھ پر سوار کرالے تو کیا حکم ہے؟ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ جانور کی پیٹھ سے قرض دینے والے کو جو نفع پہنچا وہ سود ہے۔(۲)

غور کیجئے کہ جب قرض دے کر اتفاق سے، شرط لگائے بغیر سواری کی پیٹھ سے نفع اٹھانا سود ہے، تو شرط یا عرف کی وجہ سے مستقل طور پر سالوں تک گھر سے فائدہ اٹھانا کب جائز ہوسکتا ہے؟

بعض لوگوں نے اس حرام کو حلال کرنے کا ایک حیلہ بھی تراش رکھا ہے، وہ یہ کہ ماہانہ کچھ کرایہ دیتے ہیں؛ مگر وہ اتنا کم ہوتا ہے کہ اس کو کرایہ قرار نہیں دیا جاسکتا۔ مثلاً ایک گھر ہزار روپیہ کا ہے، مارٹ گیج کی صورت میں اس کا پچاس پچیس روپیہ کرایہ دے دیا جاتا ہے اور یہ خیال کرلیا جاتا ہے کہ ہم سود سے بچ گئے؛ مگر یہ محض حیلہ ہے، جو کسی ناجائز کو جائز نہیں کردیتا۔ غور کریں کہ کیا اگر مالک مکان کو جو قرض دیا گیا ہے، وہ نہ دیا جاتا تو وہ اتنا کم کرایہ اس گھر کا لے لیتا؟ ہرگز ہرگز نہ لیتا۔

معلوم ہوا کہ کرایہ میں جو کمی کی گئی وہ قرض کی وجہ سے ہے اور یہ بہ نص حدیث سود ہے۔ حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ نے ''صفائی معاملات'' میں لکھا ہے:

بعض لوگوں نے یہ حیلہ نکالا ہے مثلاً اسی روپیہ کو زمین رکھی اور یہ شرط

---

(۱) سنن بیهقی:۵/۳۵۰

(۲) سنن بیهقی:۵/۳۵۰

ٹھہرائی کہ زمین ایک روپیہ سالانہ پر دے دو، چوں کہ ایک روپیہ سالانہ پر زمین کرایہ پر دینا محض قرضے کے دباؤ سے ہے، اس لیے یہ معاملہ حرام اور انتفاع خبیث ہوگا۔(۱)

چٹ فنڈ یا چٹھی

ایک مصیبت آج چٹ فنڈ چٹھی کی بھی چل پڑی ہے اور اس کی مختلف شکلیں تراشی گئی ہیں۔ عام طور پر جو صورت رائج ہے، جس کو یہاں لوگ ''ہر اس کی چٹھی'' کہتے ہیں، وہ یہ ہے کہ کچھ لوگ مثلاً دس آدمی ہر ماہ دس دس ہزار روپیہ ڈالتے ہیں۔ یہ ایک لاکھ روپے ہو گئے۔ اب اتفاق رائے سے یا قرعہ اندازی سے کسی کا نام تجویز ہوتا ہے اور وہ یہ رقم دو ہزار یا تین ہزار روپے چھوڑ کر لے لیتا ہے۔ دو ہزار یا ڈھائی ہزار، تین ہزار کی رقم چٹ فنڈ چلانے والا لیتا ہے۔ حالاں کہ یہ رقم سراسر سود اور حرام ہے؛ مگر افسوس کہ لوگ بازاروں میں عام طور پر اس میں ملوث ہیں۔ ایسی چٹھی میں شامل ہونا بھی حرام ہے۔ البتہ بغیر چھوڑے ہر آدمی ایک ایک ماہ پوری رقم لے لے، تو اس میں حرج نہیں؛ بل کہ یہ ایک دوسرے سے تعاون کی ایک اچھی صورت ہے۔

رشوت خوری

سود کی طرح اسلام میں رشوت خوری بھی حرام و ناجائز ہے، علمانے رشوت کے معنیٰ یہ بتائے ہیں کہ '' مَا يُعْطِيْ لِإِحْقَاقِ بَاطِلٍ أَوْ لِإِبْطَالِ حَقٍّ ''(کسی ناحق و باطل کو ثابت کرنے یا کسی کے حق کو باطل کرنے پر جو کچھ دیا جائے وہ رشوت ہے۔)(۲)

---

(۱) صفائی معلاملات ملخصاً:۲۵

(۲) التعاریف:۱/ ۳۶۵،التعریفات:۱/ ۱۴۸

اس کو سمجھنے کے لیے چند مثالیں سنئے: مثلاً ایک شخص کی کچھ رقم ایک آدمی کے ذمہ تھی، قاضی کے پاس اس نے اس کے خلاف مقدمہ دائر کیا اور دوسرے نے قاضی کو کچھ مال دیا کہ تم میرے خلاف فیصلہ نہ کرو تو یہ دیا ہوا مال رشوت ہے، کیوں کہ قاضی نے ایک حق کو باطل کرنے پر اس کو لیا ہے۔

اسی طرح اگر کسی نے کسی کا حق مار لینے کے لیے قاضی کو یا کسی اور کو مال دیا تو یہ بھی رشوت ہے، کیوں کہ اس صورت میں ایک باطل کو ثابت کرنے کے لیے مال دیا گیا ہے۔

اسی طرح حاکم و قاضی یا اور کوئی افسر جو اپنی ڈیوٹی پر مقرر ہے اس کا اس ڈیوٹی کو پورا کرنے پر مال لینا بھی رشوت میں داخل ہے۔ علما نے لکھا ہے کہ اگر کسی نے قاضی کو حق کے مطابق فیصلہ کرنے کے لیے رقم دی تو یہ بھی قاضی کے لیے حرام ہے، کیوں کہ حق کے مطابق فیصلہ کرنا تو اس کا کام اور اس کی ذمے داری ہے۔ (۱)

اس سے معلوم ہوا کہ افسران اور سیاسی لوگ جو اپنی ذمے داریوں کو پورا کرنے پر رقمیں اور بڑی بڑی و موٹی موٹی رقمیں لوگوں سے وصول کرتے ہیں یہ سراسر حرام و ناجائز ہے، کیوں کہ یہ ان کی ذمے داری ہے، اس پر کچھ وصول کرنا رشوت میں داخل ہے۔

رشوت اگر ایک طرف شرعاً حرام و ناجائز ہے، تو دوسری طرف انسانیت و شرافت کے بھی بالکل خلاف ہے، اسی لیے اس کی سخت طور پر مذمت بیان کی گئی ہے اور اس پر سخت وعید بیان کی گئی ہے، یہاں چند احادیث پیش کرتا ہوں۔

(۱) حضرت عبد اللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ کہتے ہیں:

«لَعَنَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الرَّاشِيَ وَالْمُرْتَشِيَ.»

---

(۱) نهاية الزين:۱/۳۸۰، شامي:۵/۳۶۲

(حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے رشوت دینے والے اور لینے والے دونوں پر لعنت کی ہے۔)(۱)

(۲) حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ کہتے ہیں:

« لَعَنَ رَسُوْلُ اللّٰهُ صلی اللہ علیہ وسلم الرَّاشِيَ وَالْمُرْتَشِيَ وَالرَّائِشَ الَّذِيْ يَمْشِيْ بَيْنَهُمَا »

(رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے رشوت دینے والے، لینے والے اوران دونوں کے درمیان چل کر معاملہ کرانے والے پر لعنت کی ہے۔)(۲)

(۳) حضرت عبد اللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«اَلرَّاشِيْ وَالْمُرْتَشِيْ فِيْ النَّارِ»

(رشوت دینے والا اور لینے والا دونوں دوزخ میں ہیں۔)(۳)

ان احادیث سے رشوت کی حرمت کے ساتھ اس پر دردناک عذاب کا بھی پتہ چلتا ہے اوران احادیث کی بنیاد پر جمہور علما کے نزدیک رشوت لینا حرام اور گناہ کبیرہ ہے اور بعض حضرات کے نزدیک یہ کفر ہے، جیسا کہ امام نسائی نے حضرت مسروق رحمہ اللہ سے نقل کیا ہے کہ انہوں نے کہا ہے کہ قاضی اگر ہدیہ لیتا ہے تو وہ سُحت یعنی حرام ہے اوراگر وہ رشوت لیتا ہے تو کفر ہے۔(۴)

(۱) ابو داؤد:۳۵۸۰،ترمذي:۱۳۳۷،مسنداحمد:۶۵۳۲،مستدرک:۴/ ۱۱۵

(۲) مستدرک:۴/ ۱۱۵،مسند احمد:۲۲۴۵۲،ابن ابی شیبہ:۴/ ۴۴۴،شعب الایمان:۴/ ۳۹۰

(۳) معجم الاوسط:۳/ ۲۹۶،معجم الصغیر:۱/ ۵۷

(۴) نسائي:۱/ ۵۵۷

اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے بھی یہی قول نقل کیا گیا ہے، چناں چہ ایک موقعہ پر حضرت مسروق رحمۃ اللہ نے جب حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ سے پوچھا کہ کیا آپ کی رائے میں فیصلہ کر کے رشوت لینا سُحت یعنی حرام ہے؟ تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ نہیں، یہ تو کفر ہے، سُحت تو یہ ہے کہ بادشاہ کے پاس کسی کو ایک مقام حاصل ہو اور کسی آدمی کی کوئی حاجت ہو، اور یہ شخص بادشاہ سے وہ کام بغیر ہدیہ لئے نہ کرے تو یہ سُحت ہے۔(۱)

الغرض رشوت ایک بدترین فعل ہے، جس کی اسلام میں کوئی گنجائش نہیں اور نہ اہل اسلام کے معاشرے میں اس کو در آنے کا موقعہ دیا جا سکتا ہے، اس لیے اس سے بہ ہر حال بچنا چاہئے ؛ مگر افسوس کا مقام ہے کہ اس بدترین کام میں بھی اہل اسلام کا ایک طبقہ ملوث نظر آتا ہے، بالخصوص سرکاری دفاتر میں کام کرنے والے لوگ، بڑے سے لے کر معمولی عہدوں پر فائز، اکثر ایسے ہیں جن کی تن خواہ سے زیادہ آمدنی کا مدار یہی رشوت جیسی ناپاک چیز ہے، اور ہر بڑی و چھوٹی بات کے لیے رشوت کا لینا اس کی فطرت میں داخل ہو گیا ہے، اور اس کے بغیر یہ طبقہ کسی قسم کا کام کرے گا اس کا تصور بھی مشکل ہو گیا، ایسے لوگوں کو فوراً توبہ کرنا چاہئے اور اللہ کے حضور معافی مانگنا چاہئے، تا کہ جہنم کے عذاب سے بچیں۔

قمار یعنی جوابازی

حرام ذرائع آمدنی میں سے ایک قمار یعنی جوابازی بھی ہے، جس کو اسلام نے شدت سے منع کیا اور اس پر وعید بیان کی ہے، اور یہ بھی ان مسائل میں سے ہے، جس

(۱) احکام القرآن للجصاص :۴/۸۵

کی حرمت ایک جانی پہچانی حقیقت ہے۔

اس کی حرمت قرآن و حدیث میں وارد ہوئی ہے، قرآن نے اولاً جوے کی برائیوں کی طرف اشارہ فرمایا کہ:

﴿ یَسْئَلُوْنَکَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَیْسِرِ، قُلْ فِیْهِمَا اِثْمٌ کَبِیْرٌ وَّ مَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَ اِثْمُهُمَا اَکْبَرُ مِنْ نَفْعِهِمَا ﴾ (البقرۃ: ۲۱۹)

(لوگ آپ سے شراب اور جوے کے بارے میں پوچھتے ہیں، آپ کہہ دیجئے کہ ان دونوں میں بڑا گناہ ہے اور لوگوں کے لیے کچھ فائدے بھی ہیں، اور ان کا گناہ ان کے فائدوں سے بڑھا ہوا ہے)

اس کے بعد صاف الفاظ میں اس کی حرمت بیان فرمائی اور اس کا اعلان اس طرح کیا کہ:

﴿ یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَیْسِرُ وَالْاَنْصَابُ وَالْاَزْلَامُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّیْطٰنِ، فَاجْتَنِبُوْهُ لَعَلَّکُمْ تُفْلِحُوْنَ ﴾ (المائدۃ: ۹۰)

(اے ایمان والو! شراب اور جوا اور بت اور فال کھولنے کی تیریں، یہ سب گندی باتیں شیطان کے کام ہیں، لہٰذا ان سے بچو تاکہ تم کام یاب ہو)

قرآن کے بعد حدیث کو لیجئے، اس میں بھی صاف صاف قمار و جوے کی حرمت کا اعلان ہے۔

(۱) حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ نے شراب، جوے اور طبل کو حرام کیا ہے، اور ہر نشہ آور چیز حرام ہے۔(۱)

(۱) مسند أحمد: ۲۴۷٦، أبو داؤد: ۳٦۸٦، صحیح ابن حبان: ۱۲/ ۱۸۷

(۲) حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ اول رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے شراب، جوے طبل اور غبیرا (ایک قسم کی شراب) سے منع کیا اور فرمایا کہ ہر نشہ لانے والی چیز حرام ہے۔(۱)

(۳) ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو جوا کھیلتا ہے پھر نماز پڑھنے کھڑا ہوتا ہے اس کی مثال اس شخص کی سی ہے، جو پیپ اور سور کے خون سے وضو کرتا ہے، کیا اس کی نماز قبول ہوگی؟(۲)

(۴) حدیث میں ہے کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ:

« مَنْ قَالَ لِصَاحِبِهِ تَعَالَ أُقَامِرُکَ فَلْیَتَصَدَّقْ »

(جس نے اپنے ساتھی سے کہا کہ چل، میں تجھ سے جوا کھیلوں گا تو اس کو چاہئے کہ صدقہ دے)(۳)

(۵) حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے کہا کہ جو نرد سے جوا کھیلتا ہے، وہ ایسا ہے جیسے سور کھانے والا، اور جو بغیر جوے کے یوں ہی کھیلتا ہے وہ ایسا ہے جیسے وہ جوا اپنے ہاتھ سور کے خون سے آلودہ کر لے، اور جو اس کو بیٹھ کر دیکھتا ہے وہ ایسا ہے جیسے سور کو دیکھنے والا۔(۴)

جوا کیا ہے اور کیوں حرام ہے؟

ان آیات واحادیث وآثار سے واضح ہوا کہ قمار و جوا حرام ہے، اب رہا یہ کہ قمار

(۱) ابو داؤد:۳۶۸۵، مسند أحمد:۶۴۷۸

(۲) معجم کبیر:۲۹۲/۲۲

(۳) بخاری:۴۴۸۲، مسلم: ۱۳۰۷، ترمذی:۱۴۶۵، نسائی:۳۷۱۵

(۴) الأدب المفرد:۴۳۵/۱

یا جوا کسے کہتے ہیں؟

قمار یہ ہے کہ کسی چیز میں نفع ونقصان کو غیر معین ونا معلوم بات پر معلق وموقوف کیا جائے کہ اگر وہ واقع ہو جائے تو نفع ہو اور اگر واقع نہ ہو تو نقصان۔ اسی لیے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ ’’ المخاطرة من القمار ‘‘ (مخاطرہ قمار میں سے ہے) مخاطرہ کے معنی یہ ہیں کہ ایسا معاملہ کیا جائے جو نفع وضرر کے درمیان دائر ہو، یعنی یہ بھی امکان ہو کہ بہت سا مال مل جائے اور یہ بھی احتمال ہو کہ جو ہے وہ بھی ختم ہو جائے، جیسے لاٹری میں ہوتا ہے، یہ سب حرام ہے۔ حتیٰ کہ بعض صحابہ وتابعین نے فرمایا کہ:

« الميسر القمار حتى لعب الصبيان بالكعاب والجوز »

(یعنی ہر قسم کا قمار میسر میں داخل ہے یہاں تک کہ بچوں کا لکڑی کے گٹکوں اور اخروٹ وغیرہ سے کھیلنا بھی اس میں داخل ہے)(۱)

اب رہا یہ سوال کہ اسلام میں جوا کیوں حرام ہے؟ اس کا جواب حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ کی زبانی ملاحظہ کیجیے، آپ نے ’’معارف القرآن‘‘ میں لکھا ہے کہ:

’’جوے کا کھیل سارا اس پر دائر ہے کہ ایک شخص کا نفع دوسرے کے ضرر پر موقوف ہے، جیتنے والے کا نفع ہارنے والے کے نقصان ہی نقصان کا نتیجہ ہوتا ہے، کیوں کہ اس کاروبار سے کوئی دولت بڑھتی نہیں، وہ اسی طرح منجمد حالت میں رہتی ہے، اس کھیل کے ذریعہ ایک کی دولت سلب ہو کر دوسرے کے پاس پہنچ جاتی ہے، اس لیے قمار مجموعی حیثیت سے

---

(۱) مصنف عبد الرزاق:۱۰/ ۴۶۷، ابن ابی شیبہ:۵/ ۲۸۹، سنن بیہقی:۱۰/ ۲۱۳

قوم کی تباہی اور انسانی اخلاق کی موت ہے کہ جس انسان کو نفع رسانی خلق اور ایثار و ہم دردی کا پیکر ہونا چاہیے وہ ایک خون خوار درندہ کی خاصیت اختیار کر لے، کہ دوسرے بھائی کی موت میں اپنی زندگی، اس کی مصیبت میں اپنی راحت، اس کے نقصان میں اپنا نفع سمجھنے لگے، اور اپنی پوری قابلیت اس خود غرضی پر صرف کرے، بہ خلاف تجارت اور بیع و شرا کی جائز صورتوں کے، ان میں طرفین کا فائدہ ہوتا ہے، اور بذریعۂ تجارت اموال کے تبادلہ سے دولت بڑھتی ہے، اور خریدنے والا اور بیچنے والا دونوں اس کا فائدہ محسوس کرتے ہیں۔ ایک بھاری نقصان جوے میں یہ ہے کہ اس کا عادی اصلی کمائی اور کسب سے عادۃً محروم ہو جاتا ہے، کیوں کہ اس کی خواہش یہی رہتی ہے کہ بیٹھے بٹھائے ایک شرط لگا کر دوسرے کا مال چند منٹ میں حاصل کرے، جس میں نہ کوئی محنت ہے نہ مشقت، بعض حضرات نے جوے کا نام میسر رکھنے کی یہ وجہ بیان کی ہے کہ اس کے ذریعہ آسانی سے دوسرے کا مال اپنا بن جاتا ہے۔ جوے کا معاملہ اگر دو چار آدمیوں کے درمیان دائر ہو، تو اس میں بھی مذکورہ مضرتیں نمایاں نظر آتی ہیں؛ لیکن اس نئے دور میں جس کو بعض سطحی نظر والے انسان نا عاقبت اندیشی سے ترقی کا دور کہتے ہیں، جیسے شراب کی نئی نئی قسمیں اور نئے نئے نام رکھ لیے گئے، سود کی نئی نئی قسمیں اور نئے نئے اجتماعی طریقے بینکنگ کے نام سے ایجاد کر لیے گئے ہیں، اسی طرح قمار اور جوے کی بھی ہزاروں قسمیں چل گئیں، جن میں بہت سی قسمیں ایسی اجتماعی ہیں کہ قوم کا تھوڑا تھوڑا روپیہ جمع ہوتا ہے اور جو

نقصان ہوتا ہے وہ ان سب پر تقسیم ہو کر نمایاں نہیں رہتا اور جس کو یہ رقم ملتی ہے اس کا فائدہ نمایاں ہوتا ہے؛ اس لیے بہت سے لوگ اس کے شخصی نفع کو دیکھتے ہیں؛ لیکن قوم کے اجتماعی نقصان پر دھیان نہیں دیتے، اس لیے ان کا خیال ان نئی قسموں کے جواز کی طرف چلا جاتا ہے، حالاں کہ اس میں وہ سب مضرتیں موجود ہیں جو دو چار آدمیوں کے جوے میں پائی جاتی ہیں، اور اس حیثیت سے اس کا ضرر اس قدیم قسم کے قمار سے بہت زیادہ اور اس کے خراب اثرات دور رس اور پوری قوم کی بربادی کا سامان ہے کیوں کہ اس کا لازمی اثر یہ ہوگا کہ ملت کے عام افراد کی دولت گھٹتی جائے گی اور چند سرمایہ داروں کے سرمایہ میں مزید اضافہ ہوتا رہے گا، اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ پوری قوم کی دولت سمٹ کر محدود افراد اور محدود خاندانوں میں مرتکز ہو جائے گی، جس کا مشاہدہ سٹہ بازار اور قمار کی دوسری قسموں میں روزمرہ ہوتا رہتا ہے۔ اور اسلامی معاشیات کا اہم اصول یہ ہے کہ ہر ایسے معاملہ کو حرام قرار دیا جس کے ذریعہ دولت پوری ملت سے سمٹ کر چند سرمایہ داروں کے حوالے ہو سکے۔(۱)

الغرض جوا حرام ہے اور اس سے وصول ہونے والی آمدنی بھی حرام ہے، جس پر سخت وعیدیں ہیں جیسا کہ معلوم ہوا۔

جوے کا مسلم معاشرے میں چلن

مگر مقام حیرت و افسوس ہے کہ اس حرام چیز کا رواج مسلم معاشرے میں پایا جاتا ہے، آج کل جوا لاٹری کی مختلف شکلیں رائج ہیں، اسی طرح بیمہ (انشورنس) پالیسی،

(۱) معارف القرآن: ۲/ ۴۷۸

اور ریس کا کاروبار، قسط وار بیع کی بعض صورتیں، بند ڈبوں کی خرید وفروخت، یہ سب اسی قمار میں داخل ہیں، اور یہ ساری چیزیں آج معاشرہ میں بڑے پیانے پر جاری ہیں اوران میں روز بروز زیادتی نظر آتی ہے، اور غیر تو غیر ان سب میں ہمارے مسلمان بھائیوں کی بھی ایک اچھی خاصی تعداد ملوث نظر آتی ہے اوراس نے اس کو ذرائع آمدنی بنا لیا ہے۔ **لاحول ولا قوۃ الا باللّٰہ.**

مسلمان کی شان تو یہ ہے کہ وہ حرام تو حرام مشتبہ امور سے بھی پرہیز کرتا ہے، اور یہ چیزیں تو حرام قطعی ہیں، جس میں مسلمانوں کا ابتلا نہایت حیران کن بات ہے۔ یہاں یہ معلوم ہونا چاہئے کہ آج قمار و جوے کی بہت سی شکلیں تراش لی گئی ہیں، ان میں سے بعض کی طرف بالخصوص توجہ دلانے کی ضرورت ہے، لہٰذا یہاں ان کا ذکر کرتا ہوں:

انشورنس اسکیم

ان میں سے ایک انشورنس اسکیم ہے جو عالمی پیانہ پر پھیلی ہوئی ہے، یہ اسکیم سود وجوا دونوں سے مل کر بنی ہے؛ مگر لوگ آج کثیر تعداد میں اس میں ملوث ہیں اور بے تحاشا اس کی طرف لپکتے چلے جارہے ہیں اور یہ احساس ہی باقی نہ رہا ہے کہ کل خدا کے حضور پیشی ہوگی تو کیا منہ دکھائیں گے؟

انشورنس ایک ایسے معاملہ کو کہا جاتا ہے، جس میں بعض شرائط پر ایک شخص کو دوسرے کی طرف سے مستقبل میں پیش آنے والے امکانی خطرات سے حفاظت اور بعض نقصانات کی تلافی کی یقین دہانی کی جاتی ہے، اور وہ شرط یہ ہے کہ وہ شخص جس کے لئے خطرات سے حفاظت اور نقصانات کی تلافی کی یقین دہانی کی گئی ہے، وہ ایک معینہ مدت تک ایک مقررہ رقم قسط وار دوسرے شخص کو ادا کرتا رہے، اگر اس مقررہ مدت کے درمیان اس کی جان و مال واملاک کو کوئی خطرہ لاحق ہوگیا تو یہ دوسرا شخص

اس کو اس خطرہ سے بچائے گا، اور اس کے نقصان کی تلافی کرے گا، اور اس مقررہ مدت میں کوئی خطرہ پیش نہ آیا تو بالاقساط ادا کردہ پوری رقم، سود کے ساتھ واپس کردی جائے گی، پھر اس قسط وار جمع شدہ رقم پر سود دینا، اور خطرات کے لاحق ہونے کی صورت میں نقصانات کی تلافی کرنا، یہ دشوار گذار مرحلہ تھا، اس کو اس طرح حل کیا جاتا ہے کہ اس رقم کو سود پر دیا جاتا ہے اور اس سے حاصل ہونے والے سود سے ان ذمے داریوں کو پورا کیا جاتا ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ انشورنس ایک ایسا معاملہ ہے جس کی ابتداء قمار (جوئے) سے ہوتی ہے اور انتہاء سود پر، گویا انشورنس قمار اور سود دونوں کا مرکب ہے، حقیقت کے لحاظ سے انشورنس کا معاملہ ایک سودی کاروبار ہے، جو بینک کے کاروبار کے مثل ہے، دونوں میں جو فرق ہے وہ شکل کا ہے، حقیقت کے لحاظ سے دونوں میں کوئی فرق نہیں، حقیقت میں کوئی فرق ہے تو صرف اتنا کہ اس میں ربوا کے ساتھ غرر (دھوکہ) بھی پایا جاتا ہے۔

اس کے بعد واضح رہے کہ آج انشورنس کی مختلف قسمیں اور صورتیں رائج ہیں، ایک زندگی کا انشورنس، دوسرے املاک کا انشورنس، اور تیسرے ذمے داریوں کا انشورنس، چوتھے میڈیکل انشورنس، وغیرہ، انشورنس کی ان صورتوں اور قسموں میں جو بات مشترک طور پائی جاتی ہے وہ وہی ہے جو اوپر ذکر کی گئی کہ اس کی ابتداء قمار و جوئے سے ہوتی ہے، اور اس کا اختتام سود پر ہوتا ہے، یا یہ کہ اس کی بعض صورتوں میں سود ہے اور بعض میں قمار و جوا پایا جاتا ہے۔

لہٰذا اس کے حرام ہونے میں کیا شبہ رہ جاتا ہے؟ ہاں انشورنس کا وہ معاملہ جو حکومت کی طرف سے جبراً لاگو کیا گیا ہے، جیسے سواریوں و گاڑیوں پر انشورنس، اس حد تک کہا جا سکتا ہے کہ اس کی اجازت ہے اور وہ معاف ہے، کیوں کہ یہ معاملہ غیر اختیاری ہے؛ مگر جو اپنی رضا و خوشی سے لوگ اس اسکیم میں لگے ہوئے ہیں، یہ سراسر

حرام و نا جائز ہے، کیوں کہ اس میں سود بھی ہے اور جوا بازی بھی۔

لاٹری ٹکٹ

ان میں سے ایک لاٹری ٹکٹ بھی ہے، جس کا آج بے حد رواج ہوگیا ہے اور عالمی پیمانہ پر اس کا کاروبار پھیلا ہوا ہے، یہ بھی اسلام کی رو سے سراسر قمار و جوا ہے، کیوں کہ اس میں بھی ایک آدمی اپنی جو رقم لگاتا ہے، اس میں اس کو کبھی جیت ہوگی، تو لاکھوں ہاتھ لگ گئے اور اگر ہارا تو جو اپنا تھا وہ بھی گیا۔

بند ڈبوں کی خرید و فروخت

جوے کی صورتوں میں سے ایک یہ ہے کہ بند ڈبوں کی خرید و فروخت کی جاتی ہے، جیسے عموماً نمائش (EXHIBITION) میں اس کا رواج ہے کہ بند ڈبے ہوتے ہیں، جس میں بعض ڈبے خالی ہوتے ہیں اور بعض میں بڑی اور قیمتی چیز ہوتی ہے اور بعض میں معمولی چیز ہوتی ہے، اور ان کو خریدا بیچا جاتا ہے، اور لوگ شوق سے لیتے اور اپنی قسمت آزمائی کرتے ہیں، اس لیے کہ ہوسکتا ہے کہ کوئی بڑی قیمتی چیز والا ڈبہ ہاتھ لگ جائے؛ مگر اس میں یہ بھی ہوسکتا ہے کہ خالی ڈبہ ہاتھ لگے یا حقیر چیز کا ڈبہ ہاتھ لگے، لہٰذا اسلام میں یہ بھی جوا ہے۔

بیع بالقسط کی بعض صورتیں

اسی طرح جوے کی ایک اور شکل رائج ہوگئی ہے اور لوگ دل و جان سے اس کو اپنائے ہوئے ہیں، اور وہ ''بیع بالاقساط''(installment) کی ایک صورت ہے کہ کچھ لوگوں کو ممبر بنا کر ان سے ہر ماہ ایک رقم لی جاتی ہے اور ہر ماہ قرعہ اندازی سے نام نکالا جاتا ہے، جس کا نام نکلے اس کو مقررہ چیز جیسے موٹر سائیکل وغیرہ دے دی

جاتی ہے اور اس کو آئندہ کچھ دینا نہیں پڑتا، پھر اسی طرح ہر ماہ ایک ایک کا نام قرعہ میں نکالتے ہیں اور جس کا نام نکلے اس کو ایک چیز دے دی جاتی ہے اور پھر اس کو بقیہ قسطیں دینے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ یہ بھی سراسر قمار یعنی جوا بازی ہے؛ کیوں کہ اس میں کسی کو صرف ہزار روپیہ میں موٹر سائیکل مل جاتی ہے اور کسی کو دو میں، کسی کو پندرہ ہزار میں، کسی کو بیس ہزار میں ملتی ہے۔اسی کو شریعت میں جوا کہا جاتا ہے کہ معاملہ نفع ونقصان میں دائر رہے؛ مگر افسوس کہ لوگ ان سب صورتوں میں ملوث ہو کر حرام کا ارتکاب کرتے جارہے ہیں۔

ہاں اگر بیع بالقسط (Instalment) کی یہ صورت ہو کہ آدمی کو ماہانہ ایک ایک قسط کر کے ساری قسطیں ادا کرے اور مقررہ قیمت پوری ادا ہو جانے پر معاملہ ختم ہو جائے ،تو یہ صورت جائز ہے؛ اگر اس میں اس چیز کی عام قیمت سے کچھ زائد دینی پڑے، مثلاً ایک گاڑی پچاس ہزار روپے کی ہو اور اس کو ''انسٹالمنٹ'' میں لینے پر اس کی قیمت پچپن ہزار ہو جائے تو یہ جائز ہے، کیوں کہ یہ زائد رقم دراصل قیمت میں اضافہ ہے اس کی گنجائش ہے۔

چوری کرنا یا ڈکیتی

حرام کمائی کی ایک صورت چوری یا ڈکیتی کر کے کمانا ہے ،جس کا حرام ہونا صرف اسلام کے نزدیک نہیں ؛ بل کہ تمام انسانوں کا مسلم ومتفقہ فیصلہ ہے، اور شاید ہی دنیا میں کوئی ذی عقل وہوش ایسا ہوگا جو اس کو درست قرار دیتا ہو۔

قرآن میں اس کی دنیوی سزا کے طور پر چور کے ہاتھ کاٹنے کا حکم دیا گیا ہے، نیز ایک جگہ فرمایا گیا ہے کہ

﴿ وَمَنْ يَغْلُلْ يَأْتِ بِمَا غَلَّ يَوْمَ الْقِيَامَةِ ﴾ (آل عمران: ۱۶۱)

(اور جو شخص خیانت کرے گا وہ اس کو قیامت کے دن اُٹھالائے گا)

اس آیت میں غلول کا ذکر ہے اس کے معنیٰ مطلقاً خیانت کے بھی آتے ہیں اور خاص طور پر مال غنیمت میں خیانت کے معنیٰ بھی آتے ہیں۔اس آیت میں مال غنیمت میں چوری کرنے پر یہ وعید سنائی گئی ہے، کہ چوری کرنے والا قیامت کے دن اپنے اوپر لادکر وہ چیز لائے گا۔

اور ایک حدیث میں ایک گورنر جس نے بیت المال کے مال میں سے اپنے لیے بہ طور ہدیہ کچھ لے لیا تھا، اس قصہ میں اس سے اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا:

”اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں میری جان ہے، بلا شبہ جو بھی خیانت کرے گا وہ قیامت کے دن اس حال میں حاضر کیا جائے گا کہ وہ خیانت والی چیز اس کی گردن پر سوار ہوگی، اگر وہ چیز اونٹ ہے تو اونٹ کو لادے ہوئے آئے گا، جس کی آواز بھی ہوگی اور اگر وہ چیز گائے ہے، تو گائے کو لادے ہوئے آئے گا، جس کی آواز بھی ہوگی اور اگر وہ بکری ہے، تو وہ بکری لائے گا جو پکار رہی ہوگی، پس میں نے تم کو پہنچادیا ہے۔(۱)

لہٰذا عام چوری ہو یا خاص طور پر مال غنیمت میں چوری ہو، حرام اور بدترین جرم ہیں، یہاں تک کہ ایک حدیث میں چوری اور ایمان کو دو متضاد چیزیں بتایا گیا ہے۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے روایت کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

« لَايَزْنِي الزَّانِي حِيْنَ يَزْنِي وَهُوَ مُؤْمِنٌ وَلَا يَسْرِقُ السَّارِقُ حِيْنَ يَسْرِقُ وَهُوَ مُؤْمِنٌ وَلاَ يَشْرَبُ الْخَمْرَ حِيْنَ يَشْرَبُهَا

(۱) بخاري:۶۱۴۵، مسلم:۴۳۱۳، ابو داود:۲۵۵۷

وَهُوَ مُؤْمِنٌ وَلاَ يَنْتَهِبُ نُهْبَةً ذَاتَ شَرَفٍ يَرْفَعُ النَّاسُ إِلَيْهَا أَبْصَارَهُمْ وَهُوَ مُؤْمِنٌ »

(کوئی زنا کار زنا نہیں کرتا ہے اس حال میں کہ وہ مومن ہو اور کوئی چور چوری نہیں کرتا اس حال میں کہ وہ مومن ہو اور کوئی شرابی شراب نہیں پیتا اس حال میں کہ وہ مؤمن ہو اور کوئی کسی کی ایسی چیز جس کی طرف لوگوں کی آنکھیں اُٹھتی ہیں، ایسی چیز کو نہیں چھینتا اس حال میں کہ وہ مؤمن ہو)(۱)

الغرض چوری کرنا اور کسی کا مال اس کے ذریعہ لے لینا دنیا و آخرت دونوں کے لحاظ سے تباہی ہے، اور یہ آمدنی بھی حرام ہے۔

فائدہ

عام مال میں چوری کی مذمت و برائی اور اس پر وعیدیں و سزائیں معلوم ہوگئیں، یہاں یہ بھی جاننا چاہئے کہ جو مال کسی ادارے یا مسجد یا مدرسہ یا وقف کا ہو اس میں چوری اور بھی زیادہ سخت و شدید ہے۔ حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ نے آیت: ﴿ وَمَنْ يَغْلُلْ يَأْتِ بِمَا غَلَّ يَوْمَ الْقِيَامَةِ ﴾ (آل عمران: ۱۶۱) (اور جو شخص خیانت کرے گا وہ اس کو قیامت کے دن اُٹھالائے گا) کے تحت لکھا ہے:

''یہی حال مساجد و مدارس، خانقاہوں اور اوقاف کے اموال کا ہے، جس میں ہزاروں لاکھوں مسلمانوں کا چندہ ہوتا ہے؛ اگر معاف بھی کرائے، تو کس کس سے معاف کرائے؟ اسی طرح حکومت کے سرکاری خزانے (بیت المال) کا حکم ہے، کیوں کہ اس میں پورے ملک کے

(۱) بخاری: ۲۲۹۵، مسلم: ۸۶، نسائی: ۴۷۸۷، ابن ماجہ: ۳۹۲۶

باشندوں کا حق ہے، جو اس میں چوری کرے اس نے سب کی چوری کی؛ مگر چوں کہ یہی اموال عموماً ایسے ہوتے ہیں جس کا کوئی شخص مالک نہیں ہوتا، نگرانی کرنے والے بے پروائی کرتے ہیں، چوری کے مواقع بہ کثرت ہوتے ہیں، اس لیے آج کل دنیا میں سب سے زیادہ چوری اور خیانت انہی اموال میں ہو رہی ہے اور لوگ اس کے انجام بد اور وبالِ عظیم سے غافل ہیں کہ اس جرم کی سزا علاوہ عذابِ جہنم کے میدان حشر کی رسوائی بھی ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت سے محرومی بھی، نعوذ باللہ منہ۔(۱)

میں کہتا ہوں کہ آج بہت سے دینی و اوقافی اداروں، جیسے مساجد و مدارس اور وقف بورڈ کے اموال و املاک میں غبن و خیانت اور چوری کے واقعات بہ کثرت پیش آرہے ہیں جو ایک طرف اہل اسلام کے لیے باعث ننگ ہیں، تو دوسری طرف ملت کی فلاح و بہبودی میں رکاوٹ کا بھی سبب ہیں۔

اور بعض اہل مدارس (جو اصل میں اہل مدارس کہلانے کے لائق ہی نہیں ہیں؛ بل کہ صرف اہل مدارس کا لبادہ اوڑھ رکھا ہے، تاکہ اس سے مدارس کے نام پر مال حاصل کیا جاسکے) ایسی لوگوں کی جانب سے بھی اس سلسلہ میں بے احتیاطیاں پائی جارہی ہیں؛ بل کہ صاف کہنا چاہئے کہ چوریاں کی جارہی ہیں، جو اور بھی زیادہ باعث ننگ بات ہے، کہ دین کے نام پر چوری کی جائے، ایسے لوگوں کی ان ناشائستہ حرکات کی وجہ سے عام لوگوں کی نظر سے علما و اہل مدارس و اہل دین ہی کا وقار ختم ہوتا جارہا ہے اور عوام الناس ان کی ان حرکات کو دیکھ کر تمام مدارس کے بارے میں بدظنی

---

(۱) معارف القرآن: ۲/۲۳۳

کا شکار ہوتے جا رہے ہیں، ان لوگوں کو اللہ سے ڈرنا چاہیے اور اس بدترین فعل سے باز آنا چاہیے۔

اسی طرح ڈکیتی کا حکم بھی ہے؛ بل کہ یہ چوری سے بھی بدتر ہے، اسی وجہ سے قرآن نے ڈکیتوں کی دنیوی سزا بھی بہت سخت بیان کی ہے۔

چناں چہ فرمایا:

﴿ إِنَّمَا جَزَاءُ الَّذِيْنَ يُحَارِبُوْنَ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ وَ يَسْعَوْنَ فِي الْأَرْضِ فَسَادًا أَنْ يُقَتَّلُوْا أَوْ يُصَلَّبُوْا أَوْ تُقَطَّعَ أَيْدِيْهِمْ وَ أَرْجُلُهُمْ مِنْ خِلَافٍ أَوْ يُنْفَوْا مِنَ الْأَرْضِ، ذٰلِكَ لَهُمْ خِزْيٌ فِي الدُّنْيَا وَلَهُمْ فِي الْآخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ﴾ (المائدة : ۳۳)

(جو لوگ اللہ اور اس کے رسول سے لڑتے ہیں اور ملک میں فساد مچاتے پھرتے ہیں، ان کی یہی سزا ہے کہ ان کو قتل کیا جائے یا سولی دئے جائیں یا ان کے ہاتھ اور پاؤں مخالف جانب سے کاٹ دئے جائیں یا ملک سے دور (کر کے جیل بھیج) دئے جائیں، یہ ان کی رسوائی ہے دنیا میں اور ان کے لیے آخرت میں بڑا عذاب ہے)۔

علمائے تفسیر نے فرمایا ہے کہ اس آیت میں جن فسادیوں کا ذکر ہے ان سے مراد راہ زن و ڈاکو ہیں، اور یہ کہ اس آیت میں چار قسم کی سزا بیان کی گئی ہے، وہ اس لحاظ سے کہ ان کی طرف سے بھی چار قسم کی شرارتیں اور شر انگیزیاں ہوسکتی ہیں:

(۱) ایک یہ کہ انھوں نے لوگوں کو صرف قتل کیا ہو اور مال لوٹنے کی نوبت نہ آئی ہو، اس صورت میں ان کی سزا یہ ہے کہ ان کو بھی قتل کیا جائے، اس کو آیت میں " يُقَتَّلُوْا " سے بیان کیا گیا ہے۔

(۲) اور دوسرے یہ کہ انہوں نے قتل بھی کیا ہو اور مال بھی لوٹا ہو، ان کی سزا یہ ہے کہ ان کو سولی دی جائے، اس کو آیت میں " أَوْ يُصَلَّبُوْا" سے بیان فرمایا گیا ہے، (۳) اور تیسری صورت یہ ہے کہ انہوں نے صرف مال لوٹا ہو، قتل نہ کیا ہو، ان کی سزا یہ ہے کہ ان کے ہاتھ پاؤں مخالف جانب سے کاٹے جائیں، اس کا ذکر آیت میں "أَوْ تُقَطَّعَ أَيْدِيهِمْ وَ أَرْجُلُهُمْ مِنْ خِلَافٍ" کے الفاظ سے کیا گیا ہے، (۴) اور چوتھی صورت یہ کہ وہ رہ زنی کے کے ارادے سے نکلیں؛ مگر کچھ کرنے سے پہلے ہی پکڑ لئے جائیں، ان کی سزا قید وحبس ہے، جس کا ذکر " أَوْ يُنْفَوْا مِنَ الْأَرْضِ" میں ہے۔(۱)

اس سے ڈاکوؤں کا اللہ کی نظر میں نہایت معتوب ہونا اور سخت ترین سزا کا مستحق ہونا معلوم ہوا، اور یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ اس سے حاصل کردہ مال حرام ہے، کیوں کہ اس کو ایک معمولی انسان بھی جانتا اور مانتا ہے، چہ جائے کہ ایک مسلمان سے یہ بات مخفی رہ جائے۔

غصب یا ظلم سے کسی کا مال لینا

کسی کی چیز بلا اس کی اجازت کے لے لینا حرام ہے، اسی طرح کسی کا مال حاصل کرنے ظلم وغصب کرنا اور اس کو چھین لینا بھی ایک بدترین قسم کا کام ہے، جس کی اسلام میں کوئی گنجائش نہیں، اور اس پر وعیدِ شدید وارد ہوئی ہے، لہذا جو کسی کی کوئی چیز اس طرح لیتا ہے اس کے لیے وہ چیز حرام ہوتی ہے، حتیٰ کہ اگر جھوٹا مقدمہ چلا کر وصول کرتا ہے تب بھی وہ حرام ہے۔

قرآن پاک میں ایک موقعہ پر فرمایا گیا ہے:

(۱) روح المعانی:۶/۱۱۹، احکام القرآن للجصاص:۴/۵۳-۵۴

﴿ إِنَّ الَّذِيْنَ يَأْكُلُوْنَ أَمْوَالَ الْيَتٰمٰى ظُلْمًا إِنَّمَا يَأْكُلُوْنَ فِيْ بُطُوْنِهِمْ نَارًا ، وَسَيَصْلَوْنَ سَعِيْرًا ﴾ (النسآء : ١٠)

(بلا شبہ جو لوگ یتیموں کا مال ظلم زبردستی کھا جاتے ہیں وہ دراصل اپنے پیٹوں میں انگارے کھاتے ہیں اور وہ عن قریب جہنم میں داخل ہوں گے۔)

اس سلسلہ میں بہت احادیث آئی ہیں، چند ملاحظہ کیجیے:

اولاً ان احادیث کو لیجیے جن میں کسی کی چیز بلا اس کی اجازت کے لینا ناجائز قرار دیا ہے۔

(۱) حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

« لَا يَحِلُّ لِامْرِئٍ أَنْ يَأْخُذَ عَصَا أَخِيْهِ بِغَيْرِ طِيْبِ نَفْسِهِ وَذٰلِكَ لِشِدَّةِ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ عَزَّ وَجَلَّ مَالَ الْمُسْلِمِ عَلَى الْمُسْلِمِ. »

(کسی شخص کو حلال نہیں کہ وہ اپنے مسلمان بھائی کا عصا یعنی لکڑی بھی بغیر اس کے دل کی خوشی و رضا کے لے لے، یہ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے مسلمان کا مال دوسرے مسلمان پر سخت طور پر حرام کیا ہے)(۱)

(۲) ایک حدیث میں ہے کہ حضرت محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

« لَا يَحِلُّ مَالُ امْرِئٍ مُسْلِمٍ إِلَّا بِطِيْبِ نَفْسٍ مِّنْهُ »

(کسی مسلمان کا مال اس کی دلی رضا و خوشی کے بغیر لینا حلال نہیں)(۲)

(۱) مسند احمد: ۲۲۵۰۰، سنن بیہقی: ۶/۱۰۰

(۲) سنن بیہقی: ۶/۱۰۰

(۳) حضرت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

« كُلُّ الْمُسْلِمِ عَلَى الْمُسْلِمِ حَرَامٌ، مَالُهُ وَ دَمُهُ وَ عِرْضُهُ بِحَسْبِ امْرِىءٍ مِّنَ الشَّرِّ أَنْ يَحْقِرَ أَخَاهُ الْمُسْلِمِ. »

(مسلمان کی ہر چیز دوسرے مسلمان پر حرام ہے، اس کا مال بھی، اس کی جان بھی اور اس کی عزت و آبرو بھی اور آدمی کے شر کے لیے یہ بات کافی ہے کہ وہ مسلمان کی تحقیر کرے۔)(۱)

ظلم و زبردستی کے ساتھ کسی کا مال لے لینے کے بارے میں چند حدیثیں سن لیجئے، تا کہ عبرت ہو سکے۔

(۱) چناں چہ حضرت سعید بن زید رضی اللہ عنہ سے حدیث مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

« مَنْ أَخَذَ شِبْرًا مِنَ الْأَرْضِ ظُلْمًا فَإِنَّهُ يُطَوَّقُهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ مِنْ سَبْعِ أَرْضِيْنَ »

(جس نے کسی کی ایک بالشت بھر زمین بھی ظلم سے لے لی، قیامت کے دن ساتوں زمینوں کا طوق بنا کر اس کو پہنایا جائے گا)(۲)

(۲) حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

« مَنْ أَخَذَ مِنَ الْأَرْضِ شَيْئًا بِغَيْرِ حَقِّهِ خُسِفَ بِهِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ إِلٰى سَبْعِ أَرْضِيْنَ. »

---

(۱) ابو داود:۴۲۳۸، مسلم:۴۶۵۰، ترمذی:۱۸۵۰

(۲) بخاری:۲۹۵۹، مسلم:۳۰۲۳

(جس نے بغیر حق کے کسی کی زمین سے کچھ لے لیا تو اس کو سات زمینوں تک دھنسا دیا جائے گا)(۱)

(۳) اسی طرح یہ حدیث اوپر گزری ہے کہ رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے فرمایا کہ:

« وَلاَ يَنْتَهِبُ نُهْبَةً ذَاتَ شَرَفٍ يَرْفَعُ النَّاسُ إِلَيْهَا أَبْصَارَهُمْ وَهُوَ مُؤْمِنٌ »

(کوئی کسی کی ایسی چیز جس کی طرف لوگوں کی آنکھیں اُٹھتی ہیں، ایسی چیز کو نہیں چھینتا اس حال میں کہ وہ مؤمن ہو)

(۴) حضرت وائل بن حجر رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے فرمایا کہ جو شخص کسی آدمی کی زمین غصب کرلے وہ اللہ سے اس حال میں ملاقات کرے گا کہ اللہ تعالے اس پر غضب ناک ہوگا۔ (۲)

جوڑے جہیز کا مطالبہ

ان احادیث سے معلوم ہوا کہ ایک مسلمان کا مال اس کی دلی رضا وخوشی کے بغیر لینا حرام ہے، لہذا آج کل جو مانگ کر جوڑا جہیز لیا جاتا ہے، اس میں چوں کہ رضا و خوشی یا تو پائی نہیں جاتی یا پوری رضا نہیں پائی جاتی، اس لیے یہ مطالبہ بھی حرام اور یہ مال بھی حرام ہو جاتا ہے؛ مگر افسوس ہے کہ آج یہ بات اچھے اچھے لوگوں میں رواج پا گئی ہے کہ اپنے لڑکے کے لیے رشتہ طے کرتے وقت ایک طویل لسٹ میں مطلوبہ اشیا کا اندراج کر کے لڑکی والوں کو دیا جاتا ہے، اور اگر اس میں کمی بیشی ہوتی ہے تو

(۱) بخاری: ۲۹۵۷
(۲) معجم کبیر: ۱۸/۲۲

لڑائیاں جھگڑے اور اس سے آگے لڑکی پر ظلم و زیادتی کے واقعات پیش آتے ہیں، کہاں تو اسلام کی یہ تعلیم کہ حرام سے پرہیز کرو؟ اور کہاں یہ رواج کہ دوسروں سے مانگ مانگ کرلیا جاتا ہے اور اس میں ان کی رضا ہی نہیں ہوتی !!

اس کے علاوہ یہ بات غور کرنے کی ہے کہ اس طرح مانگ کر لینا، کیا بھیک نہیں ہے؟ ایک مسلمان مرد، لڑکی سے بھیک مانگ کر اپنی زندگی بنائے، یہ باعث شرم بات ہے؛ مگر عجیب بے خبری و غفلت اندیشی کا زمانہ ہے کہ لوگ اس میں آگے ہی بڑھتے جارہے ہیں۔ یاد رکھو کہ یہ سراسر حرام کمائی ہے اور اس کا وبال بڑا سخت ہے۔

ایک حدیث سن لیجیے، حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ نے کہا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا:

« مَنْ تَزَوَّجَ امْرَأَةً لِعِزِّهَا لَمْ يَزِدْهُ اللّٰهُ إِلَّا ذُلًّا ،وَمَنْ تَزَوَّجَهَا لِمَالِهَا لَمْ يَزِدْهُ اللّٰهُ إِلَّا فَقْرًا ،وَمَنْ تَزَوَّجَهَا لِحَسَبِهَا لَمْ يَزِدْهُ اللّٰهُ إِلَّا دَنَاءَةً ،وَمَنْ تَزَوَّجَ امْرَأَةً لَمْ يَتَزَوَّجْهَا إِلَّا لِيَغُضَّ بَصَرَهُ أَوْ لِيُحْصِنَ فَرْجَهُ أَوْ لِيَصِلَ رَحِمَهُ بَارَكَ اللّٰهُ لَهُ فِيهَا وَ بَارَكَ لَهَا فِيهِ. »

(جو کسی عورت سے اس کی شان بان کی وجہ سے شادی کیا، اللہ اس کی ذلت میں اضافہ کرے گا اور جو عورت کے مال کی وجہ سے شادی کیا اللہ تعالے اس کے فقر و فاقہ میں اضافہ کرے گا اور جو عورت کے حسب ونسب کی وجہ سے شادی کیا اللہ تعالیٰ اس کی حقارت و ذلت میں زیادتی کردے گا اور جو عورت سے اس لیے شادی کیا کہ اپنی آنکھوں کو پست رکھے اور شرم گاہ کی حفاظت کرے اور صلہ رحمی کرے تو اللہ اس عورت

سے نکاح میں اس مرد کو بھی اور عورت کو بھی برکت عطا کرے گا۔)(۱)

اب غور کرلیں وہ لوگ جو شادی کا مقصد عورت کے مال کو بناتے ہیں اور شادی رچاتے ہیں اور اس میں کمی ہو جانے پر اس پر ظلم و زیادتی بھی کرتے ہیں، کیا یہ کام اللہ کو ناراض کرنے والا نہیں؟ اور کیا اس کی وجہ سے دنیا یا آخرت میں آدمی کو سکون مل سکتا ہے؟

میراث میں خیانت

نیز ان احادیث سے جب یہ معلوم ہوا کہ کسی کی کوئی چیز ظلماً و جبراً لے لینا جائز نہیں، حرام ہے، تو اسی سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ یہ بھی حرام ہے کہ میراث سے کسی وارث کو محروم کر دیا جائے اور اس کا حصہ نہ دیا جائے، اور اس پر خود قابض ہو جائے، آج کل یہ وبا بھی عام ہوتی جارہی ہے کہ ایک وارث سب مال میراث پر قابض ہو جاتا ہے اور دوسروں کو محروم کر دیتا ہے، اور بعض لوگ وارث بھی نہیں ہوتے اور وہ دوسروں کی جائیداد پر قبضہ کر لیتے ہیں اور وارثین کو محروم کر دیتے ہیں، اور بعض جگہ یہ رواج ہے کہ بھائی لوگ میراث کا کل مال لے لیتے ہیں اور اپنی بہنوں کو اس سے محروم کر دیتے ہیں۔ یہ سب دین و دنیا دونوں کی ہلاکت کا سامان ہے۔

ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«مَنْ قَطَعَ مِيْرَاثًا فَرَضَهُ اللّٰهُ قَطَعَ اللّٰهُ مِيْرَاثَهُ مِنَ الْجَنَّةِ.»

(جس نے اللہ کے فرض کردہ کسی کی میراث کا حصہ کاٹ لیا اللہ تعالیٰ جنت کی میراث سے اس کا حصہ کاٹ دیں گے)(۲)

---

(۱) معجم اوسط طبرانی:۳/۲۱

(۲) شعب الایمان:۶/۲۲۴، سنن سعید بن منصور:۱/۹۶

ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں:

« مَنْ أَبْطَلَ مِيرَاثًا فَرَضَهُ اللّٰهُ فِي كِتَابِهِ أَبْطَلَ مِيرَاثَهُ مِنَ الْجَنَّةِ. »

(جس نے کسی کی میراث جو اللہ نے اپنی کتاب میں فرض کی ہے اس کو باطل کرے گا تو اللہ اس کی جنت کی میراث کو باطل کردے گا۔)(۱)

الغرض میراث پر خود قابض ہو جانا اور وارثین کو اس سے محروم کردینا اور اس میں اللہ کے مقرر کردہ حصوں میں وارثین کی رضا کے بغیر کمی بیشی کرنا سب حرام و ناجائز ہے اور موجب وعید و گناہ ہے۔

جھوٹا مقدمہ لڑ کر کسی کا مال لینے کے بارے میں فرمایا گیا ہے:

(۱) ایک حدیث میں حضرت وائل بن حجر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ایک شخص حضر موت سے اور ایک شخص قبیلہ کندہ سے حاضر ہوئے، حضرمی نے کہا کہ یا رسول اللہ! یہ میری زمین پر قابض ہو گیا ہے، کندی نے کہا کہ یہ زمین میری ہے جس میں میں کھیتی کرتا ہوں، اس کا اس میں کوئی حق نہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرمی سے پوچھا کہ کیا تیرے پاس گواہی ہے، اسنے کہا کہ نہیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تیرے سلسلہ میں (دوسرے سے) قسم لی جائے گی، حضرمی نے کہا کہ یا رسول اللہ! یہ فاجر آدمی ہے، اور قسم کھانے میں اس کی پرواہ نہیں کرتا کہ کس چیز پر قسم کھا رہا ہے، آپ نے فرمایا کہ اس کے بغیر کوئی چارہ نہیں، پس وہ آدمی قسم کھانے کے لیے چلا، جب وہ مڑ گیا تو آپ نے ارشاد فرمایا:

---

(۱) مصنف ابن ابی شیبہ: ۶/۲۴۰

«أَمَا لَئِنْ حَلَفَ عَلٰى مَالِهِ لِيَأْكُلَهُ ظُلْمًا لَيَلْقَيَنَّ اللّٰهَ وَهُوَ عَنْهُ مُعْرِضٌ.»

(اگر اس نے دوسرے کا مال ظلم کے طور پر لے لینے کے لیے اس کے مال پر قسم کھالی تو یہ اللہ سے اس حال میں ملے گا کہ وہ اس سے اعراض فرمائے گا)(۱)

(۲) ایک اور حدیث میں حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«إِنَّمَا أَنَا بَشَرٌ، وَ إِنَّكُمْ تَخْتَصِمُوْنَ إِلَيَّ، وَلَعَلَّ بَعْضَكُمْ أَنْ يَكُوْنَ أَلْحَنَ بِحُجَّتِهِ مِنْ بَعْضٍ، وَأَقْضِي لَهُ عَلٰى نَحْوِ مَا أَسْمَعُ، فَمَنْ قَضَيْتُ لَهُ مِنْ حَقِّ أَخِيْهِ شَيْئًا فَلَا يَأْخُذْ، فَإِنَّمَا أَقْطَعُ لَهُ قِطْعَةً مِنَ النَّارِ.»

(میں ایک انسان ہوں اور تم لوگ اپنے جھگڑے میرے پاس لاتے ہو، اور ممکن ہے کہ تم میں بعض دوسرے کے لحاظ سے اپنی حجت پیش کرنے میں زیادہ زبان آور ولسّان ہو اور میں اس سے جو سنوں اس کے مطابق اس کے حق میں فیصلہ کردوں، پس میں کسی کے حق میں اس کے بھائی کے حق میں سے لے کر فیصلہ کردوں تو وہ اس کو نہ لے، کیوں کہ میں اس صورت میں اس کے حق میں دوزخ کے حصہ کا فیصلہ کر رہا ہوں۔)(۲)

معلوم ہوا کہ کسی کی کوئی چیز ظلم زبردستی لے لینے سے وہ حلال نہیں ہوجاتی؛ بل

---

(۱) مسلم:۱۹۹،ترمذي:۱۲۶۰،ابو داود:۲۸۲۴

(۲) بخاري:۲۴۵۲،مسلم:۳۲۳۱

کہ دراصل یہ جہنم میں جانے کی تیاری ہے اور کسی طور پر حلال نہیں، حتیٰ کہ اگر مقدمہ چلا کر جھوٹے ثبوت دکھا کر مقدمہ جیت گیا تو بھی وہ حلال نہیں۔

(۲) دوسرا اصول یہ یاد رکھنا چاہئے کہ تجارت، ملازمت اور صنعت وحرفت ان سب میں یہ ضروری ہے کہ جس چیز کی تجارت کی جائے یا جس چیز کی ملازمت کی جائے یا جس چیز کو بنایا جائے، وہ شرعی لحاظ سے جائز وحلال ہو؛ اگر وہ چیز ناجائز و حرام ہوگی تو نہ یہ تجارت جائز ہوگی نہ ملازمت جائز ہوگی اور نہ یہ پیشہ جائز ہوگا۔ اور اس سے جو آمدنی ہوگی وہ بھی ناجائز ہوگی۔

مثلاً یہ بات سب کو معلوم ہے کہ اسلام میں شراب اور سود کا کاروبار حرام ہے، لہٰذا اس سے جو آمدنی ہوگی وہ بھی حرام ہوگی۔

حدیث میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فتح مکہ کے دن مکہ میں یہ کہتے ہوئے سنا کہ اللہ اور اس کے رسول نے شراب، مردار، خنزیر اور بتوں کی تجارت کو حرام قرار دیا ہے، آپ سے پوچھا گیا کہ مردار جانور کی چربی کے بارے میں کیا رائے ہے؟ فرمایا کہ نہیں، وہ بھی حرام ہے، پھر فرمایا کہ اللہ یہود کو غارت کرے کہ اللہ نے ان پر مردار کی چربی کو حرام کیا تھا، پس انہوں نے اس کو پگھلایا اور اس کو بیچ کر اس کی قیمت کھانے لگے۔ (۱)

اس حدیث سے جہاں یہ معلوم ہوا کہ شراب کا کاروبار حرام ہے، وہیں یہ بھی پتہ چلا کہ اس کی آمدنی بھی حرام ہے؛ کیوں کہ اس میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہود کی خباثت کا ذکر کرتے ہوئے یہ بتایا کہ اللہ نے ان پر مردار کی چربی کو حرام کیا تھا تو ان لوگوں نے اس کو پگھلا کر بیچا اور اس کی قیمت کھالی، اگر اس کی قیمت کھانا

---

(۱) مختصراً من البخاری:۲۱۲۱، مسلم:۱۵۸۱

حلال ہوتا تو آپ اس پر نکیر نہ فرماتے۔

اس کے علاوہ ایک حدیث میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے صراحۃً فرمایا کہ:

« ثَمَنُ الْكَلْبِ وَ مَهْرُ الْبَغِيِّ وَ ثَمَنُ الْخَمْرِ حَرَامٌ »

(کتے کی قیمت فاحشہ کی اجرت اور شراب کی قیمت حرام ہے)(۱)

نیز حضرت ابوامامہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا گیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ بلاشبہ اللہ تعالی نے گانے والی کو، اس کی تجارت کو اور اس کی قیمت کو اور اس کی تعلیم کو اور اس کی طرف کان لگانے کو حرام قرار دیا ہے۔(۲)

اس حدیث میں بھی گانے والی عورت کو خریدنے بیچنے کو بھی ناجائز فرمایا گیا اور اسی کے ساتھ اس کی قیمت کو بھی ناجائز ٹھہرایا گیا ہے، الغرض معلوم ہوا کہ حرام چیز کا کاروبار و تجارت بھی حرام ہے اور اس کی آمدنی بھی حرام ہوتی ہے۔

اسی طرح حرام کام کی اجرت و مزدوری بھی حرام ہے، لہذا کسی ایسے کام کی ملازمت اختیار کرنا جو ناجائز ہو اور اس سے مال حاصل کرنا دونوں ناجائز ہیں، اوپر کی حدیث میں زانیہ و فاحشہ کی اجرت کو اسی وجہ سے حرام قرار دیا گیا ہے۔ نیز حدیث میں کاہن و نجومی کی اجرت کو بھی حرام قرار دیا ہے۔

چناں چہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

« لَا يَحِلُّ ثَمَنُ الْكَلْبِ وَ حُلْوَانُ الْكَاهِنِ وَ لَا مَهْرُ الْبَغِيِّ . »

(کتے کی قیمت، اور کاہن کی اجرت اور زانیہ کی اجرت حلال

---

(۱) احمد: ۳۳۴۵، سنن دارقطنی: ۳/۷، مسند طیالسی: ۱/۳۶۰

(۲) ذم الملاهی: ۲۷، کنز العمال: ۹۳۹۰

نہیں ہے)(۱)

غور کیجیے کہ اسلام میں کہانت وغیب کی باتیں بتانے کا کام حرام ہے، اس لیے اس کی اجرت ومزدوری کو بھی ناجائز قرار دیا گیا، معلوم ہوا کہ حرام کام کی ملازمت و مزدوری کرنا بھی حرام ہے اور اس کی اجرت لینا بھی حرام ہے۔

اسی طرح کوئی ایسا پیشہ اختیار کرنا اور اس کے ذریعہ کمائی کرنا بھی ناجائز ہے جو اسلام میں ناجائز ہو۔

(۱) چناں چہ روایات میں ہے کہ ایک شخص حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کے پاس آیا اور کہا کہ میں ایک آدمی ہوں جس کی معیشت کا مدار ہاتھ کی کاری گری پر ہے، میں یہ تصویریں بناتا ہوں، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ میں تجھے وہ بات سناتا ہوں جو میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنی ہے کہ آپ نے فرمایا کہ جو شخص تصویر بناتا ہے تو اللہ تعالے اس کو عذاب دیں گے، یہاں تک کہ وہ اس تصویر میں روح ڈالے، اور وہ روح ڈال نہ سکے گا۔ یہ سن کر اس شخص کی سانس زور زور سے پھولنے لگی اور اس کا چہرہ زرد پڑ گیا، ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ تیری خرابی ہو، اگر تو نہیں مانتا تو اس درخت اور ایسی چیز جس میں جان نہ ہو اس کی تصویر بنالیا کرنا۔ (۲)

(۲) حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے کہا:

«نَهٰى رَسُوْلُ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم عَنْ كَسْبِ الْحَجَّامِ وَ عَنْ ثَمَنِ الْكَلْبِ وَ عَنْ كَسْبِ الزَّمَّارَةِ وَعَنْ عَسبِ الْفَحْلِ.»

(رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پچھنے لگانے کی کمائی، کتے کی

---

(۱) نسائی:۴۲۱۹، ابو داود:۳۰۲۳

(۲) بخاری:۲۰۷۳، احمد:۳۲۲۰

قیمت، بانسری کی کمائی اور نر جانور کو جفتی کے لیے کرایہ پر لینے سے منع کیا ہے)(۱)

(۳) حضرت انس رضی اللہ عنہ نے کہا:

« أَخْبَثُ الْكَسْبِ كَسْبُ الزَّمَّارَةِ . »

(بدترین کمائی بانسری کی کمائی ہے۔)(۲)

ان احادیث و آثار میں غور فرمایا جائے، ان سے معلوم ہوتا ہے کہ چوں کہ جان دار شئی کی تصویر سازی اسلام میں حرام ہے، اس لیے اس کا پیشہ اختیار کرنا بھی ناجائز ہے، لہذا اس سے کمائی بھی نہیں کی جاسکتی۔ اسی کو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے اس شخص کو بتایا تھا، ہاں غیر جان دار اشیا کی تصویر سازی بھی جائز ہے اور اس کو بہ طور پیشہ اختیار کرنا بھی جائز اور اس کی آمدنی بھی جائز ہے۔ اسی طرح گانا بجانا اسلام میں حرام ہے، اس لئے گانے بجانے کی اجرت کو بھی ناجائز فرمایا گیا ہے اور بانسری بجانے کی کمائی کو نہایت خبیث فرمایا گیا ہے۔

(۳) تیسری بات یہ ہے کہ تجارت و پیشے میں اس بات کا خصوصی خیال رکھنا چاہئے کہ کسی کو دھوکہ دے کر مال حاصل نہ کرے، کیوں کہ دھوکہ دے کر مال کا لینا حرام ہے۔

متعدد حضرات صحابہ سے یہ حدیث روایت کی گئی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

« مَنْ غَشَّنَا فَلَيْسَ مِنَّا . »

---

(۱) مسند اسحاق:۱/۱۸۸

(۲) ذم الملاهی لابن ابی الدنیا:۷۸

(جس نے ہم کو یعنی مسلمانوں کو دھوکہ دیا وہ ہم میں سے نہیں۔)(۱)

اور یہ دھوکہ مختلف انداز وطریقوں سے ہوتا ہے، مثلاً عمدہ قسم کا مال دکھا کر ردی و خراب قسم کا مال دیا جائے، یا جھوٹی قسم کھا کر کسی خراب چیز کی خوبی بیان کی جائے، یا مال میں ملاوٹ کی جائے، عیب کو چھپا کر بیچا جائے، یا ناپ تول میں کمی کی جائے۔

اس سلسلے میں احادیث ملاحظہ کیجئے۔

عمدہ قسم کا مال دکھا کر ردی وخراب قسم کا مال فروخت کرنے کے بارے میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے ایک حدیث مروی ہے، وہ یہ کہ ایک دفعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کھانے (کی کسی چیز) کے ایک ڈھیر پر سے گزر ہوا، آپ نے اس ڈھیر کے اندر اپنا ہاتھ ڈالا، تو آپ کی انگلیوں میں کچھ تری لگ گئی، آپ نے اس کھانا بیچنے والے سے فرمایا کہ اے کھانے والے! یہ کیا ہے؟ اس نے کہا کہ بارش کا پانی اس میں پڑ گیا ہے، آپ نے فرمایا کہ پھر اس تر کھانے کو تو نے اوپر کیوں نہیں رکھا، تاکہ لوگ اس کو دیکھتے، جو شخص ہمیں دھوکہ دے وہ ہم میں سے نہیں۔ (۲)

نیز حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک بار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا گزر ایک کھانے کے پاس سے ہوا، اور کھانا بیچنے والا اس کو بہت سجا کر رکھا تھا، آپ نے اس میں اپنا ہاتھ ڈالا تو دیکھا کہ اندر گھٹیا قسم کا کھانا ہے، آپ نے فرمایا کہ اس گھٹیا کو الگ رکھ کر بیچنا اور عمدہ کو الگ رکھنا، جو ہمیں دھوکہ دے وہ ہم میں سے نہیں۔ (۳)

نیز حضرت قیس بن ابی غرزہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

---

(۱) الترغیب و الترھیب:۲/۵۷۴

(۲) مسلم:۱۴۷، ترمذی:۱۲۳۶

(۳) مسند احمد:۵۱۱۳، و اللفظ له، معجم اوسط:۳/۶۳، الترغیب:۲/۵۷۲

کا گزر ایک شخص کے پاس سے ہوا جو کھانا بیچ رہا تھا، آپ نے فرمایا کہ اے کھانا بیچنے والے! کیا اس کے نیچے والا ایسا ہی ہے جیسا اس کے اوپر والا؟ اس نے کہا ہاں اے اللہ کے رسول! آپ نے فرمایا کہ جو مسلمانوں کو دھوکہ دے وہ ان میں سے نہیں۔ (۱)

ان احادیث نے یہ بات واضح کردی کہ عمدہ قسم کا سامان ظاہر کرنا اور ردی و کھوٹے قسم کا بیچنا حرام ہے، شریعت اس کی اجازت نہیں دیتی، اور اس سے آمدنی حرام قرار پاتی ہے۔

جھوٹی قسم کھا کر مال فروخت کرنے کے بارے میں حدیث آئی ہے، حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تین آدمیوں پر اللہ تعالے قیامت کے دن نظر رحمت نہیں فرمائیں گے اور نہ ان کو گناہوں سے پاک کریں گے، اور ان کو دردناک عذاب ہوگا، حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے پوچھا کہ یارسول اللہ! وہ کون لوگ ہیں؟ آپ نے فرمایا:

«اَلْمُسْبِلُ وَالْمَنَّانُ وَالْمُنْفِقُ سِلْعَتَهُ بِالْحَلِفِ الْكَاذِبِ .»

(ایک ازار لٹکانے والا، دوسرا احسان جتانے والا، اور تیسرا اپنے سامان کو جھوٹی قسم کھا کر چلتا کرنے والا۔) (۲)

اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ: " اَلْحَلِفُ مُنْفِقَةٌ لِلسِّلْعَةِ، مُمْحِقَةٌ لِلرِّبْحِ " اور بعض روایات میں " مُمْحِقَةٌ لِلْكَسْبِ " ہے اور بعض میں " مُمْحِقَةٌ لِلْبَرَكَةِ " ہے (قسم سامان کو چلتا کردیتا ہے اور کمائی کی برکت کو مٹا دیتا ہے۔) (۳)

---

(۱) معجم کبیر: ۱۸/۳۵۹، مسند ابو یعلی: ۲/۲۳۳

(۲) مسلم: ۱۵۴، ترمذی: ۱۱۳۲، نسائی: ۲۵۱۶، ابو داود: ۳۵۶۵

(۳) بخاری: ۱۹۴۵، مسلم: ۳۰۱۴، نسائی: ۴۳۸۵

معلوم ہوا کہ جھوٹی قسم کھا کر اپنے مال وسامان کو بیچنا بھی حرام وناجائز ہے، لہٰذا اس طرح کی کمائی پر محاق وعذاب آجاتا ہے، اوراس میں کوئی برکت نہیں ہوتی۔

مال میں ملاوٹ کرکے بیچنے کے بارے میں حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

«لَا تَشُوْبُوْا اللَّبَنَ لِلْبَيْعِ .»

(بیچنے کے لیے دودھ میں ملاوٹ نہ کرو۔)

اسی حدیث میں ہے کہ اس کے بعد آپ نے فرمایا:

”تم سے پہلے لوگوں میں ایک شخص انگور کا شیرہ ایک گاؤں میں لے آیا، اوراس میں خوب پانی کی ملاوٹ کی اور بیچا، پھر وہاں سے ایک بندر خریدا اور کشتی میں سمندر کا سفر شروع کیا، جب کشتی موجوں کے بیچ پہنچی تو اللہ نے اس بندر کے دل میں ڈالا اور وہ بندر اس شخص کے پیسوں کا بٹوہ اٹھالیا اور کشتی کے اوپر ایک لکڑی پر چڑھ گیا اور بٹوہ کھولا، اس کا مالک اس کو دیکھ رہا تھا، بندر ایک دینار سمندر میں ڈالتا اور ایک دینار کشتی میں ڈالتا رہا، یہاں تک کہ نصف نصف کردیا۔(۱)

مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالے نے اس گناہ وجرم کی سزا یہ دی کہ بندر کے ذریعہ اس کی حرام کمائی کو سمندر میں ڈلوادیا اور حلال کمائی کو اس کے پاس پہنچادیا۔

ایک روایت میں ہے کہ ایک بار حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ مقام حرہ سے گزر رہے تھے کہ ایک آدمی کو دیکھا کہ وہ دودھ بیچنے کے لیے لے جارہا ہے، حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے اس کو دیکھا تو اس نے دودھ میں پانی ملایا ہوا تھا، آپ نے فرمایا کہ ”تیرا

---

(۱) شعب الایمان:۴/۳۳۳، الترغیب:۲/۵۷۳

اس وقت کیا حال ہوگا جب قیامت میں تجھ سے کہا جائے گا کہ پانی کو دودھ میں سے الگ کر؟"۔(۱)

مال کے عیب کو چھپا کر فروخت کرنے کے متعلق متعدد احادیث مروی ہیں، یہاں دو تین لکھتا ہوں:

(۱) حضرت واثلہ بن الاسقع رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا:

«لَا یَحِلُّ لِأَحَدٍ یَبِیْعُ شَیْئًا إِلَّا بَیَّنَ مَا فِیْهِ وَلَا یَحِلُّ إِنْ عَلِمَ ذٰلِکَ إِلَّا بَیَّنَهُ.»

(کسی کے لیے حلال نہیں کہ وہ کوئی چیز فروخت کرے، مگر یہ کہ اس کے عیب کو بیان کردے اور کسی کے لیے حلال نہیں اگر وہ اس کو جانتا ہو؛ مگر یہ کہ اس کو بتادے۔)(۲)

(۲) حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ روایت فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

«اَلْمُسْلِمُ أَخُوْ الْمُسْلِمِ،وَلَایَحِلُّ لِمُسْلِمٍ إِذَا بَاعَ مِنْ أَخِیْهِ بَیْعًا فِیْهِ عَیْبٌ أَنْ لَّا یُبَیِّنَهُ.»

(مسلمان مسلمان کا بھائی ہے، کسی مسلمان کے لیے جائز نہیں کہ جب وہ اپنے بھائی کو کوئی عیب دار چیز بیچے تو اس کو بیان نہ کرے۔)(۳)

---

(۱) شعب الإیمان:۴/۳۳۳،الترغیب و الترهیب:۵۷۳

(۲) مسند أحمد:۱۶۰۵۶،حاکم وقال صحیح الاسناد:۲/۱۲،سنن بیهقی:۵/۳۲۰

(۳) حاکم في المستدرک وقال: حدیث صحیح علی شرط الشیخین:۲/۱۰، ابن ماجه:،سنن بیهقی:۵/۳۲۰

(۳) حضرت واثلہ بن الاسقع رضی اللہ عنہ کی ایک روایت میں انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے یہ الفاظ نقل کئے ہیں کہ آپ نے فرمایا:

« مَنْ بَاعَ عَيْبًا لَمْ يُبَيِّنْهُ لَمْ يَزَلْ فِي مَقْتِ اللّٰهِ وَلَمْ تَزَلِ الْمَلَائِكَةُ تَلْعَنُهُ . »

(جس نے کوئی عیب دار چیز بغیر بتائے بیچ دی تو وہ ہمیشہ اللہ کے غضب میں اور فرشتوں کی لعنت میں ہوگا۔)(۱)

کس قدر واضح طور پر اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بتا دیا کہ عیب دار چیز کو اس کا عیب چھپا کر بیچ دینا جائز نہیں اور اس کی وجہ سے آدمی اللہ کے غضب اور فرشتوں کی لعنت کا مستحق بن جاتا ہے۔

ناپ تول میں کمی کی حرمت و ممنوعیت اور اس کی برائی و مذمت میں قرآن و حدیث کے بے شمار نصوص موجود ہیں۔

ایک جگہ ارشاد خداوندی ہے:

﴿ وَيْلٌ لِلْمُطَفِّفِيْنَ الَّذِيْنَ إِذَا اكْتَالُوْا عَلَى النَّاسِ يَسْتَوْفُوْنَ وَإِذَا كَالُوْهُمْ أَوْ وَّزَنُوْهُمْ يُخْسِرُوْنَ . ﴾ (المطففين : ۱–۳)

(ناپ تول میں کمی کرنے والوں کے لیے خرابی ہے، جو اپنا حق لوگوں سے وصول کرتے ہیں تو پورا پورا لیتے ہیں اور جب دوسروں کو دیتے ہیں تو کمی کر دیتے ہیں۔)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے اس آیت کے شان نزول میں فرمایا کہ جب اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ تشریف لائے تو وہاں کے لوگ ناپ میں بہت کمی

(۱) ابن ماجه:۲۲۴۷،معجم کبیر:۲۲/۶۵،مسند الشاميين:۲/۳۶۹

کرتے تھے، اس پر یہ آیت نازل ہوئی، اس کے بعد وہ سب سے زیادہ بہترین ناپنے والے ہو گئے۔(۱)

اس آیت سے معلوم ہوا کہ ناپ تول میں کمی اور گھٹانا اسلام میں سخت حرام و ناجائز ہے، اسی لیے کئی جگہ قرآن میں ایک طرف یہ حکم دیا گیا ہے کہ ناپ تول پورا پورا کرو، تو دوسری جانب اس کی بھی تاکید کی گئی ہے کہ ناپ تول میں کمی نہ کرو۔

چناں چہ ناپ تول کو پورا کرنے کا حکم دیتے ہوئے سورۂ انعام میں فرمایا ہے:

﴿وَأَوْفُوا الْكَيْلَ وَالْمِيْزَانَ بِالْقِسْطِ.﴾ (الأنعام: ۱۵۲)

(اور تم ناپ تول انصاف کے ساتھ پورا پورا کرو۔)

اور دوسری جگہ فرمایا گیا ہے:

﴿وَأَوْفُوا الْكَيْلَ إِذَا كِلْتُمْ، وَزِنُوْا بِالْقِسْطَاسِ الْمُسْتَقِيْمِ، ذٰلِكَ خَيْرٌ وَّ أَحْسَنُ تَأْوِيْلاً.﴾

(الإسراء: ۳۵)

(اور تم ناپ پورا کرو جب ناپ کر دیا کرو، اور سیدھی ترازو سے تولا کرو، یہ بات بہتر اور انجام کے لحاظ سے عمدہ ہے)

اور ناپ تول میں کمی کرنے کی ممانعت حضرت شعیب علیہ السلام کی زبانی متعدد مواقع پر ذکر کی گئی ہے:

﴿وَلَا تَنْقُصُوا الْمِكْيَالَ وَالْمِيْزَانَ، إِنِّيْ أَرَاكُمْ بِخَيْرٍ وَّإِنِّيْ أَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ مُّحِيْطٍ، وَيٰقَوْمِ أَوْفُوا الْمِكْيَالَ وَالْمِيْزَانَ بِالْقِسْطِ وَلَا تَبْخَسُوا النَّاسَ أَشْيَاءَ هُمْ

(۱) لباب النقول: ۲۲۸، تفسیر طبری: ۳۰/۹۱

وَلَا تَعْثَوْا فِيْ الْأَرْضِ مُفْسِدِيْنَ. ﴾ (هُود : ۸۴ - ۸۵)

(اور تم ناپ تول میں کمی نہ کرو، میں تمہیں آسودہ حال دیکھ رہا ہوں اور مجھے تم پر گھیر لینے والے عذاب کے دن کا اندیشہ ہے، اے میری قوم! ناپ تول انصاف کے ساتھ پورا کرو، اور لوگوں کو ان کی چیزوں میں گھٹا کر نہ دو، اور زمین میں فساد مچاتے نہ پھرو۔)

یہ بات اگر چہ حضرت شعیب عَلَیْہِ السَّلَام نے اللہ کی جانب سے اپنی قوم سے فرمائی تھی؛ مگر حکم کے لحاظ سے یہ اس امت کو بھی شامل ہے، کیوں کہ دوسری جگہ یہی حکم ہمیں بھی دیا گیا ہے، جیسا اوپر آیت گزری، لہذا اس سے روگردانی و اعراض کی صورت میں یہ امت اس وعید میں بھی شامل ہوگی۔

اور حدیث میں ہے کہ حضرت عبد اللہ بن عمر رَضِیَ اللہُ عَنْہُ کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ نبی کریم صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم ہماری طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا کہ:

« خَمْسٌ إِذَا ابْتُلِيْتُمْ بِهِنَّ ، وَأَعُوْذُ بِاللّٰهِ أَنْ تُدْرِكُوْهُنَّ ، لَمْ تَظْهَرِ الْفَاحِشَةُ فِيْ قَوْمٍ قَطُّ حَتّٰى يُعْلِنُوْا بِهَا إِلَّا فَشَا فِيْهِمُ الطَّاعُوْنُ ، وَالْأَوْجَاعُ الَّتِيْ لَمْ تَكُنْ مَضَتْ فِيْ أَسْلَافِهِمُ الَّذِيْنَ مَضَوْا، وَلَمْ يَنْقُصُوْا الْمِكْيَالَ وَالْمِيْزَانَ إِلَّا أُخِذُوْا بِالسِّنِيْنَ وَشِدَّةِ الْمَئُوْنَةِ وَ جَوْرِ السُّلْطَانِ ، وَلَمْ يَمْنَعُوْا زَكَاةَ أَمْوَالِهِمْ إِلَّا مُنِعُوْا الْقَطْرَ مِنَ السَّمَاءِ ، وَلَوْلَا الْبَهَائِمُ لَمْ يُمْطَرُوْا، وَلَمْ يَنْقُضُوا عَهْدَ اللّٰهِ وَ عَهْدَ رَسُوْلِهٖ إِلَّا سَلَّطَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ عَدُوًّا مِّنْ غَيْرِهِمْ ، فَأَخَذُوْا بَعْضَ مَا فِيْ أَيْدِيْهِمْ، وَمَا لَمْ تَحْكُمْ أَئِمَّتُهُمْ بِكِتَابِ اللّٰهِ وَ يَتَخَيَّرُوْا مِمَّا أَنْزَلَ

اللّٰهُ إِلَّا جَعَلَ اللّٰهُ بَأْسَهُمْ بَيْنَهُمْ .»(۱)

(پانچ باتیں ہیں جب تم ان میں مبتلا ہو جاؤ (تو یہ عذابات پیش آئیں گے) اور میں اللہ کی اس بات سے پناہ چاہتا ہوں کہ تم ان کو پاؤ، جب کسی قوم میں بے حیائی علی الاعلان ہونے لگے، تو ان میں طاعون اور ایسی ایسی بیماریاں پھیل جائیں گی جو ان کے اسلاف میں نہیں تھیں، اور جب کوئی قوم ناپ تول میں کمی کرے گی تو اس کو قحط سالی و تنگی اور بادشاہ کے ظلم میں گرفتار کیا جائے گا اور جب کوئی قوم زکاۃ کو روکے گی، تو اس سے بارش روک دی جائے گی اور اگر جانور نہ ہوتے تو اس پر کبھی بارش نہ ہوتی اور جب اللہ و رسول کے عہد کو توڑے گی تو اس پر غیر قوم میں سے کوئی دشمن مسلط کیا جائے گا، جو اس سے ان کے مال چھین لے گا، اور جب ان کے ائمہ اللہ کی کتاب سے فیصلہ نہیں کریں گے اور اللہ کے نازل کردہ احکام میں سے اپنی مرضی کے مطابق لے لیں گے تو اللہ تعالے ان کے آپس میں لڑائی ڈال دیں گے۔)

اس حدیث میں اور باتوں کے ساتھ نبی کریم صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نے اس بات کا بھی ذکر کیا ہے کہ جب ناپ تول میں کمی کا رواج اور چلن ہوگا تو اس کو قحط سالی و تنگی اور بادشاہ کے ظلم میں گرفتار کیا جائے گا۔ اس سے معلوم ہوا کہ ناپ تول میں کمی کرنا ناجائز و حرام ہے، جس سے اللہ کی پکڑ دنیا میں بھی آجاتی ہے، اور آخرت کا عذاب الگ ہوگا۔

ان ساری تفصیلات سے یہ بتانا مقصود ہے کہ مال کے حاصل کرنے میں کسی قسم

(۱) ابن ماجہ:۴۰۰۹

کا دھوکہ شامل نہ ہونا چاہئے، لہٰذا دھوکہ دیکر کمائی کسی بھی صورت میں جائز نہیں، اس سے حاصل ہونے والا مال حرام و ناجائز ہوتا ہے۔

یہ چند موٹی موٹی باتیں اور واضح اصول ہیں جن کی رعایت و اہتمام سے ان شاء اللہ العزیز امید ہے کہ آدمی حلال کھانا اور حلال کمائی کی راہ پر پڑ جائے گا، اور حرام سے بچنا اس کے لیے آسان ہو جائے گا، ان کے علاوہ اس سلسلے میں جو احکامات قرآن و حدیث میں وارد ہوئے ہیں اور حضرات فقہائے کرام نے ان کی تفصیلات بیان کی ہیں ان کو بھی مدنظر رکھنا چاہئے، کیوں کہ بعض اوقات علم نہ ہونے کی وجہ سے آدمی کوئی فاسد و باطل معاملہ یہ سمجھ کرتا ہے کہ یہ جائز ہے، جب کہ یہ شرعاً ناجائز ہوتا ہے، اور اس طرح حرام یا مکروہ کام کا ارتکاب کر بیٹھتا ہے اور ناجائز آمدنی کو حلال خیال کر کے اختیار کر لیتا ہے۔

چند اہم احادیث

اس کے بعد چند اہم احادیث کا ذکر کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے جن میں سچے تاجر کے فضائل وغیرہ بیان کئے گئے ہیں۔

(۱) حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«اَلتَّاجِرُ الصَّدُوْقُ الْأَمِيْنُ مَعَ النَّبِيِّيْنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَاءِ .»

(سچا امانت دار تاجر نبیوں اور صدیقین اور شہیدوں کے ساتھ ہوگا۔)(۱)

(۲) حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

(۱) ترمذی: ۱۱۳۰، دارمی: ۲۴۲۷

« اَلتَّاجِرُ الصَّدُوْقُ الْأَمِیْنُ الْمُسْلِمِ مَعَ الشُّهَدَاءِ یَوْمَ الْقِیَامَۃِ ''
(سچا امانت دار مسلمان تاجر قیامت کے دن شہیدوں کے ساتھ ہوگا)(۱)

(۳) حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

« التاجر الصدوق تحت ظل العرش یوم القیامۃ. »
(سچا تاجر قیامت کے دن اللہ کے عرش کے سایہ میں ہوگا۔)(۲)

(۴) حضرت حکیم بن حزام رضی اللہ عنہ نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

خرید و فروخت کرنے والے دو شخصوں کو (خریدنے بیچنے) کا اختیار اس وقت تک ہے جب تک کہ وہ دونوں جدا نہ ہوں، پس اگر یہ دونوں خریدنے بیچنے والے سچ بولیں اور (چیز و قیمت کے عیب و کھوٹ کو) بیان کردیں تو ان کے لیے ان کے معاملہ میں برکت دی جاتی ہے، اور اگر وہ (عیب و کھوٹ کو) چھپائیں اور جھوٹ بولیں، تو ممکن ہے کہ وہ نفع کمالیں اور تجارت کی برکت کو ختم کردیا جاتا ہے۔(۳)

(۵) حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

سب سے زیادہ پاکیزہ کمائی ان تاجرین کی کمائی ہے جو بات کرتے

---

(۱) ابن ماجہ:۲۱۳۰

(۲) الترغیب و الترھیب:۲/۵۸۵

(۳) بخاری:۱۹۴۰، مسلم:۲۸۲۵، ترمذی:۱۱۶۷، نسائی:۴۳۸۱، ابو داؤد:۳۰۰۰

ہیں تو جھوٹ نہیں بولتے اور جب ان کے پاس امانت رکھی جائے ،تو اس میں خیانت نہیں کرتے اور جب کسی بات کا وعدہ کرتے ہیں،تو وعدہ خلافی نہیں کرتے ،اور جب کسی سے کوئی چیز خرید تے ہیں،تو چیز کی برائی نہیں کرتے ،اور جب اپنی چیز بیچتے ہیں،تو اس چیز کی جھوٹی تعریف نہیں کرتے ،اور جب ان کے ذمہ کسی کی چیز ہوتی ہے،تو ٹال مٹول نہیں کرتے اور جب دوسروں پر ان کی کوئی چیز ہوتی ہے،تو اس کو تنگ نہیں کرتے۔(۱)

یہ چند احادیث ہیں جن میں نیک بخت اور سچے تاجروں کی تعریف وفضیلت بیان کی گئی ہے اوران کے لیے برکت کی بشارت سنائی گئی ہے،لہذا حلال کمائی کے متلاشی کو اس کا اہتمام کرنا چاہئے۔

حرام کمائی کی چند رائج صورتیں

آج حرام کمائی کی بہت سی صورتیں رائج ہیں جیسا کہ اوپر عرض کر چکا ہوں۔ان میں سے چند کو یہاں شمار کرا دینا مناسب خیال کرتا ہوں۔

(۱) شراب اور دوسری نشہ لانے والی چیزوں کی تجارت۔

(۲) انسانی خون اور اعضاء کی (بلاضرورت) تجارت۔

(۳) تصاویر کی تجارت ،اور جو تصاویر عریانیت وفحش پر مشتمل ہوں،وہ اور زیادہ حرام ہیں۔

(۴) فحش ناول لکھ کر،یا چھپوا کر،یا بیچ کر کمائی کرنا۔

---

(۱) الترغیب:۲/۵۸۶

(۵) فلمی گانوں، قوالیوں اور فحش غزلوں کی کیسٹوں کی تجارت۔

(۶) ویڈیو اور اس کی کیسٹوں کی تجارت یا ان کو کرایہ پر دینے کا کاروبار۔

(۷) ٹیلی ویژن کی تجارت۔

(۸) ویڈیو اور ٹیلی ویژن کی مرمت کا کام۔

(۹) سینما گھر چلانا۔

(۱۰) فوٹو گرافی کا پیشہ کرنا۔

(۱۱) حجام کا داڑھی مونڈنا۔

(۱۲) گانے بجانے کا پیشہ کرنا۔

(۱۳) فال کھولنا اور غیب کی باتیں بتانے کا پیشہ کرنا۔

(۱۴) مارٹ گیج (MORTGAGE) کی صورت میں دوکان یا مکان میں بلا کرائے رہنا۔

(۱۵) سنیما، بینک، شراب خانہ وغیرہ حرام کاموں کے لیے مکانات کرایہ پر دے کر کرایہ کھانا۔

(۱۶) بینک، شراب خانہ وغیرہ، انشورنس ڈپارٹمنٹ سنیما گھر وغیرہ حرام جگہوں پر ملازمت کرنا۔

(۱۷) رشوت لینا۔

(۱۸) سود کھانا، خواہ بینک میں روپیہ جمع کرنے پر جو ملتا ہے وہ ہی کیوں نہ ہو۔

(۱۹) بیمہ یعنی انشورنس اسکیم سے فائدہ اٹھانا۔

(۲۰) چٹی فنڈ کے ذریعہ نفع اٹھانا (اس کی تشریح آگے آئے گی)۔

(۲۱) لاٹری ٹکٹ بیچنا۔

(۲۲) لاٹری ٹکٹ سے فائدہ اٹھانا (لاٹری ٹکٹ کی بے شمار شکلیں ہیں، کچھ کا ذکر آگے آئے گا۔

(۲۳) بینک یا کسی اور حرام کمپنی کے شیرز (SHARES) خریدنا اور اس کا نفع لینا وغیرہ۔

یہ اور اس جیسی ہزاروں صورتیں معاشرے میں رائج ہیں، جن میں سے بعض صریح و قطعی حرام ہیں اور بعض ان سے کم درجہ کی حرام ہیں؛ مگر ہیں سب خلاف شریعت اور نا جائز، جن سے بچنا ہر مسلمان کے لیے ضروری ہے۔

مگر افسوس کہ یہ سب باتیں مسلمانوں میں رواج پا گئی ہیں اور ان میں سے بعض صورتوں کو لوگ حرام بھی نہیں سمجھتے , لہٰذا یہاں ان بعض خاص صورتوں کی وضاحت کر دینا بھی ضروری ہے۔

ایک حدیث نبوی

اصل چیز جس پر مسلمان کو توجہ دینا ہے وہ آخرت ہے نہ کہ دنیا، حرام کمائی و حرام مال دنیا میں کچھ عزت دیتے ہیں تو آخرت میں وہ ذلیل کریں گے۔ حدیث میں ہے کہ حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قیامت کے دن کسی آدمی کے قدم ہٹ نہ سکیں گے جب تک کہ اس سے پانچ چیزوں کا سوال نہ ہو جائے، ان میں سے ایک یہ سوال ہوگا کہ مال کہاں سے کمایا اور کہاں خرچ کیا۔[1]

یعنی حلال ذریعہ سے کمایا، یا حرام سے اور حرام میں خرچ کیا، یا حلال میں۔ اس وقت حرام کمائی کرنے والوں کا کیا جواب ہوگا؟ اور انہیں کیسے چھٹکارا ملے گا۔ غور کرنے کی ضرورت ہے۔

---

(۱) ترمذی: ۲۳۴۰

رزق حلال ووسیع کے لیے اعمال ودعائیں

آخر میں جی چاہتا ہے کہ ان اعمال ودعاؤں کو ذکر کر دیا جائے جو اللہ تعالیٰ کے عظیم الشان دربار میں رزق حلال کے لیے اور وسعت رزق کے لیے پیش کرنے پر امید قوی ہے کہ اللہ تعالیٰ حلال وکشادہ ووسیع رزق کی دولت سے نوازیں گے۔ یہ بات ہر مسلمان جانتا اور مانتا ہے کہ رزق دینا اس میں وسعت وتنگی کرنا، سب اللہ عزوجل کے اختیار میں ہے، قرآن میں متعدد مواقع پر اللہ تعالیٰ نے یہ مضمون ارشاد فرمایا، ایک جگہ فرماتے ہیں:

﴿ اَللّٰهُ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَاءُ مِنْ عِبَادِهٖ وَ يَقْدِرُ لَهٗ ، إِنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَىْءٍ عَلِيْمٌ . ﴾ (العنکبوت: ٦٢)

(اللہ تعالے جس کے لیے چاہتا ہے رزق کو کشادہ کرتا ہے اور جس کے لیے چاہتا ہے تنگ کرتا ہے، بلاشبہ اللہ ہر چیز کو جاننے والا ہے۔)

لہٰذا ایک صاحبِ ایمان کی شان یہ ہے کہ وہ ہر چیز میں عموماً اور رزق کے معاملہ میں بھی خاص طور پر اللہ تعالے ہی سے طلب کرے، ایک طرف شرعی اصول واسلامی قوانین کے مطابق جد و جہد، اور محنت کرے، اور اللہ کی عنایت کردہ صلاحیتوں و قابلیتوں کا ان کے مطابق استعمال کرے، اور دوسری جانب اللہ سے مانگے اور اسی سے التجائیں کرے۔ لہٰذا ہم اولاً اعمال پیش کرتے ہیں پھر احادیث کے حوالے سے چند دعائیں اور اذکار نقل کریں گے۔

توکل علی اللہ اور رزق

اللہ تعالے پر توکل واعتماد بندۂ مؤمن کی خاص ادا وشان ہے، اور اس پر اللہ کی

طرف سے رزق کا وعدہ فرمایا گیا ہے۔ایک صحیح حدیث میں حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا:

« لو أنكم توكلتم على الله حق توكله لرزقكم كما يرزق الطير تغدو خماصا و تروح بطانا .»

(اگر تم اللہ تعالے پر اس طرح توکل کرو جیسا کہ اس کا حق ہے تو اللہ تعالے تم کو اس طرح رزق دیگا جیسے وہ پرندوں کو دیتا ہے، کہ صبح بھوکے نکلتے ہیں اور شام سیر ہو کر لوٹتے ہیں۔)(۱)

معلوم ہوا کہ اللہ پر صحیح معنے میں اعتماد و توکل کرنا رزق خداوندی کو حاصل کرنے کا سبب بنتا ہے؛ مگر یہاں یہ بات فراموش نہیں کرنا چاہئے کہ توکل کی حقیقت اسباب و ذرائع و وسائل کا ترک کر دینا نہیں ہے؛ بل کہ سارے اسباب اختیار کرنے کے باوجود یہ عقیدہ رکھنا کہ اسباب سے نہیں؛ بل کہ مسبب الاسباب سے کام بنتا ہے اور ان اسباب میں بھی اسی اللہ کی ذات نے صلاحیت رکھی ہے، وہ اگر نہ چاہے تو اسباب سے کچھ نہیں ہوتا، وہ اگر چاہے تو بغیر اسباب کے بھی ہو سکتا ہے۔ہاں ہمیں اللہ تعالے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب سے حکم ہے کہ اسباب اختیار کرو، اس لیے ہمیں چاہئے کہ اسباب و وسائل اختیار کریں؛ مگر ساری طاقتوں وقوتوں کا منبع اللہ کی ذات کو سمجھیں۔

چناں چہ اس سلسلہ میں اللہ کے رسول کی تعلیم بہت واضح طور پر موجود ہے، ایک حدیث میں آیا ہے کہ ایک شخص اپنی اونٹنی پر سوار آیا اور عرض کیا کہ یا رسول اللہ! کیا

---

(۱) ابن ماجه:۴۱۶۴، مسند احمد:۳۷۰، صحیح ابن حبان:۲/۵۰۹، مستدرک: ۴/۳۵۴، مسند طیالسی:۱/۱۱، مسند ابو یعلی:۱/۲۱۲

میں اس اونٹنی کو یوں ہی چھوڑ دوں اور اللہ پر توکل کروں؟ آپ نے فرمایا کہ:

« أعقلها و توكل. »

(اس کو رسی سے باندھ پھر توکل کر۔)(۱)

ایک اور حدیث میں ہے کہ اللہ کے نبی صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم نے کسی جھگڑے میں دو شخصوں کے درمیان فیصلہ کیا، تو جس کے خلاف فیصلہ ہوا وہ واپس ہوتے ہوئے کہنے لگا کہ ''**حسبي الله و نعم الوكيل**'' نبی کریم صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم نے فرمایا کہ اللہ تعالے کم ہمتی پر ملامت کرتے ہیں، لہٰذا تجھ پر لازم ہے کہ اول عقل و ہمت سے کام لے، اس کے باوجود تقدیر تجھ پر غالب ہو جائے تو کہنا ''**حسبي الله و نعم الوكيل**''۔(۲)

اسی طرح حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آپ کا گزر کچھ لوگوں پر سے ہوا، آپ نے ان سے پوچھا کہ تم کون ہو؟ انہوں نے کہا کہ ہم متوکلین ہیں، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ: بل کہ تم تو متکلین (دوسروں پر بوجھ بننے والے) ہو، پھر فرمایا کہ کیا میں نہ بتاؤں کہ متوکل کون لوگ ہوتے ہیں؟ متوکل وہ ہے جو زمین میں بیج ڈالتا ہے، پھر اللہ پر توکل کرتا ہے۔(۳)

الغرض توکل ترک اسباب کا نام نہیں؛ بل کہ اسباب کو اختیار کرتے ہوئے اللہ پر اعتماد کرنے کا نام ہے۔

تقویٰ اور رزق

تقویٰ و پرہیزگاری کی زندگی گزارنے سے بھی اللہ کی جانب سے رزق کے

(۱) شعب الایمان:۸۰/۲

(۲) شعب الایمان:۸۱/۲

(۳) شعب الایمان:۸۱/۲

دروازے کھول دئے جاتے ہیں۔

قرآن میں ارشادِ ربانی ہے:

﴿وَمَنْ يَّتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَهُ مَخْرَجًا وَ يَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ .﴾ (الطّلاق : ۲)

(جو اللہ سے ڈرتا ہے اللہ اس کے لیے مصیبت سے نکلنے کا راستہ بنا دیتے ہیں اور اس کو اس جگہ سے رزق دیتے ہیں جہاں اس کا گمان بھی نہیں جاتا۔)

معلوم ہوا کہ تقویٰ و پرہیز گاری کی یہ دولت اللہ تعالیٰ کی جانب سے رزق کا انتظام کر دیا جاتا ہے اور اس طرح کر دیا جاتا ہے کہ اس کو خود بھی اس کا گمان نہیں ہوتا۔

نماز اور رزق

قرآن کریم سے معلوم ہوتا ہے کہ نماز کا اہتمام و پابندی کرنے سے رزق کے دروازے کھلتے ہیں:

ایک جگہ ارشاد ہے:

﴿وَأْمُرْ أَهْلَكَ بِالصَّلٰوةِ وَاصْطَبِرْ عَلَيْهَا، لَا نَسْئَلُكَ رِزْقًا ، نَحْنُ نَرْزُقُكَ ،وَالْعَاقِبَةُ لِلتَّقْوٰى .﴾ (طٰهٰ :۱۳۲)

(اپنے گھر والوں کو نماز کا حکم دیجئے اور خود بھی اس پر پابندی کیجئے، ہم آپ سے رزق نہیں مانگتے ،ہم خود آپ کو رزق دیں گے ،اور نیک انجام تقویٰ والوں کے لیے ہے)

صلہ رحمی اور رزق

رزق کے دروازے اس وقت بھی کشادہ ہوتے ہیں جب آدمی صلہ رحمی اور رشتہ

داری کے حقوق ادا کرتا ہے، ایک حدیث میں حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

« مَنْ سَرَّهُ أَنْ يُبْسَطَ لَهُ فِي رِزْقِهِ اَوْ يُنْسَأَ لَهُ فِيْ أَثَرِهِ فَلْيَصِلْ رَحِمَهُ . »

(جس کو یہ بات خوش کرتی ہو کہ اس کے رزق میں وسعت و کشادگی کی جائے اور اس کی عمر لمبی ہو تو اس کو چاہئے کہ صلہ رحمی کرے، یعنی رشتہ داروں سے اچھا سلوک کرے۔)(۱)

معلوم ہوا کہ رشتے داروں کے ساتھ صلہ رحمی، ان کے حقوق کی ادائیگی، ان سے نیک برتاؤ، عمر درازی کا بھی سبب ہے اور رزق میں وسعت کا بھی ذریعہ۔

استغفار اور رزق

قرآن وحدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ استغفار کی کثرت بھی رزق کے دروازے کھولتی ہے، لہذا روزانہ اس کا بھی معمول بنانا چاہئے۔

قرآن پاک میں ہے:

﴿ اِسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ ، إِنَّهُ كَانَ غَفَّاراً، يُرْسِلِ السَّمَاءَ عَلَيْكُمْ مِّدْرَاراً وَّ يُمْدِدْكُمْ بِأَمْوَالٍ وَّ بَنِيْنَ وَيَجْعَلْ لَّكُمْ جَنّٰتٍ وَّ يَجْعَلْ لَّكُمْ أَنْهَاراً . ﴾ (نوح: ۱۰-۱۲)

(اپنے رب سے استغفار کرو، بلاشبہ وہ بہت بخشنے والا ہے، وہ تم پر بہتی بارش کرے گا، اور تمہارے مالوں اور اولاد کو زیادہ کرے گا اور تمہارے لیے باغات مقرر کرے گا اور نہریں مقرر کرے گا۔)

(۱) بخاری: ۱۹۶۱، مسلم: ۲۵۵۷، ابو داود: ۱۶۹۳

اس سے معلوم ہوا کہ استغفار وتوبہ کا ثمرہ وفائدہ یہ بھی ہے کہ اللہ تعالے بارشیں برساتے ہیں، مال واولاد میں اضافہ کرتے ہیں اور باغات ونہروں کا انتظام فرماتے ہیں اور یہ ظاہر ہے کہ یہ سب رزق کے وسائل ہی ہیں۔

حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ کے پاس ایک شخص نے قحط کی شکایت کی تو فرمایا کہ استغفار کرو، ایک اور نے فقر و فاقہ کی شکایت کی تو فرمایا کہ استغفار کرو، ایک تیسرے آدمی نے عرض کیا کہ میرے لیے اولاد کی دعا کیجیے، تو فرمایا کہ استغفار کرو، ایک اور شخص نے اپنے باغ کے سوکھ جانے کی شکایت کی تو فرمایا کہ استغفار کرو، حضرت صبیح کہتے ہیں کہ ہم نے ان سے اس سلسلہ میں پوچھا کہ آپ نے سب کا ایک ہی جواب دیا، تو فرمایا کہ یہ میں نے اپنی جانب سے نہیں کہا ہے؛ بل کہ اللہ تعالے سورہ نوح میں یہ فرماتے ہیں۔ (۱)

اور ایک حدیث میں حضرت ابن عباس ؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«مَنْ لَزِمَ الْاِسْتِغْفَارَ جَعَلَ اللّٰهُ لَهُ مِنْ كُلِّ هَمٍّ فَرَجاً، وَمِنْ كُلِّ ضِيقٍ مَخْرَجاً، وَرَزَقَهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ .»

(جو استغفار کو لازم پکڑ لے اللہ اس کے لیے ہر غم دور ہونے کا راستہ بناتے ہیں اور ہر تنگی سے نکلنے کی سبیل کرتے ہیں اور وہاں سے اسے رزق عطا کرتے ہیں جہاں سے اسے کوئی گمان بھی نہیں ہوتا) (۲)

(۱) تفسیر قرطبی:۳۹۲/۱۸

(۲) ابو داؤد: سنن بیھقی:۳۵۱/۳،معجم اوسط:۲۴۰/۶،سنن کبری للنسائی: ۱۱۸/۶،ابن ماجه:مسند احمد: مستدرک حاکم:۲۹۱/۴، قال الحاکم: صحیح الاسناد.

معلوم ہوا کہ استغفار کا اہتمام رزق میں وسعت و کثرت کا سبب و وسیلہ ہوتا ہے اور یہ بھی معلوم ہوا کہ اللہ تعالےٰ استغفار کرنے والے کو ایسی جگہ سے رزق دیتے ہیں کہ اس کو وہم و گمان بھی نہیں ہوتا۔

تلاوت قرآن اور رزق

حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

« لَا فَاقَةَ لِعَبْدٍ يَقْرَأُ الْقُرْآنَ، وَلَا غِنٰى لَهُ بَعْدَهُ . »

(جو بندہ قرآن پڑھتا ہے اس کو فاقہ نہیں ہوتا اور نہ اس کے حق میں قرآن کے بعد کوئی چیز غنا و مال داری کی ہے۔)(۱)

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ قرآن مجید کی تلاوت کرنے والے بندے کو اللہ تعالیٰ فقر و فاقہ کی مصیبت و پریشانی سے محفوظ رکھتے ہیں، لہذا طالب رزق حلال کو چاہئے کہ وہ قرآن کی تلاوت کا اہتمام کرے۔

سورۃ الواقعہ اور رزق

حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص ہر رات سورۂ واقعہ پڑھتا ہے اس کو کبھی فاقہ نہیں ہوتا، حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ اپنی بچیوں کو اس کا حکم دیتے تھے۔ (۲)

اس حدیث نے بتادیا کہ سورۂ واقعہ کی فضیلت یہ ہے کہ اس کی تلاوت کا معمول رات میں رکھنے سے فاقہ نہیں ہوتا، حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ خود بھی اس کا اہتمام

---

(۱) مسند الشھاب:۲/۴۶

(۲) شعب الایمان:۲/۴۹۱، مسند الحارث:۲/۷۲۹

کرتے تھے اور اپنی بچیوں کو بھی اس کا اہتمام کرنے کی تاکید فرماتے تھے۔

مسجد کی حاضری اور رزق

حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب مسجد تشریف لے جاتے تھے تو یہ دعا پڑھتے تھے:

«اَللّٰهُمَّ افْتَحْ لِي أَبْوَابَ رَحْمَتِکَ وَسَهِّلْ عَلَيَّ أَبْوَابَ رِزْقِکَ.»

(اے اللہ! میرے لیے اپنی رحمت کے دروازے کھول دے اور اپنے رزق کے دروازے آسان فرمادے۔)(۱)

اس حدیث میں غور طلب بات یہ ہے کہ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم جب مسجد تشریف لے جاتے تھے تب یہ دعا پڑھتے رہتے جس میں رحمتِ خداوندی کے دروازوں کے ساتھ آپ اللہ تعالے سے رزق کے دروازوں کو آسان فرمانے کی درخواست فرمارہے ہیں، اس سے ایک بات واضح ہوتی ہے کہ اس دعا کی تاثیر اس وقت ہے جب آدمی نماز کے لئے مسجد کی حاضری دے گا، معلوم ہوا کہ مسجد کی حاضری بھی وسعت رزق کا سبب بنتی ہے۔

فقر و حاجت کی خاص دعائیں

(۱) حدیث میں ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ و حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے یہاں فاقہ تھا، حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا سے کہا کہ اگر تم اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں جاؤ اور آپ سے کچھ سوال کرو تو اچھا ہو! حضرت

(۱) عبد الرزاق:۱/۴۲۶، ابن ابی شیبہ:۱/۲۹۸

فاطمہ رضی اللہ عنہا آپ کی خدمت میں آئیں اور دروازہ کھٹکھٹایا، اس وقت حضور علیہ السلام کی خدمت میں حضرت ام ایمن رضی اللہ عنہا موجود تھیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یہ کھٹکھٹانے کا انداز تو فاطمہ کا سا ہے، اور آج وہ ایسے وقت آئی ہے کہ اس وقت آنے کی عادت نہیں ہے، الغرض وہ حاضر ہوئیں اور عرض کیا کہ یا رسول اللہ! ان اللہ کے فرشتوں کا کھانا تو اللہ کی تسبیح وتعریف اور لا الہ الا اللہ ہے، ہمارا کھانا کیا ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اس ذات کی قسم جس نے مجھے حق کے ساتھ بھیجا ہے، ایک ماہ سے محمد کے گھر والوں کے یہاں چولہا نہیں جلا، اور ہمارے پاس اب کچھ بھیڑ آئے ہیں، اگر تم چاہو تو میں تمہارے لیے پانچ بھیڑوں کا حکم دے دوں اور اگر تم چاہو تو پانچ کلمات سکھا دوں، جو مجھے حضرت جبریل علیہ السلام نے سکھائے ہیں، حضرت فاطمہ نے عرض کیا کہ مجھے وہ کلمات سکھا دیجیے، آپ نے فرمایا کہ کہو: ’’يَا أَوَّلَ الْأَوَّلِيْنَ وَيَا آخِرَ الْآخِرِيْنَ وَيَا ذَا الْقُوَّةِ الْمَتِيْنِ وَيَا رَاحِمَ الْمَسَاكِيْنِ وَيَا أَرْحَمَ الرَّاحِمِيْنَ‘‘ (اے سب سے اول، اور اے سب سے آخر، اے مضبوط طاقت والے، اے مسکینوں پر رحم کرنے والے، اے سب سے زیادہ رحم کرنے والے)، حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا واپس ہوئیں اور حضرت علی رضی اللہ عنہ سے کہا کہ میں آپ کے پاس سے دنیا کی خاطر گئی تھی اور آخرت لے کر آئی ہوں، حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ یہ دن تمہارے بہترین دنوں میں سے ہے۔ (۱)

(۲) حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ایک عورت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس اپنی ضرورت و حاجت کی شکایت کرتے ہوئے آئی، آپ نے فرمایا کہ کیا میں اس چیز سے زیادہ بہتر بات نہ بتاؤں؟ تو سوتے وقت

(۱) کنز العمال: ۵۰۱۹

تینتیس دفعہ ''سُبحَانَ اللّٰہِ'' تینتیس دفعہ '' لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ'' اور چونتیس دفعہ ''اَلحَمدُ لِلّٰہِ'' پڑھ لینا، یہ دنیا و مافیھا سے سو گنا زیادہ بہتر ہے۔(۱)

(۳) حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جسے یہ بات خوش کرتی ہو کہ اس کی عمر لمبی ہو، اس کو دشمن پر فتح حاصل ہو، اس کا رزق کشادہ کیا جائے، اور اس کو بری موت سے بچایا جائے اس کو چاہئے کہ وہ صبح و شام تین مرتبہ یہ پڑھے:

«سُبحَانَ اللّٰہِ مِلْءَ الْمِیزَانِ وَمُنتَھَی الْعِلْمِ وَ مَبلَغَ الرِّضَا وَ زِنَةَ الْعَرْشِ، وَلَا إِلٰہَ إِلَّا اللّٰہُ مِلْءَ الْمِیزَانِ وَمُنتَھَی الْعِلْمِ وَ مَبلَغَ الرِّضَا وَ زِنَةَ الْعَرْشِ، وَاللّٰہُ أَکْبَرُ مِلْءَ الْمِیزَانِ وَمُنتَھَی الْعِلْمِ وَ مَبلَغَ الرِّضَا وَ زِنَةَ الْعَرْشِ.»

(اللہ کی پاکی ہو ترازو بھر کر، اور اتنی کہ علم جہاں تک پہنچے، اور اللہ کی رضا جہاں تک پہنچے اور عرش کے وزن کے برابر، اور لا الہ الا اللّٰہ ترازو بھر کر، اور اتنا کہ علم جہاں تک پہنچے، اور اللہ کی رضا جہاں تک پہنچے اور عرش کے وزن کے برابر، اور اللہ اکبر ترازو بھر کر، اور اتنا کہ علم جہاں تک پہنچے اور اللہ کی رضا جہاں تک پہنچے اور عرش کے وزن کے برابر۔)(۲)

---

(۱) کنز العمال:۵۰۲۰

(۲) کنز العمال:۴۹۵۱

چند دعائیں اوراذ کار

(۱) اَللّٰهُمَّ اكْفِنِيْ بِحَلَالِكَ عَنْ حَرَامِكَ وَ أَغْنِنِيْ بِفَضْلِكَ عَمَّنْ سِوَاكَ .(۱)

(اے اللہ! اپنا حلال رزق دے کر مجھے اپنے حرام سے کفایت فرما، اور اپنا فضل دے کر اپنے غیر سے مستغنی کردے)

(۲) اَللّٰهُمَّ إِنِّيْ أَسْئَلُكَ عِلْمًا نَّافِعًا وَّ رِزْقًا وَّاسِعًا وَّعَمَلاً مُّتَقَبَّلاً. (۲)

(اے اللہ! میں تجھ سے علم نافع، اور کشادہ رزق اور مقبول عمل کا سوال کرتا ہوں)

(۳) اَللّٰهُمَّ فَالِقَ الْإِصْبَاحِ وَ جَاعِلَ اللَّيْلِ سَكَنًا وَّالشَّمْسِ وَالْقَمَرِ حُسْبَانًا اِقْضِ عَنِّيْ الدَّيْنَ وَأَغْنِنِيْ مِنَ الْفَقْرِ وَ مَتِّعْنِيْ بِسَمْعِيْ وَ بَصَرِيْ وَ قُوَّتِيْ فِيْ سَبِيْلِكَ .(۳)

(اے اللہ! اے صبح کو نکالنے والے، اور رات کو آرام کا وقت بنانے والے اور سورج و چاند کو اوقات کا ذریعہ بنانے والے! میرا قرض ادا فرما دے، اور مجھے فقر و فاقہ سے مستغنی کر دے اور میرے کان اور آنکھ اور قوت کو اپنے راستہ میں کارآمد بنا دے)

(۴) اَللّٰهُمَّ اجْعَلْ أَوْسَعَ رِزْقِكَ عَلَيَّ عِنْدَ كِبَرِ سِنِّيْ وَانْقِطَاعِ عُمْرِيْ ۔(۴)

(اے اللہ! اپنا وسیع رزق مجھے میرے بڑھاپے میں اور عمر کے ختم ہونے کے وقت عطا فرما۔)

---

(۱) ترمذی:۳۵۶۳احمد:۱۳۱۸

(۲) مسنداحمد:۲۶۶۴۴

(۳) مؤطا مالک:۴۹۵

(۴) مستدرک حاکم:۱/۲۶۷

(۵) اَللّٰهُمَّ اغْفِرْ لِي ذَنْبِي وَوَسِّعْ لِي فِي دَارِي وَبَارِكْ لِي فِي رِزْقِي .(۱)

(اے اللہ ! میرے گناہوں کی بخشش فرما، اور میرے گھر میں میرے لیے کشادگی فرما اور میرے رزق میں میرے لیے برکت عطا فرما)

(۶) اَللّٰهُمَّ ارْزُقْنَا مِنْ فَضْلِكَ وَلَا تَحْرِمْنَا رِزْقَكَ وَ بَارِكْ لَنَا فِيمَا رَزَقْتَنَا وَ اجْعَلْ غِنَائَنَا فِيْ اَنْفُسِنَا وَ اجْعَلْ رَغْبَتَنَا فِيمَا عِنْدَكَ. (۲)

(اے اللہ! ہم کو اپنے فضل سے رزق عطا فرما اور ہمیں اپنے رزق سے محروم نہ فرما، اور جو رزق تو نے ہم کو عطا فرمایا ہے اس میں ہمیں برکت دے اور ہم کو دل کی تونگری عطا فرما اور ہمارے دل میں ان نعمتوں کی رغبت ڈال دے)

(۷) اَللّٰهُمَّ ارْزُقْنِيْ مِنْ رِّزْقِكَ الْحَلَالِ الطَّيِّبِ الْمُبَارَكِ مَا تَصُوْنُ بِهٖ وُجُوْهَنَا عَنِ التَّعَرُّضِ اِلٰى أَحَدٍ مِّنْ خَلْقِكَ. (۳)

(اے اللہ! ہم کو اپنا حلال وطیب اور برکت والا رزق عنایت فرما، جس کی وجہ سے تو ہمیں اس بات سے بچالے کہ ہم اپنا منہ تیری مخلوق میں سے کسی کے سامنے سوال کے لیے لے کر آئیں)

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہم سب مسلمانوں کو حلال وحرام میں تمیز کرنے اور حرام سے بچ کر صرف حلال سے نفع اٹھا کر خدا کو راضی کرنے کی توفیق دے۔ آمین

محمد شعیب اللہ خان مفتاحی

---

(۱) مسند احمد:۱۶۶۵۰، ترمذی:۳۵۰۰، معجم اوسط:۷/۷۳

(۲) مصنف ابن ابی شیبہ:۶/۵۱، حلیۃ الاولیاء:۵/۶۶

(۳) الحزب الاعظم:۱۸۰

ایک مغالطہ

اور اس کا علمی جائزہ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

ابتدائیہ

تقریباً چھ ماہ قبل کی بات ہے کہ محترم جناب عبدالرحیم صاحب نیل سندر (بنگلور) نے احقر کے پاس ایک رسالہ بہ نام ''مسلمانوں پر آفتوں کے اسباب، عبادت کی کمی یا کچھ اور؟'' روانہ کیا اور اس پر تبصرہ کرنے کی فرمائش کی۔ یہ ''رسالہ ریسرچ بیورو یودلت ساہتیہ اکیڈمی'' کی فکر کا نتیجہ اور تحقیق کا نچوڑ ہے اور اس کا ترجمہ ''اڈوکیٹ لیس اے مجیب'' اور ''اڈوکیٹ اقبال احمد شریف'' نامی صاحبان نے کیا ہے۔

میں نے اس کو اپنے پاس رکھ لیا اور وقتِ فرصت پا کر دیکھا، تو معلوم ہوا کہ یہ رسالہ پراگندہ خیالات، غیر معقول نظریات اور بے تکی باتوں کا مجموعہ ہے اور عبارت بھی ایسی بے ڈھنگی و بے ترتیب ہے، کہ بعض جگہ مراد ہی واضح نہیں ہو رہی ہے۔

یہ دیکھ کر احقر نے خیال کیا کہ ایسی بے تکی باتوں اور غیر معقول نظریات کی تردید وتنقید کی کوئی ضرورت نہیں؛ مگر جناب محترم عبدالرحیم صاحب کی طرف سے اصرار وتقاضا ہوا کہ اس رسالے کا جواب ضرور لکھا جائے، تا کہ اس کی وجہ سے جو لوگ تردد و تذبذب کا شکار ہوئے ہیں یا جن لوگوں پر ان غلط و بے تکی باتوں کا انکشاف ہی نہیں ہوا ہے ان کی اصلاح ہو سکے، انہی کے اصرار پر ارادہ کیا کہ چند ضروری امور پیش کر کے حقیقت کو واشگاف کروں۔

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ مدد فرمائے اور صحیح رہنمائی فرمائے۔ اللھم ارنا الحق حقا وارزقنا اتباعه وارنا الباطل باطلا وارزقنا اجتنابه. آمین یارب العلمین۔

فقط

محمد شعیب اللہ خان عفی عنہ

۲۱/ اکتوبر/ ۱۹۹۳/ ۱۴۱۴

بسم اللہ الرحمن الرحیم

ایک مغالطہ اور اس کا علمی جائزہ

رسالہ ''مسلمانوں پر آفتوں کے اسباب، عبادت کی کمی یا کچھ اور''؟ سرِ ورق پر یہ عبارت درج کی گئی ہے ''علمائے دین و مسلم قیادت سے جواب طلبی''

جس سے بہ ظاہر یوں محسوس ہوتا ہے کہ ان مدعیانِ تحقیق نے بڑی عرق ریزی سے مصائب اور آفات کے اسباب تلاش کر لیے ہوں گے اور وہاں تک ان کی عقل نے رسائی پالی ہوگی، کہ علما و قائدین اسلام وہاں تک نہیں پہنچے ہیں؛ مگر رسالہ دیکھنے کے بعد بڑا افسوس ہوتا ہے کہ مدعیانِ تحقیق نے کوئی بات بھی عقل کی نہیں کہی۔ رسالۂ مذکورہ میں تحقیق کے بہ جائے چند دعوے ہیں، جن پر کوئی دلیل نہیں دی گئی ہے اور جس کو دلیل خیال کر کے پیش کیا ہے، وہ مفیدِ مطلب نہیں ہے جیسا کہ واضح ہوگا۔

علما کا تحقیقی جواب

رسالے کے شروع ہی میں ان مدعیانِ تحقیق نے لکھا ہے کہ ہم نے بہت سے علمائے دین سے سوال کیا:

> ''ہندوستان کے مسلمانوں پر آفت و مصیبت کیوں آرہی ہے، حالاں کہ وہ ہندوؤں کو کوئی تکلیف نہیں پہنچاتے اور نہ ہندوؤں نے اس کی شکایت کی ہے۔ پھر کیوں مسلمان مارے اور قتل کیے جارہے ہیں؟ ان علما کا جواب یہ تھا کہ ہم اسلام کی تعلیمات پر نہیں چل رہے ہیں، ہماری اخلاقی

زندگی خراب ہو چکی ہے۔ (رسالۂ مذکورہ:۳)

ناظرین کرام! غور فرمایئے کہ علما کا جواب دو باتوں پر مشتمل ہے: "ایک تعلیماتِ اسلام پر عمل میں کوتاہی" دوسرے: "اخلاقی زندگی کی خرابی وخستہ حالی۔" اور روز روشن کی طرح یہ دونوں باتیں واضح ہیں؛ مسلمانوں کے مصائب ومشکلات میں ان دونوں امور کا بڑا دخل ہے۔

علما کی دلیل

علما کے اس ارشاد کی دلیل قرآن مجید کی بے شمار آیتیں ہیں، اس لیے کہ قرآن اہلِ اسلام کے نزدیک اللہ کا کلام ہے، جو کبھی جھوٹا نہیں ہوسکتا اور نہ وہم کا شکار ہوسکتا ہے۔ ہم یہاں صرف چند آیات کو پیش کرتے اور ان کی تشریح کرتے ہیں۔

قرآن مجید نے فرمایا:

﴿ وَقَضَيْنَآ اِلٰى بَنِىْٓ اِسْرَآءِ يْلَ فِى الْكِتٰبِ لَتُفْسِدُنَّ فِى الْاَرْضِ مَرَّتَيْنِ وَلَتَعْلُنَّ عُلُوًّا كَبِيْرًا فَاِذَا جَآءَ وَعْدُ اُوْلٰىهُمَا بَعَثْنَا عَلَيْكُمْ عِبَادًا لَّنَآ اُولِىْ بَاْسٍ شَدِيْدٍ فَجَاسُوْا خِلٰلَ الدِّيَارِ وَ كَانَ وَعْدًا مَّفْعُوْلًا ثُمَّ رَدَدْنَا لَكُمُ الْكَرَّةَ عَلَيْهِمْ وَ اَمْدَدْنٰكُمْ بِاَمْوَالٍ وَّ بَنِيْنَ وَجَعَلْنٰكُمْ اَكْثَرَ نَفِيْرًا اِنْ اَحْسَنْتُمْ اَحْسَنْتُمْ لِاَنْفُسِكُمْ وَاِنْ اَسَاْتُمْ فَلَهَا فَاِذَا جَآءَ وَعْدُ الْاٰخِرَةِ لِيَسُوْٓءٗا وُجُوْهَكُمْ وَلِيَدْخُلُوا الْمَسْجِدَ كَمَا دَخَلُوْهُ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَّلِيُتَبِّرُوْا مَا عَلَوْا تَتْبِيْرًا ﴾ (الإسراء: ۴-۷)

(ہم نے صاف کہہ سنایا بنی اسرائیل کو کتاب میں کہ تم خرابی کرو گے ملک میں دوبارہ اور سرکشی کرو گے بڑی سرکشی۔ پھر جب آیا پہلا وعدہ بھیجے ہم نے تم پر اپنے بندے سخت لڑائی والے، پھر پھیل پڑے شہروں میں اور وہ وعدہ ہونا ہی تھا، پھر ہم نے پھیر دی تمہاری باری ان پر اور

قوت دی تم کو مال سے اور بیٹوں سے اور اس سے زیادہ کر دیا تمہارا لشکر، اگر بھلائی کی تم نے تو بھلا کیا اپنا اور اگر برائی کی تو اپنے لیے، پھر جب پہنچا وعدہ دوسرا بھیجے اور بندے کہ اداس کر دیں تمہارے منہ اور گھس جائیں مسجد میں جیسے گھس گئے تھے پہلی بار اور خراب کر دیں جس جگہ غالب ہوں پوری خرابی۔ (ترجمہ: شیخ الہند رحمہ اللہ)

ان آیات کی تفسیر میں حضرت حکیم الامت تھانوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں

''ان آیات میں اجمالاً دو واقعوں کا بیان ہے کہ بنی اسرائیل نے ایک بار معاصی میں انہماک کیا، تو ان پر اعدا (دشمن) مسلط ہوئے اور ان کو تباہ کیا؛ پھر ذرا شرارت کم ہوئی، تو پھر سنبھل گئے، مگر بعد چندے پھر ویسی ہی شرارت کی اور پھر اسی طرح تباہ ہوئے''۔(۱)

حضرت شاہ عبد القادر دہلوی رحمہ اللہ ان آیات کی تفسیر میں فرماتے ہیں:

''اس کی جزا میں دشمن ان کے ملک پر غالب ہوں گے۔ اسی طرح ہوا، ایک بار جالوت غالب ہوا، پھر حق تعالیٰ نے اس کو داؤد علیہ السلام کے ہاتھ سے ہلاک کیا، پیچھے بنی اسرائیل کو اور قوت دی، حضرت سلیمان علیہ السلام کی سلطنت میں، دوسری بار فارسی لوگوں میں بخت نصر غالب ہوا، تب سے ان کی سلطنت نے قوت نہ پکڑی۔'' (۲)

آیات متذکرہ بالا اور علما کی تفسیروں سے واضح ہوا کہ بنی اسرائیل نے معاصی و گناہ کے کام کیے، تو اللہ تعالیٰ نے ان پر کفار کو مسلّط کیا، جنہوں نے ان کو تباہ کیا اور بیت المقدس میں گھس کر اس کی بے حرمتی کی۔ یہ بنی اسرائیل پر مسلط ہونے والے

(۱) بیان القرآن
(۲) بہ حوالہ تفسیر عثمانی

بادشاہ بخت نصّر اور جالوت، خبیث قسم کے دشمنِ خدا تھے؛ مگر اللہ نے ان کو مسلمانوں پر مسلّط کیا اور یہ گناہوں کی وجہ سے تھا۔ اس سے معلوم ہوا کہ خدائی تعلیمات پر نہ چلنا، آفات ومصائب کا سبب ہے۔

ایک حدیث میں ہے:

''دس صحابہ حضور صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم کی خدمت میں حاضر تھے، آپ نے فرمایا کہ جب کوئی قوم ناپنے تولنے میں کمی کرے گی، تو قحط اور تنگی اور ظلم حکام میں مبتلا کی جائے گی اور جس قوم نے عہد شکنی کی، اس پر اللہ تعالیٰ دشمن قوم کو مسلط کردے گا، جو ان سے جبراً ان کا مال چھین لے گی''۔ (۱)

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ ناپ تول میں کمی کرنا یا عہد شکنی کرنا۔ جو اخلاقی خرابیاں ہیں۔ ان پر اللہ کی طرف سے یہ عذاب آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ظالم حاکموں اور دشمنوں کو مسلط کردیتا ہے، جو مال وجان کے لیے خطرہ بن جاتے ہیں۔

نمونے کے لیے قرآن سے ایک دلیل اور حدیث سے ایک دلیل پیش کی گئی ہے۔ قرآن کی دلیل سے خدا کی نافرمانی پر اہلِ اسلام پر دشمنوں کا تسلط اور ان کے ہاتھوں ان کی تباہی وہلاکت بیان کی گئی ہے اور حدیث میں اخلاقی گراوٹ پر اسی عذاب کو بتایا گیا ہے۔ اس سے علما کے جواب کا مدلل ہونا ثابت ہوگیا؛ لہٰذا علما کا یہ کہنا کہ یہ آفات اس لیے مسلمانوں پر آتی ہیں کہ وہ اسلام پر نہیں چلتے اور اخلاق خراب ہوگئے ہیں، صحیح ہے۔

علما کے سکتے کی وجہ

مگر مدعیانِ تحقیق نے رسالۂ مذکورہ میں لوگوں کو دھوکہ دینے اور علما کی وقعت کو

(۱) ابن ماجہ: مختصراً ۴۰۰۹:۱، المعجم الکبیر: ۴۵/۱۱، المعجم الأوسط: ۶۱/۵

گھٹانے کے لیے کہا ہے:

جب ہم نے ان عالموں سے اس جواب کی تشریح کرنے اور مثالیں پیش کرنے کے لیے کہا، تو پہلے پہل وہ سکتے میں آ گئے۔ (رسالۂ مذکورہ:۳)

میں کہتا ہوں کہ یہ سکتہ اس وجہ سے نہیں ہوا تھا کہ ان کو تشریح کرنا مشکل تھا یا انہوں نے کوئی غلط بات کہہ دی تھی، جس کو مدلل کرنا انہیں پریشان کر رہا تھا؛ بل کہ ان کو یہ سکتہ اس لیے ہوا تھا کہ ان کے سامنے ایسے جاہل وان پڑھ لوگ تھے، جنہیں کھلی ہوئی بات وحقیقت کی تشریح کی ضرورت پیش آ رہی تھی اور وہ اس کے لیے مثالیں پوچھ رہے تھے۔ مدعیانِ تحقیق کی اس غفلت وجہالت پر علما وقائدین کو حیرت ہوئی اور وہ سکتے میں آ گئے۔ انہوں نے سوچا ہوگا کہ یہ محقق جاہل کیا اتنا بھی نہیں جانتے کہ آج امتِ مسلمہ نماز، روزہ، زکوۃ جیسے بنیادی فرائض سے بھی غافل ہے؟ کیا اس کے لیے تشریح وتمثیل کی ضرورت ہے؟

علما کی تشریح اور مدعیان تحقیق کی کج فہمی

ان مدعیانِ تحقیق نے علما کے سکتے میں آجانے کا ذکر کرنے کے بعد لکھا ہے:

(ان علمانے) پھر کچھ وقت تک سوچ کر جواب دیا ''ہم روزانہ نماز نہیں پڑھتے، رمضان کے روزے نہیں رکھتے اور خدا کے بتائے ہوئے راستوں پر نہیں چلتے''۔ (رسالۂ مذکورہ:۳)

حضراتِ علما کا یہ تشریحی وتمثیلی جواب ہے، جو مدعیانِ تحقیق کے اس سوال کے جواب میں دیا گیا ہے کہ مسلمانوں کے تعلیمات اسلام پر نہ چلنے کی تشریح کیجیے اور مثال دیجیے۔ اس جواب سے ان مدعیانِ تحقیق نے یہ نتیجہ نکال لیا ہے کہ علما کے نزدیک عبادت کی کمی ہی آفات کا سبب ہے اور اسی پر غالباً رسالے کا نام اس طرح

رکھا گیا ہے ’’ مسلمانوں پر آفتوں کے اسباب، عبادت کی کمی یا کچھ اور‘‘؟

اولاً : تو یہ سمجھنا چاہیے کہ علما نے اپنے جواب کی تشریح کی ہے اور نماز، روزے سے غفلت یا اس میں کمی کو مثال کے طور پر پیش کیا ہے اور یہ بتانا چاہا ہے کہ تعلیماتِ اسلام پر نہ چلنے کا جو ذکر ہم نے کیا ہے، اس کی کھلی ہوئی دلیل و مثال نماز، روزہ جیسے بنیادی عبادات میں غفلت ہے۔ اس سے یہ کیسے اور کیوں سمجھ لیا گیا کہ صرف عبادت کی کمی آفات کا سبب ہے؟ افسوس کہ جو علما کے کلام کو سمجھنے کی بھی صلاحیت نہیں رکھتے وہ علما پر تنقید کی جرأت کرتے ہیں۔ فیاللعجب !!!

ثانیاً: خود علما نے اپنے جواب میں فرمایا ہے کہ ہم خدا کے بتائے ہوئے راستوں پر نہیں چلتے۔ اس عموم کے باوجود یہ نتیجہ پیدا کرنا کہ علما کے نزدیک صرف عبادات کی کمی آفات کا سبب ہے اور رسالے کا عنوان اسی پر قائم کرنا کج فہمی نہیں تو اور کیا ہے؟

ثالثاً: ان مدعیانِ تحقیق نے خود آگے چل کر نقل کیا ہے کہ آفات و مصائب کے اسباب میں بعض نے مسلمانوں میں لیڈر نہ ہونے کا اور بعض نے اتحاد نہ ہونے کا اور کسی نے قرآنی احکامات میں کوتاہی کا اور کسی نے لاعلمی کا ذکر کیا۔ (رسالۂ مذکورہ:۴)

پھر رسالے کے عنوان میں سب کو چھوڑ کر عبادت کی کمی کا ذکر کر کے لوگوں کو دھوکے میں کیوں ڈالا؟ شاید یہ بھی تحقیق کی کوئی قسم ہوگی!؟

کیا یہ بے کار کی اور سطحی باتیں ہیں؟

مدعیانِ عقل و تحقیق نے رسالۂ مذکورہ میں آفات کے مذکورہ بالا اسباب نقل کرنے کے بعد فرمایا ہے:

> ’’ہمیں ان جوابات سے تسلی نہیں ہوئی، ہم نے ان جوابات پر غور کیا اور ہمیں معلوم ہوا کہ یہ سب سطحی باتیں ہیں۔ (رسالۂ مذکورہ)

غور کیجیے کہ کس قدر جرأت ہے؟ اور بلا جھجک دعویٰ بے دلیل کس طرح کیا جارہا ہے؟ ہم کہتے ہیں کہ اوپر کے نقل کردہ اسباب میں سے بعض مثلاً: اسکولوں کی تعلیم میں کوتاہی وغیرہ کو سطحی کہا جاسکتا ہے؛ مگر قرآنی احکامات پر اور اسلامی تعلیمات پر نہ چلنا اور معاصی کا ارتکاب کرنا، قرآن اور حدیث کی رو سے آفات ومصائب کے اسباب ہیں، ان کو سطحی قرار دینا قرآن وحدیث سے جہالت کے ساتھ ساتھ ان کی توہین وانکار بھی ہے۔(۱)

ہم اوپر عرض کر چکے ہیں کہ خدا کی نافرمانی اور معصیت، قرآن وحدیث کی رو سے آفت کا سبب ہے۔ یہ تحقیق پیش کرنے والے اگر اہلِ اسلام میں سے ہیں، تو ان کو اپنی اس ضلالت پر توبہ کرنا چاہیے اور اہلِ اسلام سے نہیں ہیں، تو ان کی خدمت میں عرض ہے کہ ہم اہلِ اسلام ہر چیز کے لیے قرآن وحدیث کی طرف رجوع کرتے ہیں، محض اپنی عقل اور تجربے پر بھروسہ نہیں کرتے؛ بل کہ عقل کو قرآن وحدیث سمجھنے کے لیے کام میں لاتے ہیں؛ لہٰذا قرآن وحدیث کے خلاف آپ کی تحقیق آپ ہی کو مبارک ہو، ہمیں نہ اس کی ضرورت ہے اور نہ اس سے ہمیں کوئی واسطہ؛ آپ کو ہمارے معاملات میں مشورہ دینے کی ضرورت نہیں اور نہ اسلام کی تعلیمات کے خلاف ہم دردی کی حاجت۔

خودساختہ فلسفہ اور اس پر تبصرہ

ان مدعیانِ تحقیق نے آگے چل کر دو تین صفحات میں نہایت بے ترتیب عبارت میں یہی خودساختہ فلسفہ پیش کیا ہے، جس کا خلاصہ یہ نکلتا ہے کہ:

اسلام نے دو طرح کے عمل مقرر کیے ہیں:

(۱) ایک ''حقوق اللہ''، جس میں نماز، روزہ ذکر وغیرہ ہیں۔

(۱) اس موضوع پر راقم کا رسالہ ''انحطاط و پریشانیوں کے اسباب اور راہِ عمل'' کا مطالعہ کیجیے۔

(۲) دوسرے ''حقوق العباد'' ۔حقوق اللہ میں کوتاہی سے صرف اس کوتاہی کرنے والے پر گناہ ہوتا ہے؛ مگر لوگوں کی طرف سے اس پر ظلم وزیادتی کا سبب یہ نہیں ہوسکتا ؛ البتہ حقوق العباد میں کوتاہی کرنے سے ان پر ظلم وزیادتی ہوسکتی ہے۔ (رسالۂ مذکورہ: ۴۔۷)

نوٹ: ہم نے مدعیانِ تحقیق کی عبارت کا جو خلاصہ پیش کیا ہے، یہ ایسی پراگندہ اور منتشر عبارت سے نکالا گیا ہے، جس کی مراد نہایت درجہ خفا میں ہے۔ بہت مشکل سے سیاق وسباق پر گہری نظر رکھتے ہوئے محتاط طریقے پر یہ خلاصہ پیش کیا گیا ہے؛ اگر ان کی مراد کچھ اور ہو، تو وہ اپنی مراد کو کسی صحیح لکھنے والے سے لکھوا کر پیش کریں۔ اب ہم اوپر کے درج شدہ خلاصہ پر تبصرہ کرتے ہیں۔

اولاً: حقوق اللہ اور حقوق العباد میں جو فرق کیا گیا ہے، وہ بلا دلیل ہے۔ کوئی آیت یا حدیث اس کی دلیل میں پیش نہیں کی گئی ہے اور ہم نے اوپر واضح کیا ہے کہ اللہ کی نافرمانی پر اللہ کی طرف سے دشمن کو مسلط کر کے عذاب دیا جاتا ہے اور یہ نافرمانی مطلق بیان کی گئی ہے، جس میں حقوق اللہ میں کوتاہی بھی ضرور شامل ہے۔ اس کے علاوہ مزید ملاحظہ کیجیے کہ اللہ تعالیٰ قرآن میں فرماتے ہیں:

﴿ وَمَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِيْ فَاِنَّ لَهٗ مَعِيْشَةً ضَنْكاً ﴾

(طٰہٰ: ۱۲۵)

(اور جو شخص میرے ذکر سے منہ موڑے اس کے لیے تنگ زندگی ہے)

اس آیت میں ''ذکر'' سے غفلت پر تنگ زندگی کی وعید سنائی گئی ہے، ذکر سے بعض علما نے قرآن مراد لیا ہے اور بعض نے احکام خداوندی اور بعض نے تلاوتِ قرآن۔ (۱)

---

(۱) قرطبي: ۱۱/۲۵۸

اور تنگ زندگی یہی ہے جس میں آج لوگ مبتلا ہیں، کہ ان پر ظلم ڈھایا جاتا ہے اور ان کے ساتھ درندگی و بربریت کا معاملہ کیا جاتا ہے، گھروں کو لوٹا اور دکانوں کو جلایا جاتا ہے، ان کی معیشت کو تباہ کیا جاتا ہے۔ غور کیجیے کہ تنگ زندگی کا عذاب کس بنا پر بتایا گیا ہے؟ قرآن سے غفلت پر، تلاوتِ قرآن سے غفلت پر۔ ظاہر ہے کہ تلاوت تو اللہ کے ذکر کی ایک قسم ہے، اس میں کوتاہی اور غفلت پر تنگ زندگی کا عذاب سنایا گیا ہے اور ذکر حقوق اللہ میں سے ہے، معلوم ہوا کہ حقوق اللہ میں بھی کوتاہی پر اس ظلم وزیادتی کا عذاب آتا ہے۔

ثانیاً: ان کی عبارت سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ لوگ (مدعیانِ تحقیق) لوگوں کی طرف سے ظلم وزیادتی کو خدا کا عذاب نہیں سمجھتے؛ اسی لیے لکھا ہے:

"نماز، روزے میں کوتاہی پر گناہ ہوتا ہے؛ مگر یہ سیاسی ومعاشی نفرت کا سبب نہیں ہوسکتا۔" (رسالہ مذکورہ:۷)

مگر یہ ان لوگوں کی کوتاہ نظری کا نتیجہ ہے۔ احادیث میں صراحت کے ساتھ وارد ہے کہ گناہوں کے نتیجہ میں اللہ تعالیٰ گناہ گاروں پر دشمنوں اور ظالموں کو مسلط کر دیتے ہیں اور یہ ظالم لوگ ان پر ظلم کرتے ہیں؛ یہ بھی خدا کے عذاب کی ایک شکل ہے، نمونے کے طور پر کچھ احادیث ملاحظہ کیجیے۔

(۱) ایک لمبی حدیث میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

"بادشاہوں کا دل میرے ہاتھ میں ہے، جب بندے میری نافرمانی کرتے ہیں، تو بادشاہوں کے دل ان پر غصے وانتقام کے لیے پھیر دیتا ہوں، جس سے وہ ان کو سخت تکلیف پہنچاتے ہیں"۔ (۱)

(۲) فرمایا کہ کسی جماعت پر اللہ کا غصہ ہوتا ہے، تو نرخ میں گرانی

---

(۱) المعجم الأوسط:۹/۹، حلیة الأولیاء:۲/۳۸۸

کر دیتے اور بدترین لوگوں کو حاکم بنا دیتے ہیں۔ (۱)

(۳) فرمایا کہ جب میری امت اپنے علما سے بغض رکھنے لگے اور بازاروں کی تعمیر کو نمایاں کرنے لگے اور مال کی خاطر نکاح کرنے لگے، تو حق تعالیٰ ان پر چار چیزیں مسلط کر دیتا ہے۔ (۱) زمانے کا قحط (۲) بادشاہ کا ظلم (۳) حکام کی خیانت (۴) دشمنوں کا حملہ۔ (۲)

ان احادیث میں حقوق اللہ وحقوق العباد میں کمی وکوتاہی پر دوسرے عذابات کے ساتھ حکام وبادشاہوں کا ظلم اور دشمنوں کا حملہ بھی مذکور ہے اور تیسری حدیث خاص امتِ محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ ظالم حکام ودشمنوں کا حملہ بھی اللہ کے عذاب کی ایک شکل ہے۔

انتباہ: مگر اس سے یہ نہ سمجھا جائے کہ ہر ظلم وزیادتی عذاب ہی بن کر آتی ہے؛ نہیں! بل کہ یہ کہنا ہے کہ یہ عذاب کی ایک شکل ہے اور یہ اس وقت ہے جب کہ لوگ نافرمانی ومعصیت میں مبتلا ہوں۔ اور بغیر معصیت کے یہ چیز پیش آئے، تو اس کے اسباب دوسرے ہوتے ہیں مثلاً درجات کی بلندی وغیرہ۔ اس کی تفصیل کا یہ موقع نہیں، یہاں صرف یہی بتانا ہے کہ دشمنوں کی طرف سے حملہ اور ظلم وزیادتی، خدا کی نافرمانی ومعصیت کی سزا بھی ہوتی ہے، جیسا کہ حدیثوں سے واضح ہوا۔

مسلمان اور حقوق العباد

اکیڈمی نے اپنے مطالعے ومعائنے کا حوالہ دے کر وضاحت کی ہے:

” حقوق العباد کے معاملے میں مسلم عوام پوری طرح کامیاب

---

(۱) رواہ الحاکم: ۴/۳۶۱

(۲) مسند الفردوس: ۳/۵۴

ہیں،ان کی طرف سے کوئی کوتاہی نہیں ہے اور اگر کوتاہی ہے،تو مسلمانوں کے عالموں،ذمے داروں اور مال داروں میں ہے"۔(رسالہ مذکورہ:٦)

ہم اکیڈمی کے مسلمان عوام سے حسنِ ظن پر اس کو شکریہ ادا کرتے ہیں اور ہمارا بھی دعویٰ ہے کہ مسلمان غیر مسلموں کو ایذا و تکلیف پہنچانے اور ان پر ظلم وزیادتی کرنے سے دور ہیں ؛ مگر حقیقت کو واضح کرنے یہ عرض کرنا بھی ضروری ہے کہ مسلمان خود آپس میں نزاع و جھگڑے میں پڑ کر حقوق العباد میں کوتاہی کر رہے ہیں۔خاندانی جھگڑے، جماعتی جھگڑے اور تعصّبات،ایک دوسرے کے حقوق کو ادا کرنے سے باز رکھے ہوئے ہیں ؛ نیز تجارت و معاملات میں خدائی احکام کی خلاف ورزی بھی عام ہوگئی ہے؛ لہٰذا یہ اور اس جیسی باتوں کی وجہ سے خدائی عتاب نازل ہوتا ہے۔

رہے وہ صفات،جس کا ذکر اکیڈمی نے رسالے(صفحہ/٦، ٧) میں کیا ہے کہ یہ اوصاف عام مسلمانوں میں پائے جاتے ہیں،تو ہمیں بھی اس کا انکار نہیں ؛ بلا شبہ مسلمان بہت سی خوبیوں کا مالک ہے اور جن کا ذکر کیا گیا ہے،ان سے ہزاروں درجہ زیادہ کا حامل ہے؛مگر جیسا کہ عرض کیا گیا بعض اعمال بھی ایسے ہوتے ہیں کہ ان پر عتاب نازل ہوتا ہے۔مثلاً علما: سے بغض، ناپ تول میں کمی ،امانت میں خیانت، مال کے لیے نکاح کرنا وغیرہ اور ان برائیوں کا جو حقوق العباد سے متعلق ہیں، مسلمانوں میں شائع اور عام ہونا معلوم ہے۔بس اسی سے روکنے کے لیے علمائے اہلِ اسلام یہ عیوب بیان کر کے خدا کا ڈر اور خوف پیدا کرتے ہیں۔

رہے علما و ذمے دارانِ قوم،تو نہ علما نے ہی یہ دعوی کیا،نہ قائدینِ اسلام نے کہ وہ معصوم ہیں ؛ بل کہ ہم نے تو دیکھا ہے کہ علما سے کوتاہی ہوتی ہے،تو وہ پشیمان و پریشان ہوتے ہیں،توبہ و انابت الی اللہ میں مشغول ہوجاتے ہیں،احساسِ ندامت سے اشک بار آنکھوں کے ساتھ خدا کے حضور گڑگڑاتے ہیں۔اور عوام بھی غلطی کرتے ہیں؛ مگر یہ

پشیمانی و پریشانی، یہ احساس ندامت اور توبہ وانابت ان میں نہیں دیکھی جاتی۔

غرض یہ کہ کوتاہی میں سب شامل ہیں؛ الا ماشاء اللہ۔ مگر پھر بھی علما اور عوام میں فرق ہے؛ مگر عجیب بات یہ ہے کہ مدعیانِ تحقیق کو سارے عیوب علما میں نظر آ رہے ہیں اور عوام میں کچھ نظر نہیں آ رہے ہیں، جیسے بعض بے بصیرت اہلِ نظر کو ہندوستان کے تمام فسادات میں مسلمانوں کا قصور نظر آتا ہے، ہندوؤں کا نہیں۔ اگر نظر کے ساتھ بصیرت بھی حاصل ہوتی! تو یوں نہ کہتے؛ یہی حال اکیڈمی کے محققین حضرات کا ہے۔

ایک سازش ہے یہ!

یہاں میں عوام کو خبر دار کرنا چاہتا ہوں کہ ان مدعیانِ تحقیق کے تعریف کرنے سے کسی خوش فہمی میں ہرگز مبتلا نہ ہوں یہ سب دراصل ایک سازش ہے کہ مسلم عوام کا رشتہ علما سے کٹ جائے، تاکہ عوام علما کی گرفت میں نہ رہیں، ان کو اپنے سے اچھا نہ خیال کریں؛ بل کہ عوام کے دل میں یہ بیٹھ جائے کہ ہم ہی تمہارے علما سے اچھے ہیں، ہم میں کوئی عیب وکوتاہی نہیں، سارا قصور تمہارے علما میں ہے۔ یہ سازش نئی نہیں؛ بل کہ عیسائیوں نے اسپین (SPAIN) میں اس طرح عوام کو بدظن کر کے ان کا علما سے رشتہ توڑا تھا اور آخر کار وہ سب کچھ ہو گیا، جس کی توقع اس وقت ہرگز نہ کی جا سکتی تھی، جب علما کا رشتہ عوام سے اور عوام کا علما سے قائم رہتا۔

ممکن ہے کہ اکیڈمی کے ان کوتاہ نظروں کی نظر میں یہ بات نہ ہو کہ ان کے اس تجربے و تحقیق کا اثر لازماً یہی مرتب ہوگا، جو ہم نے بیان کیا ہے؛ مگر یہ معلوم ہونا چاہیے کہ کسی چیز کا اثر مرتب ہونے میں، اس اثر کے مرتب کا علم ہونا ضروری نہیں؛ اگر زہر کو مٹھائی سمجھ کر کھایا جائے گا؛ تو بھی ہلاکت ہوگی۔ ضروری نہیں کہ زہر کا زہر ہونا پہلے سے معلوم ہو۔ ہم یہ عرض کرنا چاہتے ہیں کہ اکیڈمی نے سازش کے طور پر نہ

صحیح، حقیقت سمجھ کر ہی صحیح، اپنی جو تحقیق پیش کی ہے، وہ اپنا اثر ضرور کرے گی اور ہم عرض کر چکے ہیں کہ ان کی یہ تحقیق کہ علما میں زیادہ کوتاہی ہے، سراسر غلط ہے؛ بل کہ علما میں کوتاہی کم ہے اور اس پر بھی وہ پشیمان ہوتے ہیں۔

زمانۂ رسالت اور گناہ گار

ساہتیہ اکیڈمی کے محققین نے آگے چل کر کہا ہے کہ عوام محنت کش ہونے اور فرصت نہ پانے کی وجہ سے نماز نہیں پڑھتے؛ لہٰذا اس کو جرم بتا کر تمام برائیوں کی ذمے داری اس پر ڈال دینا انصاف نہیں ہے، پھر کہا کہ اس قسم کے بے نمازی تمام مسلم ممالک جیسے سعودی عرب، پاکستان، ایران وغیرہ؛ بل کہ تمام دنیا میں ہیں۔ پھر ان پر ظلم کیوں نہیں ہو رہا ہے؛ نیز یہ کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں بھی گناہ گار مسلمان تھے؛ چوری، زنا، جھوٹ اور شراب نوشی اور بے نمازیوں کا ذکر احادیث میں ملتا ہے، فرق یہ ہے کہ ان کی تعداد کم تھی۔ (رسالہ مذکورہ: ٦-٧)

اس کا جواب یہ ہے: (ا) گناہ صرف نماز چھوڑنا ہی نہیں ہے، عوام میں کئی گناہ رائج ہیں؛ نماز کا ذکر علما کی زبان پر بہ طور مثال آیا ہے جیسا کہ پہلے ہم واضح کر چکے ہیں؛ لہٰذا یہ تأثر دینے کی کوشش کرنا کہ یہ صرف نماز نہ پڑھنے پر تمام برائیوں کی ذمے داری اس پر ڈالی جا رہی ہے، قصورِ فہم کا نتیجہ اور مضحکہ خیز ہے۔

(۲) مسلم ممالک اور دنیا کے دیگر حصوں میں بھی نماز سے غفلت برتنے والے ہیں اور ان پر عتاب کسی اور شکل میں ہے، عتاب اور عذاب کی صرف ایک ہی شکل نہیں ہے۔ پاکستان میں بھی آپس کی لڑائیاں جاری ہیں، ظالم حکام کا سلسلہ موجود ہے، پھر کہیں مسلمان شہر بدر کیے جا رہے ہیں، جیسے فلسطین میں ہوا؛ نیز ظلم کی اور راہیں بھی اختیار کی جا رہی ہیں، بوسنیا وغیرہ کے حالات معلوم ہی ہیں، اگر یہ سب نہ

بھی ہو، تو عتاب کبھی زلزلوں، آندھیوں، سیلاب، طوفان وغیرہ کی شکل میں بھی ہوتا ہے۔ لہٰذا ہندوستان میں جس نوعیت کا ظلم ہے، اسی نوعیت کا عتاب دوسری جگہ ہونا کوئی ضروری نہیں ہے۔

(۳) زمانۂ رسالت میں گناہ گاروں کا وجود۔ جس کا دعوی اکیڈمی نے کیا ہے۔ اگر تسلیم کرلیا جائے، تب بھی اس سے یہ کیسے ثابت ہوگا کہ گناہ کی وجہ سے عتاب نہیں ہوتا؟ جب کہ بعض دلائل بتاتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں بھی جب صحابہ رضی اللہ عنہم سے غلطی ہوئی، تو ان کے لیے پریشانی کے اسباب پیدا کردیے گیے۔ مثلاً: جنگِ احد کے موقعہ پر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے پچاس صحابہ رضی اللہ عنہم کو ایک پہاڑ کے درے پر مقرر کیا کہ یہاں سے کسی بھی حالت میں مت ٹلنا؛ پھر ان صحابہ میں سے بعض نے غلط فہمی کی بنا پر اس حکم سے سرتابی کی، تو اللہ نے فتح کو شکست میں تبدیل کردیا؛ نیز جنگِ حنین کے موقعے پر مسلمانوں نے اپنی کثرت پر ناز کیا، تو اللہ نے مسلمانوں کو شکست دے دی۔ جس کا ذکر تو سورۂ توبہ میں خود اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے اور اس میں یہ الفاظ بھی ہیں:

﴿وَضَاقَتْ عَلَيْكُمُ الْأَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ﴾ (التوبۃ: ۲۵)

(کہ تم پر زمین باوجود فراخی کے، تنگ ہوگئی)

اس سے معلوم ہوا کہ حضراتِ صحابہ رضی اللہ عنہم سے اگر کچھ غلطی ہوئی، تو اللہ نے ان پر بھی عتاب کیا ہے۔ اس کے علاوہ سوچیے کہ صحابہ کا پورا معاشرہ ایک صالح معاشرہ تھا، جس میں اخلاقی و دینی اقدار کو بلندی حاصل تھی؛ اگر وہاں اکا دکا بے نمازی ہو یا کسی سے اتفاقیہ زنا کا صدور ہو جائے، تو کیا اس کو ہمارے معاشرہ پر قیاس کیا جاسکتا ہے؟ اور دونوں کو ایک ہی پلیٹ فارم، پر رکھا جاسکتا ہے؟

حضراتِ صحابہ رضی اللہ عنہم فرماتے ہیں کہ نماز تو نماز، جماعت کے چھوڑنے کی بھی

وہاں کسی میں ہمت نہ تھی۔ حتیٰ کہ منافقین بھی برابر جماعت میں حاضر ہوتے اور کسی کو چلنے کی طاقت نہ ہوتی تو دو آدمیوں کے سہارے وہ مسجد کو آتا۔ (۱)

کیا ایسے معاشرے پر یہ حکم لگانا کہ وہاں بھی گناہ گار و بے نمازی تھے، کوئی انصاف کا تقاضا ہے یا تحقیق کا مقتضا؟ اس کے علاوہ کبھی کسی صحابی سے کسی غلط کام کا صدور ہوگیا، تو وہ بے چین ہوکر، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے دربار میں حاضر ہوتے اور اس کے بارے میں خدا اور رسول کا حکم اپنے اوپر جاری کراتے تھے۔ جیسے حضرت ماعز اور غامدیہ رضی اللہ عنہا عورت کا واقعہ حدیث میں آیا ہے۔ اس کے برعکس ہمارے معاشرے میں گناہ کر کے فخر کیا جاتا ہے، برائی کا احساس تک نہیں ہے، نماز کی دعوت دینے والوں کو گالی دی جاتی ہے۔ بتاؤ! دونوں معاشرے ایک ہیں؟ پھر آخر میں میں خود ساختہ محققین سے مطالبہ کرتا ہوں کہ وہ صحابہ کے دور میں کسی مستقل چور، ڈکیت، زنا کار، جواڑی، شرابی وغیرہ کی نشان دہی کریں، جیسے ہمارے معاشرے میں لاکھوں ایسے افراد ہیں؛ کیا یہ بے عقل محقق اس کی نشان دہی کر سکتے ہیں؟

مساجد پر کس کا قبضہ ہونا چاہیے؟

ان محققین و ہم دردانِ مسلم عوام نے آگے لکھا ہے:

> ”ہندوستان کی آزادی کے دن مسلمانوں کے بزرگوں نے سماجی میل ملاپ کے لیے ہر شہر میں انجمنیں، عاشور خانے، ادارے وغیرہ بنائے، جن کو برباد کر دیا گیا یا کمزور و بدنام کر دیا گیا اور مسجدیں بچی رہیں، وہاں دنیوی معاملات پر بات چیت کی نہ اجازت ہے نہ مسجد اس کے لیے استعمال کی جا سکتی ہے اور مسجدوں پر علمائے دین، پنج وقتہ نمازیوں اور

(۱) مشکوٰۃ:۹۶

کمیٹی کے اراکین کا مکمل قبضہ ہو چکا ہے۔ (رسالۂ مذکورہ ۸۔۹)

ہم ان ہم دردانِ قوم سے پوچھنا چاہتے ہیں کہ اگر علما و نمازیوں و مسجد کے اراکین وخدمت گاروں کا مسجد پر قبضہ ہونا تمہاری نظر میں کھٹک رہا ہے، تو یہ بتاؤ کہ مسجدوں پر کس کا قبضہ ہونا چاہیے؟ بے نمازیوں کا، شرابیوں کا، زنا کاروں کا، جاہلوں کا، مسجد کو لوٹ کر برباد کرنے والوں کا، کس کا؟

کس قدر جہالت وحماقت ہے کہ علما و نمازیوں کا مسجد پر قبضہ بھی کھٹک رہا ہے؛ کیا یہ بھی کوئی قابلِ اعتراض بات تھی؟ میں ان جاہل محققین سے کہتا ہوں کہ مسجد پر قبضہ تو اپنے لوگوں کا ہونا چاہیے اور قرآن کی یہ آیت اس کے لیے کافی ہے:

﴿اِنَّمَا یَعْمُرُ مَسٰجِدَ اللّٰهِ مَنْ آمَنَ بِاللّٰهِ وَالْیَوْمِ الْآخِرِ﴾ (التوبۃ: ۲۴)

(مسجد کی آباد کاری تو صرف وہ لوگ کرتے ہیں، جو اللہ پر ایمان رکھتے ہیں اور آخرت کو مانتے ہیں اور جو نماز کو قائم کرتے ہیں اور زکوۃ دیتے ہیں، اور اللہ کے سوا کسی اور سے نہیں ڈرتے۔)

پھر یہ جو کہا کہ دنیوی معاملات کی مسجد میں اجازت نہیں، تو معلوم ہونا چاہیے کہ دنیوی معاملات دو قسم کے ہوتے ہیں: ایک وہ جو خالص دنیوی، دوسرے وہ، جس میں دینی وملی رخ ہو۔ دوسری قسم کے معاملات کا مسجد میں طے کرنا، اس پر مشورہ کرنا جائز ہے، اس کا کام ہر جگہ جاری ہے؛ مگر صرف ان کو نظر آتا ہے، جو مسجد کو آتے ہیں، جو نہیں آتے بھلا ان کو کیسے نظر آئے گا؟ ہاں! محض دنیا کے دھندے مسجد میں درست نہیں ہیں، اس میں آخر اشکال کی کیا بات ہے؟

علما کا اختلاف اور جہالت کا کرشمہ

ان مدعیانِ عقل وتحقیق نے بعض جماعتوں کا آپس میں اختلاف اور علما کا بعض

مسائل میں اختلاف پیش کر کے، اپنی جہالت کا کرشمہ دکھایا ہے اور بعض ایسے امور کو بھی ان اختلافی مسائل میں پیش کیا ہے، جن میں علما کا کوئی اختلاف نہیں؛ بل کہ جُہلا کا اختلاف ہے، مثلاً پائجامہ ٹخنوں کے اوپر ہو یا نیچے؟ یہ کوئی علما میں اختلافی مسئلہ نہیں ہے اور نہ ہی مساجد میں اس مسئلے پر کوئی بحث وجدال ہوتا ہے۔

پھر ان لوگوں نے کہا کہ ''ہر مسجد لڑائی کا گھر بن چکی ہے''؛ میں ان مدعیانِ عقل سے پوچھتا ہوں کہ کیا سیاست دانوں میں اختلاف نہیں ہوتا؟ کیا تمہارے ایوانوں میں آپس میں لے دے نہیں ہوتی؟ پھر کیا پارلیمینٹ ہاؤس کو لڑائی کا گھر کہنا روا ہے؟ کیا دو وکیلوں اور دو ججوں میں اختلاف نہیں ہوتا؟ کیا ڈاکٹروں اور انجینیروں میں اختلاف نہیں ہوتا؟ کیا اسکولوں میں اساتذہ و ذمہ داروں میں اختلافات نہیں ہیں؟ اگر ہیں، تو پھر علما و دینی جماعتیں اور مساجد ہی تمہاری ملامت و مذمت کا نشانہ کیوں بنتے ہیں؟ پھر یہ بھی غلط ہے کہ تمام مسجدیں لڑائی کا گھر بن گئیں، کسی کسی جگہ لڑائیاں ہوتی ہیں، روزانہ ہر مسجد میں لڑائی نہیں ہے، یہ سراسر جھوٹ ہے اور ان مدعیان عقل کی جہالت کا کرشمہ ہے۔

ہم مانتے ہیں کہ بعض ناخداترس لوگ بعض باتوں کو لے کر اختلاف کرتے ہیں؛ مگر اس سے تمام علما و دینی جماعتوں کو بدنام کرنا جہالت کا کرشمہ نہیں تو اور کیا ہے؟ یہ سب دراصل عوام کو علما سے اور دینی جماعتوں اور خود مساجد سے بدظن و دور کرنے کی سازش ہے۔

علما دنیوی علوم سے نابلد ہیں

اکیڈمی کے ماہرانِ علوم، جن کو مضمون لکھنے کی بھی صلاحیت نہیں، علما کے وقار کو کم کرنے کے لیے فرماتے ہیں:

’’یہ علما دنیوی علوم، جیسے: نفسیات ،عمرانیات، سماجیات ،سیاسیات، تاریخ فلسفہ اور سب سے بڑھ کر ان سے ہر روز مقابلہ کرنے والے ہندو ، ہندو مت اور ہندو فلسفے سے بالکل نابلد ہیں۔ ان سے ہمارا مطلب مسجدوں کے لاکھوں امام اور خطیب سے نہیں ہے، یہ ذمے داری ساری کی ساری اسلامی مدارس اور تحریکوں کے مالکوں کی ہے۔‘‘

(رسالہ مذکورہ:۳۰۔۱۰ خلاصہ)

اس کا مطلب یہ ہوا کہ مساجد کے ائمہ وخطیب تو درکنار جن کا کوئی شمار ہی نہیں ،اسلامی مدارس اور دینی تحریکات کے مالک و ذمے دار علما بھی ان دنیوی علوم سے نابلد ہیں۔

میں کہتا ہوں کہ یہ اعتراض میرے نزدیک اور ان شاء اللہ ہر صاحبِ عقل وبصیرت کے نزدیک مجنوں کی بڑ سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔ سوچنے کی بات ہے کہ علما نے اپنے لیے ایک میدان منتخب کیا ہے، کہ علومِ شریعت سے اپنے کو آراستہ کریں گے اور پھر ان کو اختیار کر کے زندگی گذاریں گے اور ان ہی علوم کی تادمِ آخر نشر و اشاعت اور ترویج وتبلیغ کریں گے اور علومِ شریعت نے الحمد للہ ضروریات کے پیش نظر ہر مفید علم کو اپنے اندر سمولیا ہے اس میں سیاست بھی ہے، نفسیات بھی ہے، تاریخ بھی ہے اور اخلاق کا فلسفہ بھی ہے۔ اب ان علما سے یہ کہنا کہ تم اس فن وعلم سے نابلد ہو، تم کو یہ بھی کرنا چاہیے، یہ بھی بننا چاہیے، تو اس کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی ڈاکٹر سے کہے کہ تم کیا ہو، صرف ڈاکٹر بن گئے، تم کو کارپنٹر بھی بننا چاہیے، ٹیلر بھی بننا چاہیے، کھیتی کرنا بھی سیکھنا چاہیے وغیرہ۔ بتایئے ڈاکٹر کو یہ مشورہ دینے والا پاگل قرار نہ پائے گا؟ پھر علما کو یہی مشورہ دینے ولا مجنون کیوں نہیں ہوگا؟ کیا علما کے ذمے ہی ہر چیز ہے۔

دوسروں کے ذمہ کچھ نہیں؟

دوسرے یہ کہنا بھی صحیح نہیں کہ علما میں سے کوئی بھی ان علوم سے واقف نہیں ہے۔ بہت سے علما دنیوی علوم وفنون میں اپنے ذوق کے موافق کسی کسی علم کو حاصل کیے ہوئے ہیں؛ مگر یہ تو ضروری نہیں کہ ہر عالم تمام علوم سے واقف ہو اور نہ ہی یہ ممکن ہے۔ کیا دنیوی علوم کی مہارت کے دعوے دار یہ کہہ سکتے ہیں کہ وہ تمام علوم سے واقف ہیں؟ سائنس داں تاریخ سے واقفیت نہیں رکھتے، تاریخ داں سائنس کو نہیں جانتے سیاست داں سائنس داں نہیں ہوتے، ڈاکٹر انجنیئر نہیں ہوتے؛ پھر علما ہی اس بارے میں کیوں قابلِ ملامت ہیں؟ ان کو ان کے فن وعلم کے لحاظ سے دیکھیے، میں پوچھتا ہوں کہ مذکورہ رسالے کے مترجم صاحبان، جو اپنے نام کے ساتھ اڈوکیٹ لگائے ہوئے ہیں، کیا وہ بھی ان سب علوم سے واقف ہیں؟

غرض یہ کہ یہ سب جہالت وحماقت اور سب سے بڑھ کر شرارت کی وجہ سے کیا جارہا ہے، ورنہ یہ اعتراض کسی عقل مند کی طرف سے نہیں ہوسکتا۔ رہا ہندو فلسفے کا علم، تو اس کی تردید وابطال کے لیے بہ طورِ فرضِ کفایہ بعض علما اس کو جانتے ہیں؛ مگر سب کو اس کے جاننے کی نہ ضرورت ہے اور نہ ہی سب پر یہ لازم ہے۔ الحمدللہ علما کے طبقے میں اس کے اصل مرجع وماخذ پر گہری نظر رکھنے والے اور اس کی اصل زبان سے اس کو جاننے اور اس کو سمجھنے والے موجود ہیں اور اس سلسلے میں کام بھی کررہے ہیں؛ مگر یہ کام نہ سب علما کو کرنے کا ہے، نہ اس کی ضرورت۔

یہ معلوم ہے کہ ہر کام ہر آدمی کرے، تو بھلائی کے بہ جائے خرابی ہی رونما ہوگی؛ اسی وجہ سے خود شرعی علوم میں بھی ہر علم کی مہارت ہر عالم کو نہیں ہوتی۔ لہٰذا علما بھی ایک دوسرے کی طرف رجوع کرتے ہیں اور صحیح اصول وطریقہ بھی یہی ہے۔

مساجد اور سادگی

آگے چل کر رسالۂ مذکورہ میں علما و دینی جماعتوں کے بارے میں کہا گیا ہے:

”یہ بڑی بڑی مسجدیں، عالی شان قالین کے ساتھ اور اونچی میناروں وگنبدوں کے ساتھ بناتے ہیں؛ حالاں کہ اس روپیے سے ہاسپٹل، ہاسٹل، سماجی مراکز بھی قائم کیے جاسکتے اور غریبوں کو مکانات بنا کر دیے جاسکتے ہیں، مسجدیں سادہ بنانا چاہیے وغیرہ۔“ (رسالہ مذکورہ: ۱۰)

میں اکیڈمی کو مطلع کرنا چاہتا ہوں کہ خود حضراتِ علما بھی یہی کہتے ہیں کہ مساجد سادہ طرز کی بنائی جائیں، جیسا کہ کتبِ فقہ میں لکھا ہے؛ مگر مسجد بنانے والے اکثر جگہ عوام ہوتے ہیں، جو علما کے ان اقوال کو یا تو جانتے نہیں یا مانتے نہیں، ممکن ہے بعض جگہ علما سے بھی کوتاہی ہوگئی ہو؛ مگر ایسا نادر ہے؛ رہی بات اونچی مناروں کی کہ یہ مسجد کی علامت ہونے کی وجہ سے قابل تنکیر نہیں ہے۔

قذافی کا ارشاد (۱)

پھر ان محققین نے علما و دینی جماعتوں کو بھکاری کا لقب بھی عطا فرمایا ہے اور اپنی بات کی تائید میں ”معمر قذافی“ کا یہ ارشاد بھی پورے احترام سے نقل کیا ہے:

---

(۱) قذافی صاحب کے نظریات وہی ہیں، جو جمال عبدالناصر کے تھے، ہم اس سلسلے میں حضرت مولانا سید ابو الحسن علی حسنی ندوی رحمۃ اللہ کی کتاب ”مسلم ممالک میں اسلامیت و مغربیت کی کشمکش،، سے قذافی کے نظریات پیش کرتے ہیں:

” قذافی کا خیال ہے کہ اسلام جو کتاب وسنت سے ماخوذ ہے، اس انقلابی عہد کا ساتھ نہیں دے سکتا۔ انھوں نے ایسے بیانات دیے، جو اسلام کے تسلیم شدہ افکار ونظریات کے خلاف تھے؛ ان کے نزدیک حدیث کی صحت مشکوک ہے اور حدیث پر اعمال کی بنیاد رکھنا صحیح نہیں“۔ وغیرہ

(دیکھو مذکورہ کتاب: ۲۱۸ تا ۲۲۴)

''ہندوستان کے مسلمان موت سے پہلے کی نہیں ؛ بل کہ بعد کی زندگی کے لیے پریشان ہیں ، یہ صرف مسجدوں اور قبرستانوں کے لیے روپیہ مانگتے ہیں ، کسی اور کام کے لیے نہیں''۔(۱)

(اس کے بعد بلا سمجھے ہی جہاد وایمان کی فضیلت میں آئی آیات کو پیش کر دیا ہے۔)

اس کے جواب میں عرض ہے کہ دین کے لیے چندہ مانگنے کو بھیک اور مانگنے والوں کو بھکاری کہنا ایسا ہی ہے، جیسے بعض لوگوں کا قول اللہ نے نقل کیا ہے:

﴿اِنَّ اللّٰهَ فَقِيْرٌ وَّنَحْنُ اَغْنِيَاءُ﴾ (آل عمران :۱۸۱)

(کہ اللہ فقیر و بھکاری ہے ہم مال دار ہیں)

ظاہر ہے کہ اس سے اللہ فقیر نہ ہوا! اسی طرح علما بھی بھکاری نہ ہوئے۔ رہا مسٹر قدافی کا قول، تو اس کو بھی اور اس کے ساتھ اس کے ہم نوا محققینِ بے مایہ کو بھی معلوم ہونا چاہیے کہ بلا شبہ مسلمان کی شان یہی ہے کہ وہ موت کے بعد کی زندگی کے لیے پریشان ہوتا ہے اور جس کی یہ شان نہیں، وہ مسلمان ہی نہیں! پورا قرآن اس قسم کے مضامین سے پُر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے کفار کی صفت یہ بتائی ہے:

﴿وَفَرِحُوْا بِالْحَيٰوةِ الدُّنْيَا﴾

(کہ وہ دنیوی زندگی پر خوش ہوتے ہیں)

اور دنیوی زندگی کو ترجیح دینے پر قرآن نے انکار کیا ہے:

﴿بَلْ تُؤْثِرُوْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا﴾ (الاعلیٰ :۱۶)

(کہ تم دنیوی زندگی کو (آخرت پر) ترجیح دیتے ہو)

معلوم ہوا کہ دنیا کی زندگی کے بہ جائے آخرت اور بعدِ موت والی زندگی کے

---

(۱) (رسالہ مذکورہ:۱۱)

لیے پریشان ہونا، مسلمان کی علامت ہے اور اس کے لیے ضروری ہے۔ اب قذافی خود ہی غور کرلیں کہ وہ دنیا چاہتے ہیں یا آخرت اور یہ کہ آخرت کو ترجیح دینے والے قرآن کے مطابق کرر ہے ہیں یا تم؟

رہا قذافی کا یہ کہنا کہ یہ ہندوستانی مسلمان صرف مسجدوں اور قبرستانوں کے لیے چندہ مانگتے ہیں، کسی اور کام کے لیے نہیں؛ یہ حقیقت کے خلاف ہے۔

قبرستان کے لیے چندہ ممکن ہے بعض قبر پرست لوگ مانگتے ہوں۔ سب پر یہ الزام رکھنا سراسر تقاضائے انصاف سے بعید ہے اور مسجدوں کے لیے چندہ مانگنا برا نہیں؛ بل کہ ضرورت کے لیے ہے؛ پھر صرف مسجدیں ہی نہیں، علما دینی تعلیم کے لیے مدارس و مکاتب کو بھی جگہ جگہ قائم کرتے جارہے ہیں۔ اس کے علاوہ کئی اور ملی و دینی خدمات بھی انجام دی جارہی ہیں اور اسی چندے سے الحمد للہ ہندوستان میں دینی مدارس نے وہ کام کیا ہے اور کرر ہے ہیں، کہ اسلامی ممالک میں حکومتیں بھی اس کا تصور نہیں کرسکتی ہیں۔ اور قذافی صاحب ہوں یا ان کے ہم نوا ہوں، یہ ہرگز خیال نہ کریں کہ یہ ساری خدمات عربی حکومتیں یا مسلم حکومتیں یا عرب کے شیوخ کے چندوں سے انجام دی جارہی ہیں؛ بل کہ یہ سب دراصل ہندوستانی مسلمانوں کے اخلاص و خلوص سے دیے ہوئے چندوں سے انجام پارہی ہیں اور ہندوستان میں ان ہی خدمات سے دین زندہ ہے۔ اور یہ بھی معلوم ہونا چاہیے کہ یہ دینی مدارس حکومت کے تعاون کو پسندیدگی کی نظر سے نہیں دیکھتے، ان سے مانگنا تو درکنار۔ ہاں! خلوص سے دینے والے غریبوں سے تعاون چاہتے ہیں۔

رہی جہاد کی فضیلت، جس کا حوالہ قرآن کی آیات سے دیا گیا ہے، تو الحمد للہ اس پرانی ہی بوریوں پر بیٹھ کر پڑھانے والے اور پڑھنے والوں کو زیادہ یقین ہے اور وقت

پر یہی لوگ اس پر آگے آتے ہیں۔ دیو بند کا مدرسہ ہو یا اس کے نقش قدم پر چلنے والے ہزاروں مدارس، ان کے فارغین نے جہاد کے ہر میدان میں حصہ لیا ہے اور کفر خواہ کسی شکل میں ظاہر ہوا ہو، اس کا پوری شدت وقوت سے مقابلہ کیا ہے اور کر رہے ہیں۔ جہاد صرف تلوار لے کر نکلنے کا نام نہیں، سلطان جائر (ظالم بادشاہ) کے سامنے کلمۂ حق کہنا بھی جہاد ہے اور بڑا جہاد ہے؛ نیز ہندوستان کی آزادی کی جدوجہد ان ہی بوریا نشین اور مدرسوں کی چہار دیواری میں بند علما نے شروع کی تھی اور اس کی کام یابی کا سہرا بھی حقیقت میں ان ہی کے سر ہے، اگرچہ تاریخ کے ورق الٹنے والے محققین تاریخ کے ان حقائق سے ناواقف ہیں۔

بہ ہر حال عرض یہ کرنا ہے کہ یہ ہندوستانی مسلمان (علما) صرف مسجدوں کے لیے چندہ نہیں مانگتے؛ بل کہ دین کے تمام شعبوں میں پوری تندہی کے ساتھ مصروفِ عمل ہیں اور قذافی جیسے بے ایمانوں کی جڑیں اکھاڑنے میں مصروف ہوکر جہاد کا فریضہ انجام دے رہے ہیں۔ (وللہ الحمد علی ذلك)

تبلیغی جماعت پر ناروا حملے

اکیڈمی کے محققین نے بعض جماعتوں پر کھل کر تنقید کی ہے اور جماعت اسلامی کے ساتھ تبلیغی جماعت کو بھی اپنے حملوں کا نشانہ بنایا ہے۔ یہاں میں واضح کروں کہ ہمیں جماعتِ اسلامی کے اسلام کی تعبیر وتشریح کے متعلق موقف سے قطعی طور پر اختلاف ہے؛ اسی طرح اس کا حضراتِ صحابہ وسلفِ صالحین کے متعلق موقف ہماری نظر میں نہایت غلط ہے۔ مگر ان محققین نے اس پر جو تنقید کی ہے، وہ اس موقف پر نہیں ہے؛ بل کہ دیگر امور پر ہے؛ چوں کہ ان امور کے متعلق جماعت اسلامی کا نقطۂ نظر ہمیں معلوم نہیں؛ لہذا ہم اس سلسلے میں کوئی وضاحت پیش نہیں کر سکتے اور اسلام کی

تعبیر اور اکابرینِ امت وسلفِ صالحین کے متعلق اس کے موقف کو جو ہم غلط سمجھتے ہیں، اس کی وضاحت کا یہ موقعہ نہیں ہے اور نہ یہاں اس کی ضرورت ہے۔

تبلیغی جماعت پر پہلا اعتراض اور جواب

البتہ تبلیغی جماعت کے متعلق ان محققین نے جو کہا ہے، ہم اس کا جواب دینا چاہتے ہیں۔ ان لوگوں نے تبلیغی جماعت کے بارے میں ایک بات یہ کہی ہے:

"(اس تبلیغی جماعت) کی قیادت کو زمین کی سطح کے نیچے کی قبر اور آسمانوں کے اوپر کی جنت کے علاوہ کسی اور چیز سے کوئی سروکار نہیں۔" (رسالہ مذکورہ: ۱۳۰)

میں کہتا ہوں کہ اس کا اگر یہ مطلب ہے کہ تبلیغی جماعت کی قیادت قبر اور جنت میں راحت کی زندگی کی خاطر نیک اعمال اور یقین وایمان کی تحصیل میں لگی ہوئی ہے، تب تو یہ بات قابلِ اعتراض ہے ہی نہیں۔ کیوں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اور خود قرآن واسلام نے بھی اسی کا حکم دیا ہے، جیسا کہ ہم نے اوپر قذافی کے قول کی تردید کے موقعے پر تفصیل سے لکھا ہے، اگر یہ جرم ہے تو میں کہتا ہوں کہ تبلیغی جماعت اور اس کی قیادت سے بڑھ کر اس جرم کے مرتکب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم وصحابہ و اسلافِ امت ہیں۔ اگر اسی کا نام جرم ہے، تو ہمیں اقرار ہے اور فخر کے ساتھ اعتراف ہے کہ ہم بھی اس جرم کے مرتکب اور اس گناہ کے مجرم ہیں۔

اور اگر اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ لوگ شرعی حدود میں رہتے ہوئے بھی دنیا کو حاصل نہیں کرتے؛ بل کہ رہبانیت اختیار کیے ہوئے ہیں، تو یہ ان پر صریح بہتان ہے اور حقیقت کے بالکل خلاف ہے۔ وہ حضرات جو تبلیغی جماعت سے منسلک ہیں، ان میں ڈاکٹر بھی ہیں، انجینئر بھی ہیں، تاجر پیشہ بھی ہیں، مزدور وملازم بھی ہیں، مال دار

بھی ہیں، غریب بھی ہیں اور اس کی قیادت کرنے والوں میں علما ہیں جوان لوگوں کو ان دنیوی معاملات میں شرعی حدود کی رعایت کے ساتھ لگے رہنے کی تعلیم دیتے ہیں، ہاں! وہ یہ ضرور کہتے ہیں کہ دنیا برائے دنیا کافرانہ مزاج و مذاق ہے، مسلمان دنیا برائے آخرت کا قائل ہے۔ لہذا ہر چیز آخرت کے لیے کی جائے اور یہ بعینہ اسلام کی تعلیم ہے۔

تبلیغی جماعت پر دوسرا اعتراض اور جواب

آگے ان مدعیان تحقیق نے لکھا ہے:

"تبلیغی جماعت اور اس کی قیادت کو صرف جنت کی فکر ہے، کوئی پرواہ نہیں کہ ہندو نازی مسجد کو ڈھا دیں، امینہ کے چہرے سے نقاب نوچ دیں، سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج مطہرات کا نعوذ باللہ ٹھٹھا اڑائیں، کامن سیول کوڈ کی جدوجہد کریں، مسلمانوں کے بزرگوں کو مجرم، لفنگے اور تباہ کار قرار دیں، سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم پر حملے ہوتے ہیں؛ لیکن جماعت ٹس سے مس نہیں ہوتی۔ ایران کا اسلامی انقلاب، بغداد پر بمباری، بوسینیا میں مسلمانوں کا قتل عام یہ سب معاملات تبلیغی جماعت کو معلوم تک نہیں، بابری مسجد تبلیغی مرکز سے چند میل پر شہید ہوئی ہے؛ مگر اس کی لیڈر شپ پر جوں تک نہیں رینگتی وغیرہ۔" (رسالہ مذکورہ :۱۴)

راقم عرض کرتا ہے کہ اس ساری بکواس کا خلاصہ یہ ہے کہ اسلام اور مسلمانوں سے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم، آپ کی ازواج، مساجد و دینی اداروں سے، جماعت تبلیغ کو کوئی دل چسپی نہیں۔ ان چیزوں سے نہ محبت ہے اور ان پر حملوں سے نہ ان کے دلوں میں درد ہوتا ہے اور ان چیزوں پر ہونے والے حملوں کا ان تبلیغی لوگوں کو علم

بھی نہیں ہے۔

میں ان مدعیانِ تحقیق سے یہ پوچھتا ہوں کہ مثلاً: ''دکن ہیرالڈ'' میں شائع ہونے والی جھوٹی کہانی پر جن لوگوں نے ہندوستان اور دنیا کے مختلف حصوں وخطوں میں احتجاج کیا اور اس کہانی کی تردید کی اور اس کے خلاف کاروائیوں میں حصہ لیا، کیا ان میں جماعتِ تبلیغ کے افراد شامل نہیں تھے؟ اور اگر تھے اور یقیناً تھے اور ہر جماعت کے افراد سے زیادہ تھے، تو یہ کیا کوئی تحقیق کا تقاضا تھا کہ اس کے خلاف تم لوگوں نے لکھا ہے یا جہالت وشرارت کا یہ کرشمہ ہے؟

بابری مسجد کی شہادت پر جماعت کی قیادت کے کانوں پر جوں نہ رینگنا؛ ان کو کس ذریعے سے معلوم ہوا؟ غالباً تم یوں کہو گے کہ کوئی اخباری بیان ان کی طرف سے جاری نہیں ہو، اریڈیو، ٹیلی ویژن اور دوسرے ذرائع ابلاغ سے ان کی طرف منسوب کوئی بات شائع وجاری نہیں ہوئی؛ مگر میں کہتا ہوں کہ جن لوگوں نے یہ سب کچھ کیا، آخر اس کا کیا نتیجہ ہوا؟ پھر بے نتیجہ بات میں مشغول ہونے کی ان کو اگر کوئی ضرورت محسوس نہیں ہوئی، تو یہ کون سا جرم ہے؟ بے شک انہوں نے یہ سب نہ کیا؛ مگر انہوں نے ایک کام وہ کیا، جو ان اخباری بیانات جاری کرنے والے لوگوں میں سے اکثر نہیں کرتے؛ یعنی ''خدا کی طرف توجہ، اسی سے مدد واعانت کی درخواست''؛ نیز اہلِ اسلام کو دین پر چلنے کی تعلیم وتلقین۔ بلاشبہ انہوں نے جلوس نہیں نکالا، احتجاجی جلسے نہیں کیے، نعرے نہیں مارے اور دعوے نہیں کیے؛ اس لیے کہ یہ سب مفید ونتیجہ خیز چیزیں نہیں ہیں اور اگر کسی درجے میں یہ مفید ہے، تو یہ سمجھا کہ یہ کام بہت سے اور لوگ بھی کررہے ہیں اور بعض جماعتیں تو اسی کام کے لیے اپنے کو وقف کی ہوئی ہیں؛ پھر تبلیغی جماعت بھی اس کو کیوں کرے؟ اور جو اصل کام تھا کہ خدا سے مدد حاصل کی جائے، یہ کام اس نے

اپنے ذمے لیا اور اس میں مشغول رہی۔ آخر یہ کون سی قابل اعتراض بات ہے؟

رہا یہ کہنا کہ ''ایرانی انقلاب وغیرہ کی ان کو خبر تک نہیں''۔ یہ خود ان محققین کی بے خبری کا نتیجہ ہے؛ پھر یہ بھی حیرت انگیز بے خبری ہے کہ ایرانی انقلاب کو اسلامی انقلاب قرار دیا اور سمجھا جائے، یہ ایران کا انقلاب اسلامی انقلاب نہیں، یہ تمہاری جہالت کا کرشمہ ہے کہ اس کو اسلامی انقلاب کا نام دیا ہے، تمہیں معلوم ہے کہ اسلام کے نام پر ہونے والے اس انقلاب کے بعد اہلِ سنت پر وہاں کیا کیا مظالم ڈھائے گئے اور خود اسلام کے خلاف کیا کیا ہوا؟ اگر نہیں معلوم تو اپنی جہالت پر رونے کی ضرورت ہے اور دوسروں پر طعن کرنے سے قبل اپنے گریبان میں جھانکنے کی ضرورت ہے۔

تیسرا اعتراض اور جواب

آگے لکھا ہے:

> ''اس کے (جماعت تبلیغ کے) اراکین کو کانا پھوسی کے ذریعے مسجدوں کے منتظمین کے اندر نئے نئے تضادوں کے اٹھانے کی ٹریننگ دی جاتی ہے کہ آیا یہ تسبیح پڑھی جانی چاہیے یا دوسری پڑھی جائے؟'' (رسالۂ مذکورہ :۱۴)

یہ بھی سراسر بہتان والزام ہے، جس کو حقیقت سے کوئی علاقہ نہیں؛ اگر یہ حقیقت ہے، تو اس کا ثبوت پیش کرنا چاہیے، محض دعویٰ قابلِ قبول نہیں ہوا کرتا؛ یہ ہوسکتا ہے کہ تبلیغی جماعت سے منسلک بعض افراد نے اس قسم کی کسی حرکت کا ارتکاب کیا ہو؛ مگر اس کی ذمہ داری جماعت پر یا اس کی قیادت پر نہیں ہے، یہ بعض افراد کا اپنا ذاتی عمل ہے۔

دوسرے ان مدعیانِ تحقیق کو یہ سوچنا چاہیے کہ اگر کسی تسبیح وعبادت کی مروجہ شکل شریعت کے خلاف ہو اور تبلیغی جماعت یا اس کے کچھ افراد اس بدعت کی اصلاح کے لیے کوشاں ہوں، تو اس کو تضاد ونزاع قرار دینا، کیا جہالت نہیں ہے؟

حضرت عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے بعض لوگوں کو مسجد میں ایک خاص طریقے پر، جو سنتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت نہیں۔ ذکر کرتے ہوئے دیکھا، تو ان کو بدعتی قرار دے کر مجلس سے نکل جانے کا حکم دیا تھا۔ (۱)

احقر نے اس واقعے کی تفصیل مع حوالہ اپنے رسالے ''منکرات رمضان'' میں پیش کی ہے۔ اس کو دیکھ کر کوئی ان محققین کی طرح حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ کو تضاد ونزاع برپا کرنے والا قرار دے، تو کیا یہ اس کی جہالت نہیں ہے؟ ممکن ہے اسی طرح کی چیزوں پر تبلیغی جماعت نکیر کرتی ہو اور طریقۂ سنت کے اجرا کی کوشش کرتی ہو۔ آخر تم کو کیا حق ہے کہ اس پر معترض ہو؟

چوتھا اعتراض اور جواب

آگے لکھا ہے:

> ''نوعمر لڑکوں کو ہر روز بھرتی کیا جاتا ہے اور ان کے ہاتھوں میں تسبیح تھمائی جاتی ہے اور انہیں تسبیح کے دانے ڈھکیلنے اور بناوٹی رونے کی آوازیں نکالنے اور چیخ چیخ کر دعائیں مانگنے کی ٹریننگ دی جاتی ہے۔ اور ایسے ڈرانے کے لیے بجلی کا سوئچ بند کر کے اندھیرے میں کیا جاتا ہے، تا کہ اللہ کی مہربانیوں کا نزول ہو۔ یہ ادارہ بے مقصدیت کے عذاب میں مبتلا ہے اور اس کے اراکین اپنے چاروں طرف احساس برتری کی ہوا اڑاتے ہوئے گھومتے رہتے ہیں۔'' (رسالہ مذکورہ:۱۵)

ناظرین غور کریں کہ مذکورہ عبارت آیا کسی تحقیق کے نتیجے میں ظاہر ہوئی ہے یا محض عناد وبغض کے نتیجہ میں؟ کیا ان محققین کو یہ نہیں معلوم کہ تبلیغی جماعت لوگوں کو

(۱) دیکھو الدارمی:۱/۴۹

نماز سکھاتی ہے، اسلامی تعلیمات کی طرف توجہ دلاتی ہے، حلال وحرام کے فرق کو ملحوظ رکھنے کی ترغیب دیتی ہے اور ذکر واذکار کی تعلیم کرتی ہے، ان سب باتوں کو چھوڑ کر ہاتھوں میں تسبیح تھمانے اور تسبیح کے دانے ڈھکیلنے اور بناوٹی آوز نکالنے اور چیخ کر دعائیں کرنے کا تذکرہ کرنا، کیا محض الزام و بہتان نہیں ہے؟

تسبیح تھمائی نہیں جاتی؛ بل کہ ذکر خداوندی کی حلاوت ان لوگوں کو تسبیح تھامنے پر مجبور کرتی ہے اور صرف ڈھکیلتے نہیں؛ بل کہ اس کے ساتھ خدا کی یاد بھی ہوتی ہے اور اس طرح گنتی کا ثبوت شرع میں موجود ہے۔ اور بناوٹی رونے کی بات تو خود بھی صحابہ رضی اللہ عنہم سے مروی ہے۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے فرمایا تم میں جو رو سکے وہ روئے اور جس کو رونا نہ آئے، تو وہ رونے کی صورت بنا لے، اور یہی بات عبداللہ عمرو ابن العاص رضی اللہ عنہ نے بھی فرمائی ہے۔(۱)

اگر یہی تعلیم وتربیت تبلیغی جماعت والے دیں اور اس پر عمل کریں، تو برا کیوں؟ ہاں! تم جیسے لوگوں کو یہ سمجھ میں آنا مشکل ہے کہ دنیا کی عقل اس کے لیے کافی نہیں ہے۔ رہی بے مقصدیت کی بات؛ تو عرض ہے کہ واقعی تمہارا جو مقصد ہے، اس کے لحاظ سے تبلیغی جماعت بے مقصد جماعت ہے، جیسے ہمارے نزدیک تمہاری حرکات و سکنات بے مقصد ہیں؛ کیوں کہ تمہارا مقصد دنیا ہے اور ہمارا آخرت؛ مگر دیکھنا تو یہ ہے کہ خدا کی نظر میں کون با مقصد ہے؟ آخرت کو مقصد بنانے والا یا دنیا کو مقصد بنانے والا؟

قرآن وحدیث کا مطالعہ اور سیرتِ نبوی اور اسوۂ صحابہ کا مطالعہ واضح وصاف انداز میں ہمیں اس نتیجے پر پہنچاتا ہے کہ آخرت کی تیاری کے لیے اس دنیا میں انسان

(۱) احیاء العلوم للغزالی:۴/۱۶۳

کو بھیجا گیا ہے، دنیا اس کے لیے ایسا راستہ ہے، جیسے مسافر کا راستہ۔ یہ دنیا مقصد نہیں، منزل نہیں، وطن نہیں ہے، آخرت ہی منزل و مقصد ہے؛ لہٰذا ہم اس مقصد کے تحت زندگی کرنے کو با مقصد سمجھتے ہیں۔ البتہ انسان ہیں تو کوتاہیاں ہو جاتی ہیں، پھر گڑگڑا کر اور رونا نہ آئے تو رونے کی صورت بنا کر خدا کے حضور معافی چاہتے ہیں۔ والحمدلله علی ذلك.

صیاد اپنے ہی دام میں!

اکیڈمی نے ''مسلم لیگ'' اور ''اتحاد المسلمین'' کو با مقصد ادارے قرار دیا ہے اور ''مجلس مشاورت'' اور ''بابری مسجد کمیٹی'' اور علمائے شمال کی شکایت کی ہے کہ وہ جنوبی ہند کی دانش مند قیادت کے سامنے سر جھکانے تیار نہیں؛ یہ کون قائدین ہیں اور ان کا کارنامہ کیا ہے؟ اس کا کوئی ذکر نہیں۔ شاید ایسے محقق لوگ ہی قائد ہوں گے، جن کو بے تکی ہانکنے کے علاوہ کچھ نہیں آتا اور وہ جاہلیت کے عمیق غار میں ہیں۔ اس کے بعد ایک ذیلی عنوان ''مسلمانوں کی تباہی کے ذمہ دار کون''؟ کے تحت فرماتے ہیں:

> ''کسی بھی قوم کی تباہی کی ذمہ داری قرآن پاک اس کے ان سرداروں پر ڈالتا ہے، جن کو دنیا کی نعمتیں دی گئی ہوتی ہیں، جو فسق میں مبتلا ہو جاتے ہیں (پھر ایک آیت بنی اسرائیل کی پیش کی ہے)''
>
> (رسالۂ مذکورہ:۱۶)

میں کہتا ہوں کہ اس آیت میں فسق کو تباہی و بربادی کا سبب قرار دیا ہے اور فسق کے معنے حد طاعت سے نکل جانے کے ہیں، ''روح المعاني'' میں اسی آیت کی تفسیر میں لکھا ہے:

''خرجوا عن الطاعة''

(کہ طاعت وفرماں برداری سے نکل گئے)(۱)

معلوم ہوا کہ فسق اطاعت سے نکل جانے کا نام ہے اور اطاعت تمام حدود اللہ کو پورا کرنے کا نام ہے، خواہ وہ حقوق اللہ سے متعلق ہوں یا حقوق العباد سے۔

پس معلوم ہوا کہ فسق اور حقوق اللہ وحقوق العباد میں کوتاہی تباہی کا سبب ہے، اس سے ہم نے اوپر جو ثابت کیا تھا وہ ثابت ہوا۔ ناظرین کو یاد ہوگا کہ ان جاہل محققوں نے اوپر اس کا انکار کیا تھا اور کہا تھا کہ نماز نہ پڑھنے سے یا حقوق اللہ میں کوتاہی سے دنیا میں تباہی وظلمت نہیں ہوتی۔ خدا کی قدرت کہ صیاد اپنے ہی دام میں آگیا اور حق ظاہر ہوگیا؛ لہٰذا یہی آیت ہماری تائید کررہی ہے اور تمہارا رد کررہی ہے۔ والحمد لله علی ذالك۔

چور کی ڈانٹ کوتوال پر

اکیڈمی نے تبلیغی جماعت اور جماعت اسلامی پر یہ الزام لگایا ہے کہ یہ مسلم عوام کے عیب بیان کرتے ہیں اور ان کی خوبیوں پر نظر نہیں کرتے، جب کہ مسلم عوام میں بہادری، سچائی، اصولوں پر جان قربان کرنے کے لیے رضا مندی وغیرہ اوصاف پائے جاتے ہیں؛ عوام حضور صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم کے نام پر جہاد کے لیے تیار ہو جاتے ہیں؛ پھر بنگلور میں ''دکن ہیرالڈ'' اخبار کی حضور صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم کے بارے میں توہین اور مسلمانوں کا ردعمل اور قربانی کا واقعہ پیش کیا ہے۔

میں کہتا ہوں کہ عیب تلاشی کا جو الزام تم نے لگایا ہے، اس میں تم خود مبتلا ہو؛ اب تک تبلیغی جماعت پر جو الزام تراشی وعیب تراشی تم نے کی ہے، یہ کس اصول سے درست ہے؟ اسی کو کہتے ہیں ''الٹا چور کوتوال کو ڈانٹے'' اور یہی ہے ''چوری اور سینہ

(۱) روح المعانی:۱۵/۴۳

زوری''۔ اور یہ بتاؤ کہ تبلیغی جماعت میں شامل افراد میں کوئی خوبی نہیں؟ کیا تم نے اس کو دیکھا ہے؟ ہر گز نہیں! بل کہ تم نے تو عیب تلاشی ہی نہیں؛ بل کہ الزام تراشی کی ہے، جو عیب تلاشی سے بڑھ کر جرم ہے۔

دوسرے عیب تلاشی اصلاح کے لیے کی جائے، تا کہ غلط کار لوگ اپنی اصلاح کر کے خدا کے محبوب بندے بنیں، تو یہ نہ صرف یہ کہ جائز ہے؛ بل کہ ضروری ہے، ورنہ قرآن وحدیث میں امر بالمعروف ونہی عن المنکر کی تاکید کیوں کی جاتی؟ صحیح یہ ہے کہ تم نے جس کو عیب تلاشی کہا ہے، اس کو عیب تلاشی کہتے ہی نہیں؛ یہ نہی عن المنکر کہلاتا ہے اور یہ کام تو انبیا نے بھی کیا ہے!۔ ہاں! تم نے تبلیغی جماعت کے اوپر اب تک جو بکواس کی ہے، یہ ضرور عیب تلاشی والزام تراشی میں داخل ہے۔

اچھا یہ بھی پوچھنا ہے کہ ''دکن ہیرالڈ'' کے واقع میں یا اس طرح کے دیگر واقعات میں شہید ہونے والے لوگ کیا تبلیغی جماعت و جماعتِ اسلامی سے منسلک نہیں ہوتے؟ تم جن کو عوام کہتے ہو، وہ آخر کون ہیں؟ ہم دعوے کے ساتھ کہتے ہیں کہ پچاس فی صد سے زیادہ دینی جماعتوں میں سے صرف تبلیغی جماعت سے منسلک افراد اس میں ہوتے ہیں تو تم جن کی برائی اوپر کر آئے، ہو وہ ہی دراصل یہ جہاد کا میدان بھی جیتتے ہیں؛ اگر نہیں، تو تم اس کو ثابت کرو کہ ایسے مواقع پر تبلیغی جماعت کے افراد نہیں ہوتے، اگر نہ ثابت کر سکو، تو اپنی تحقیق و عقل کی خیر مناؤ۔

مصائب کا اسلامی فلسفہ

تبلیغی جماعت اور دیگر جماعتوں پر الزام تراشیوں کے بعد محققینِ ساہتیہ اکیڈمی کی طرف سے ارشاد ہوتا ہے:

''مسلمانوں پر ہر اس وقت ظلم ہوا ہے، جب وہ اسلام کی خاطر کھڑے ہوئے ہیں اور جب اسلام کو چھوڑتے اور آرام سے بیٹھے رہتے ہیں، تو انہیں بھلا دیا جاتا ہے۔ مکے کے گیارہ سالہ دور میں سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم پر پتھر برسائے گئے، مارا پیٹا گیا، بے عزت کیا گیا، جلتے ہوئے انگاروں اور گرم ریت پر لٹایا گیا؛ کیا یہ تکلیفیں اس لیے دی گئی تھیں کہ انہوں نے اسلامی شعائر کو چھوڑ دیا تھا؟ نہیں! بل کہ اس لیے کہ وہ اسلامی شعائر پر شدت سے عامل تھے۔ (رسالۂ مذکورہ: ۱۷۔۱۸)

پھر آگے چل کر بھی اسی قسم کی باتیں دہرائی گئی ہیں اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس قسم کی مصیبتوں کو قرآن پاک آزمائش بتاتا ہے، یہ جماعتیں (تبلیغی و اسلامی) ان مصائب کو آزمائش سمجھ کر مسلمانوں پر الزام لگانا، کیوں نہیں بند کر دیتے؟ (رسالہ مذکورہ: ۱۸)

راقم الحروف عرض کرتا ہے کہ ان محققین کی نظر صرف ایک طرف گئی ہے، دوسری طرف سے یہ لوگ غافل ہیں؛ اس لیے حقیقت تک رسائی سے محروم رہ گیے ہیں؛ لہٰذا ضروری ہے کہ یہاں ہم یہ بتائیں کہ اسلام میں مصائب کا فلسفہ کیا اور کس طرح ہے؟

لوگ دو طرح کے ہیں: ایک وہ جو خدائی احکامات اور اسلامی تعلیمات کو پوری طرح اپناتے ہیں۔ دوسرے: وہ جو خدائی احکامات اور تعلیمات کو اپناتے نہیں یا اس سلسلے میں کوتاہی کرتے ہیں۔ مصائب و آفات تو دونوں قسم کے لوگوں پر آتے ہیں؛ مگر پہلے گروہ پر مصائب ان کے درجات کی بلندی اور عظمت اور بڑائی کی زیادتی کے لیے

آتے ہیں، جب کہ دوسرے گروہ پر یہی مصائب سزا و عذاب بن کر نازل ہوتے ہیں۔

چناں چہ قرآن میں ایک جگہ ارشاد ہے:

﴿ اِنْ یَّمْسَسْکُمْ قَرْحٌ فَقَدْ مَسَّ الْقَوْمَ قَرْحٌ مِّثْلُهٗ وَتِلْکَ الْاَ یَّامُ نُدَاوِلُهَا بَیْنَ النَّاسِ وَلِیَعْلَمَ اللّٰهُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَیَتَّخِذَ مِنْکُمْ شُهَدَاءَ، وَاللّٰهُ لَا یُحِبُّ الظّٰلِمِیْنَ .وَلِیُمَحِّصَ اللّٰهُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَیَمْحَقَ الْکٰفِرِیْنَ﴾ (آل عمران :۱۴۰-۱۴۱)

(اگر تم کو زخم پہنچے، تو اس (کافر) قوم کو بھی پہنچا ہے اور ہم ان دنوں کو لوگوں کے درمیان ادلتے بدلتے رہتے ہیں اور تا کہ اللہ تعالیٰ ایمان والوں کو جان لے اور تم میں سے بعضوں کو شہید بنائے اور اللہ ظلم کرنے والوں کو پسند نہیں کرتے اور تا کہ میل کچیل سے صاف کر دے ایمان والوں کو اور مٹا دے کافروں کو)

اس آیت میں صحابہ رضی اللہ عنہم سے خطاب کر کے ان پر کافروں کی جانب سے ہونے والے ظلم کی حکمتیں بتائی گئی ہیں:

(۱) اہلِ ایمان کی آزمائش (۲) اہلِ ایمان کو شہادت کا مرتبہ دینا (۳) ان کا میل کچیل دور کرنا۔ یہ ہے آزمائش یا بلندیٔ درجات؛ مگر قرآن میں یہ بھی آیا ہے:

﴿ وَمَا أَصَابَکُمْ مِنْ مُصِیْبَةٍ فَبِمَا کَسَبَتْ أَیْدِیْکُمْ ﴾

(الشوریٰ :۳۰)

جو کچھ مصیبت پہنچتی ہے، وہ تمہارے ہی ہاتھوں کے کیے کاموں سے پہنچتی ہے۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ گناہوں کی پاداش میں اور سزا کے طور پر بھی مصائب آتے ہیں، یہ فیصلہ کہ کن پر سزا کے طور پر اور کن پر آزمائش یا بلندیٔ درجات کے لیے مصائب آتے ہیں، بہت آسان ہے؛ جو گناہوں میں مبتلا ہیں ان پر بہ طور سزا مصائب

آتے ہیں اور جو شرع کے پابند ہیں، جیسے صحابہ رضی اللہ عنہم ان پر مصائب، بلندیٔ درجات کے لیے آتے ہیں۔

اب غور کیجیے کہ آج کے مسلمان کیا صحابہ رضی اللہ عنہم کے طریقے پر ہیں؟ یا اس سے ہٹ کر ہیں؛ جو ہٹ کر ہیں، ان پر مصائب سزا و عذاب کے طور پر آتے ہیں اور اکثر ایسے ہی لوگ ہیں؛ اسی لیے علما اس کو کثرت سے بیان کرتے ہیں۔ ہاں! جو لوگ نیک ہیں اور شریعت کے پابند ہیں، ان کے لیے مصائب بلندیٔ درجات کے لیے آتے ہیں اور علما اس کو بھی بیان کرتے ہیں؛ مگر اکثریت کا لحاظ کرتے ہوئے پہلی بات زیادہ بیان کی جاتی ہے، تاکہ لوگ عبرت حاصل کریں۔

ایک عمدہ مثال!

اس کو ایک مثال سے سمجھئے کہ بخار کے بارے میں اطبا کہتے ہیں کہ کئی وجہ سے ہوتا ہے، ان میں سے دو وجہ عام ہیں: ایک گرمی، دوسری سردی؛ بعض دفعہ گرمی سے بخار ہوتا ہے اور بعض اوقات سردی سے ہوتا ہے۔ اگر سردی سے بخار ہوا ہو، تو طبیب اس کے موافق علاج تجویز کرے گا اور گرمی سے بخار ہوا ہو، تو اس کے موافق علاج کیا جائے گا؛ اگر کوئی طبیب کسی شخص کو بخار ہونے پر دیکھے کہ سردی کی وجہ سے ہے اور اس کا علاج گرم ادویہ سے کرے اور کوئی صاحب جو فنِ طب سے واقف نہیں اور یہ سمجھے ہوئے ہیں کہ بخار گرمی سے ہوتا ہے، یہ عرض کریں کہ بخار کا علاج گرم دوا سے کیوں کر رہے ہیں؟ تو بتایے! ڈاکٹر و طبیب اس کا کیا جواب دے گا؟ یہی نا کہ جناب یہ بخار گرمی سے نہیں سردی سے ہوا ہے، اگر آپ کو یہ معلوم نہ ہو، تو آپ خاموش رہیں۔ اسی طرح مصائب بلندیٔ درجات کے لیے بھی آتے ہیں، جیسے صحابہ رضی اللہ عنہم کے اوپر آتے تھے اور گناہوں کی وجہ سے بھی آتے ہیں، جیسے گناہ گاروں پر آتے ہیں۔ مصائب

آنے پر صحابہ کا حوالہ دے کر یہ کہنا کہ صحابہ پر جیسے بلندئ درجات کے لیے مصائب آتے تھے، علما یہاں بھی وہی بات کہیں، یہ جہالت ہے اور نا قابلِ التفات ہے۔

بہ ہر حال! علما کا یہ کہنا کہ مصائب آج کی مسلم اکثریت پر حد شرع سے ہٹ جانے کی وجہ سے ہیں، بالکل صحیح ہے۔

کفار کا غلبہ کیوں؟

ان محقق حضرات نے آگے لکھا ہے:

> اگر مسلمان نماز اور روزے کی پابندی نہیں کر رہے ہیں، تو کیا مسلمانوں کے دشمن نازی نماز اور روزے کو اختیار کیے ہوئے ہیں، کہ پوری کام یابی کے ساتھ مسلمانوں پر ظلم ڈھا رہے ہیں اور تباہ کر رہے ہیں۔ (رسالۂ مذکورہ :۱۸)

اس عبارت کو پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ یہ محقق حضرات جس طرح دین سے بے بہرہ ہیں، تاریخ سے بھی ناواقف ہیں۔

شریعت سے معلوم ہوتا ہے کہ گناہ گاروں پر اللہ تعالیٰ ظالم لوگوں کو مسلط کر دیتا ہے۔ہم نے اس مضمون کی آیت وحدیث پچھلی صفحات میں نقل کر دی ہے، ان کو دہرانے کی ضرورت نہیں؛ تاریخ کی کچھ مثالیں ملاحظہ فرمائیں:

(۱) حضرت سلیمان علیہ السلام کے بعد بنی اسرائیل کی بے دینی وغفلت پر ان پر کئی دفعہ غیر قوموں کا تسلط ہوا، بابل کا بادشاہ ''بخت نصر'' نے بیت المقدس پر چڑھائی کی اور بہت ظلم ڈھایا اور بہت سے لوگوں کو قیدی بنا کر لے گیا اور کشت وخون اور قتل وغارت گری کی انتہا کر دی۔ یہ بخت نصر مشرک تھا اور بنی اسرائیل گناہ گار مسلمان، اس واقعے کو قرآن میں، توریت میں کی گئی پیش گوئی کے طور پر بیان

کیا گیا ہے، قرآن کے اس مقام کی تشریح ہم پہلے کر آئے ہیں، دیکھ لیں۔

(۲) اسی طرح انطا کیہ کے بادشاہ نے جو کافر تھا، ایک سوستر سال قبل مسیح بنی اسرائیل پر چڑھائی کی اور ہزاروں یہودیوں کو قتل کیا، چالیس ہزار کو قیدی بنایا، مسجد کی بھی بے حرمتی کی؛ یہ واقعہ بھی توریت کی پیش گوئی کے حوالے سے قرآن میں اسی جگہ مذکور ہے جس کا اوپر حوالہ آیا ہے۔(۱)

(۳) بائبل کے مختلف مقامات سے بھی پتہ چلتا ہے کہ بنی اسرائیل کی غفلت شعاری و بے دینی پر اللہ نے ان پر ان کے دشمنوں کو مسلط کر دیا ہے۔ یروشلم کے بادشاہ ''صدقیاہ'' کے زمانے میں یرمیاہ نبی پر وحی آئی کہ کوئی شخص کسی عبرانی بھائی بہن کو غلام باندی بنا کر نہ رکھے، آزاد کر دے۔ پہلے تو لوگوں نے تعمیل کی، پھر اس سے پھر گئے۔ اس پر خداوندِ تعالیٰ نے ان لوگوں سے کیا فرمایا، وہ صحیفۂ یرمیاہ کے مطابق ملاحظہ کیجیے:

> ''ہاں! میں ان کو ان کے جانی دشمنوں کے حوالے کروں گا اور ان کی لاشیں ہوائی پرندوں اور زمین کے درندوں کی خوراک ہوں گی اور میں شاہ یہوداہ صدقیاہ کو اور اس کے امرا کو ان کے جانی دشمنوں اور شاہ بابل کی فوج کے حوالے کروں گا۔''(۲)

سوال یہ ہے کہ غلام باندی بنانے والے یہ بنی اسرائیل جو مسلمان تھے، ان پر جس دشمنِ قوم کو مسلط کرنے کی وعید سنائی جا رہی ہے، یہ کیا بڑے بڑے اولیاء اللہ تھے؟ یا ان سے بڑے دشمنِ خدا تھے؟ ظاہر ہے کہ یہ کفار و مشرکین تھے۔ شاہ بابل بنوکدرضر اور کسدی، جن کو یہاں دشمن کہا گیا ہے، یہ کافر و مشرک لوگ تھے، جیسا کہ بائبل سے

---

(۱) تفصیل کے لیے دیکھو: ''تفسیر حقانی''

(۲) صحیفۂ یرمیاہ: باب: ۳۵: ۲۰: ۲۱

ظاہر ہے۔

بہ ہر حال! گناہ گار پر کافر کو مسلط کرنے کا قانون الٰہی پہلے سے چلا آ رہا ہے، اس لیے یہ کہہ کر کہ مسلمانوں کے دشمن کیا نماز روزے کے پابند ہیں؟ حیرت نہ کیجیے؛ بل کہ تاریخ وشرع کا علم حاصل کیجیے کہ حیرت ختم ہو جائے گی۔

اختتام

جن باتوں پر بحث کی ضرورت تھی، الحمدللہ ان پر اختصار کے ساتھ کلام ہو گیا ہے، آگے جو باتیں رسالے میں لکھی گئی ہیں، وہ ہمارے موضوع سے خارج ہیں، ان کی صحت وعدمِ صحت کی ذمے داری خود ان پر ہے اور وہ غلط بھی ہو، تو ہمارے سے ان کا کوئی تعلق نہیں۔ قرآن وحدیث کی روشنی میں جن اغلاط کی ضرورت محسوس ہوئی اور حقائق کی روشنی میں جن بنیادی دعووں کا ابطال ضروری تھا، ہم نے وہ کر دیا ہے۔ اللہ تعالی اہلِ اسلام کو نیک توفیق دے اور ان کو دین پر جماوے اور ان کی حفاظت فرمایے۔ آمین۔

فقط

حررہ العبد محمد شعیب اللہ خان مفتاحی

جامعہ مسیح العلوم بنگلور ریکم نومبر / ۱۹۹۳ء